a

فہرست

شاہ کلید	8
الفرقان	9
عرض مرتب	11
قرآن کا پیغام	15
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے	25
جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے	28
ذریعۂ نجات	31
قرآن حکیم اور ہماری زندگی	33
سُورَةُ النَّبَاء	37
سُورَةُ النّٰزِعٰت	66
سُورَةُ عَبَس	97
سُورَةُ التَّكْوِيْر	120
سُورَةُ الاِنْفِطَار	141
سُورَةُ المُطَفِّفِيْن	154
سُورَةُ الاِنْشِقَاق	178
سُورَةُ البُرُوْج	194
سُورَةُ الطَّارِق	212
سُورَةُ الاَعْلٰى	227

❑	سُورَةُ الغَاشِيَة	246
❑	سُورَةُ الفَجْر	264
❑	سُورَةُ الْبَلَد	291
❑	سُورَةُ الشَّمْس	312
❑	سُورَةُ الَّيْل	325
❑	سُورَةُ الضُحٰى	343
❑	سُورَةُ الْإِنْشِرَاح	355
❑	سُورَةُ التِّيْن	361
❑	سُورَةُ العَلَق	367
❑	سُورَةُ القَدْر	379
❑	سُورَةُ البَيِّنَة	386
❑	سُورَةُ الزِّلْزَال	398
❑	سُورَةُ العٰدِيٰت	405
❑	سُورَةُ القَارِعَة	413
❑	سُورَةُ التَّكَاثُر	419
❑	سُورَةُ العَصْر	426
❑	سُورَةُ الهُمَزَة	434
❑	سُورَةُ الفِيْل	441
❑	سُورَةُ القُرَيْش	450
❑	سُورَةُ المَاعُون	456
❑	سُورَةُ الْكَوْثَر	463
❑	سُورَةُ الكَافِرُوْنَ	469
❑	سُورَةُ النَّصْر	475
❑	سُورَةُ اللَّهَبْ	482

❑ سُورَۃُ الاِخْلَاص		489
❑ سُورَۃُ الفَلَق		496
❑ سُورَۃُ النَّاس		503
❑ **ضمیمہ**		
● قرآن حکیم اور حدیثِ رسول ﷺ کا ربط	شیخ عمر فاروق	511
● قرآن مجید کے فنی محاسن	سید قطب شہید	518
● امثال القرآن	علامہ ابن قیم	527
● اسماء القرآن	حافظ محمد عبداللہ رفیق	529
● قرآنی دعائیں	مولانا سید شبیر احمد	549
● قرآن فہمی کے آداب	سید مودودی، مولانا اصلاحی	571
● قرآن کا فہم عام کرنے کے لیے لائحہ عمل	خرم مراد، حافظ محمد ادریس، پروفیسر عرفان احمد، مولانا امین احسن اصلاحی	575
● صحابہؓ کا فہم قرآن	ڈاکٹر عبداللہ محسن	581
● خواتین اسلام کا فہم قرآن	نسیم عرفان	586
● قرآن حکیم پر حیرت انگیز عبور	شیخ عمر فاروق	592
● اسلام...... ایک متوازن طرز زندگی	شیخ عمر فاروق	597
● اسلامی نظام تہذیب کے چودہ رہنما اصول	سید ابوالاعلیٰ مودودی	623

شاہِ کلید

میں قدیم جدید فلسفہ، سائنس، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں، مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ میں آئی ہے، کانٹ، ھیگل، نٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں، بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے، جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں، پھر بھی حل نہ کر سکے، ان کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا، اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے، میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے اس نے مجھے بدل کے رکھ دیا ہے، حیوان سے انسان بنا دیا، تاریکیوں سے نکال کر روشنی پر لے آئی ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے، انگریزی میں اس کنجی کو ''Master Key'' کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھل جائے، سو میرے لئے یہ قرآن ''شاہ کلید'' ہے، مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اس کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

الفرقان

[تیسواں پارہ]

اللہ تعالیٰ نے زندگی اور موت کا سلسلہ قائم کر کے انسان کی آزمائش کا ایک نظام وضع فرمایا ہے۔ آزمائش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا کے مقابلے میں انسان نہ اپنی مرضی کو اہمیت دے سکتا ہے نہ اپنے جیسے کسی اور انسان کی منشا کے مطابق چلنے کی راہ اختیار کر سکتا ہے۔ اس آزمائش میں سے بخیر وسلامتی گزرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے شعور میں حق و باطل کا فرق الہام کر دیا ہے اور خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت ودیعت فرمادی ہے۔ خیر اور حق کو اپنانے کا انعام اور باطل اور شر کو اختیار کرنے کا بدانجام بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے انسان کے سامنے روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہدایت و رہنمائی کا یہ سلسلہ ابتدائے حیات کے ساتھ ہی شروع ہو گیا اور بدقسمتی کا حال یہ ہے کہ انسانوں نے بہت کم اس ہدایت کو قبول کیا اور دنیا کی چمک دمک، ریل پیل، خوشی و شادمانی، نفسانی رغبتوں اور مادی چیزوں ہی کو حقیقت سمجھا ان کے علاوہ کسی اور وجود اور کسی دوسری زندگی کو ناممکن خیال کیا۔ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد یہی تھا کہ انسانوں کو بار بار یہ یاددہانی کرائی جائے کہ تمہیں بالآخر ایک روز اس دنیاوی زندگی کا حساب دینا ہوگا، لہٰذا اس زندگی کو مہلت عمل سمجھو اور آخرت کے لیے زیادہ سے زیادہ توشہ جمع کر لو۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ انسان نے بحیثیت مجموعی اس روشن حقیقت کو نہ صرف جھٹلایا بلکہ سرکشی کے آخری حدود کو پہنچنے کی پوری کوشش کی۔ قرآن مجید گزشتہ آسمانی کتابوں کی جامع کتاب ہے، اس کتاب نے ہدایت کے منکرین اور رسالت کے معترضین کو یوں جھنجوڑا ہے کہ اس بیان کو سننے والا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہے بغیر نہیں رہ سکتا الّا یہ کہ ہدایت اس کے مقدر ہی سے ٹل گئی ہو۔ قرآن مجید انسان کو اچھے اعمال پر جنت کی خوشخبری بھی دیتا ہے اور برائیوں کے ارتکاب پر جہنم کی وعید بھی سناتا ہے۔ پورے قرآن مجید میں عبرت و موعظت کے رنگ برنگ اسلوب بیان موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مثالوں کے ذریعے بھی سمجھایا ہے اور دلیل و برہان سے بھی اس کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ تیسویں پارے کا بیشتر حصہ انہی مثالوں اور دلائل و براہین سے لبریز ہے۔ موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا اور حساب کے لیے جمع کیا جانا ان دلائل و براہین کا مرکزی مضمون ہے۔ اس مضمون کے ذریعے انسان کے اندر یہ احساس بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ تخلیق کائنات پر غور و فکر کرے کہ جو خالق یہ سب کچھ کر سکتا ہے وہ انسان کو دوبارہ زندگی بھی دے سکتا ہے اور اسے حساب کے لیے جمع بھی کر سکتا ہے۔ یہ سب اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

جب کچھ سرکش اور باغی قسم کے انسانوں نے ان دلائل پر کان نہ دھرا اور سرکشی و بغاوت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش

کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی پیدائش کی حقیقت یاد دلائی کہ انسان کی حیثیت ہی کیا ہے وہ تو حقیر اور ذلیل مادۂ منویہ سے تخلیق ہوا ہے اور ہم ہی اسے تخلیق کرنے والے ہیں اور وہ ہمارے ہی سامنے سرکشی کا مظاہرہ کرتا ہے؟ اگر کسی کو اپنی قوت اور اختیار، قبیلہ اور کنبہ، مال اور دولت پر ناز اور غرور ہے تو وہ گزشتہ سرکش انسانوں کے انجام پر نظر ڈال لے کہ ان کے پاس یہ سب کچھ تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ کی پکڑ آ گئی تو ان کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔

قرآن مجید کا تیسواں پارہ اس ابدی اور اصل حقیقت کے علاوہ انسان کو حق و راستی، امن و سلامتی، اخوت و محبت، اخلاص و للّٰہیت اور اطاعت و فرمانبرداری جیسی صفات اختیار کرنے کی بھی ترغیب دلاتا ہے۔ اس کی ایک ایک آیت میں حکمت و دانش کے لازوال خزینے اور درس و عبرت کے ناقابل انکار نمونے موجود ہیں۔ گرامی قدر جناب شیخ عمر فاروق صاحب نے پارے کی اسی اہمیت کے پیش نظر سورۂ البقرۃ کی تکمیل کے بعد الفرقان کے سلسلے کو تیسویں پارے سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ موصوف نے تیسویں پارے کی سورتوں میں بھی تفسیر و توضیح کا وہی انداز برقرار رکھا ہے جو سورۂ البقرۃ میں اختیار کیا تھا۔ تفاسیر کے جس ذخیرے سے سورۂ البقرۃ کی توضیح میں استفادہ کیا تھا اس پارے کی تشریح میں بھی انہیں تفاسیر کو پیش نظر رکھا۔ تاہم تیسویں پارے میں جن اہم مفسرین کے نکات جمع کیے گئے ہیں ان میں ''تفہیم القرآن'' کے مفسر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ''تدبر قرآن'' کے مفسر مولانا امین احسن اصلاحی اور ''فی ظلال القرآن'' کے مفسر سید قطب شہید کے تفسیری نکات کو کلیدی اور امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ الفرقان میں موجود مفسرین کے گروہ میں یہ حضرات ستاروں میں چاند سورج کی طرح چمکتے اور پوری وسعت سے اپنی روشنی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

محترم شیخ عمر فاروق صاحب نے جس لگن، محبت اور اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ الفرقان کو مرتب کیا اور اسے بلا معاوضہ تقسیم کے لیے شائع کیا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ لوگ بھی اسی جذبے اور اخلاص کے ساتھ اس سے استفادہ کریں۔ مرتب کی ساری تگ و تاز، جہد و مشقت اور انفاق و ایثار کا مقصود یہی ہے کہ قرآن و حدیث کی تعلیماتِ جانفزا لوگوں تک پہنچیں اور وہ اپنی زندگیوں کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں جس کا نتیجہ آخرت میں نجات کی صورت نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر پڑھنے والے کو یہ مقصود حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العٰلمین!

——————ارشاد الرحمٰن

ہفت روزہ **ایشیا** 9/1-A رائل پارک لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتب

ربّ کریم کی بے پایاں عنایات نے اِنسانوں کو ہمیشہ اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ایک طرف انہیں نورِ بصیرت سے ہمکنار کیا تو دوسری طرف وحی الٰہی سے اُن کی دستگیری بھی فرمائی، ان کی ہدایت کے لئے انھی میں سے نیک سیرت انسانوں کو منتخب فرمایا اورانہیں اپنی ہدایت سے بہرہ ور کیا۔ یہ پاکباز انسان انبیاء کہلائے، علیہم السلام، اِن نفوسِ قدسیہ کی زندگیاں دوسروں کے لئے نمونہ ٹھہریں کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو اپنی زندگیوں میں جاری و ساری کیا۔ دنیا کے مختلف خطّوں اور علاقوں میں کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اوررسول آئے اوراُن سب نے بلاکم وکاست حق کا پیغام انسانیت تک پہنچایا، سب سے آخر میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب قرآن حکیم عطا فرمائی اورآپ کی حیاتِ طیبہ کو قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیا: ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن'' اورقرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ بھی خود لے لیا۔''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ''۔

قرآن حکیم کی حفاظت کئی طرح سے ہورہی ہے:

ا) اسے حِفظ کرنے کیے لئے اللہ تعالیٰ نے سینوں میں فَراخی پیدا فرمادی، اس عظیم الشان، ضخیم کتاب کو چھ سات برس کا بچہ اپنے سینہ میں ضبط کرلیتا ہے اور ماہ رمضان میں درجنوں نمازیوں کی امامت کرتے ہوئے اسے سناڈالتا ہے اور یہ سلسلہ تواتر سے صدیوں پر محیط ہے، اس وقت دنیا کے ہر ملک، اس کے ہر شہر، ہر بستی اور ہر گاؤں میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں حفاظ موجود ہیں اور شب و روز ہزاروں بچے حفظ کررہے ہیں، یہ شرف صرف اورصرف قرآن حکیم کو حاصل ہے اس کے علاوہ دنیا میں کوئی بھی کتاب اس فضیلت سے بہرہ ور نہیں ہے۔

ب) اِس کے معنی ومطالب کو ذہن نشین کرانے کے لئے اہلِ حق میں سے علماء کرام کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا

فرمائی جنہوں نے اِس خدمت میں اپنی زندگیاں وقف کر ڈالیں، متقدِّمِین اور متاخّرِین میں سے متعدد اہلِ علم وفضل کا قرآن حکیم سے قلبی لگاؤ رہا اورانہوں نے تفسیری خدمات کو بہ دل وجان سرانجام دیا، چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱- علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ)......ان کی ''تفسیر طبری'' کے نام سے مشہور ہے۔اور بڑے سائز کی تیس جلدوں میں ہے۔

۲- حافظ عمادُ الدّین ابو الفِدا ابن کثیر دمشقی شافعیؒ (متوفی ۷۷۴ھ) کی تفسیر ''ابن کثیر'' کے نام سے معروف ہے یہ پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳- علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح القرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) کی تفسیر ''تفسیر اَلقُرطبی'' کے نام سے معروف ہے اوردس ضخیم جلدوں میں ہے۔

۴- اِمام فخر الدّین رازیؒ (متوفی ۶۰۶ھ) ان کی ''تفسیر کبیر'' کے نام سے مشہور ہے اور آٹھ بڑی جلدوں میں ہے۔

۵- علامہ ابوحسّان غرناطی اندلسی (متوفی ۷۵۴ھ) ان کی تفسیر ''البحر المحيط'' کے نام سے موسوم ہے۔

۶- علاّمہ محمود آفندی الآلوسی (متوفی ۱۲۷۰ھ)......ان کی تفسیر ''روح المعانی'' کے نام سے جانی جاتی ہے اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۷- احمد مصطفیٰ المراغی......ان کی تفسیر ''المراغی'' کے نام سے مشہور ہے اور دس ضخیم جلدوں میں ہے۔

۸- ابی بکر جابر الجزائری......ان کی تفسیر ''ایسر التفاسیر'' کے نام سے معروف ہے اور چار ضخیم جلدوں میں ہے۔

۹- محمد جمال الدّین القاسمی......ان کی تفسیر ''القاسمی'' کے نام سے معروف ہے اور دس ضخیم جلدوں میں ہے۔

۱۰- سید قطب شہیدؒ......ان کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کے نام سے مشہور ہے اور آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے۔

۱۱- مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری......ان کی تفسیر ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' کے نام سے مشہور ہے۔

۱۲- محمد الامین بن محمد المختار الشّنقیطی......ان کی تفسیر کا نام ''اَضْوَاءُ البَیَان فِیْ ایضاح القُرآن'' ہے اور یہ آٹھ جلدوں میں ہے۔

۱۳- محمد علی الصابونی۔ان کی تفسیر ''صفوۃ التفاسیر'' کے نام سے معروف ہے ۳ جلدوں میں ہے۔

یہ سب عربی تفاسیر ہیں اوراب چند اردو تفاسیر کے نام:

۱۴- سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر ''تفہیم القُرآن'' ہے، یہ چھ جلدوں میں ہے۔

۱۵- مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کے نام سے معروف ہے، یہ نو جلدوں میں ہے۔

۱۶- مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر ''معارف القرآن'' ہے، یہ آٹھ جلدوں میں ہے۔

۱۷- مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' ہے، یہ دو جلدیں ہیں اور صرف سترہ پارے ہیں۔

۱۸- مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ کی تفسیر ''تیسیر القرآن'' ہے یہ چار جلدوں میں ہے۔

۱۹- ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی کی تفسیر ''تیسیرُ الرحمٰن'' ہے، یہ دو جلدوں میں ہے۔

۲۰- الشیخ صلاح الدّین یوسف کی تفسیر ''احسنُ البیان'' کے نام سے معروف ہے۔

۲۱- مولانا عبدالماجد دریابادی کی کاوش ''تفسیر ماجدی'' کے نام سے مشہور ہے، یہ دو جلدوں میں ہے۔

۲۲- مولانا عبدالحی فاروقی کی تفسیر ''درس قرآن'' ہے، یہ چھ جلدوں میں ہے۔

۲۳- مولانا محمد حنیف ندوی، کی تفسیر ''سراج البیان'' کے نام سے معروف ہے، یہ پانچ جلدوں میں ہے۔

مندرجہ بالا جن مفسرین کے آخر (بریکٹ) میں سنِ وفات درج نہیں ہے انہوں نے یہ تفاسیر تقریباً گزشتہ صدی (۱۴۰۰) ھجری میں لکھی ہیں البتہ ہمارے محترم الشیخ صلاح الدین یوسف اور ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی المحترم نے چند سال قبل تکمیل فرمائی ہے۔ ان سب حضرات نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق تفسیری موتی بکھیرے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں اجرِ عظیم سے نوازے اور مجھے یومِ جزا اُن کی صف کے پیچھے کھڑا کر دے! آمین۔

تفسیر طبری (ابن جریر) تفسیر ابن کثیر، تفسیر رازی البحر المحیط اور روح المعانی کے علاوہ عاجز کی چھوٹی سی لائبریری میں مندرجہ بالا تمام تفاسیر موجود ہیں اور ''الفرقان'' مرتب کرتے وقت میں ان کا خوشہ چین رہا ہوں، ان میں جہاں جہاں بھی کوئی اچھا نکتہ ملا ہے وہ حوالے کے ساتھ الفرقان میں درج کر دیا ہے۔

عربی لغت کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل کتب پیش نظر رہی ہیں:

۱- المفردات فی غریبِ القُرآن ...... اَبی القاسم الحُسین بن محمد المعروف بالرّاغب الاصفہانی (۵۰۴ھ)

۲- کلماتُ القُرآن ...... الشیخ حسنین بن مخلوف

۳- انوار القرآن ...... مولوی عبدالرحمٰن صاحب

۴- القامُوس الوحید ...... مولانا وحید الزّماں قاسمی کیرانوی

۵- مُترادِفات القرآن ...... مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

اس کے علاوہ قرآن حکیم کے قدیم و جدید متعدد تراجم سامنے رہے۔

الفرقان کو چھاپ کر مادی نفع حاصل کرنے کا ادنیٰ سا خیال بھی ذہن میں نہیں ہے، بس فکر ہے تو یہی کہ امتِ مسلمہ قرآن جیسی گوہر نایاب کتاب کو مقصد حیات بنا کر اپنی عظمتِ رفتہ کو پھر سے پالے۔ اِس سے قبل

الفرقان (الجزء الاوّل) مع ضمیمہ (قرآنی مضامین) کا خوبصورت ایڈیشن سال (۱۴۲۳ھ) میں چھپ کر تحفۃً تقسیم ہو چکا ہے، اس کے بعد سورۃ البقرہ مکمل شائع کر کے تقسیم کی گئی۔ اسے بہن بھائیوں نے بڑا پسند کیا اور کئی دینی مدارس اور متعدد مقامات پر اِس کے مطابق دروس القرآن کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے، اور لوگوں کو خاصا فائدہ پہنچا ہے، الحمدللہ اب اِسی جذبے سے قرآن حکیم کے تیسویں پارے کو اسی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد قرآن حکیم کے الفاظ اور صیغوں کی پہچان آسان ہو گئی اور بقیہ پاروں کی تفہیم بھی آسان ہو جائے گی، ان شاء اللہ۔

اس پارے کی نظر ثانی اور مسودوں کی پروف ریڈنگ کو بہتر سے بہتر بنانے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے، برادرم جناب ارشاد الرحمٰن صاحب نائب مدیر ہفت روزہ ایشیا کا ممنون ہوں کہ انہوں نے یہ کام کیا، تاہم انسان کمزور واقع ہوا ہے اس تمام تر کوشش کے باوجود غلطیوں کا امکان ہے، بہن بھائیوں سے التماس ہے کہ دوران مطالعہ اگر کوئی غلطی پائیں تو عاجز کو مطلع کریں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔

جو بہن بھائی اِس کی اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے جذبے کو قبول فرمائے۔ اور ہم سب کو خلوص کی نعمت سے بہرہ ور فرما کر جنت الفردوس میں اکٹھا کر دے: آمین۔

خاکسار

شیخ عمر فاروق

B/15 وحدت کالونی، لاہور۔

فون: 7585960

مولانا نعیم صدیقی

قرآن کا پیغام

قرآن نا آشنا آدمی کا رویہ زندگی کے شہر میں کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے جیسے کوئی نادان دیہاتی کسی بڑے شہر میں جا پہنچے۔ وہ حیرت زدہ اور مبہوت بھی ہو، سر پھرا اور غلط جسارتوں کا مرتکب بھی۔ کبھی وہ آوارگی کرتا پھرتا ہے کبھی من مانے طریقے سے تفریح کرتا ہے یا لاابالی پن سے انسانوں اور عمارتوں پر نظر ڈالتا ہے کبھی دنگے فساد پر اتر آتا ہے تو کبھی خواتین سے بدتمیزی کر گذرتا ہے کبھی اداروں دفتروں اور عمارتوں میں غلط طور پر جا گھستا ہے۔ کبھی ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کرتا ہے کبھی آنکھیں بند کر کے بھاگتا ہوا سڑک پار کرتا ہے۔ غرض قدم قدم پر اپنے اور دوسروں کے لئے مشکلات پیدا کرتا ہے بسا اوقات پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے کبھی عدالت میں لے جایا جاتا ہے کبھی جیل کی ہوا بھی کھاتا ہے اور پھر کسی ناخوشگوار تجربے کے بعد بے بسی کے عالم میں بیٹھ کر زار زار رونے لگتا ہے مگر وہ سمجھ نہیں پاتا یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ کیوں ہے۔ فرض کیجئے اسی طرح کے کسی نادان و نو وارد کو آپ کسی جگہ پریشان و خستہ حال دیکھتے ہیں یا کسی سڑک پر کسی پارک میں بے بسی سے روتا پاتے ہیں آپ اس کے قریب چلے جاتے ہیں ہمدردی سے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی درد بھری کتھا سنتے ہیں پھر اسے پیار سے سمجھاتے ہیں عزیز من! اس شہر کی ایک حکومت ہے اس کا ایک انتظام ہے اس شہر میں رہنے اور اس کی چیزوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کی پارکوں عمارتوں اور گاڑیوں کو استعمال کرنے کے کچھ ضابطے ہیں۔ یہاں کے انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے اور تعلق رکھنے کے کچھ آداب مقرر ہیں، ان کو اگر نہیں جانو گے اور ان کا اگر لحاظ نہیں رکھو گے تو بار بار اذیت اور نقصان اٹھاؤ گے ان کو سمجھ لو اور قبول کر لو تو کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ لو میں تمھیں بتاؤں کہ یہاں حکومت کس کی ہے یہاں کے قوانین اور آداب کیا ہیں اور یہاں کا اخلاقی آئین کیا ہے۔

کچھ ایسا ہی ہمدردانہ اور خیر خواہانہ معاملہ ہے جو قرآن غم زدہ پریشان حال اور آوارہ خیال انسان سے کرتا ہے۔

(۱)

قرآن کا بنیادی اور ابتدائی پیغام۔ یا سبق اول انسان کے لئے یہ ہے کہ یہ دنیا جس میں تم اتار دیئے گئے ہو یہ اندھی نگری نہیں ہے جس کا نہ کوئی راجہ ہو، نہ جس میں کوئی قانون و ضابطہ رائج ہو۔ یہاں تم شتر بے مہار بن کر کبھی امن و

سکون نہیں پا سکتے۔ یہاں مادر پدر آزادی کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہ کائنات کسی کھلنڈرے بچے کا بنایا ہوا گھروندا نہیں ہے زندگی رام لیلا کی طرز کا کوئی ناٹک نہیں ہے بے مقصد بھول بھلیاں بھی نہیں۔ یہ سلسلہ حوادث ایک حیرت خانہ امروز وفردا نہیں ہے غرض تمہیں یونہی دل لگی کے لئے نیست سے ہست نہیں کر دیا گیا۔ تمہارے وجود اور زندگی دونوں کے لئے بڑی بھاری ذمہ داریاں ہیں۔

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً

اور وہ لوگ زمین اور آسمانوں (کے نظام) کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں (اور پھر پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب تو نے یہ سب فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے (آل عمران۔۱۹۱)

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی فضول پیدا کر دیا ہے۔ (المومنون۔۱۱۵)

(۲)

قران سلطنت الٰہی کے انجان شہری کو کچھ اور باتیں بتاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس چمن میں پھول ہی پھول نہیں ہیں کانٹے بھی ہیں۔ یہاں نسیم سحری ہی نہیں چلتی باد صرصر وسموم بھی چلتی ہے یہاں نشیمن ہی نہیں، دام اور قفس بھی ہیں۔ یہاں خرمن ہی نہیں ہوتے بجلیاں بھی گرتی ہیں یہاں خیر کے ساتھ ساتھ شر بھی پایا جاتا ہے اور راحتوں کے ساتھ دکھ بھی۔ یہاں زندگی اپنے کرشمے دکھاتی ہے اور موت اپنا اپنا پارٹ ادا کرتی ہے یہاں انسان اضداد کے درمیان گھرا ہوا ہے۔

یہاں ہر اقدام لازماً اچھی ہی سمت میں نہیں ہوتا بلکہ بہت سی جادہ پیمائیاں منزل مقصود سے دور تر بھی لے جاتی ہیں یہاں رہنما اور رہزن ایسے گھلے ملے ہیں کہ آدمی کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ کس کا ساتھ دے یہاں ہر قدم پر ایک دوراہا سامنے سے آتا ہے اور آدمی کو فوری فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کدھر جائے۔

حق وراستی کی طرف لے جانے والے محرکات خیر بھی ہیں اور محرکات شر بھی جن کے اثر سے بے شمار افراد بلندی کی طرف بھی جاتے ہیں اور بے شمار لوگ پستی کی طرف بھی لڑھکتے ہیں۔ اسی طرح اقوام ترقی بھی کرتی ہیں اور تباہ بھی ہوتی ہیں دیکھو کتنے عالیشان تمدنوں کے مزار چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا

اور تم سے پہلے کی قوموں کو (جو اپنے زمانے میں بر سر عروج تھیں) ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی۔ (یونس۔۱۳)

وہ بتاتا ہے کہ یہ دنیا کوئی چھوٹ کی دنیا نہیں ہے یہ لاوارثا گھر نہیں ہے یہاں کوئی خوان یغما بچھا ہوا نہیں ہے

بلکہ یہ کسی کی ملکیت ہے جس کے قوانین گھات لگائے بیٹھے ہیں جہاں تم نے غلط قدم اٹھایا کوئی نہ کوئی قانون تمہیں گھیر لے گا۔ایک نادیدہ قانونی قوت تمہارا احاطہ کر لے گی اور تم اس کی پکڑ سے باہر نہ جاسکو گے۔

پھر جیسے آپ اپنے شہر کے نو وارد کو بتاتے ہیں کہ میاں یہاں ذرا چوکنا رہ کے چلو پھرو یہاں جیب کترے اور ٹھگ، اٹھائی گیرے بھی ہیں جو بھنگ یا نشہ آور مٹھائی کھلا کر نو واردوں پر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں اسی طرح قرآن انسان کو آگاہ کرتا ہے کہ یہاں ابلیس اور اس کا لشکر جن میں شیاطین انس بھی شامل ہیں پھیلا ہوا ہے جو ہر بدی کو خوشنما اور رنگین ودلفریب بنا کر پیش کرتا ہے اور پھر چمکار کر بہلا کر پھسلا کر تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔قرآن انتباہ کرتا ہے کہ:

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ

شیطان کی پیروی نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔(البقرۃ۔۱۶۸)

یہ شیاطین بسا اوقات دوست اور ناصح بن کر آتے ہیں بڑے خیر خواہانہ مشورے دیتے ہیں، امیدیں دلاتے ہیں پراسرار طریق سے اپنی بات القا کرتے ہیں، بدترین مصیبت کو رومان اور لذت اور تفریح اور رنگینی سے آراستہ کر کے لاتے ہیں بدترین مفاسد کو حکمت وفلسفہ کے مرعوب کن پیرائے میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں اور پھر جب ان کا شکار تباہی سے دوچار ہو جاتا ہے تو اسے دھتکار کر کہتے ہیں کہ اب اپنی حماقت کا نتیجہ مزے سے بھگتو۔شیاطین کے سربراہ کا یہ چیلنج بھی ملاحظہ ہو کہ:

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ

پھر میں ضرور بالضرور ان (ابنائے آدم) کو آگے سے پیچھے سے دائیں سے اور بائیں سے گھیروں گا۔(الاعراف:۱۷)

قرآن کے خیر خواہانہ انتباہات سے ایک سلیم الفطرت آدمی یہ حقیقت پالیتا ہے کہ زندگی گذارنا کوئی کھیل نہیں ہے یہاں تو ایک پرخطر جنگل میں سے راستہ ہے اور جو مختلف راستے نکلتے ہیں اور ان کی طرف مختلف بلانے والے بلاتے ہیں ان میں سے صحیح راستے کی شناخت کرنی ہے جو انسانی ارتقاء کی آخری منازل تک پہنچا سکے۔

(۳)

قرآن کے اس دوسرے سبق کے تقاضے سے تیسرا سبق ابھرتا ہے اور ایک بیدار دل آدمی کا ذہن خود بخود ادھر منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا بچ بچا کر چلنے کی جگہ ہے یہاں پھونک پھونک کے قدم رکھنا چاہئے یہاں ہر مقام پر طے کرنا ضروری ہے کہ صحیح کیا ہے؟اور غلط کیا ہے۔

مدعا یہ کہ صحیح زندگی جبھی مل سکتی ہے جب کہ اس کے ساتھ تمیز خیر وشر کی کم از کم سنجیدہ کوشش پائی جائے جو زندگی تمیز خیر وشر کی کوشش سے خالی ہو وہ فلاح سے خالی رہے گی اور کبھی اچھے نتائج تک نہیں پہنچے گی۔

(۴)

قرآن شہر زندگی کے پریشان خیال نووارد کو یہ احساس دلاتا ہے کہ دنیا کی گذرگاہ سے گذرنے والے مسافر کے لئے غفلت کے ساتھ اور عبرت سے بے نیاز ہو کر چلنا درست نہیں ہے بلکہ بیدار عقل، متحرک ذہن کھلے کانوں اور دیکھتی آنکھوں کے ساتھ ہی یہ وادی بخیر وخوبی پار کی جاسکتی ہے اس کی نگاہ میں وہ لوگ فریضہ زندگی کو ادا کرنے میں بالکل ناکارہ ہیں۔ جو صم بکم عمی (بہرے گونگے اور اندھے) کی تعریف میں داخل ہیں اور سنئے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ

یقیناً خدا کے نزدیک بد ترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (الانفال-۲۲)

دوسری جگہ وہ اس ناکارہ عنصر کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا، وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا، وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا، أُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ

ان لوگوں کے دل (ودماغ) ہیں مگر یہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر یہ ان سے دیکھتے نہیں۔ اور ان کے پاس کان ہیں مگر یہ ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے گئے گذرے' یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔ (الاعراف-۱۷۹)

وہ انسانوں کو تفکر اور تدبر کا درس دیتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کائنات اور زندگی کی حقیقتوں کے متعلق آدمی کے دل میں سوالات پیدا ہوں۔ وہ اپنی حقیقت کے جاننے کے درپے ہو۔ وہ اپنا صحیح مقام دنیا میں متعین کرے کہ وہ کہاں کھڑا ہے اس کا مرتبہ کیا ہے اس کا کس سے کیا تعلق ہے اور اسے یہاں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔

لیکن جو لوگ ان بنیادی مسائل کے بارے میں کبھی کاوش ہی میں نہ پڑیں کبھی ان کی دلوں میں کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو بلکہ کھانے کمانے گھر بسانے جنسی تسکین کے درپے رہیں۔ انہیں بھلا کیسے راہ مل سکتی ہے؟

(۵)

عقل سے کام لے کر مطالعہ کائنات وحیات کا مشورہ دیکر قرآن پیچھے نہیں ہٹ جاتا بلکہ شہر زندگی کے مسافر کو ایک گائیڈ کی طرح اپنے ساتھ گھماتا ہے اور ایک ایک کر کے آیات حقیقت کو اس کے سامنے کھولتا ہے۔

وہ مونس وہمدم بن کر اس سے کہتا ہے کہ آؤ تمہارے ساتھ ہو کر تمہیں کچھ دکھاؤں۔ پیارے انسان یہ دیکھتے ہو کہ سورج کس باقاعدگی سے مشرق سے نکل کر مغرب میں ہر روز ڈوبتا ہے اور چاند تاروں کی گردش دیکھو، دن اور رات کا ادل بدل دیکھو موسموں کے چرخے کا گھماؤ دیکھو یہ مقررہ ڈھنگ سے چلنے والی ہوائیں یہ ہواؤں کے دوش پر لد کر آنے

والے بادل اور پھر بادلوں کا کثیف بن جانا یہ مردہ زمینوں کا زندہ ہونا یہ ننھے ننھے بیجوں کا پھوٹنا۔ یہ نشوونما پاتی فصلیں یہ ہرے بھرے کھیت یہ طرح طرح کے درخت، ان پر لگنے والے مختلف رنگوں اور ذائقوں کے پھل، یہ زمین پر بنے ہوئے راستے اور ان کو نمایاں کرنے والے نشانات، یہ سمندروں پر تیرتی کشتیاں، یہ پہاڑ جیسی اٹھتی موجیں، یہ کشتیوں اور طوفانوں کی کشاکش میں انسانی زندگی کا ڈانواں ڈول ہونا، خود انسان کا اپنا نظام ولادت و پرورش، انسانوں کی شکلوں اور رنگوں اور بولیوں کا تفاوت، یہ تمہارے سامنے پھیلی ہوئی کتاب حقیقت کی روشن آیات ہیں۔ ان میں تم تین باتیں نمایاں دیکھتے ہو۔ ایک نظم و ترتیب دوسرے توافق اور تیسرے حسن و جمال اور وہ دریافت کرتا ہے۔

مَا تَرٰی فِی خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ

تو اللہ رحمٰن کی پیدائش وصفت خلق میں کوئی نقص و کوتاہی نہ پائے گا ایک بار ذرا نگاہ ڈال۔ کیا اس نظام میں کوئی رخنہ نظر آتا ہے۔ (الملک:۳)

قرآن اپنے شاگرد کو پھر توجہ دلاتا ہے کہ یہ تمام چیزیں قانون کی پابند ہیں اور ایک اقتدار میں جکڑی ہوئی ہیں اتنے بھاری بھاری اَجرام اور عالم طبعی کو طوفانی طاقتوں کو ضوابط کی زنجیروں نے جکڑ رکھا ہے اور وہ قوت برتر کے سامنے مطیع و منقاد اور مسلم عاجز بنی ہوئی ہیں۔

وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا

اور آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں۔ (آل عمران-۸۳)

اس استدلال کے راستے قرآن آدمی کو ساتھ لئے اس شعور تک پہنچاتا ہے کہ نظم و ترتیب اور توازن و توافق اور قانون و ضابطہ اور حسن و جمال کے ساتھ چلنے والی اس دنیا میں جہاں پتہ پتہ، قطرہ قطرہ اور ذرہ ذرہ (اور آج کی معلومات کے مطابق ایٹم کا ایک ایک برقیہ) ایک بندش میں جکڑا ہوا ہے خود تم بھی نہ تو عملاً آزاد ہو اور نہ آزادی کا استحقاق رکھتے ہو اور نہ ہی آزادی میں تمہارا بھلا ہے۔

یوں قرآن شہر زندگی کے انجان نو وارد کو گھماتے پھراتے اور یہاں کے احوال کا مشاہدہ کراتے کراتے اس کے اندر غیر محسوس طور سے یہ احساس پیدا کر دیتا ہے کہ یہاں تمہارا مقام مالک اور حاکم و مقتدر کا نہیں ہے بلکہ محکومی اور عبودیت کا ہے اور تمہاری خیر اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو 'ملیک مقتدر' کی رضا کے حوالے کر دو۔

(۶)

قرآن متذکرہ بالا سارے ابتدائی اسباق ہیں جن کا مقصد اصل سبق کے لئے مخاطب اور قاری کو تیار کرنا ہے وہ درحقیقت ہدایت کی پیاس پیدا کرنا چاہتا ہے بعد میں ہدایت کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ وہ پہلے طلب پیدا کرتا ہے پھر مطلوب کو سامنے لے آتا ہے پہلے سوال ابھارتا ہے پھر جواب فراہم کرتا ہے۔

قرآن اہل تدبر اور تفکر اور اصحاب احتیاط وتقویٰ کو وہ اصل سبق دیتا ہے جس کے لئے بڑی تیاریاں ہیں اور بڑا اہتمام ہے۔

آیئے اس مرکزی سبق کو قرآن سے اخذ کریں۔ وہ مختصر سا سبق یہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

اے انسانو تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا شاید کہ تم (پوری طرح) تقویٰ کیش بن سکو۔ (البقرۃ:۲۱)

یعنی غور وفکر کرنے والے (اولوالالباب) جب یہ حقیقت پالیں کہ یہاں نظم وتوافق ہے مقصد وغایت ہے۔ حسن وجمال ہے تو انہیں اس صداقت تک از خود پہنچنا چاہیئے کہ یہ سارا سلسلہ وجود حکیمانہ قوانین پر مبنی ہے اور قانون کا وجود یہ پتہ دیتا ہے کہ کوئی قانون ساز اور کارپرداز ہے قرآن بتاتا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے وہی تمہارا رب ہے اور اس رب کے ساتھ ساتھ تمہارے تعلق کی ایک ہی صورت عقلاً بھی درست ہے اور عملاً بھی صحیح ہے کہ تم اس کے عبد بن کے رہو مگر عبادت کسی جزوی صورت میں مراد نہیں، یہاں پوری زندگی کا مصرف بیان ہوا ہے اس کائنات میں دو ہی بڑے مناصب ہیں ایک رب اور معبود ہونے کا دوسرا بندہ اور عبادت گذار ہونے کا، انسان بہرحال عبد ہے اور معبود نہیں ہے اس کا منصب صرف دوسرا ہی منصب ہوسکتا ہے اور وہی ساری مخلوق کا مقام بھی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے کسی بھی گوشے میں اور زمانہ کے کسی بھی حصے میں عبدیت کے مقام سے الگ نہیں ہوسکتا اور اس کے لئے کوئی امکان نہیں ہے کہ رب یا معبود کے مرتبے میں رب کائنات کا حصہ دار ہوسکے۔

پوری زندگی کو اللہ کی عبادت میں لگا دینا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ قرآن کا دانشور شاگرد اپنے رب کے سامنے سر تسلیم خم کردے، پوری طرح جھک جائے اور اس کے بالمقابل اپنی آزادی سے دستبردار ہوجائے اس بارے میں قرآن کا سبق یہ ہے کہ:

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا

پس تمہارا اللہ (معبود) ایک ہی اللہ ہے سو اسی کے آگے سر تسلیم خم کرو۔ (الحج:۳۴)

اس مطلوب رویہ کی بہترین مثال حضرت ابراہیمؑ کے طرز عمل سے لی گئی کہ۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اور جب اسکے رب نے کہا کہ (میرے سامنے) جھک جاؤ اس نے کہا میں رب العالمین کے سامنے جھکتا ہوں۔ (البقرۃ:۱۳۱)

اس رویہ پر جو دین حق پر مبنی ہے جو مسلک زندگی اس سے مطابقت رکھتا ہے اس کا نام ہی ''اسلام'' (مسلک

تسلیم) طے پایا۔ فرمایا کہ:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَاللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ

یقیناً اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ (آل عمران:۱۹)

(۷)

لیکن یہ مسلک اسلام یہ دین حق یہ عبادت رب کوئی ایسی چیز نہیں کہ افراد اپنی حد تک اس کے کچھ تقاضے پورے کر کے فارغ ہو جائیں۔

اس کے ساتھ ایک بڑا عظیم الشان فریضہ اور مشن ہے جو اس کے ماننے والوں کو تفویض کیا گیا ہے۔

وَ لۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ

اور چاہئے کہ تم میں سے کچھ لوگوں پر مشتمل ایسا گروہ اٹھے جو (لوگوں کو) بھلائی کی طرف پکارے نیکی کا حکم دے، اور بدی سے روکے۔ (آل عمران:۱۰۴)

قرآن فی الحقیقت ایک ایسی تحریک برپا کرنا چاہتا ہے جس کے تحت ہر خدا پرست نیکی کا علمبردار بن کے بدی کے خلاف میدان میں اترے، بدی کی قوت کے بالمقابل نیکی کی قوت باقاعدہ محاذ آرا ہو۔

یہی وہ بنیادی مشن ہے جس کے لئے قرآن ایسے لوگوں کی تلاش میں ہے جنہیں وہ اس مشن کے شہداء (علمبردار) بنانا چاہتا ہے۔

(۸)

نیکی کی تلقین کرنے اور بدی کا انسداد کرنے کا درس دینے کے ساتھ ساتھ قرآن یہ تصور بھی دلاتا ہے کہ نیکی کسی جزوی عمل کا یا چند جزوی وظائف کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ نیکی ساری زندگی پر پھیلا ہوا ایک نظام ہوتی ہے۔

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ وَالۡکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ

نیکی اس کا نام نہیں ہے کہ تم بس (نمازوں میں) اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بخلاف اس کے نیکی تو اس شخص کی ہے جو ایمان لائے اللہ اور یوم آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور انبیاء پر وہ جو اپنا مال اسے عزیز رکھنے کے باوجود قرابت داروں یتیموں مساکین مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے اور لوگوں کی گردنیں چھڑانے میں خرچ کرے اور وہ نماز قائم کرے زکوۃ دے اور وہ لوگ جو وعدہ کریں تو ایفا کرنیوالے ہوں اور وہ لوگ جو سخت

حالات میں اور مصیبت کے مواقع پر اور (جنگ کے) مصائب میں صبر سے کام لینے والے ہوں یہ ہیں وہ لوگ جو سچے نکلے اور یہی لوگ ہیں جو اہل تقویٰ ہیں۔ (البقرۃ:۱۷۷)

دیکھئے یہاں افکار و اعمال اور اعتقادات و اخلاق سبھی کچھ مذکور ہے مصلیٰ سے لیکر میدان جنگ تک سارے مراحل سامنے آگئے مالی اور اقتصادی امور بھی شمار کرا دیئے گئے۔ اتنی ساری چیزوں کو اختیار کر کے پوری زندگی کو ایک خاص نقشے پر ڈھالنا ہے ظاہر ہے کہ اس وسیع تصور نیکی کے ساتھ فرد کسی بگڑے ہوئے معاشرے کے درمیان اپنے آپ کو پوری طرح سنوار نہیں سکتا اسے پورے معاشرے کو سنوارنا ہوگا اور اس کے لئے ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کا فریضہ انجام دینا ہوگا۔

(۹)

پیچھے سے جو کڑیاں ملتی چلی آرہی ہیں وہ ایک سلیم الطبع شخص کو از خود اس نتیجہ تک پہنچاتی ہیں کہ مسلک عبادت رب یا دین اسلام پر چلنے والا تقویٰ کیش آدمی بدی کی طاقتوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ اس کا اعتقاد اور اس کی دعوت اور اس کا مشن فطری طور پر مخالف چیزوں سے تصادم کا باعث بنتا ہے جو شخص حق کو لے کے چلے اسے باطل سے رشتہ توڑنا ہوگا جو نیکی کو اختیار کرے اس کا بدی سے بگاڑ ضرور پیدا ہوگا جو رب کو معبود بنائے اس کی بات پھر طاغوت نہ بن سکے گی۔ اس لئے قرآن ان لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتا ہے جو رب پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ طاغوت سے کنارہ کش ہو جائیں۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِی كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوْا الطَّاغُوْتَ

اور یقیناً ہم نے ہر امت کے اندر کوئی نہ کوئی رسول (اس پیغام کے ساتھ) مامور کیا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے کنارہ کشی کرو۔ (النحل:۳۶)

طاغوت ہر وہ چیز ہے جو اللہ کی عبادت سے ہٹا کر اللہ کی نافرمانی کرنے پر مائل یا مجبور کرے یا اس کا سبب بنے۔ طاغوت اشخاص و افراد بھی ہو سکتے ہیں طاغوت فلسفہ و نظریات بھی ہو سکتے ہیں اور طاغوت سیاسی اور اقتصادی نظام بھی ہو سکتا ہے جس شکل میں بھی طاغوت کا وجود پایا جائے اس سے انکار اور اسکی تردید کرنا اس شخص کے لئے لازم ہو جاتا ہے جو قرآن کا شاگرد بن کر ایمان باللہ اور عبادت رب کی راہ اختیار کرے۔

اپنی اس بنیادی تعلیم اور تلقین میں قرآن کوئی ابہام نہیں چھوڑتا اور لگی لپٹی نہیں رہنے دیتا ملاحظہ ہو۔

وَلَا تُطِيْعُوْآ اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ

حد یں پھاند جانے والوں کی اطاعت نہ کرو (شعراء:۱۵۱)

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا اَوْ كَفُوْرًا

اورتم ان لوگوں میں سے نافرمان اور ناشکروں کی اطاعت نہ کرو(الدہر:۲۴)

اس سے بھی آگے قرآن نے بدی کی طاقتوں سے تعاون کوممنوع ٹھرادیا۔

وَلَا تعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

اورگناہ اورنافرمانی کے کاموں میں کسی سے تعاون نہ کرو۔(المائدہ:۲)

(۱۰)

یہ بات جب واضح ہوگئی کہ عبادت رب کے ساتھ اطاعت طاغوت چلنے کی چیزنہیں اورامر بالمعروف کا کام کرنے والے اثم وعدوان سے تعاون نہیں کرتے تو پھر یہ حقیقت قرآن کے طالب علم پرازخود کھل جاتی ہے کہ اسلام کسی مخالف اسلام طاقت کے غلبے میں اپنے پورے تقاضوں کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

پس ضروری ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مشن خود غالب طاقت بن جائے۔اسی اصول پر قرآن اپنے مخاطب کو یہ تلقین کرتا ہے کہ عبادت رب کے نظام اورمسلک اسلام کوغالب کرو۔

هُوَالَّذِی اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ

وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا ہے کہ وہ اسے ہر دوسرے طریقے اورنظام پرغالب کردے۔(الصّف:۹)

وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا

اوراللہ کا کلمہ(قانون یادین)بلندوبرتر ہوکے رہنے کے لئے ہے۔(التوبہ:۴۰)

دوسری جگہ ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ

اللہ نے یہ بات طے کردی کہ مجھے اور میرے رسولوں (یعنی ان کے دین و نظام) کو غالب ہو کے رہنا ہے۔(المجادلہ:۲۱)

مختصر بات یہ ہوئی کہ قرآن اپنے پیغام کومعاشرے میں کامیاب اورعملاً جاری وساری دیکھنے کا تقاضہ کرتا ہے۔

(۱۱)

مخالف نظاموں سے انکارواجتناب اورعدم تعاون سے بات آگے بڑھ کر یہاں آ پہنچی کہ جوارباب تدبروتفکر اپنے رب کے سامنے سرتسلیم خم کردیں زندگی اس کی عبادت کے لئے وقف کردیں اس کے مقررکردہ مشن امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے اٹھ کھڑے ہوں ان کا کام محض واعظوں کا ساٹھنڈا کام نہیں ہے بلکہ ان کیلئے لازم ہے کہ وہ قرآن کے نظام کوعملاً غلبہ دلانے کی جدوجہد کریں۔

قرآن کی رو سے بھی اور اللہ تعالی کے قانون مشیت کے تحت بھی حق و باطل کا تصادم ناگزیر ہے۔

اس کشمکش کی کٹھالی کے پیش نظر قرآن اپنے شاگرد کو بتاتا ہے کہ جنت کی منزل کامرانی کو جانے والا راستہ بڑا مردافگن ہے۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ‌ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ‌ؕ اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ

کیا تم نے یہ گمان باندھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر پہلے لوگوں جیسے سخت حالات نہیں گزرے جن کو تنگی اور مصیبت نے آدبوچا اور وہ اس حد تک جھنجھوڑ دیئے گئے کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (اس مرحلے پر ان کو مژدہ سنایا گیا کہ) سنو اللہ کی مدد قریب ہے۔(البقرہ:۲۱۴)

اس کشمکش کے لئے قرآن اپنی تحریک (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کے آدمی سے یہ بات پہلے ہی قدم پر طے کر لیتا ہے کہ وہ اس راہ پر آئے تو اللہ سے اپنے جان و مال کا سودا کر کے آئے۔

اور اس کے لئے وہ اپنے پیغام پر لبیک کہنے والوں کی ایک جماعت بناتا ہے اور اس جماعت کا نام حزب اللہ رکھتا ہے جسے حزب الشیطان سے معرکہ آرا ہونا ہے قرآن کا پیغام یہ ہے کہ اس کے پیغام کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے اجتماعی اور منظّم سعی ضروری ہے۔

(۱۲)

قرآن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جس تحریک کو چلا کر دنیا میں امن و سلامتی کا دور پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی کامیابی کی صورت میں وہ مطالبہ کرتا ہے کہ دین کا پورا نظام اور قرآن کا سارا قانون جاری رکھا جائے۔اس سے حیاۃِ طیبہ اور حیات صالحہ اور حیات مطمئنہ پیدا ہوتی ہے۔

یہاں مقالہ ختم ہو رہا ہے اس موقع پر یاد دلانا ضروری ہے کہ قرآن کا مرکزی پیغام جو اس مقالہ میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے وہ بس ایک ہی ہے اعبدوا ربکم باقی ساری چیزیں اسی کے تقاضے ہیں......

....

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

شک وریب سے پاک

الٓمّٓ(۱) ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ(۲)[البقرہ]

''الم،اس کتاب (قرآن مجید) میں کچھ شک نہیں۔''

اندھیروں سے روشنی کی طرف

الٓرٰ، کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰـہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ، بِاِذْنِ رَبِّھِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ(ابراھیم:۱)

''الرٰ،(اے رسول ﷺ) قرآن مجید ایک کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے،تاکہ آپ انسانوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہدایت کی روشنی میں لائیں،اس اللہ کے راستے پر جو بڑا زبردست غلبے والا اور بذات خود تعریف کیا گیا ہے''۔

نزول قرآن کی ابتدا کا مہینا

شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانُ(البقرۃ:۸۵)

رمضان کا مہینہ وہ (باعظمت مہینہ ہے) جس میں قرآن مجید کا نزول ہوا وہ (قرآن مجید) جو عالم انسانیت کے لئے سرمایہ ہدایت ہے اور جس میں (اللہ تعالیٰ کے نظام ہدایت کی) کھلی اور روشن دلیلیں ہیں اور جو حق و باطل کا فرق الگ الگ کردینے والا ہے۔

ابتدا کس رات سے ہوئی؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰـہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ (القدر:۱)''ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔''

یہ دنیا کے تمام خزانوں سے بہتر ہے

قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَبِرَحۡمَتِهٖ، فَبِذٰلِکَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا، هُوَ خَيۡرٌ، مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ (یونس:۵۸)

"(اے رسول ﷺ) کہہ دیجئے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (یہ کتاب نازل ہوئی ہے) تو اس پر انہیں خوش ہونا چاہیے کیونکہ یہ (روحانی عظمتوں کا گنجینہ لازوال) ان تمام مادی وسائل سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں"۔

قرآن سھل اور آسان ہے

وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡآنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ (القمر:۲۲)

"اور یقیناً یقیناً ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا پھر کیا ہے کوئی نصیحت ماننے والا؟"

توجہ اور غور سے سنو

وَاِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ وَاَنۡصِتُوۡا لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (الاعراف:۲۰۴)

"اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم ہو (تم پر رحمت الٰہی نازل ہو اور فہم قرآن سے بہرہ ور ہو جاؤ)"۔

قرآن فہمی کے لئے رحمٰن کی مدد تلاش کیجئے

اَلرَّحۡمٰنُ (۱) عَلَّمَ الۡقُرۡآنَ (۲) خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ (۳) عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ (۴)[الرحمٰن]

"رحمٰن (وہی ہے) جس نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا اور اظہار مدعا کی صلاحیت بخشی"۔

قرآن پر تدبر کیجئے

كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوۡا آيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (ص:۲۹)

"جو کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے، بڑی بابرکت ہے تا کہ لوگ اس کی آیات میں غور وفکر کریں اور تا کہ اہل عقل وبصیرت سبق حاصل کریں"۔

قرآن پڑھنے سے قبل تعوذ

فَاِذَا قَرَأۡتَ الۡقُرۡآنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ (النحل:۹۸)

"اور جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو"۔

ٹھہر ٹھہر کے پڑھیے

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (المزمل:۴)

''اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کے پڑھا کیجئے (کہ مفہوم دل میں سما جائے)''

جسم ولباس پاکیزہ کر لیجیے

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (الواقعہ:۷۹)

''اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں''۔

قرآنی احکام فرض ہیں

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ (القصص:۸۵)

''(اے نبی ﷺ) بلاشبہ جس (اللہ) نے آپ پر قرآن (عمل اور تبلیغ کے لئے) فرض کیا ہے یقیناً وہ آپ کو ایک اعلیٰ جگہ (جنت الفردوس) میں لوٹا دے گا''۔

قرآن کا راستہ سب سے سیدھا ہے

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (بنی اسرائیل:۹)

''بلاشبہ یہ قرآن تو وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے''۔

قرآن کو چھوڑنے والے

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (الفرقان:۳۰)

''اور روز جزا وسزا رسول ﷺ کہیں گے کہ اے میرے رب! میری قوم (کے یہ لوگ ہیں جنہوں) نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا''۔

بوقت فجر تلاوت قرآن کی فضیلت

وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (بنی اسرائیل:۷۸)

''اور (بوقت) فجر قرآن (کا بھی التزام کیا کرو) کیونکہ فجر کے وقت قرآن پڑھنا مشہود ہے (اس وقت فرشتے اعمال قلمبند کرتے ہیں)''۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے

بہترین شخص

وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

"خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ" (رواہ بخاری)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سب سے بہتر بندہ وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور پھر دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔''

قابل رشک آدمی

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

"لَا حَسَدَ اِلَّا فِیْ اِثْنَیْنِ رَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْقُرْآنَ فَھُوَ یَقُوْمُ بِہٖ آنَاءَ الَّیْلِ وَآنَاءَ النَّھَارِ، وَرَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ مَالًا فَھُوَ یُنْفِقُہٗ آنَاءَ الَّیْلِ وَآنَاءَ النَّھَارِ" (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''صرف دو آدمی قابل رشک ہیں ...... ایک وہ جس کو اللہ نے قرآن کی نعمت عطا فرمائی پھر وہ صبح وشام اس کے پڑھنے پڑھانے میں لگا رہتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جسے اللہ نے مال ودولت سے نوازا اور وہ بھی صبح وشام اسے اللہ کی راہ میں لٹاتا رہتا ہے (غربا ومساکین کی خدمت کرتا ہے)۔''

قوموں کا عروج وزوال

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

"اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ" (رواہ مسلم)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن مجید) کی بدولت بہت سے لوگوں کو بلند فرمائے گا اور بہت سے لوگوں کو

نیچے گرائے گا (اس پرعمل کرنے والے سرفراز ہوں گے جبکہ اس سے منہ موڑنے والے نامراد ہوں گے)۔"

قلوب کا صیقل ہونا

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

"اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ، اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ، قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا جِلَاءُهَا؟ قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"بنی آدم کے قلوب پر اس طرح زنگ آجاتا ہے جس طرح پانی لگنے سے لوہے پر زنگ آجاتا ہے، عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! دلوں کے اس زنگ کو دور کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا......موت کو زیادہ یاد کرنا (کہ اس سے دل نرم ہو جاتے ہیں) اور قرآن مجید کی (سمجھ کر) تلاوت کرنا (کہ اس سے بندہ رموز حیات سے آگاہ ہو کر عمل کی طرف راغب ہوتا ہے)"

کاتب وقاریِ قرآن کا مقام

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ، وَالَّذِیْ يَقْرَءُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهٗ اَجْرَانِ" (بخاری، مسلم)

ام المومنین بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس نے قرآن میں مہارت حاصل کر لی ہو (اور اس کی قرأت کے علاوہ مفہوم ومطالب کو بھی جانتا ہو) وہ معزز وفادار اور فرمانبردار فرشتوں کے ساتھ ہوگا (محترم ومعزز بن جائیگا) اور جو بندہ تلاوت کے دوران اٹکتا ہو تو اس کو دو اجر ملیں گے (ایک تلاوت کا دوسرا مشقت اور زحمت کا)

قرآن حکیم میں مشغولیت

عَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

"يَقُوْلُ الرَّبُّ تَبٰرَكَ وَ تَعَالٰى مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ عَنْ ذِكْرِیْ وَمَسْأَلَتِیْ، اَعْطَيْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِی السَّائِلِيْنَ، وَفَضْلُ كَلَامِ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ" (ترمذی، دارمی)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"جس شخص کو میرے ذکر اور سوال (دعا) کرنے سے قرآن نے مشغول رکھا میں اس کو اس سے افضل عطا

کروں گا جو سائلوں (اور دعا کرنے والوں) کو عطا کرتا ہوں اور دوسرے اور کلاموں کے مقابلوں میں اللہ کے کلام کو ایسی عظمت وفضیلت حاصل ہے جیسی اپنی مخلوق کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔''

قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا انعام

عَنْ مُعَاذِ الْجُهَنِيِّ، قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيْهِ اُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءُهٗ اَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوْتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيْكُمْ، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهٰذَا؟" (رواہ احمد۔ ابوداؤد)

حضرت معاذ جُہنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے قرآن پڑھا اور اس میں جو کچھ ہے اس پر عمل کیا، قیامت کے روز اس کے ماں باپ کو ایک ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ حسین ہوگی جبکہ وہ روشنی دنیا کے گھروں میں ہو اور آفتاب آسمانوں سے ہمارے پاس ہی اتر آئے......اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھر تمہارا کیا گمان ہے جس نے خود (قرآن پڑھا) اور اس پر عمل کیا ہو؟ (اسکی جزا اور انعام کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟)''

قرآن کی دیکھ بھال

عَنْ أَبِي مُوسٰى رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:

"تَعَاهَدُوْا هٰذَا الْقُرْآنَ، فَوَ الَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَهُوَ أَشَدُّ تَفَلُّتًا مِنَ الْاِبِلِ فِيْ عُقُلِهَا" (متفق علیہ)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''قرآن حکیم کی نگرانی کرو (سمجھ کر روزانہ تلاوت کیا کرو) اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے کہ اس کا سینوں سے نکل جانا بندھے ہوئے اونٹ کے نکل بھاگنے سے زیادہ آسان ہے۔''

خوش الحانی

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:

"مَا أَذِنَ اللّٰهُ لِشَيْءٍ مَا أَذِنَ لِنَبِيٍّ حَسَنِ الصَّوْتِ يَتَغَنّٰى بِالْقُرْآنِ يَجْهَرُ بِهٖ" (متفق علیہ)۔

حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

اللہ تعالیٰ کو کوئی آواز اتنی پسند نہیں جتنی کہ نبی ﷺ کی اچھی آواز کہ جو خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں (اس طرح نبی ﷺ) کی اتباع میں جو شخص بھی تلاوت کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول و مستجاب ہے۔

............❁............

فتنہ میں ذریعہ نجات

ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں حارثؓ اعور فرماتے ہیں:

مَرَرْتُ فِی الْمَسْجِدِ فَاِذَالنَّاسُ یَخُوْضُوْنَ فِی الْاَحَادِیْثِ

فَدَخَلْتُ عَلٰی عَلِیٍّؓ فَاَخْبَرْتُہٗ فَقَالَ اَوَ قَدْ فَعَلُوْھا؟

میں مسجد میں داخل ہوا۔ تو دیکھا کچھ لوگ بعض مسائل میں جھگڑا کر رہے ہیں۔

تو میں حضرت علیؓ کے پاس گیا اور انھیں اس بات کی خبر دی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: کیا یہ باتیں ہونے لگیں؟

قُلْتُ نَعَمْ (میں نے کہا: جی ہاں۔)

قَالَ اَمَا اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَلا اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ

حضرت علیؓ نے فرمایا: ''یاد رکھو میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: خبردار رہو، عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا۔''

قُلْتُ فَمَا الْمَخْرَجُ فِیْھَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ (میں نے عرض کیا ''اس فتنے میں ذریعہ نجات کیا ہوگا''؟)

قَالَ: ''کِتَابُ اللّٰہِ'' (آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب'')

فِیْہِ نَبَاءُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبْرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ ھُوَالْفَصْلُ لَیْسَ بِالْھَزْلِ مَنْ تَرَکَہٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَہُ اللّٰہُ وَمَنِ ابْتَغَی الْھُدَی فِیْ غَیْرِہٖ اَضَلَّہُ اللّٰہُ

(اس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے حالات ہیں۔ تم سے بعد میں ہونے والی باتوں کی خبر ہے اور تمہارے آپس کے معاملات کا فیصلہ ہے۔ اور یہ ایک دوٹوک بات ہے۔ ہنسی دل لگی کی باتیں نہیں ہیں جو سرکش اسے چھوڑ دے گا اللہ اس کی کمر توڑ دے گا اور جو اسے چھوڑ کر کسی اور بات میں ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے گمراہ کردے گا۔)

وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ (اور اللہ کی مضبوط رسی یہی ہے۔)

وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ (اور یہی حکمتوں سے بھری ہوئی یاددہانی ہے۔)

وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ (اور یہی بالکل سیدھی راہ ہے۔)

وَهُوَ الَّذِیْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ (اوراس کے ہوتے ہوئے خواہشیں گمراہ نہیں کرتی ہیں۔)

وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ (اور نہ اس سے زبانیں لڑکھڑاتی ہیں۔)

وَلَا تَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ (اوراہل علم کا دل کبھی اس سے سیر نہیں ہوتا۔)

وَلَا يَخْلُقُ عَلٰى كَثْرَةِ الرَّدِّ (اور یہ بار بار دہرانے سے پرانا محسوس نہیں ہوتا)

وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ (اوراس کی عجیب باتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔)

وَهُوَ الَّذِیْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذَا سَمِعَتْهُ حَتّٰى قَالُوْا (یہ وہی ہے جسے سنتے ہی جنّ پکار اٹھے تھے)

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِیْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ

(بلاشبہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے لہٰذا ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔)

مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ (جس نے اس کی سند پر کہا، سچ کہا۔)

مَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ (جس نے اس پر عمل کیا اجر پائے گا۔)

وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ (جس نے اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا۔)

وَمَنْ دَعَآ اِلَيْهِ هَدٰى اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

(جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کی۔)

خُذْهَا اِلَيْكَ يَا اَعْوَرُ (اے اعور! ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو۔)

ان مبارک الفاظ میں بڑی نصیحت ہے خصوصاً مندرجہ ذیل باتوں پر غور کیجیے:

۱- فتنے کے زمانے میں قرآن ہی ذریعہ نجات ہے۔

۲- یہی ہمارے سارے قضیوں اور جھگڑوں کا فیصل ہے۔

۳- اس کو چھوڑ دینا دنیا کی بہت بڑی سرکشی ہے اور اس کے بعد انسان اللہ تعالٰی کی مدد اور حمایت سے محروم اور اس کے غضب کا شکار ہو جاتا ہے۔

۴- قرآن پر ایمان رکھنے والوں کو قرآن سے منہ موڑنے کے بعد سوائے گمراہی کے کچھ نصیب نہ ہوگا۔

قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی

قرآنِ حکیم کتابِ ہدایت ہے، یہ رب العالمین کا پیغام انسان کے نام ہے اس نے اسے جبریل امین کے ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر نازل فرمایا۔ کیوں اتارا؟ ارشاد ہوتا ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (ص:۲۹)

''یہ ایک بڑی بابرکت کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تا کہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل وفکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔''

عربی زبان میں کتاب کو پڑھنے کے لئے قرأت کا لفظ آتا ہے جس سے اسم فاعل قاری عربی میں پڑھنے والے کو کہتے ہیں جب کہ تدبّر اس طرح پڑھنے کو کہتے ہیں کہ کتاب کے الفاظ اور عبارت پر غور وفکر کیا جائے، معنی اور مطالب کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے احکام وہدایات کو حرزِ جان بنانے کی سعی وجستجو کی جائے اس لئے اس آیۂ مبارکہ میں ہے کہ عقلمند اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں کہ قلب وروح کو جلا بخشنے اور فرد واجتماع کو سنوارنے کے لئے جو تصورات اس میں مذکور ہیں، ان کو عمل میں لاتے ہیں اور ان کی روشنی میں اپنے لئے نظامِ حیات وضع کرتے ہیں۔ اسی سے زندگی میں انقلاب آتا ہے، وہ عزت ورفعت سے ہمکنار ہوتی ہے کیا خوب شاعر مشرق نے کہا ہے ؎

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟
زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟

آں کتاب زندۂ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

کیا تو جانتا ہے کہ تیرا آئین کیا ہے۔آسمان کے نیچے تیری شان وشوکت کا راز کیا ہے۔وہ کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ہے یقیناً اس میں درج حکمت کی باتیں ہمیشہ رہنے والی اور قدیم ہیں ۔(اور حکمت کبھی پرانی نہیں ہوتی)۔

قرآنِ حکیم سے بھر پور فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تلاوت کے وقت دل و دماغ کو حاضر کیا جائے،اور سمع وبصر کو کام میں لایا جائے،اور یہ خیال کیجئے کہ آپ کوئی معمولی کتاب نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ خالق کائنات کا کلام ہے جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آپ تک پہنچایا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَھُوَ شَہِیۡدٌ.(ق:٣٧)

’’بے شک اس میں درس عبرت ہے اس کے لئے جس کے پاس قلب (سلیم) ہو یا جو کان لگا کر بات سنے اور دل سے حاضر ہو(قرآن کے بیان کردہ واقعات پر غور وفکر کر سکے)۔‘‘

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

’’لفظ قلب اپنے حقیقی یعنی دل زندہ کے معنی میں ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے قلب (دل) کو احساس کرنے،عبرت حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کے لئے بنایا ہے،جب تک آدمی کا دل یہ کام کرتا ہے،اس وقت تک اس کا دل زندہ ہے اور جب تک دل زندہ ہے(یعنی اس میں سوچ بچار کی صلاحیت ہے)اس وقت تک آدمی بھی زندہ ہے۔اس لئے کہ آدمی کی حقیقی زندگی اس کے دل کی زندگی ہی سے ہے،اگر دل یہ خصوصیات کھو بیٹھا تو پھر آدمی بھی مردہ ہے اگر چہ اس کی رگوں میں کتنا ہی خون دوڑتا پھرتا ہو۔

’’اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَھُوَ شَہِیۡد‘‘یعنی اگر دل پوری طرح بیدار نہ ہو تو کم از کم اتنی بات تو انسان کے اندر ہو کہ کوئی معقول آدمی اس کو کوئی بات سنائے تو وہ اس کو توجہ سے سنے،یہ توجہ بھی انسان کے لئے بڑی خیر و برکت کا باعث ہے،اس سے بھی بسا اوقات دل کی غفلت دور اور اس کی عبرت پذیری کی صلاحیت زندہ ہو جاتی ہے،لیکن جو شخص ایسا بدقسمت ہو کہ نہ اس کا دل ہی بیدار ہو اور نہ وہ کسی معقول آدمی کی بات سننے ہی کے لئے اپنے کان کھولنے پر آمادہ ہو تو ایسے آدمی کے اندر کوئی معقول بات کدھر سے راہ پائے گی(تدبر قرآن جلد ششم)

نصیحت حاصل کرنے اور اس سے فیض یاب ہونے کے لئے دل سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور بات کو توجہ سے سننے کی عادت کے علاوہ شہید کا لفظ بول کر مزید چوکس کیا جارہا ہے کہ وہ محض جسم وجان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ دل و دماغ کے ساتھ حاضر رہے،مثلاً غور کیجئے کہ وہی نماز قیمتی بنتی ہے جو حضور قلب سے خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کی جائے۔اسی طرح وہی تلاوت سودمند ثابت ہوتی ہے جو تدبر اور پورے شعور سے کی جائے اور اس کے احکام کو دل وجان سے تسلیم کیا

جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ(۲۷) قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ(۲۸)[الزمر]

''یقیناً ہم نے لوگوں کے (سمجھانے) لئے قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ نصیحت پکڑیں (اور اپنی زندگیوں کو سنوار لیں) یہ قرآن (فصیح) عربی زبان میں ہے جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں ہے تاکہ وہ ڈر جائیں (اور آخرت کے برے انجام سے بچ جائیں)۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وشعور سے نوازا ہے اور شرفِ انسانیت کا تقاضا ہے کہ اس کو بروئے کار لایا جائے، قرآنِ حکیم سے وہی لوگ فیض یاب ہو سکتے ہیں جو اس پر تدبر اور تفکر کرتے ہیں، رب کریم کا اعلان ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا. (محمد۔۲۴)

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں۔''

ظاہری بصارت کے ساتھ ساتھ جب تک داخلی بصیرت سے کام نہ لیا جائے انسان کبھی کسی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ قرآنِ حکیم نے یہ بات واشگاف الفاظ میں بتلائی کہ حقیقی اندھا پن، دل کا اندھا پن ہے۔ جو لوگ ظاہری آنکھیں رکھتے ہوئے بھی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے، وہ بصارت رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں کیونکہ انہوں نے بصیرت سے کام نہ لیا اور وہ دل کے اندھے ہو گئے۔

ارشاد ہوتا ہے!

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ. (الحج:۴۶)

''حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

قرآنِ حکیم کتابِ عظیم ہے، اسی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہمارے اسلاف قدر و منزلت اور عروج و سربلندی سے ہمکنار ہوئے تھے۔ آج امت مسلمہ اس دولت بے بہا اور متاع گراں مایہ سے غافل ہو چکی ہے۔ اسے محض برکت کے طور پر محفلوں اور مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے۔ مگر اس کی قیمتی اور لازوال تعلیمات کا اثر کہیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ یہ مسلمان کے لئے زندگی گزارنے کا آئین (دستورِ حیات) ہے۔ مگر آج مسلمان کیلئے ہر طرف سے ذلت وخواری ہے۔

شاعر مشرق اس پر اس طرح آنسو بہاتا ہے ؎

ملّتے را رفت چوں آئین ز دست
مثل خاک اجزائے او ازہم شکست

ہستی مسلم ز آئین است و بس
باطن دین نبیؐ این است و بس

برگِ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد
گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبط صدا پیدا ستے
ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستے

(ہائے افسوس) جب آئین ملت کے ہاتھ سے چلا گیا تو مٹی کی طرح اس کے اجزا بھی بکھر گئے، مسلمان کی ہستی صرف آئین پر ہی ہے اور بس۔ نبی ﷺ کے دین کا باطن یہی ہے اور بس، جب پھول کی پتیاں آئین سے وابستہ ہو جاتی ہیں، تو گلدستہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں (کیا یہ حقیقت نہیں ہے) کہ آواز کو ضابطے میں لانے سے نغمہ پیدا ہوتا ہے اور جب نظم وضبط ختم ہو جاتا ہے تو وہ محض بے ہنگم شور وغل ہوتا ہے۔

قرآن آج پھر امت مسلمہ کو پکار رہا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (آل عمران۔۱۳۹)

”اور تم دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔“

(شیخ عمر فاروق)

سُوْرَۃُ النَّبَا

اس سورۃ مبارکہ کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا، قیامت اور حشر کا ثبوت اس سورت کا مرکزی مضمون ہے، دراصل دین کی تبلیغ کا آغاز تین بنیادی باتوں سے ہوا۔

(ا) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان اور شرک سے کلی طور پر اجتناب

(ب) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اور آپ ﷺ کی اطاعت کا حکم

(ج) آخرت پر یقین اور اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی پر پختہ ایمان

مشرکین عرب اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتے تھے اور سخت مشکلات میں صرف اسی کی طرف رجوع کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بزرگوں کے مجسمے اپنے ہاتھوں سے تراش رکھے تھے اور بیت اللہ جسے اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے توحید کا مرکز بنایا تھا اس میں بھی انہوں نے متعدد بت سجا رکھے تھے اور کہا کرتے تھے: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر:۳) ''ہم تو ان (بتوں) کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ تک ہماری رسائی کرا دیں۔''

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر ان کے اس شرک کا رد کیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و امانت پر انہیں یقین تھا وہ آپ کے اخلاق عالیہ سے بھی متاثر تھے مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ رسول ایسا بھلا کیونکر ہو سکتا ہے جو شاہراہوں پر چلتا پھرتا ہو اور ان کی طرح کھاتا پیتا ہو، اسے مافوق البشر ہونا چاہیے۔ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (الفرقان:۷) ''وہ کہتے یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔''

ان کی عقل میں یہ بات نہ آتی تھی کہ رسول وہی ہو سکتا ہے جس کی حیات طیبہ ان کے لیے ہر معاملہ میں نمونہ ہو۔

تیسری بات یہ کہ قیامت پر ان کا یقین نہیں تھا وہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے ان کے خیال میں ہزاروں صدیوں کی پہنائیوں میں ان کے مشت غبار کے بکھرے ہوئے ذرے کون جمع کرے گا۔ قَالُوْٓا ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (المومنون:۸۲) وہ کہتے ''کیا جب مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔''

قرآن حکیم نے اس کا متعدد مقامات پر جواب دیا کہ رب قدیر ہر بات پر قادر ہے، جو خالق تمھیں نیست سے ہست میں لایا، وہ ہر چیز کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے، اس سورۃ مبارکہ میں اس کی قدرتوں کا مشاہدہ کرایا گیا ہے، عرش سے فرش تک ہر جگہ اور ہر سمت اس کی قدرت عیاں ہے، جس طرح لیل و نہار کی آمد و رفت میں اس کی قدرت ظاہر ہے، اسی طرح دنیا کے بعد آخرت بھی یقینی ہے، دنیا دار العمل ہے تو آخرت دار الجزا ہے۔

سُوْرَۃُ النَّبَا

آیات:۴۰ رکوعات:۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿عَمَّ یَتَسَآءَ لُوۡنَ(۱) عَنِ النَّـبَاِ الۡعَظِیۡمِ(۲) الَّذِیۡ ھُمۡ فِیۡہِ مُخۡتَلِفُوۡنَ(۳) کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ(۴) ثُمَّ کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ(۵)﴾

یہ لوگ کس چیز کی بابت باہم سوال (چہ می گوئی) کرتے ہیں؟ کیا اس بڑے واقعہ کے متعلق جس (کے بارے) میں یہ مختلف (رائیں رکھتے) ہیں؟ یقیناً یہ ابھی جان لیں گے اور بالیقین انہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔

﴿عَمَّ یَتَسَآءَ لُوۡنَ﴾

(یہ لوگ) کس چیز کی بابت باہم سوال کرتے ہیں۔

عَمّ (عَنۡ.مَا) سے۔کس (چیز) عَنۡ، حرفِ جر ہے، کلمہ ما، استفہامیہ ہے، عربی زبان میں جب کسی لفظ کی ادائیگی میں ثقالت (بوجھ) محسوس ہو تو لفظ کو ملا دیتے ہیں، اسے ''قاعدۂ اِدغام'' کہتے ہیں۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے الف حذف کر دیا گیا ہے اور نون و میم کے اِدغام سے عَمَّ پڑھا جارہا ہے۔ یَتَسَآءَ لُوۡنَ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں، (سَأَلَ، یَسۡئَلُ، سُؤَالًا) پوچھنا، معلوم کرنا، دریافت کرنا، سوال کرنا، (تَسَاءَ لَ، یَتَسَاءَ لُ، تَسَآءُ لٌ) باب تفاعل ایک دوسرے سے پوچھنا، سوال کرنا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

تساءُل کے معنی آپس میں کسی چیز سے متعلق پوچھ گچھ کے ہیں۔ پوچھ گچھ دریافتِ حال اور تحقیق کے لیے بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات محض سخن گستری اور استہزاء (مذاق) کے لیے بھی، یہاں یہ استہزا کے مفہوم میں ہے۔ (تدبر قرآن، جلد: ہشتم)

﴿عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ، الَّذِیۡ هُمۡ فِيۡهِ مُخۡتَلِفُوۡنَ﴾

اس بڑے واقعہ کے متعلق جس (کے بارے) میں یہ مختلف (رائیں رکھتے) ہیں۔

عَنِ سے، حرف جر بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے، النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ، عظیم خبر، مراد قیامت ہے یعنی کفار بطورِ استہزا قیامت کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں، الَّذِیۡ، جس کے (متعلق) اسم موصول، النَّبَا (قیامت) سے متعلق ہے، هُمۡ وہ، ضمیر جمع مذکر غائب، فِيۡهِ (فِیۡ. ہِ) میں، اُس۔ یعنی اس میں، مراد ہے قیامت سے متعلق، مُخۡتَلِفُوۡنَ وہ اختلاف کرتے ہیں (اِخۡتَلَفَ، يَخۡتَلِفُ، اِخۡتِلَافٌ) اختلاف کرنا، اردو میں استعمال ہوتا ہے، مُخۡتَلِفُوۡنَ مختلف الرائے ہیں اسم فاعل، جمع مذکر، اس کا مفرد مُخۡتَلِفٌ 'اختلاف کرنے والا' ہے۔

خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن کا نزول شروع ہوا، تو آپؐ نے مشرکین مکہ کو توحید کی دعوت دی، انہیں ایمان کی طرف بلایا اور زندگی کے حقائق سے آگاہ کرتے ہوئے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی اعمالِ حسنہ سے آراستہ کرنے کے لیے عطا فرمائی ہے، جو لوگ یہ حیاتِ مستعار اطاعتِ الٰہی میں گزاریں گے انہیں خالق و مالکِ روزِ جزا (قیامت کو) اجر عظیم سے نوازے گا اور جو نافرمانی اور خواہشات نفسانی کی پیروی میں گزاریں گے انہیں روزِ قیامت اس کی سزا دی جائے گی۔ یہ دنیا محض ایک امتحان گاہ ہے۔

مشرکین مکہ نے اس پر طرح طرح کے اعتراضات شروع کر دیے، کوئی کہتا تھا ﴿مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ؟﴾ [یٰسین:۴۸] یہ وعدہ کب پورا ہوگا، قیامت کب آئے گی۔ کسی نے کہا ﴿مَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً﴾ [الکہف:۳۶] میرا گمان نہیں کہ یہ قیامت آئے گی۔ اور کسی کی زبان پر اس طرح ہوتا ﴿اِنۡ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ﴾ [المؤمنون:۸۳] (اجی!) یہ تو صرف اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ اور کوئی یوں گویا ہوتا ﴿ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ﴾ [الرعد:۵] کیا جب ہم (مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو از سرِ نو پیدا ہوں گے؟ قیامت سے متعلق کفار اس قسم کی چہ میگوئیاں کرتے تھے، قرآن حکیم نے اس کا جواب واشگاف الفاظ میں یوں دیا۔

﴿كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ، ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ﴾

یقیناً یہ ابھی جان لیں گے اور بالیقین انہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔

كَلَّا ہرگز نہیں (یقیناً) یہ لفظ کسی بات کو روکنے اور تنبیہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، سَيَعْلَمُوْنَ، عنقریب وہ جان لیں گے، فعل مضارع جمع مذکر غائب، عِلْمٌ اس کا مصدر ہے (عَلِمَ، يَعْلَمُ عِلْمٌ) کسی بات کو جاننا، ادراکِ حقیقت، سین مفتوح (زبر والا سین) فعل مضارع پر داخل ہو کر اسے مستقبل کے لیے خاص کر دیتا ہے اور مستقبل قریب میں ہونے والے واقعہ کی خبر دیتا ہے۔

ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ پھر ہرگز نہیں (یقیناً) وہ جان لیں گے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''زور و جوش کے موقع پر فقروں کی یہ تکرار عربی حسن خطابت اور اسلوب بلاغت کا ایک خاص نمونہ ہے۔ اردو محاورہ میں بھی تو زور و جوش کے موقع پر کہتے ہیں۔ ''اجی یہ دیکھیں گے اور پھر دیکھیں گے۔'' (تفسیر ماجدی، ج:۲)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) یہ دنیا دارالامتحان ہے جبکہ آخرت دارالجزا ہے، اس زندگی میں لوگ جو کچھ کرتے ہیں، آگے اس کا اچھا یا برا بدلہ نہ ملے تو یہ بڑی بے انصافی ہوگی، خالق کائنات تو بڑا ہی منصف اور مہربان ہے، وہ ضرور بالضرور ایک دن سب کو جمع کرے گا پھر نیکوں کو جزا اور بروں کو سزا دے گا۔

۲) قیامت کا یقین انسان کی روش اور رویے پر گہرا اثر ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر بات کے لیے جوابدہ ہونے کا شعور، انسان کو راہ راست پر رکھتا ہے، وہ ہر اس بات کو چھوڑ دیتا ہے جو مولا و مالک کی ناراضی کا سبب ہو اور ہر اس بات کو اختیار کرتا ہے جس سے وہ راضی ہو جائے۔

۳) النَّبَا الْعَظِيْم قیامت کی ہولناکی کی خبر ہے جس میں اعمالِ خیر کے سوا اور کوئی چیز نفع نہ دے گی۔

۴) سَيَعْلَمُوْنَ میں 'س' قیامت کے عنقریب واقع ہونے کی اطلاع دیتی ہے، انسان کی مختصر سی زندگی

کے اختتام پر موت فیصلہ کن گھڑی کی علامت ہے، پھر یا تو ابدی راحت کا پیغام مل جاتا ہے یا ابدی عذاب کا دور شروع ہو جاتا ہے۔موت وہ اٹل حقیقت ہے جس کا انکار ناممکن ہے، آج تک اس کا تریاق تلاش کرنے میں انسان کی ہر سعی و جستجو ناکام رہی ہے۔

....

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا(٦) وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا(٧) وَّ خَلَقْنٰـكُمْ اَزْوَاجًا(٨) وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا(٩) وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا(١٠) وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا(١١)﴾

”(لوگو!) کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا؟ اور تمھیں (مردوں اور عورتوں کے) جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا اور تمھاری نیند کو باعث راحت وسکون بنایا، رات کو تمھارا پردہ اور دن کو روزی کمانے کا وقت بنایا۔“

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا، وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾

کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا؟

اَلَمْ کیا نہیں؟ نَجْعَلِ بنایا، ہم نے (جَعَلَ، یَجْعَلُ، جَعْلًا) بنانا، وجود میں لانا، الْاَرْضَ زمین کو، مِهٰدًا بچھونا (فرش)، وَّالْجِبَالَ اور پہاڑوں کو، جَبَلٌ اس کا مفرد ہے، اَوْتَادًا میخیں، اس کا مفرد وَتَدٌ ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

”ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ان آثار کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس کی قدرت، حکمت، رحمت، ربوبیت، توحید، قیامت اور ایک روزِ جزا وسزا کے لازمی ہونے پر ایسی واضح حجت ہیں کہ کوئی سلیم الفطرت ان کا انکار نہیں کرسکتا، آخر میں یہ نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ

مِيقَاتًا (بلاشبہ فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے) جو شخص بھی ان نشانیوں پر غور کرے گا، وہ اس اعتراف پر مجبور ہوگا کہ اس کے بعد ایک فیصلہ کا دن ضرور آئے گا اور اس کا وقت اس کائنات کے خالق کے نزدیک معین ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا، وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا،

سب سے پہلے زمین اور اس کے پہاڑوں کی طرف توجہ دلائی کہ انسان اگر روزِ جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے تو کیا وہ ربوبیت کے اس اہتمام پر غور نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے، بغیر کسی استحقاق کے، رکھا ہے کہ زمین کو اس کے لیے گہوارے کی طرح قرار و سکون کی جگہ بنایا ہے اور اس میں پہاڑوں کی میخیں ٹھونکی ہیں تاکہ یہ اپنی جگہ پر برقرار رہے اور کوئی تزلزل اس میں نہ پیدا ہونے پائے۔

زمین کے اندر پہاڑوں کے لنگر انداز کرنے کی مختلف حکمتوں کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں، ایک مقام پر ارشاد ہوا: وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (النحل:۱۵) ''اور زمین میں اس نے پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے کہ مبادا وہ تمھارے سمیت لڑھک جائے''، یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اگر غور کرے تو یہ سمجھنے سے وہ قاصر نہیں رہے گا کہ جو رب اس زمین کے گہوارے میں اس اہتمام سے اس کی پرورش کر رہا ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایسا دن نہ لائے جس میں ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی ربوبیت کا حق پہچانا اور اس کو ادا کیا ہو اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی ناشکری اور نافرمانی کی ہو۔ ربوبیت کے ساتھ مسؤلیت لازمی ہے [ربوبیت اللہ کی مسؤلیت بندے کی]، ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کائنات کے خالق کے نزدیک شکرگزار اور نابکار دونوں برابر ہیں، یہ ایسی بھونڈی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ سے متعلق اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ (تدبر قرآن، جلد ہشتم)

﴿وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا﴾

اور پیدا کیا ہم نے تمھیں جوڑے (مرد اور عورت) سے۔

وَ اور، یہ واؤ عاطفہ کہلاتا ہے جس کا ربط سابقہ عبارت سے ہوتا ہے، خَلَقْنَا ہم نے پیدا کیا فعل ماضی

صیغہ جمع متکلم، اللہ تعالیٰ واحد ہے، جمع کا صیغہ بطور عزت وعظمت کے لیے آیا ہے (خَلَقَ، یَخْلُقُ خَلْقًا) پیدا کرنا، اَزْوَاجًا جوڑے، اس کا مفرد زوجٌ ہے۔

اسی سے معاشرتی زندگی کی داغ بیل پڑتی ہے، نسل انسانیت پھلتی پھولتی ہے، اور ایک دوسرے سے تعاون کی راہیں کُھلتی ہیں اور سب سے بڑھ کر انس ومحبت، اور ہمدردی وغمخواری کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ یہی انسان کا شرف ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً (الروم:۲۱) ''اور (ربِّ قدیر) کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔''

﴿وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾

اور بنایا ہم نے، نیند تمہاری کو آرام کا سبب۔

وَّ اور، عاطفہ ہے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھنے کے لیے (جَعَلَ، يَجْعَلُ) کرنا، بنانا، جَعَلْنَا ہم نے بنایا، فعل ماضی جمع متکلم، نَوْمَكُمْ (نَوْمَ. كُمْ) نیند تمھاری، نَوْم نیند، مضاف، كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، سُبَاتًا، قَطْعُ الْحَرَكَةِ لِتَحْصِيْلِ الرَّاحَةِ (المراغی)، ''نقل وحرکت کا منقطع ہو جانا، راحت وآرام کے لیے''، انسان جب دن بھر کام کاج سے تھک ہار جاتا ہے تو نیند لینے سے تازہ دم ہو کر پھر سے چاق وچوبند ہو جاتا ہے، یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔

﴿وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا، وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾

اور بنایا ہم نے رات کو لباس اور کیا ہم نے دن کو وقتِ معاش۔

وَ عاطفہ ہے، جَعَلْنَا (جَعَلَ. نَا) بنایا، ہم نے فعل ماضی جمع متکلم، الَّيْلَ رات (کو)، لِبَاسًا، لباس یعنی رات کا اندھیرا اور تاریکی ہر چیز کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے، جس طرح لباس انسان کے جسم کو چھپا لیتا ہے۔ (تفسیر احسن البیان) وَجَعَلْنَا اور بنایا، ہم نے النَّهَارَ دن (کو)، مَعَاشًا، وقتِ معاش (حق حلال کی روزی کمانے کا وقت)۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) قرآن حکیم کا اندازِ بیان فطری ہے، وہ کوئی مافوق الفطرت واقعات بیان نہیں کرتا بلکہ ہر انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد انفس وآفاق پر گہری نظر ڈالے تو خالق کائنات کی قدرت وطاقت کا مشاہدہ کر لے گا۔

۲) ارض وسماء (زمین وآسمان) خالق کائنات کی قدرت کے کتنے بڑے نشان ہیں زمین کو انسان کے لیے بچھا کر پہاڑوں کے ذریعے اس کے توازن کو برقرار رکھا گیا ہے تاکہ انسان اس پر شاہراہیں تعمیر کرے، مکانات بنائے، کھیتی باڑی کرے اور جس طرح اور جیسے چاہے اس پر چلے پھرے، وہ کبھی اس کے سامنے سرکشی نہیں کرتی۔

۳) تم کو جوڑے جوڑے بنایا...... مرد اور عورت، ہر ایک دوسرے کی تسکین اور راحت کا سامان ہیں اور اسی انتظام کی بدولت تمھاری نسل پلتی بڑھتی ہے، ذرا سوچو تو سہی، اس انتظام کے بغیر اگر زندگی ہوتی تو کیسی اجیرن اور کتنی بے لطف اور کس قدر بے کیف ہوتی!

۴) رب کائنات نے دن کام کاج کے لیے تو رات کو راحت وآرام کے لیے بنایا ہے تاکہ زندگی کا تسلسل اور توازن برقرار رہے، دن رات (چوبیس گھنٹوں) کی تقسیم میں بڑا توازن اور اعتدال ہے اور رب کائنات کی حکمت اور قدرت کی نشانی ہے، اور انسان کے لیے اسی میں دلچسپی اور خوشگواری ہے۔ اگر یہ سارا وقت دن ہی دن ہوتا یا رات ہی رات ہوتی تو انسان کے لیے کام کاج کرنا دوبھر ہو جاتا اور زندگی کی تمام دلچسپیاں ٹھپ ہو کر رہ جاتیں۔

....

﴿وَّبَنَيۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا (۱۲) وَّ جَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا(۱۳) وَّ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا(۱۴) لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا(۱۵) وَّ جَنّٰتٍ اَلۡفَافًا(۱۶) اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِيۡقَاتًا (۱۷)﴾

اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط (آسمان) بنائے۔ اور ہم نے (آفتاب) کو روشن چراغ بنایا، اور بھرے بادلوں سے موسلا دھار پانی برسایا تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم (تمھارے لیے) غلہ، سبزی اور گھنے باغات اُگائیں، بلاشبہ فیصلے کا دن (روزِ قیامت) ایک وقتِ مقررہ ہے۔

﴿وَّبَنَيۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا﴾

اور بنائے ہم نے تمھارے اوپر، سات آسمان سخت (مضبوط)۔

وَ اور عاطفہ ہے، سلسلہ کلام ماضی سے ربط رکھتا ہے، بَنَيۡنَا ہم نے بنایا فعل ماضی جمع متکلم، ربّ کریم کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت وعظمت استعمال ہوا ہے (بَنَى، يَبۡنِيۡ، بِنَاءً اور بُنۡيَانًا) تعمیر کرنا، بنانا، فَوۡقَكُمۡ (فَوۡق. كُمۡ) اوپر تمھارے، كُمۡ، ضمیر جمع مذکر حاضر، سَبۡعًا سات (آسمان)، شِدَادًا شدید (سخت) شِدَادٌ کا مفرد شَدِيۡدٌ ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

”زمین کی نشانیوں کے بعد آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی، فرمایا، اب (ذرا) اوپر دیکھو، ہم نے تمھارے اوپر سات محکم (مضبوط) آسمان بنائے، آسمان کا ذکر اگرچہ یہاں الفاظ میں نہیں ہے لیکن جو صفات مذکور ہیں، وہ خود دلیل ہیں کہ مراد آسمان ہی ہے، سورۃ ملک میں یہی بات اس طرح فرمائی:

اَلَّذِىۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا، مَا تَرٰى فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ، فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ هَلۡ تَرٰى مِنۡ فُطُوۡرٍ، ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ

حَسِيْرٌ (الملک:۳-۴)

(وہ رب قدیر) جس نے سات آسمان تہہ بہ تہہ پیدا کیے، تم اللہ تعالیٰ، رحمٰن ورحیم کی کاریگری میں کوئی خلل نہیں پاسکتے۔تم نگاہ دوڑاؤ، کہیں اس [آسمان] میں کوئی شگاف دیکھتے ہو، پھر دوبارہ نگاہ دوڑاؤ، نگاہ ناکام ہوکر تمہاری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔'' (تدبر قرآن، جلد:ہشتم)

اس حقیقت کو ایک کمسن بچے سے لے کر ایک عمر رسیدہ شخص تک جھٹلا نہیں سکتا، اور اس کا ہر دیہاتی اور شہری یا پڑھا لکھا اور ان پڑھ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔

﴿وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا﴾

اور بنایا ہم نے (آفتاب) کو روشن چراغ۔

وَ اور (عاطفہ)، جَعَلْنَا ہم نے بنایا، فعل ماضی جمع متکلم، سِرَاجًا چراغ، مراد اس سے آفتاب ہے، وَهَّاجًا دراصل، وَهَجٌ کے معنی روشنی، کسی چیز کی چمک دمک کے ہیں، الوھّاج انتہائی تیز، روشن، چمکدار، سِرَاجًا کی صفت وَهّاجًا، یعنی ایسا چراغ جو انتہائی روشن اور چمکدار ہے، اس سے مراد آفتاب ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں: ''سِرَاجًا وَّهَّاجًا'' سے مراد آفتاب ہونا ظاہر ہے......آسمان اور آفتاب جیسی زبردست وعظیم الشان موجودات حق تعالیٰ کی محض مخلوق ہی ہیں، ساری مخلوقات کی طرح بے بس، نہ کہ خود آفریدہ یانعوذ باللہِ شریک خدائی۔ (تفسیر ماجدی، ج:۲)

﴿وَ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا﴾

اور ہم نے اتارا (برسایا) بھرے بادلوں سے موسلا دھار پانی۔

وَ اور (عاطفہ)، اَنْزَلْنَا (اَنْزَلْ.نَا) اتارا، ہم نے (اَنْزَلَ، يُنْزِلُ، اِنْزَالٌ) اتارنا، نازل کرنا، مِنَ الْمُعْصِرٰتِ بھرے بادلوں سے، اس کا مفرد مُعْصِرَةٌ ہے، وہ بادل جو پانی سے بھرا ہوتا ہے اور برس کر جانے والا ہوتا ہے۔ الْعَصِير، رس، جوس، عرق، تیل کو کہتے ہیں۔ عَصِيْرُ الفَوَاكِه پھلوں کا رس، عَصِيْرُ الوَرْدِ، آبِ گل (القاموس الوحید)، مَآءً ثَجَّاجًا پانی۔ موسلا دھار مَآءً کی صفت ثَجّاجًا ہے

اورعربی زبان میں صفت موصوف کی اِعرابی حالت یکساں ہوتی ہے۔ثَجَّاجًا، ثَجٌ سے جس کے معنی زورشور کے ساتھ پانی برسنے اور بہنے کے ہیں۔

﴿لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا، وَّ جَنّٰتٍ اَلۡـفَافًا﴾

تاکہ نکالیں ہم (اس پانی) کے ساتھ غلہ،سبزی اور گھنے باغات۔

لِّنُخۡرِجَ (لِ.نُخۡرِجَ) تاکہ، ہم نکالیں، (اَخۡرَجَ، یُخۡرِجُ، اِخۡرَاجًا) نکالنا، نُخۡرِجَ، ہم نکالیں،رب العزت کے لیے،مضارع جمع متکلم کا صیغہ عزت اور عظمت کے لیے آیا ہے، بلاشبہ وہ واحد ہے،بِهٖ (بِ.هٖ) ساتھ اس پانی کے، حَبًّا وَّ نَبَاتًا، اناج اور سبزی،وَّ جَنّٰتٍ اور باغات اس کا مفرد جَنَّةٌ ہے،اَلۡفَافًا لپٹے ہوئے یعنی گھنے،جنّٰتٍ کی صفت الفافًا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت پانی پرغوروفکر کیجیے۔جناب محمد عبدالحیؒ لکھتے ہیں:

''بھلا کہاں سمندر اور کہاں اس کا پانی اور اس کے لیے انتظام کا ایک پورا سلسلہ کہ سورج کی گرمی پانی کو بھاپ بنائے اور پھر اس کی گرمی کی وجہ سے مختلف مقامات کی فضا میں ہوا کے دباؤ میں فرق پڑ جائے، ہواؤں کو ایک خاص نظم کے ساتھ حرکت ہو،اس حرکت کے نتیجے میں ہوائیں سمندری بخارات کو ملک ملک لے جائیں، بخارات ایک مقررہ ضابطے کے تحت پھر پانی کی شکل اختیار کرلیں اور آسمان سے موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہو جائے، پھر یہ بارش زندگی کا باعث بنے،جس کی وجہ سے زمین سے نباتات اگیں، غلے اور پھل پھول پیدا ہوں، باغات پرورش پائیں اور وہ بے شمار نعمتیں وجود میں آئیں جنہیں تم گن بھی نہیں سکتے اور جن کے بغیر تم چند گھنٹے زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔'' (آسان تفسیر)

﴿اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا﴾

بلاشبہ فیصلے کا دن (قیامت) مقرر ہے۔

اِنَّ حرف مشبہ بالفعل،کلام میں زور پیدا کرتا ہے، بلاشبہ، بے شک،یَوۡمَ دن اِنَّ کا اسم مضاف، الۡفَصۡلِ فیصلہ مضاف الیہ،یَوۡمَ الفصل فیصلہ کا دن، مراد ہے قیامت، کَانَ ہے، (کَانَ، یَکُوۡنُ، کَوۡنًا) ہونا، واقع ہونا،مِیۡقَاتًا، وقتِ مقرر،اس کا مادہ وقت ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''یہ اوپر کی ساری بحث و تفصیل (آغاز سورت سے آیت نمبر 16 تک) کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ اہتمامِ ربوبیت اور آسمان سے لے کر زمین تک یہ انتظامِ پرورش صاف گواہی دے رہا ہے کہ جس پروردگار نے یہ سب کچھ کیا ہے، وہ انسان کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ لازماً ایک فیصلہ کا دن اس نے مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ سب کو جمع کرے گا کہ کس نے اس کی ربوبیت کا حق پہچانا اور کس نے اس کی ناقدری کی، پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔'' (تدبر قرآن۔ ج:۸)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) آنکھ بینا ہو تو رب کائنات کی قدرت و حکمت کا ہر طرف مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ زمین اور اس پر سر بفلک پہاڑ اور ان پر ہر طرف سبزہ زار، یہ طرح طرح کے میوہ جات اور ان کے نت نئے ذائقے، یہ انواع و اقسام کے غلہ جات اور جسم و جان کے لیے ان کے فوائد و ثمرات! یہ آسمان اور اس پر بکھرے ہوئے ستارے کہ جن میں کئی زمین سے بھی بڑے ہیں سب اللہ کی قدرت و طاقت کے مظاہر ہیں۔

۲) پانی اور ہوا ہر چیز کی زندگی کا سر و سامان ہیں......اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمتیں ہیں کہ کوئی عقلمند ان کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔ ہوا نہ ہو تو چند ساعتیں گزارنا مشکل ہے اور پانی نہ ملے تو چند گھنٹوں میں ہی جان پر بن جاتی ہے، فصلوں کو پانی نہ ملے تو وہ خشک ہو جاتی ہیں اور ان کی نشو و نما رک جاتی ہے، کس کے حکم سے پانی کی موجوں سے بادل بن کر اٹھتے ہیں اور ہوا انہیں اپنے دوش پر ادھر ادھر لیے پھرتی ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے؟

۳) تو کیا ایسا حکیم، ایسا صناع، ایسا قادر اور اتنے بڑے کارخانے کا مالک قیامت لانے پر قادر نہیں؟

۴) جس قادرِ مطلق نے اتنی بڑی کائنات کو بنایا اور سجایا ہے اور انسان کو اس میں اشرف اور اعلیٰ بنایا ہے بلکہ زمین کی نیابت عطا کی ہے ضروری ہے کہ وہ اسے اس فرض کی ٹھیک طور پر ادائیگی پر جزا اور کوتاہی پر سزا دے۔

....

يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا(۱۸) وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتۡ اَبۡوَابًا(۱۹) وَّ سُيِّرَتِ الۡجِبَالُ فَكَانَتۡ سَرَابًا(۲۰)

جس دن صور پھونکا جائے گا، تو تم گروہ در گروہ (اللہ کے حضور) چلے آؤ گے اور آسمان کھول دیا جائے گا، تو (اس میں) دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب (چمکتی ریت) ہو جائیں گے

﴿يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا﴾

جس دن صور پھونکا جائے گا، تو تم گروہ در گروہ (اللہ کے حضور) چلے آؤ گے۔

يَوۡمَ جس دن، طرف زمان، گزشتہ آیہ مبارکہ اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِيۡقَاتًا (بلاشبہ، فیصلے کا دن، وقت مقرر ہے) سے عطف بیان ہے، يُنۡفَخُ پھونکا جائے گا، مضارع مجہول واحد مذکر غائب اس کا مادہ ہے (نَفَخَ، يَنۡفُخُ، نَفۡخًا) پھونک مارنا، الصُّوۡرِ نرسنگھا، بگل، فَتَاۡتُوۡنَ (ف. تَاۡتُوۡنَ) تو، تم آؤ گے فعل مضارع جمع مذکر حاضر (اَتٰى، يَاۡتِىۡ، اِتۡيَانٌ) آنا، اَفۡوَاجًا، فوج در فوج (گروہ در گروہ) اس کا مفرد فَوۡجٌ ہے، یہ لفظ اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''ہم ان الفاظ سے ایک ایسی ہولناک آواز کا تصور کر سکتے ہیں جس کی دہشت سے انسان (قبروں سے) اٹھ کھڑے ہوں گے اور فوج در فوج چلے آ رہے ہوں گے، ہم اس منظر کا تصور کر سکتے ہیں کہ بے شمار انسان...... جو یکے بعد دیگرے زمین پر رہ بس کر دنیا سے غائب ہو گئے تھے اور انہوں نے زمین کو خالی کر دیا تھا کہ مبادا وہ بعد میں آنے والوں کے لیے تنگ ہو جائے...... یکجا ہو جائیں گے، یہ سب (اللہ کے حکم سے) زندہ کیے گئے ہوں گے، سب میدانِ حشر میں کھڑے ہوں گے، زمین کے ایک ایک گوشہ سے آ کر جمع ہوئے

ہوں گے! بے شمار قبروں کا تصور کر سکتے ہیں جس کی نہ ابتدا معلوم ہوگی نہ انتہا! ہم اس ہولناک حادثہ کا تصور کر سکتے ہیں جس کے باعث یہ عظیم مجمع ایک ہی وقت بلکہ ایک ہی گھڑی میں یکجا ہوگا، اتنا مجمع اور ایسا مجمع اس دن کے سوا کبھی اکٹھا نہ ہوا تھا، یہ سب کہاں ہوگا؟ ہمیں نہیں معلوم، اس کائنات میں، جسے ہم جانتے ہیں، بہت سے ایسے حوادث اور ہولناک واقعات ہوتے رہتے ہیں جو بہت عظیم ہوتے ہیں۔(فی ظلال القرآن)

﴿وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾

اور آسمان کھول دیا جائے گا، تو (اس میں) دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔

وَ فُتِحَتِ اور کھولا جائے گا، وَ، عاطفہ ہے، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، فُتِحَتِ، فَتْحٌ سے فعل ماضی مجہول واحد مونث غائب (فَتَحَ، يَفْتَحُ، فَتْحًا) کھولنا، السَّمَآءُ آسمان، فَكَانَتْ (ف. كَانَتْ) پس وہ ہو جائیں گے، كَانَ مصدر سے ماضی واحد مونث غائب، اَبْوَابًا، دروازے، اس کا مفرد باب ہے یعنی روز قیامت آسمان اللہ تعالیٰ کے حکم سے پھٹ جائے گا اور اس میں جا بجا دروازے نظر آئیں گے۔

﴿وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾

اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب (چمکتی ریت) ہو جائیں گے۔

وَّ سُيِّرَتْ اور چلائے جائیں گے ماضی مجہول واحد مونث غائب اس کا مادہ (س ی ر) ہے، (سَارَ، يَسِيْرُ، سَيْرًا) چلنا، چالو ہونا، جانا، حرکت کرنا اسی سے فعل (سَيَّرَ، يُسَيِّرُ) چلانا، اس سے واحد مونث غائب مجہول کا صیغہ سُيِّرَتْ ہوا، الْجِبَالُ پہاڑ اس کا مفرد جَبَلٌ ہے، غیر ذوی العقول جمع کے لیے عام طور پر واحد مونث غائب کا صیغہ آتا ہے، یہ بات ذہن میں رہے کہ انسان کے علاوہ تمام اشیاء غیر ذوی العقول ہیں، فَكَانَتْ (ف. كَانَتْ) پس ہو جائیں گے، سَرَابًا (چمکتی ہوئی ریت) یہ كَانَتْ کی خبر ہے، اور پہاڑ چلا دیے جائیں گے، پس وہ ہو جائیں گے سراب یعنی پہاڑ بلند و بالا ہونے کے باوجود سراب کی طرح بے حقیقت ہو جائیں گے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

یعنی آسمان جو انتہائی مضبوط اور محکم ہیں دروازے، دروازے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے جیسا کہ دوسرے مقامات اور سورتوں میں ہے، ان کی ایسی ہیئت ہو جائے گی جس سے ہم آشنا نہیں ہیں اور پہاڑ جو میخوں کی طرح زمین میں گڑے اور جمے ہوئے ہیں زمین پر سے ہٹا دیے جائیں گے، وہ چلنے لگیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ریت کی مانند کوٹے ہوئے، پسے ہوئے، ہوا میں اڑتے ہوئے ذرات کے مانند ہو جائیں گے جنہیں ہوائیں اڑائے پھریں گی جیسا کہ دوسرے مقامات اور سورتوں میں ہے...... بہ الفاظ دیگر پہاڑوں کا وجود باقی نہ رہے گا اور وہ سراب کی طرح بے حقیقت ہو جائیں گے، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہاڑوں کے ذرات سورج کی شعاعوں کی طرح چمکیں گے اور انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوگا گویا کوئی سراب ہے۔(فی ظلال القرآن)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ تعالیٰ نے ایک مقررہ وقت تک اس دنیا میں زندگی گزارنے کی مہلت عطا فرمائی ہے، جو موت آنے پر ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک دن ایسا آئے گا کہ اس پوری دنیا کی یہ مہلت ختم ہو جائے گی اللہ کے حکم سے سب کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا، اس کا نام قیامت ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ پھر سب کو زندہ کرے گا اور جتنے انسان قیامت تک اس زمین میں پیدا ہوئے ہوں گے سب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور سب اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے، اس کا نام حشر ہے......اس وقت ہر شخص کو اس کے اعمال کا صلہ ملے گا اس دنیا میں جس نے احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی گزاری ہوگی وہ ابدی راحت پالے گا، اس کا نام جنت ہے اور جس نے خواہشاتِ نفس کی پیروی کی ہوگی وہ دائمی عذاب میں ہوگا، اس کا نام جہنم ہے۔

۲) یہ وسیع وعریض کائنات...... حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا آسمان اور اس پر آفتاب و ماہتاب اور ان گنت ستارے، یہ دور دور تک پھیلی ہوئی زمین اور اس پر بلند و بالا پہاڑ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور ان کی کچھ بھی حیثیت نہ رہے گی، قرآن حکیم انسان کو متنبہ کرتا ہے کہ اس دن سے پہلے وہ اپنے آپ کو اعمال حسنہ سے آراستہ کر لے۔

....

﴿اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا(۲۱) لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا(۲۲) لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا(۲۳) لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا(۲۴) اِلَّا حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا(۲۵) جَزَآءً وِّفَاقًا(۲٦)﴾

بے شک جہنم (سرکشوں کی) تاک میں ہے اوران کا ٹھکانا ہے جس میں وہ مدت ہا مدت پڑے رہیں گے، وہاں نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ پینے کی چیز کا! سوائے کھولتے پانی اور بدبودار پیپ اور لہو کے! یہ (ان کے کرتوتوں) کا پورا پورا بدلہ ہے۔

﴿اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا﴾

بے شک جہنم (سرکشوں کی) تاک میں ہے۔

اِنَّ، بے شک، بلا شبہ جملے کے شروع میں آتا ہے اور بیان میں زور اور تاکید پیدا کرتا ہے، جَهَنَّمَ جہنم، دوزخ، كَانَتْ ہے، كَوْنٌ سے ماضی واحد مونث غائب مِرْصَادًا، گھات میں، اس کا مادہ (رص د) ہے۔ (رَصَدَ، يَرْصُدُ، رَصْدًا) کسی کی تاک میں لگنا، گھات میں بیٹھنا، نگاہ رکھنا، اَلْمَرْصَدُ، رصدگاہ، ستاروں کی گردش دیکھنے کی جگہ، یہ لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے، اَلْمِرْصَادُ، نگرانی کا راستہ یا جگہ، تاک اور گھات لگانے کا راستہ یا جگہ گویا کہ جہنم سرکش اور باغی لوگوں کے لیے منتظر اور گھات میں ہوگی۔ (القاموس الوحید)

﴿لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا﴾

یہ سرکشوں کے لیے لوٹنے/ پلٹنے کی جگہ ہے،

لام حرف جرّ، بمعنی لیے، الطّٰغِیْنَ، سرکش اور باغی لوگ اس کا مفرد، الطَّاغِیُ ہے، مَابًا (لوٹنے کی جگہ) آب، یؤُوْبُ، اِیابٌ اور مَآبٌ، لوٹنا، پلٹنا، یعنی جہنم باغی اور سرکش لوگوں کے لوٹنے کی جگہ ہے۔

﴿لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا﴾

رہیں گے وہ اس میں مدت ہا مدت۔

(لَبِثَ، یَلْبَثُ، لَبْثًا) ٹھہرنا، قیام کرنا، اس سے اسم فاعل لَابِثٌ، اور اس کی جمع لَابِثُوْن، اور حالتِ نصبی میں ہونے کی وجہ سے لّٰبِثِیْنَ ہوا، رہنے والے فِیْهَا (فِی۔هَا) میں، اس یعنی اس جہنم میں اَحْقَابًا لامتناہی زمانہ۔

اَیْ اِنَّهُمْ سَیَمْکُثُوْنَ فِیْهَا دَهُوْرًا مَتَلاحِقَةً یَتْبَعُ بَعْضُهَا بَعضًا، فَکُلَّمَا اِنْقَضٰی زَمَنٌ تَجَدَّدَ لَهُمْ زَمَنٌ آخَرُ کَمَا قَالَ "یُرِیْدُوْنَ أَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِیْنَ مِنْهَا وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (المراغی)

''یعنی وہ وہاں پے درپے ادوار ٹھہرے رہیں گے، جب ان کی سزا کا زمانہ ختم ہوگا تو سزا کا نیا دور شروع ہو جائے گا جیسا کہ رب العزت کا ارشاد ہے ''وہ جہنم سے خلاصی کا ارادہ کریں گے، مگر وہ اس سے چھٹکارا نہ پا سکیں گے اور ان کے لیے وہاں دائمی عذاب ہوگا۔''

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''دوزخ جب سے پیدا ہوئی ہے، اللہ کے باغیوں کی گھات میں ہے شدت سے ان کی منتظر ہے، اللہ کے سرکش اور باغی بندے جب وہاں پہنچیں گے تو دیکھیں گے کہ وہ ان کے استقبال کے لیے بالکل تیار ہے، گویا وہ کہیں سفر پر چلے گئے تھے، لوٹ کر اپنے ٹھکانے پر آ گئے، اب وہ یہیں رہیں گے، طویل ترین مدت، ہر طویل مدت کے بعد دوسری طویل مدت!'' (فی ظلال القرآن)

﴿لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا﴾

وہاں نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ پینے کی چیز کا۔

لَا نہ نافیہ ہے، يَذُوْقُوْنَ وہ چکھیں گے،فعل مضارع جمع مذکر غائب (ذَاقَ، يَذُوْقُ، ذَوْقًا) ذائقہ چکھنا اردو کا لفظ ذائقہ اس سے ماخوذ ہے اسی سے ملتے جلتے الفاظ ذوق اور مذاق استعمال ہوتے ہیں، فِيْهَا (فِیْ.هَا) میں۔اس یعنی جہنم میں، بَرْدًا ٹھنڈک، بَرُوْدَتٌ بمعنی ٹھنڈک اردو میں استعمال ہوتا ہے، حرارت اس کی ضد ہے، وَلَا اور نہ ہی شَرَابًا، پینا (شَرِبَ، يَشْرَبُ، شَرَابًا) پینا، اکل و شرب، کھانا پینا اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

﴿اِلَّا حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا﴾

مگر گرم پانی اور پیپ (لہو)۔

اِلَّا، مگر (سوائے) حَمِيْمًا کھولتا ہوا گرم پانی، گرمجوشی اور محبت میں دوست کو بھی عربی میں حمیم کہتے ہیں، اردو میں اسی مناسبت سے حَمام استعمال ہوتا ہے، وَّ غَسَّاقًا اور پیپ، غَسَّاقٌ کی تشریح اہل لغت نے پیپ اور لہو سے بھی کی ہے اور گندے پانی سے بھی۔(تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی)

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

"(اہل جہنم نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے نہ پینے کی چیز کا) بجز کھولتے پانی کے، جو حلق اور پیٹ کو بھون کر رکھ دے گا اور سوائے "غسّاق" (بدبودار پیپ اور لہو) کے جو جلے ہوئے دوزخیوں کے زخمی جسموں سے ٹپکے اور بہے گا۔(فی ظلال القرآن)

﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾

(یہ) بدلہ ہے پورا پورا۔

جَزَآءً بدلہ (جَزَى، يَجْزِى جَزَاءً) فائدہ پہچانا، بدلہ دینا یہ لفظ اردو میں بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے، وِّفَاقًا، پورا پورا (وَفَقَ، يَفِقُ وَفْقًا) کسی کام کا حسب منشا ہونا، موافق ہونا، موافقت اور موافق، مناسب حال اردو میں استعمال ہوتے ہیں یعنی اہل جہنم کو ان کے اعمالِ بد کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دیا جا رہا ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) احوالِ قیامت کو اس تفصیل اور اس اہمیت کے ساتھ صرف اسلام نے پیش کیا ہے۔ ان احوال کو بتا کر اس دن پیش آنے والے واقعات کی علمی تفصیلات ہمارے سامنے رکھنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس ہولناک انجام کی خبر دے کر ہماری اس زندگی کی روش کو ٹھیک کرنا مقصود ہے، قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر مختلف انداز میں اس کا ذکر کیا ہے۔

....

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا(۲۷) وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا(۲۸) وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا(۲۹) فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا(۳۰)﴾ ع ۱

وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو انہوں نے بالکل جھٹلا دیا تھا، اور (حقیقت یہ ہے کہ) ہم نے ہر (چھوٹی، بڑی، ظاہر اور پوشیدہ) چیز کو لکھ رکھا تھا سو اب چکھو مزہ، ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے۔

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا، وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا﴾

وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو انہوں نے بالکل جھٹلا دیا تھا۔

اِنَّهُمْ (اِنَّ.هُمْ) بلاشبہ۔ وہ، اِنَّ جملے میں زور پیدا کرتا ہے، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، كَانُوْا تھے، فعل ناقص ماضی جمع مذکر غائب، لَا يَرْجُوْنَ نہیں امید رکھتے تھے لَا، نافیہ، يَرْجُوْنَ، رجَآءٌ سے مضارع جمع مذکر غائب (رَجَا، يَرْجُوْ، رَجَاءً) امید رکھنا، توقع رکھنا، حِسَابًا، حساب (کی)، بلاشبہ (سرکش اور باغی) روزِ قیامت حساب کتاب کی امید نہ رکھتے تھے، اس لیے ڈھٹائی اور دلیری سے باغیانہ

روش اختیار کیے ہوئے تھے، وَّ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کِذَّابًا اور ہماری آیات کو انہوں نے بالکل جھٹلا دیا تھا، وَّ کَذَّبُوْا اور انہوں نے جھٹلایا، وَ اور عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے کَذَّبُوْا ماضی جمع مذکر غائب (کَذَّبَ، یُکَذِّبُ، تَکْذِیْبٌ) جھٹلانا، بِاٰیٰتِنَا (بِ.اٰیاتِ.نا) آیات، ہماری، کو، کِذَّابًا، جھٹلانا کَذَّبَ کے بعد کِذّاباً لاکر سرکشوں کی انتہائی نافرمانی کا ذکر ہو رہا ہے جس کا ترجمہ اردو میں ''بالکل جھٹلا دیا'' ہوسکتا ہے۔

﴿وَ کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ کِتٰبًا﴾

اور ہم نے ہر چیز کو لکھ رکھا ہے۔

وَ کُلَّ شَیْءٍ اور ہر بات کو، اَحْصَیْنٰهُ (اَحْصَیْنَا.هُ) ہم نے محفوظ کر رکھا ہے، اُسے (اَحْصٰی، یُحْصِیْ، اِحْصَاء) محفوظ کرنا، شمار کرنا، کِتٰبًا، لکھ کر (کتابت میں) کَتَبَ، یَکْتُبُ، کِتَابًا لکھنا، اسی سے کاتِبٌ اسم فاعل ہے لکھنے والا، الکتاب لکھے ہوئے اوراق کا مجموعہ گویا کہ لکھی ہوئی بات کو کتاب کہا جائے گا۔

ربِّ کریم کا ارشاد ہے کہ ہم نے تمام انسانوں کے اعمال کو کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے تاکہ اس کے مطابق انہیں جزا اور سزا دی جائے اور کسی پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو اور روزِ قیامت ہر شخص اپنے اعمال پر خود شاہد بنے گا۔

﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِیْدَکُمْ اِلَّا عَذَابًا﴾

سو اب چکھو مزہ، ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے۔

فَذُوْقُوْا (فَ.ذُوْقُوْا) پس، چکھو، یہاں پر 'ف' سبب اور وجہ کو ظاہر کر رہا ہے یہ 'ف' سببیہ کہلاتا ہے، ذُوْقُوْا فعل امر جمع مذکر حاضر (ذَاقَ، یَذُوْقُ، ذَوْقًا) چکھنا، ذَاقَ الطَّعَامَ کھانا چکھنا، ذَاقَ الْعَذَابَ، سزا بھگتنا، فَلَنْ (فَ.لَنْ) پس، ہرگز نہ، حرف نفی فعل مضارع کے شروع میں آئے تو اسے نصبُ (زبر) دیتا ہے جیسا کہ نَزِیْدُ کے شروع میں لائیں تو لَنْ نَّزِیْدَ پڑھا جائے گا، فَلَنْ نَّزِیْدَکُمْ اِلَّا

عَذَابًا، پس ہم ہرگز اضافہ نہیں کریں گے مگر عذاب کا، یعنی کفار سے کہا جائے گا کہ اس عذاب کو چکھو اور تمہاری آہ وفغاں پر سوائے عذاب میں اضافہ کے اور کچھ نہیں ملے گا۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) یہ دنیا کی زندگی امتحانی مہلت ہے، رب کائنات نے اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے لیے نیکی اور بدی کی دونوں راہیں روشن کردی ہیں جو نیک راہ اختیار کرلیں ان کے لیے لازماً جزا ہونی چاہیے اور جو بری راہ پر چل پڑیں وہ یقیناً سزا کے مستحق ہیں، ضروری ہے کہ ان دونوں کا نتیجہ نکلے اور آخرت ہی جزا اور سزا کا دن ہے۔

۲) بعض اشرار اور ظالم دنیاوی عدالت سے بچ نکلتے ہیں، ربّ کائنات عادل ہے، ضروری ہے کہ وہ ان مجرمین کے لیے ایسی عدالت لگائے جہاں انہیں ٹھیک ٹھیک سزا دی جائے اور وہ اپنے انجام کو پہنچیں۔

۳) خالق کائنات کا یہ تمام نظام بڑا صاف ستھرا اور عدل وانصاف پر مبنی ہے، اس دنیا میں ہر شخص کے اعمال کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے اور روزِ جزا اُسے بتلا دیا جائے گا، پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے پالے گا۔(سورۃ الزلزال)

....

﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا(۳۱) حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا (۳۲) وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا(۳۳) وَّكَاْسًا دِهَاقًا(۳۴) لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا(۳۵) جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا(۳۶) رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا

﴿الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا(۳۷)﴾

یقیناً اہل تقویٰ فائز المرام ہیں، (ان کے لیے) باغات ہیں اور انگور ہیں، جواں سال ہم عمر عورتیں ہیں اور چھلکتے ہوئے جام، (اس ماحول میں) نہ کوئی لغو بات ہوگی نہ کذب وافترا، یہ آپ کے رب کی طرف سے بدلہ ہے جو اپنے اپنے اعمال کے حساب سے (انہیں) ملے گا، وہ رب ہے، آسمان کی بلندیوں اور زمین کی وسعتوں اور ان کے مابین تمام کائنات ارضی وسماوی کا، بے انتہا رحم کرنے والا ہے، اس کے حضور خطاب کرنے کی کسی میں مجال نہیں ہوگی۔

﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا﴾

یقیناً متقین کے لیے مراد پانا ہے۔

اِنَّ یقیناً، بلاشبہ، زور کلام کے لیے ہے، لِلْمُتَّقِيْنَ (لِ. مُتَّقِيْنَ) لیے، مُتَّقِيْنَ (کے) یعنی پرہیز گاروں کے لیے، مَفَازًا مراد پانا ہے، (فَازَ، يَفُوْزُ، فوزًا) کامیاب ہونا، مراد پانا، اَیْ فَوزًا بِالنَّعِيْمِ وَالثَّوَابِ یعنی نعمتوں اور ثواب کا بدلہ۔ (المراغی)

﴿حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا﴾

باغات ہیں اور انگور ہیں۔

حَدَائِقَ باغات اس کا مفرد حَدِيْقَةٌ ہے، اَعْنَابًا، انگور اس کا مفرد عِنَبٌ ہے، یعنی اہل تقویٰ کی نیکی اور پرہیزگاری کا صلہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سرسبز وشاداب گھنے باغات اور شیریں ورسیلے انگوروں کی بیلیں ہیں۔

﴿وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا﴾

اور جواں سال ہم عمر عورتیں ہیں۔

وَ كَوَاعِبَ نوجواں ہم عمر عورتیں، اس کا مفرد، کَاعِبٌ ہے، اَتْرَابًا، ہم عمر، اس کا مفرد تُرُبٌ یعنی جنت میں روحانی اور جسمانی ہر طرح کی راحت ولذت، اور فرحت ومسرت کا ساز وسامان ہوگا مگر اس

کے ساتھ ساتھ طہارت اور پاکیزگی کو بھی کسی حال فراموش نہ کیا جائے گا، متقین کے لیے رب کریم کا ارشاد ہوتا ہے: وَزَوَّجۡنٰهُمۡ بِحُوۡرٍ عِيۡنٍ (الجاثیہ:۵۴) اور ہم غزال چشم (خوبصورت) عورتوں سے انہیں بیاہ دیں گے۔

﴿وَّ كَاۡسًا دِهَاقًا﴾

اور پیالے ہیں چھلکتے ہوئے۔

وَ اور عاطفہ ہے سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے آتا ہے۔ كَاۡسًا، پیالہ، اِناءٌ مِنۡ بلورٍ للشراب، (المراغی) پینے کے لیے شیشہ کے جام، دِهَاقًا، بھرے ہوئے چھلکتے ہوئے، كَأسًا کی صفت ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"كأسًا دِهاقًا (لبالب جام) یہ سب ایک کامل مکمل مرقعِ عیش کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔" (تفسیر ماجدی)

﴿لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّ لَا كِذّٰبًا﴾

(اس ماحول میں) نہ کوئی لغویات ہوگی نہ کذب وافترا۔

لَا يَسۡمَعُوۡنَ نہ سنیں گے، لَا، نافیہ يَسۡمَعُوۡن وہ سنیں گے مضارع جمع مذکر غائب (سَمِعَ، يَسۡمَعُ، سَمَاعًا) سننا، فِيۡهَا (فِیۡ.هَا) میں۔اُس، یعنی اس جنت میں، هَا کی ضمیر جنت کی طرف جاتی ہے، لَغۡوًا، لَغۡو (بری بات) الباطل مِنَ الۡكلام 'کسی بھی قسم کی فضول اور لچر گفتگو'۔ (المراغی) وَّ لَا كِذّٰبًا اور نہ کوئی جھوٹی بات ہی (كَذَبَ، يَكۡذِبُ، كَذِبًا اور كِذَابًا) جھوٹ بولنا، خلاف واقعہ خبر دینا یعنی جنت ایک ایسی صاف ستھری جگہ ہے جہاں لغویات اور کذب وافترا کا قطعی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

﴿جَزَآءً مِّنۡ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا﴾

یہ آپ کے رب کی طرف سے بدلہ ہے جو اپنے اپنے اعمال کے حساب سے (انہیں) ملے گا۔

جَزَآءً جزا، (بدلہ) ہے، مِّنْ رَّبِّکَ تمہارے رب کی طرف سے، عَطَآءً، بخشش کا وَحِسَابًا (حساب سے) یعنی ان کے رب کی طرف سے انہیں یہ صلہ ملے گا اور یہ عطیہ ان کے اعمال کے حساب سے کافی اور وافر ہوگا۔

﴿رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا﴾

وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمینوں کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، وہ مہربان ہے، اس کے حضور خطاب کرنے کی کسی میں مجال نہ ہوگی۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ آسمانوں کا رب، ربّ، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام، اس کی ربوبیت کی کرشمہ سازیاں ہر سُو پھیلی ہوئی ہیں، السَّمٰوٰت، آسمان اس کا مفرد سَماءٌ ہے، ربّ، مضاف اور السّمٰوٰت، مضاف الیہ ہے، وَ اور عاطفہ ہے، یعنی سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے، الْاَرْضِ کا عطف السّمٰوٰت پر ہے، وَمَا بَيْنَهُمَا اور جو اِن دونوں کے درمیان ہے، (بَيْنَ. هُمَا) درمیان، ان دونوں کے یعنی جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان ہے (اس کا مالک) بھی الرّحمٰن ہے، جس کی رحمتوں اور بخششوں کا بھلا کون اندازہ لگا سکتا ہے! لَا يَمْلِكُوْنَ وہ اختیار نہیں پائیں گے، وہ طاقت نہیں رکھیں گے، فعل مضارع صیغہ جمع مذکر غائب، مِنْهُ (مِن. هُ) اس سے یعنی رب العالمین سے، خِطَابًا خطاب کا (خَطَبَ، يَخْطُبُ، خِطَابًا) خطاب کرنا، یعنی اس احکم الحاکمین کے حضور لب کشائی کا کس کو یارا ہے؟ ہاں مگر جس کو وہ خود اجازت دے، ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ ذَاالَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ:۲۵۵) ''کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔''

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''کسی مقرب سے مقرب مخلوق کی بھی یہ مجال نہیں کہ بلا اِذن خود بخود اس ذاتِ پاک کے حضور میں کلام بھی کر سکے، رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ......آسمان و زمین جنہیں جاہل قومیں دیوی، دیوتا سمجھ رہی ہیں، حق تعالیٰ ان سب کا مالک و پروردگار ہے، وَمَا بَيْنَهُمَا...... جاہل قوموں نے زمین و آسمان کے

درمیان فضا کو بھی اپنے معبودوں سے بھر رکھا تھا، قرآن مجید نے اس حقیقت کا ذکر کر کے اس عقیدہ پر بھی ضرب لگادی۔'' (تفسیر ماجدی، ج:۲)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) متقی جس کی جمع متقین ہے قرآن کی ایک خاص اصطلاح ہے، جو شخص ظاہر اور باطن اور صرف اللہ کی رضامندی کا طالب رہتا ہے، اسے متقی کہتے ہیں، یہی وہ خوبی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں دیکھنا چاہتا ہے اور ان ہی کیلئے قرآن حکیم میں جابجا خوشخبریاں ہیں، ابدی انعامات اور دائمی فوز و فلاح ہے۔

۲) حسرت وشادمانی کی کیفیات انسان کی فطرت ہے...... رہنےسہنے کے لیے اچھا مکان، پہننے کے لیے اچھی پوشاک، کھانے پینے کے لیے لذیذ اور عمدہ کھانے، سیر وسفر کے لیے عمدہ سواری وغیرہ، دنیا میں ان چیزوں کو مہیا کرنے کے لیے اکثر لوگ ہر جائز و ناجائز ذرائع اختیار کرتے ہیں، حلال و حرام کی تمیز جاتی رہتی ہے۔ دنیا کے یہ فائدے اور یہ لذتیں جن کی خاطر وہ انسانیت کی حدوں کو پھلانگ جاتے ہیں، کس درجہ ناپائیدار ہیں اور ان کی چمک دمک کیسی عارضی اور غیر یقینی ہے، یہ سب چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے۔

۳) قرآن حکیم انسان کو دائمی زندگی کی عیش وعشرت اور ابدی راحت وآرام کی نوید دیتا ہے۔ اس عارضی زندگی کو اگر احکام الٰہی کا پابند بنالیا جائے تو اس پابندی میں بھی طمانیت اور سرور حاصل ہوتا ہے اور اسی کے نتیجے میں اسے ابدی زندگی کا مژدہ جانفزا سنایا جاتا ہے۔

۴) جنت میں وہ ساری نعمتیں جن کی انسان کو آرزو اور تمنا رہتی ہے مہیا کر دی جائیں گی بلکہ دنیا کی نعمتوں سے کہیں ارفع واعلیٰ کہ انسان کے سان گمان میں بھی نہیں آسکتی ہیں اور ان نعمتوں کے ساتھ ساتھ پاکیزگی اور نظافت بھی جو شرف انسانیت کے لیے لازمی اور ضروری ہے...... فحاشی اور بیہودگی کا نام ونشان نہیں ہوگا...... پھر سب سے بڑی بات یہ کہ دنیا میں جو عیش وآرام تکلیف اور مشقت کے بعد حاصل کیا جاتا ہے اور جس میں جائز اور ناجائز کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ

دیا جاتا ہے، جنت میں بلا معاوضہ اور بلا قیمت، ابدی اور دائمی طور پر مل جائے گا اور یہ صلہ ہوگا احکام الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کا۔ وہ انسان بڑے ہی بدقسمت ہیں جو عارضی زندگی اور عارضی فوائد پر فریفتہ ہو کر دائمی زندگی اور دائمی فوائد کو خیر باد کہہ ڈالیں۔

....

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا، لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (۳۸) ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ، فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (۳۹) اِنَّا اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا، يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (۴۰)﴾ ع۲

جس روز اس کی بارگاہِ عظمت میں روح الامین (جبرائیلؑ) اور تمام فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے، کسی میں بھی بات کر سکنے کی جرأت نہیں ہوگی بجز اس کے جسے اللہ الرحمٰن کی طرف سے اجازت ہوگی اور وہ ٹھیک ٹھیک بات کہے گا، (روزِ قیامت) روزِ برحق ہے، تو جو چاہے (اس دن کی فکر کر کے) اپنے رب کے پاس (اس کے جوارِ رحمت میں) ٹھکانہ بنا لے، ہم نے تمھیں اس عذاب سے خبردار کر دیا ہے جو قریب آ لگا ہے، جس روز آدمی دیکھ لے گا کہ اس کے ہاتھوں نے توشۂ عاقبت کے طور پر کیا بھیجا ہے اور کافر (حسرت وافسوس) سے کہے گا، ''اے کاش! میں مٹی ہوتا!''

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾

جس روز (اس کی بارگاہ عظمت میں) روح الامین (جبرائیلؑ) اور تمام فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔

یَوْمَ (جس) دن ظرفِ زمان، یَقُوْمُ کھڑے ہوں گے (قَامَ، یَقُوْمُ، قِیَامًا) کھڑے ہونا، قیام و سجود، اردو میں استعمال ہوتا ہے، الرُّوْحُ روح الامین (جبرائیلؑ)، وَالْمَلٰٓئِکَةُ اور فرشتے اس کا مفرد مَلَکٌ ہے، صَفًّا، صف (باندھ کر)۔

﴿لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾

نہیں وہ گفتگو کر سکیں گے بجز اس کے جسے اللہ الرحمٰن کی طرف سے اجازت ہوگی اور وہ ٹھیک بات کہے گا۔

لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ وہ نہ کلام کریں گے (تَکَلَّم، یَتَکَلَّمُ، تَکَلُّمًا) کلام کرنا، گفتگو کرنا، اِلَّا مگر، مَنْ جسے، اسم موصول، اَذِنَ اجازت دی فعل ماضی واحد مذکر غائب (اَذِنَ، یَأْذَنُ، اِذْنٌ) اجازت دینا، لَهُ (لَ. هُ) لیے، اس کے، یعنی جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بولنے کا حکم ہوگا، وہی اس کے حضور کلام کر سکے گا، وَقَالَ اور وہ کہے گا ماضی واحد مذکر غائب، (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، صَوَابًا ٹھیک بات، الصَّوَابُ، درستی صحت وحقانیت۔ (القاموس الوحید)

حافظ صلاح الدین یوسفؒ لکھتے ہیں:

''یہ اجازت اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کو اور اپنے پیغمبروں کو عطا فرمائے گا اور وہ جو بات کریں گے حق و صواب ہی ہوگی یا یہ مفہوم ہے کہ اجازت صرف اسی کے بارے میں دی جائے گی جس نے درست بات کہی ہو یعنی کلمۂ توحید کا اقراری رہا ہے۔'' (تفسیر احسن البیان)

﴿ذٰلِکَ الْیَوْمُ الْحَقُّ، فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا﴾

(روز قیامت) وہ روزِ برحق ہے تو جو چاہے (اُس دن کی فکر کر کے) اپنے رب کے پاس ٹھکانہ بنالے۔

ذٰلِکَ وہ، اسم اشارہ، الْیَوْمُ دن (روزِ قیامت) الْحَقُّ، حق ہے، شک و شبہ سے بالا ہے، لاریب آنے والا ہے، فَمَنْ (فَ. مَنْ) پس، جو، شَآءَ، چاہے (شَاءَ، یَشَاءُ، مَشِیْئَةٌ) چاہنا، خواہش رکھنا، اِتَّخَذَ پکڑے (بنائے) اِلٰی رَبِّهٖ طرف اپنے رب کے یعنی اپنے رب کے یہاں، مَاٰبًا، ٹھکانہ (جگہ لوٹنے کی) (آبَ، یَؤُوْبُ، مَاٰبًا) لوٹنا، پلٹنا، یعنی دنیا میں احکام الٰہی کی پیروی کر کے اپنے رب

کے یہاں ٹھکانہ بنالے۔

﴿اِنَّا اَنۡذَرۡنٰکُمۡ عَذَابًا قَرِیۡبًا﴾

بلاشبہ ہم نے تمہیں اُس عذاب سے ڈرایا (خبردار) کردیا جو قریب آلگا ہے۔

اِنَّا، (اِنۡ. نَا) بلاشبہ۔ ہم نے (مراد ربّ کریم ہے) ناضمیر جمع متکلم بطور عزت وتکریم اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوئی ہے، عربی زبان میں جمع کا صیغہ واحد کے لیے عزت و عظمت کا اظہار ہوتا ہے، اَنۡذَرۡنٰکُمۡ (اَنۡذَرۡنَا. کُمۡ) ہم نے ڈرایا۔ تمھیں (اَنۡذَرَ، یُنۡذِرُ، اِنۡذَارٌ) ڈرانا، آگاہ کرنا، انجام سے باخبر کرنا، نوٹس دینا، عَذَابًا قَرِیۡبًا عذاب، قریب (سے) عَذَابًا کی صفت قَرِیۡبًا ہے، یعنی عذابِ قیامت کو دور خیال کرنا حماقت اور نادانی ہے...... یہ زندگی عارضی اور چندروزہ ہے، اور جو اس دنیا سے رخصت ہوا، قیامت اس کے سامنے ہے، روزِ جزاوسزا شروع ہونے سے پہلے ہی کامیابی اور ناکامی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ مومنین وصالحین کے لیے قبر راحت وآرام کی جگہ بن جاتی ہے جبکہ کفار و مجرمین کے لیے پریشانی اور مصیبت کا پیغام ہوتی ہے۔

﴿یَّوۡمَ یَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰهُ وَیَقُوۡلُ الۡكٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ كُنۡتُ تُرٰبًا﴾

وہ دن جبکہ آدمی اپنے ہاتھوں سے کیے اعمال کو...... جو اس نے اپنے آگے بھیجے تھے، دیکھ لے گا اور کافر کہے گا ''اے کاش! میں مٹی ہوتا!''

یَّوۡمَ (جس) دن ظرفِ زمان، یَنۡظُرُ دیکھے گا، مضارع واحد مذکر غائب (نَظَرَ، یَنۡظُرُ، نَظۡرًا) دیکھنا، الۡمَرۡءُ (ہر) شخص، مَا قَدَّمَتۡ جو کچھ آگے بھیجا (قَدَّمَ، یُقَدِّمُ، تَقۡدِیۡمٌ) آگے کرنا، آگے بھیجنا، اردو زبان میں قدم، خیر مقدم کرنا، تقدیم، وغیرہ الفاظ تقریباً انہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، یَدٰهُ (یَدَا. ہ) دونوں ہاتھ اس کے، یعنی اس کے دونوں ہاتھوں نے جو اچھے یا برے اعمال آگے بھیجے وہ اسے پالے گا، وَیَقُوۡلُ اور کہے گا، الۡكٰفِرُ، کافر، منکر، باغی اور سرکش انسان یٰلَیۡتَنِیۡ (یَا. لَیۡتَنِیۡ) اے، کاش میں ہوتا، لَیۡتَ حرف تمنا ہے، لَیۡتَ کے ساتھ ''ی'' اور ''ن'' کے اضافہ سے، واحد متکلم کا صیغہ ہوا، کُنۡتُ مَیں ہوتا تُرَابًا مٹی، اور کافر کہے گا اے کاش میں مٹی ہوتا، مجھے نہ تو حساب دینا پڑتا اور نہ عذاب ہی کا

سامنا کرنا پڑتا!

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اس دن ہر شخص کے اعمال اس کے سامنے آئیں گے اور جنہوں نے اس دن کے لیے کوئی تیاری نہ کی ہوگی وہ اپنی محرومی اور بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ کاش ہم مٹی ہی رہے ہوتے۔'' (تدبر قرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) یہ عقیدہ کہ فلاں بزرگ اور ولی، نبی اور فرشتے، جس کی چاہیں روز قیامت سفارش کر سکتے ہیں اور جسے چاہیں بخشوا سکتے ہیں سراسر غلط ہے، قرآن حکیم نے اس عقیدہ پر کاری ضرب لگائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ روح الامین اور فرشتے، پیغمبر اور ولی رب عظیم وکریم کے حضور دست بستہ کھڑے ہوں گے اور کسی کو بغیر اس کی اجازت کے لب کشائی کی بھی اجازت نہ ہوگی، سفارش انہی لوگوں کے لیے ہوگی جن کے لیے اللہ تعالیٰ چاہے گا اور وہی لوگ کر سکیں گے جنہیں اس کی طرف سے سفارش کرنے کی اجازت ملے گی، قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ توحید پر ثابت قدم رہتے ہیں اور اعمال میں کسی قدر کوتاہی کا شکار ہو جاتے ہیں ان کی سفارش تو ہو سکتی ہے مگر جو صریحاً کفر وشرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور بدعملی کا شکار رہتے ہیں ان کے لیے سفارش تو کجا معافی بھی نہیں ہو سکتی ہے، کیا صالحین اور مجرمین برابر ہو سکتے ہیں؟

۲) یہ دنیا دار العمل ہے، جبکہ آخرت دار الجزا ہے اور ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، دنیا میں اسے عمل کی مہلت اور اختیار کی آزادی اسی لیے دی گئی ہے کہ اس عارضی زندگی کو اعمال حسنہ سے آراستہ کر کے وہ دائمی انعام کا مستحق بن جائے، یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی احسان ہے کہ اس نے کل پیش آنے والے خطرات سے اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے اچھے اعمال کے صلہ میں جنت کی بشارت دے دی ہے اور برے اعمال کے نتیجہ میں جہنم سے ڈرا دیا ہے۔

..................o..................

سُورَةُ النّٰزِعٰت

سورۃ مبارک کا پہلا لفظ ہی علامتی نام ہے، مکی زندگی کا دورِ اوّل ہی اس کا زمانہ نزول ہے، اس میں قیامت اور حشر کے ثبوت پر دلائل ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کے لیے ابدی خوشخبری ہے اور انکار کرنے والوں کے انجامِ بد کا تذکرہ ہے۔

رب کائنات کی ان گنت مخلوقات میں سے فرشتے بھی اس کے بندے ہیں جو شب و روز اس کی اطاعت و عبادت میں مصروف ہیں، یہاں پر ان فرشتوں کا ذکر ہے جو انسانوں کی جان نکالنے پر مامور ہیں یہاں پر ان فرشتوں کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے (اور قسم بمعنی شہادت کے ہے) کہ قیامت آکر رہے گی۔ جب اللہ کا حکم ہوگا تو ایک ہی جھٹکے سے، یہ چہل پہل سے بھرپور دنیا زیر و زبر کر دی جائے گی، پھر اس کا دوبارہ حکم ہوگا تو اول سے آخر تک تمام جن و انسان کو حساب کتاب کے لیے اکٹھا کیا جائے گا۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ظالم فرعون کا تذکرہ بھی اس سورت میں آیا کہ اس سرکش نے کس طرح حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو ٹھکرایا اور بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھائے، حضرت موسیٰؑ نے اسے انتہائی نرم و ملائم لب و لہجہ میں دعوت حق پیش کی مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا، پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب اس پر اس دنیا میں بھی آیا اور آخرت کا عذاب الگ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں انسانوں کو مخاطب کر کے پوچھا ہے کہ اے انسانو! ذرا غور کرو، تمہارا بنانا مشکل ہے یا یہ وسیع و عریض آسمان جو بغیر ستونوں کے اس نے تمہارے سروں پر معلق کر دیا ہے یاد رکھو جو ایمان لایا اور نیکی کی راہ پر چل پڑا، دنیا اور آخرت میں اس کا انجام اچھا ہے اور جو خواہشات نفس کا پجاری بنا اور ان کے پیچھے چل پڑا اس کا انجام برا ہوگا۔

آیات:۴۶ سُورَةُ النّٰزِعٰت رکوعات:۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا(۱) وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا(۲) وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا(۳) فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا(۴) فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا(۵) يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ(۶) تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ(۷)﴾

قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو (کفار کی) جان سختی سے نکالتے ہیں، اور قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو (مومنوں کی جان کی گرہ) بڑی آسانی سے کھولتے ہیں اور قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو (فضائے بسیط میں احکام لیے) تیرتے پھرتے ہیں پھر ان کی (بھی) جو (احکام الٰہی کے سننے کے لیے) آگے بڑھتے ہیں، پھر اُن کی جو (حکم الٰہی کے مطابق) ہر کام کا انتظام کرتے ہیں (کہ یہ کارخانۂ عالم بے مقصد نہیں ہے اور اس کا یوم حساب مقرر ہے) وہ ایسا روز ہے جب ہلا مارے گا زلزلے کا جھٹکا (نفخۂ اولیٰ) پھر اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا پڑے گا (نفخۂ ثانیہ)

﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا﴾

قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو (کفار کی) جان سختی سے نکالتے ہیں۔

وَ اس کے معنی کبھی 'اور' کے ہوتے ہیں اور کبھی قسم کے جیسا کہ واللہِ "اللہ کی قسم" یہ واؤ قسمیہ کہلاتی ہے۔ النّٰزِعٰتِ زور سے کھینچنے والے (فرشتوں کی جماعت)، نَزْعٌ بمعنی کھینچنا کسی چیز کو اس کی جگہ سے اُکھیڑنا، نَزَعَ القوسَ، کمان کو کھینچنا، نَزَعَ الشیءَ مِن مَکَانِہٖ، کسی چیز کو اس کی جگہ سے کھینچ کر نکالنا (القاموس الوحید) اس سے اسم فاعل، النّازِعُ، کھینچ کر نکالنے والا، النّٰازِعات اسم فاعل جمع مؤنث،

فرشتوں کی جماعت کے لیے، جمع مؤنث غائب کا صیغہ استعمال ہوا ہے، غَرْقًا ڈوب کر، غرق ہونا، اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مراد ہے سختی کرنا۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ جان نکالنے والے فرشتوں کی صفت ہے، فرشتے کافروں کی جان، نہایت سختی سے نکالتے ہیں اور جسم کے اندر ڈوب کر (گویا وہ سخت کرب و ابتلا میں مبتلا ہو جاتے ہیں)۔'' (احسن البیان)

﴿وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا﴾

اور قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو (مومنوں کی جان کی گرہ) بڑی آسانی سے کھولتے ہیں۔

وَ قسمیہ ہے۔ النَّشَاطُ سے اسم فاعل جمع مؤنث النّٰشِطٰتِ فرشتوں کی جماعت کے لیے استعمال ہوا ہے، النّشاط کے معنی بشاشت، مستعدی، پھرتی، خوشگواری، یہ لفظ اردو میں انھیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی مومنوں کی جان فرشتے بسہولت نکالتے ہیں، اور وہ ہنسی خوشی اپنے رب کے پاس پہنچ جاتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً، فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ، وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (الفجر: ۲۷-۳۰) ''اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اُس سے راضی وہ تجھ سے خوش، پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

﴿وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا﴾

اور قسم ہے (اُن فرشتوں کی) جو (احکام لیے فضائے بسیط میں) تیرتے پھرتے ہیں۔

وَ قسمیہ ہے، السّٰبِحٰتِ فرشتوں کی جماعت جو فضائے بسیط میں تیرتی ہے (سَبَحَ، یَسْبَحُ، سَبْحًا) تیرنا (ہوا یا پانی میں)۔

مولانا مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

سَبْحٌ کے لغوی معنی تیرنے کے آتے ہیں، مراد اس جگہ تیزی سے چلنا ہے جیسے دریا میں کوئی آڑ پہاڑ

نہیں ہوتا، تیرنے والا یا کشتی وغیرہ میں چلنے والا سیدھا اپنی منزلِ مقصود کی طرف جاتا ہے۔فرشتوں کی یہ صفت کہ تیز جانے والے ہیں، یہ بھی ملائکہ موت سے متعلق ہے کہ انسان کی روح قبض کرنے کے بعد اسے تیزی سے آسمان کی طرف لے جاتے ہیں۔'' (معارف القرآن)

﴿فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا﴾

پھر اُن کی (بھی) جو (احکام الٰہی کے سننے کے لیے) آگے بڑھتے ہیں۔

(ف. السّٰبِقٰتِ) پس۔آگے بڑھنے والی فرشتوں کی جماعت، سَبَقَ سے اسم فاعل جمع مؤنث، عربی زبان میں جماعت کے لیے جمع مؤنث غائب کا صیغہ استعمال ہوتا ہے (سَبَقَ، یَسۡبِقُ، سَبۡقًا) کسی شے کی طرف کسی سے آگے بڑھنا۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ فرشتے اللہ کی وحی انبیاء تک دوڑ کر پہنچاتے ہیں تاکہ شیطان کو اس کی کوئی سن گن نہ ملے یا مومنوں کی روحیں جنت کی طرف لے جانے میں نہایت سرعت سے کام لیتے ہیں۔'' (احسن البیان)

﴿فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا﴾

پھر اُن کی جو (حکم الٰہی کے مطابق) ہر کام کا انتظام کرتے ہیں۔

(ف. الۡمُدَبِّرٰتِ) پس۔ جو تدبیر کرتے ہیں، ف عاطفہ، گزشتہ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، الۡمُدَبِّرات، تدۡبیرٌ سے اسم فاعل جمع مونث غائب، یہ صیغہ فرشتوں کی جماعت کے لیے استعمال ہوا ہے۔اَمۡرًا، کام، معاملہ۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ جو کام اُن کے سپرد کرتا ہے، وہ اُس کی تدبیر کرتے ہیں، اصل مُدَبِّر تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت فرشتوں کے ذریعے سے کام کرواتا ہے تو انھیں بھی مُدبّر کہہ دیا جاتا ہے، اس اعتبار سے پانچوں صفات فرشتوں کی ہیں اور ان فرشتوں کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے،، جوابِ قسم محذوف (چھپا ہوا) ہے یعنی: لَتُبۡعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلۡتُمۡ (التغابن: ۷) ''تم ضرور

بضر وراٹھائے جاؤ گے پھر تمھیں آگاہ کیا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے۔'' قرآن حکیم نے اس بعث وجزا کے لیے کئی جگہ قسم کھائی ہے۔(احسن البیان)

﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾

وہ ایسا روز ہے جب ہلا مارے گا (سب کو) زلزلے کا جھٹکا۔

يَوْمَ جس دن، ظرفِ زمان، تَرْجُفُ کانپے گی (زمین) (رَجَفَ، يَرْجُفُ، رَجْفًا) حرکت کرنا، زورزور سے ہلنا، الرَّاجِفَةُ، جھٹکا، لرزہ، رعشہ، زلزلہ، اسم فاعل صیغہ واحد مونث (اشارہ ہے کہ زمین اور اس کی ہر چیز زلزلے کا شکار ہو جائے گی)

امام شوکانی لکھتے ہیں:

وَهِيَ النَّفْخَةُ الْأُولَى الَّتِي يَمُوتُ بِهَا جَمِيعُ الْخَلَائِقِ (فتح القدیر)

یعنی پہلی بار زبردست آواز، کہ جس سے تمام مخلوق (حکم الٰہی) سے ختم ہو جائے گی۔

﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ﴾ اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا پڑے گا۔

تَتْبَعُهَا (تتبع. ھا) پیچھے آئے گی، اس کے، تَتْبَعُ صیغہ واحد مؤنث غائب، پیچھے آنا اور ھا کی ضمیر واحد مونث آواز کی طرف جاتی ہے، (تَبِعَ، يَتْبَعُ، تَبْعًا) پیچھے چلنا، اتباع کرنا، یہ اردو میں بھی معروف ہے، الرَّادِفَةُ پیچھے آنے والی (رَدَفَ، يَرْدُفُ، رَدْفًا) (سواری میں) کسی کے پیچھے سوار ہونا، پیچھے پیچھے چلنا، الرّادِفة، رَدْفٌ سے اسم فاعل واحد مؤنث یعنی النَّفْخَةُ الثَّانِيَه (دوسری آواز) اُس کے پیچھے آئے گی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمام مخلوق دوبارہ زندہ ہو جائے گی۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) قرآن حکیم جن حقیقتوں کو انسان کے سامنے رکھتا ہے، ان میں قیامت کا واقعہ نہایت اہم ہے، مختلف انداز سے آخرت کے مناظر بیان کر کے انسان کو جگایا اور متنبہ کیا گیا ہے، تا کہ اس کے دل میں اللہ

تعالیٰ کا خوف پیدا ہو جائے اور وہ اس کے احکام کا پابند ہو کر اپنی ابدی اور سرمدی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے کوشاں ہو جائے۔

۲) اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے فرشتے بھی ہیں جو ہمہ وقت اس کی بندگی بجالانے اور حمد و ثنا بیان کرنے میں مصروف ہیں اور رب کائنات کے ہر حکم کو مِنْ وعَنْ بجالاتے ہیں۔ بعض ان میں سے انسانوں کے اچھے برے اعمال لکھتے ہیں، بعض رزق کی تقسیم پر مامور ہیں، بعض مجاہدین کا ساتھ دیتے ہیں اور بعض کے ذمہ انسانوں کی جانیں نکالنے کا کام ہے جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے پتہ چلتا ہے، یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں اور کسی معاملے میں ادنی سی بھی سرتابی نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ عظیم و قدیر کی وسیع و عریض مملکت کی شان و شوکت ہے۔

۳) جانیں نکالتے وقت ان فرشتوں کا رویہ مختلف ہوتا ہے...... کفار و مشرکین اور ظالموں اور باغیوں کے ساتھ سختی اور ذلت کا جبکہ مسلمانوں اور مومنوں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا رویہ ہوتا ہے اور انصاف کی رو سے ایسا ہونا بھی چاہیے، ایک شخص نے زندگی میں باغیانہ روش اختیار کی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو فراموش کیے رکھا جبکہ دوسرے نے اطاعت و فرمانبرداری کا راستہ اختیار کیا، اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لایا اور اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا۔ کیا دونوں کے نتائج برابر نکلنے چاہییں؟

۴) قسم بمعنی شہادت کے ہے یعنی اپنی بات کی صداقت کو منوانے کے لیے کسی کو گواہ بنایا جاتا ہے اور گواہ اُسے بنایا جاتا ہے جو ہمارے حالات سے باخبر ہے، ہمیں حکم ہوتا ہے کہ صرف اس ذات کی قسم کھاؤ جو ہمہ دان اور ہمہ بین ہے...... وہ اللہ تعالیٰ ہے جو ہمارے ماضی، حال اور مستقبل سے نہ صرف آگاہ ہے بلکہ ہمارے دل کی چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے اور اللہ عظیم و برتر نے کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور ہر ذرہ اور ہر پتہ ہر جاندار اور ہر بے جان، اس کی عظمت و شان کی گواہی دے رہے ہیں، وہ اپنی مخلوق میں سے کسی چیز کو بھی اپنی توحید کے لیے گواہ بنا سکتا ہے، قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزوں کی قسم کھائی ہے...... مثلاً لکھنے والا قلم، دمکتا ستارہ، دوڑنے والے گھوڑے، صف باندھے فرشتے، غبار اڑانے والی ہوائیں، سمندر، چاند، سورج، ستارے، رات، دن وغیرہ گویا یہ اشیاء اللہ تعالیٰ کی عظمت و برتری پر گواہ ہیں۔

﴿قُلُوبٌ يَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ(۸) اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ(۹)
يَقُولُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِی الۡحَافِرَةِ(۱۰) ءَاِذَا كُنَّا
عِظَامًا نَّخِرَةً(۱۱) قَالُوۡا تِلۡكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ(۱۲)
فَاِنَّمَا هِیَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ(۹) فَاِذَا هُمۡ بِالسَّاهِرَةِ(۱۴)﴾

کتنے دل اس روز (خوف سے) دھڑکتے ہوں گے، نگاہیں اُن کی سہمی ہوئی ہوں گی، کہتے ہیں، کیا واقعی ہم پہلی حالت کی طرف لوٹائے جائیں گے؟ کیا اس وقت جبکہ ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو چکے ہوں گے؟ کہنے لگے! تب تو یہ واپسی بڑے گھاٹے کی ہوگی۔ (انہیں معلوم ہونا چاہئے) وہ تو صرف ایک خوفناک آواز ہے کہ (جس کے پیدا ہوتے ہی) وہ (اللہ کے حکم سے) یکا یک کھلے میدان میں آموجود ہوں گے۔

﴿قُلُوبٌ يَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ﴾

کتنے دل، اس دن، دھڑکنے والے (خوفزدہ) ہوں گے۔

قُلُوبٌ دل، اس کا مفرد قَلۡبٌ ہے، يَّوۡمَئِذٍ اس دن، يَوۡم دن، ظرف زمان، مضاف، اِذٍ حرفِ جزا مضاف الیہ، اصل میں اِذۡ ہے وقف کی صورت میں نون کو تنوین سے بدل دیتے ہیں، وَّاجِفَةٌ دھڑکنے والے، اسم فاعل (وَجَفَ، يَجِفُ) کانپنا، دھڑکنا، خوف اور ڈر سے کانپنا، وَجَفَ الۡقَلۡبُ وَجِيۡفًا اِذَا خَفَقَ وَاضۡطَرَبَ مِنۡ شِدَّةِ الۡفَزَعِ (صفوۃ التفاسیر محمد علی الصابونی) شدید خوف اور ڈر سے دل کا مضطرب ہوکر کانپنا، یعنی قیامت کی ہولناکی سے کفار اور منکرین کے دل کانپ رہے ہوں گے۔

﴿اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ﴾ نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی۔

(اَبۡصَارُ.هَا) نگاہیں۔ان کی، یعنی جن کے دل شدتِ خوف سے کانپ رہے ہوں گے، اُن کی آنکھیں ذلت اور رسوائی سے جھکی ہوئی ہوں گی۔خُشُوۡعٌ سے اسم فاعل خاشِعَةٌ، جھکی ہوئی (ذلت اور رسوائی سے) ایک خشوع وخضوع نماز میں ہوتا ہے جو بندۂ مومن سراپا عجز و نیاز کی تصویر بن کر اپنے رب کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔

﴿يَقُوۡلُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِي الۡحَافِرَةِ﴾

کہتے ہیں، کیا ہم پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟

يَقُوۡلُوۡنَ وہ کہتے ہیں فعل مضارع جمع مذکر غائب (قَالَ، يَقُوۡلُ، قَوۡلًا) کہنا، بولنا، قول وقرار اردو میں استعمال ہوتا ہے، أ استفہام کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہاں پر استفہام انکاری ہے، ءَاِنَّا (ءَ اِنَّ.نَا) ہم اِنّ، حرف مشبہ بالفعل جملے میں زور پیدا کرتا ہے، نا ضمیر جمع متکلم اِنَّ اور نا دونوں جمع ہونے سے قاعدۂ ادغام کی وجہ سے اِنَّا، ہوگیا، لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ لوٹائے جائیں گے (رَدَّ، يَرُدُّ، رَدًّا) روکنا، واپس کرنا، اس سے اسم فاعل مَرۡدُوۡدٌ، واپس لوٹایا جانے والا اور اس کی جمع مَرۡدُوۡدُوۡنَ لوٹنے والے ہے۔ اس کے شروع میں لام تاکید کے لیے آیا ہے، فِي الۡحَافِرَةِ بیچ پہلی حالت کے، فِيۡ حرف جر، (بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے)، الۡحَافِرَة، حَفۡرٌ سے ہے، اس کے معنی کھودنا کے ہیں، کوئی شخص ایک مقام سے جا کر پھر انہیں قدموں پر یعنی جلد اُسی رستے اس مقام پر واپس آجائے تو عرب کہتے ہیں وہ اپنے حافرة (کھودی ہوئی جگہ) پر واپس آگیا۔(انوار القرآن، مولوی عبدالرحمٰن)

علامہ القرطبی لکھتے ہیں:

''جب منکرین کو بتایا جاتا ہے کہ تمہیں روز قیامت اٹھایا جائے گا تو وہ تعجب سے کہتے ہیں کہ ہمیں ہماری موت کے بعد پہلی حالت میں لایا جائے گا؟'' (تفسیر القرطبی)

﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾

کیا اس وقت جبکہ ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو چکے ہوں گے؟

أ، ہمزہ استفہام تعجب اور انکار کے لیے آیا ہے اِذَا جب، کُنَّا ہم ہو جائیں گے، فعل ناقص ماضی جمع متکلم، اس کا اسم عِظامًا ہے اور اس کی خبر، نَخِرَۃٌ ہے، عِظَامًا ہڈیاں اس کا مفرد عَظْمٌ (ہڈی) ہے، نَخِرَۃٌ ایسی بوسیدہ ہڈی جسے ذرا سا چھوئیں تو الگ الگ ہو جائے۔(انوار القرآن)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''(منکرین) کا یہ انکار قیامت کی مزید تاکید ہے کہ ہم کس طرح زندہ کر دیے جائیں گے جبکہ ہماری ہڈیاں بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔''(احسن البیان)

﴿قَالُوْا تِلْکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ﴾

کہنے لگے، تب تو یہ واپسی بڑے گھاٹے (نقصان) کی ہوگی۔

قَالُوْا، کہا انہوں نے، فعل ماضی جمع مذکر غائب (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، تِلْکَ اسم اشارہ بعید، وہ۔ کبھی اسم اشارہ بعید کا ترجمہ 'یہ' کر کے اُس بات کی اہمیت کو زیادہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اِذًا اُس وقت حرفِ جزا، کَرَّۃٌ لوٹ کر آنا، گردش (مصدر)، خَاسِرَۃٌ نقصان دہ، خسارے کا، (خَسِرَ، یَخْسَرُ خُسرٰنٌ) نقصان اٹھانا، خسارہ اٹھانا، اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ صفت، موصوف ہیں، کَرَّۃٌ کی صفت خَاسِرَۃٌ ہے اور صفت اور موصوف کی اعرابی حالت یکساں ہوتی ہے۔ (منکرین حق کا کہنا ہے) اگر دوبارہ اٹھنا سچا ہوا اور ہم موت کے بعد دوبارہ اٹھا دیے گئے تو ہم بہت نقصان میں ہوں گے کیونکہ آگ ہمارا ٹھکانہ ہوگا (صَفوۃُ التّفاسیر، محمد علی الصابونی)

﴿فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ، فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَۃِ﴾

وہ تو صرف ایک خوفناک آواز ہے کہ (جس کے پیدا ہوتے ہی) وہ (اللہ کے حکم سے) یکا یک کھلے میدان میں آموجود ہوں گے۔

فَاِنَّمَا (ف. اِنَّ. مَا) پس، بلاشبہ، نہیں (ہے) مگر هِیَ (یہ) ضمیر واحد مؤنث غائب، زَجْرَۃٌ (آواز) موصوف، وَّاحِدَۃٌ (ایک ہی بار) اس کی صفت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک ایسی

گرجدار آواز پیدا ہو گی، **فَاِذَاهُمْ** (فَ.اِذَا.هُمْ) پس، اچانک، وہ (ہوں گے)، **بِالسَّاهِرَةِ** (بِ.السَّاهِرَةِ) بیچ، روئے زمین کے، ساهِرَة (کھلا میدان)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

یعنی قادر مطلق کے لیے قیامت کے برپا کرنے میں دشواری ہی کیا ہے اور اسے کوئی خاص اہتمام کرنا ہی کیا ہے؟ اس کے حکم سے تو بس ایک دفعہ زور کی للکار پڑی اور ادھر سب کچھ ہو ہوا گیا۔ (تفسیر ماجدی)

صدیوں اور مدتوں سے زیر زمین ان گنت مخلوق آناً فاناً سطح زمین پر آ جائے گی۔ (صفوۃ التفاسیر)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) روز قیامت کی فضا خوف، تھرتھراہٹ، کپکپاہٹ اور دہشت سے پُر نظر آتی ہے اور اگر دِل کی آنکھیں کھلی ہوں تو واقعات کی منظر کشی عبرت وبصیرت کا باعث بن جاتی ہے۔

۲) انکارِ حق کرنے والوں کے لیے ذلت اور رُسوائی، حسرت و یاس کے سوا کچھ نہیں ہے، قیامت سے متعلق ان کے ٹھٹھے اور تمسخر دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔

۳) اُس روز ربِ عظیم کے حکم سے ایک گرجدار آواز تمام کی تمام زیر زمین مخلوق کو اٹھانے اور سطح زمین پر ایک جگہ اکٹھا کرنے کے لیے کافی ہے۔

۴) مرنے کے بعد انسان کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں اور وہ خاک کے ساتھ خاک ہو جائیں، مگر اللہ عظیم وقدیر کے حکم سے ہر ذرہ اپنے جسم سے لگ کر اٹھ کھڑا ہوگا، وہاں تو صرف حکم کی دیر ہوتی ہے اُدھر حکم ہوا اور وہ چیز وجود میں آ گئی۔

....

﴿هَلْ اَتٰـکَ حَدِیْثُ مُوْسٰی(۱۵) اِذْ نَادٰہُ رَبُّہٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی(۱٦) اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی(۱۷) فَقُلْ هَلْ لَّکَ اِلٰٓی اَنْ تَزَکّٰی(۱۸) وَاَهْدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ فَتَخْشٰی(۱۹)﴾

(ارشاد ہوا، اے رسولؐ) کیا آپ کو موسیٰؑ کے واقعہ کی خبر پہنچی ہے، جب ان کے رب نے طویٰ کی مقدس وادی میں اُن کو آواز دی (اور حکم دیا کہ) فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے، پھر اس سے کہو، ''کیا تو چاہتا ہے کہ (کفر وشرک اور غرور وتکبر ایسے رذائل) سے پاک ہو جائے؟ اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تا کہ تو اس سے ڈرنے لگے (اور نجات پا جائے)

﴿هَلْ اَتٰـکَ حَدِیْثُ مُوْسٰی﴾

(ارشاد ہوا، اے رسولؐ) کیا آپ کو موسیٰؑ کے واقعہ کی خبر پہنچی ہے۔

هَلْ کیا، حرف استفہام، جیسا کہ هل عِنْدَکَ قَلَمٌ؟ کیا آپ کے پاس قلم ہے؟ اَتٰـکَ (اَتٰی. کَ) آئی، آپ کے پاس، (اَتٰی. یأتِیْ اِتیاناً) آنا، پہنچنا، 'کَ' ضمیر واحد مذکر حاضر، حَدِیْثُ مُوْسٰی، بات، موسیٰ علیہ السلام کی، حدِیث، مضاف، موسیٰ، مضاف الیہ۔

﴿اِذْ نَادٰہُ رَبُّہٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی﴾

جب بلایا، اس کو (موسیٰؑ کو) اس کے رب نے، طوی کی مقدس وادی میں۔

اِذْ جب، ظرف زمان، وقت کے اظہار کے لیے ہے، نَادٰہُ (نادیٰ. ہُ) بلایا، اسے (نَادٰی، یُنَادِی، نِداءً) پکارنا، آواز دینا، ندا (آواز) منادی کرنا، اعلان کرنا، اردو میں استعمال ہوتا ہے، رَبُّہٗ (رَبُّ. ہٗ) رب، اس کے نے (یعنی موسیٰ علیہ السلام کے رب نے انہیں بلایا) بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ وادی

مقدس کے درمیان، ب (ساتھ) مگر یہاں معنی درمیان کے ہیں، طُوًی، مقام طویٰ میں۔

﴿اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی﴾
(اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو حکم دیا) جاؤ تم فرعون کی طرف، کہ اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

اِذْهَبْ جاؤ، فعل امر واحد مذکر حاضر (ذَهَبَ، يَذْهَبُ، ذِهَابٌ) جانا، اِلٰی فِرْعَوْنَ طرف فرعون کے اِنَّهٗ (اِنَّ. هٗ) بلاشبہ، اس نے، طَغٰی، سرکشی (اختیار) کی، (طغٰی، يَطْغِيْ، طُغيانًا) مناسب حد سے بڑھنا، پانی کا جوش مار کر کناروں سے امڈ آنا، انسان کا سرکش ہونا، نافرمان ہونا، ظلم و ستم میں حد سے بڑھنا، دریا میں طغیانی آنا، اردو میں استعمال ہوتا ہے۔

﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى﴾
پھر اسے کہو، کیا تم کو، رغبت ہے اس بات کی کہ پاک ہو جائے (کفر و شرک اور غرور و تکبر سے)۔

فَقُلْ، (ف. قُلْ) پس، کہو، ف عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، قُل فعل امر واحد مذکر حاضر، هَلْ کیا کلمہ استفہام، لَّکَ تمھیں ہے، اِلٰٓى اَنْ (رغبت) اس بات کی طرف، تَزَكّٰى، پاکیزہ نفس ہو جاؤ تم، (تزَكّٰی، يَتَزَكّٰى) نیک و صالح ہونا، پاک و صاف ہونا (شرک و کفر اور غرور و تکبر سے)، قرآن حکیم کی اصطلاح میں تزکیہ نفس کے یہی معنی ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا، وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشّمس:۹، ۱۰) ''کامیاب ہوا جس نے نفس کا تزکیہ کیا (اسے شرک و کفر، تکبر و غرور اور حسد و بغض ایسے رذائل سے پاک کر لیا) اور نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کر لیا (کفر و شرک اور حسد و بغض ایسے رذائل سے آلودہ کر لیا)۔

﴿وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى﴾
اور میں راہ دکھاؤں تجھے تیرے رب کی طرف، پس تو ڈرنے لگے۔

وَاَهْدِيَكَ (وَ. اَهْدِيَ. كَ) اور میں راہ دکھاؤں، تجھے، وَ، اور عاطفہ گزشتہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے (هَدٰى يَهْدِي فُلانًا) کسی کو راہ بتانا، راہنمائی کرنا، ہدایت کرنا، اردو میں بھی استعمال

ہوتا ہے، ''ک''ضمیر واحد مذکر حاضر ہے، فَتَخْشٰى (ف. تَخْشٰى) پس تو ڈرنے لگے، فعل مضارع واحد مذکر حاضر (خَشِيَ يَخْشَى، خَشْيَةً) ڈرتے رہنا، کھٹکا ہونا، خشیت، خشوع وخضوع، قلب خاشع وغیرہ جیسے اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی ان آیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہاں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ ذکر کرنے سے مقصود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینی ہے کہ اگر آپ کی قوم، قومِ قریش کے لوگ آپ کی اور آپ کی دعوتِ توحید کی تکذیب کر رہے ہیں، تو فرعون اور فرعونیوں نے بھی موسیٰ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا تھا، اور اللہ نے انہیں غرقاب کر دیا تھا تو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل قریش کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ کرے اور انہیں ہلاک کر دے۔

اور استفہامی طرز تعبیر سے مقصود یا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰ کا واقعہ سننے کی ترغیب دلانی ہے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان آیات کے نزول سے پہلے اس واقعہ کی خبر نہیں تھی، اور اگر خبر تھی تو مقصود یاد دہانی کرانی ہے کہ آپ کو موسیٰ اور فرعون کے واقعہ کی تو خبر ہے ہی، اسے یاد کر کے اپنے دل کو تسلی دیجیے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے نبی ﷺ! کیا آپ کو موسیٰ بن عمران کے واقعہ کی خبر ہے، جب انہوں نے پاک اور مقدس وادی (طویٰ) میں اپنے رب کو پکارا، تو ان کے رب نے انہیں بتایا کہ اس کے سوا ان کا کوئی معبود نہیں، اور انہیں صرف اپنی عبادت کا حکم دیا، پھر انہیں حکم دیا کہ وہ شاہِ مصر (فرعون) کے پاس جائیں جس نے سرکشی کی راہ اختیار کر لی ہے، اور اللہ کے بندوں کو اپنی بندگی پر مجبور کر دیا ہے اور اس سے کہیں کہ میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ تم ظلم وسرکشی اور شرک باللہ سے تائب ہو جاؤ اور میں تمھیں تمہارے رب کی راہ دکھاتا ہوں، تاکہ تم اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اس پر ایمان لے آؤ، فرائض کو بجالاؤ اور گناہوں سے بچو (تاکہ کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ)[تیسیر الرحمٰن، لبیان القرآن، حصہ دوم]

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ہدایت انہیں نصیب ہوتی ہے، جو ہدایت کے طالب ہوتے ہیں، اپنا تزکیہ نفس کرتے رہتے ہیں، انبیائے کرام کی بات سنتے ہیں اور اسے حرز جاں بناتے ہیں اور جن کی پیشانیاں ہمیشہ اپنے رب

کے سامنے خوف وخشیت سے جھک جاتی ہیں۔

۲) انبیاء کرام کی دعوت اوران کا پیغام حق وصداقت پر مبنی ہوتا ہے، وہ لوگ جوان کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو دنیا اور آخرت میں سرخرو اور کامیاب فرماتا ہے، اس کے برعکس وہ لوگ جوان کی مخالفت کرتے ہیں، بسا اوقات انہیں دنیا میں ذلت و رسوائی سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ حق کی فرعون نے نہ صرف مخالفت کی بلکہ وہ آپ کی قوم کو بھی طرح طرح کی تکالیف اور سزائیں دیتا تھا بالآخر وہ دنیا ہی میں اپنے لاؤلشکر سمیت اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوا اور دریا کی طوفانی لہروں میں ڈوب گیا۔ بنی اسرائیل نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اسی طرح خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مومن ساتھیوں کے ساتھ قریش مکہ نے ہر قسم کے ظلم وستم روا رکھے اوراس میں سردارانِ مکہ ابوجہل، ابولہب، عتبہ، شیبہ پیش پیش تھے، آخر یہی لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں غزوہ بدر میں اپنے انجام کو پہنچے، اور مسلمان اللہ کے حکم سے فاتح اور بامراد ہوئے۔

یہ آیات مسلمانوں کے لیے نشان راہ ہیں، آج بھی دنیا میں امریکہ جیسے بڑے بڑے فرعون ہیں جن کا ظلم وستم انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ مسلمان اگر اسلامی تعلیمات پر کاربند ہو کر اللہ والے بن جائیں تو اللہ کی نصرت ان کے شامل حال ہو کر انہیں کامیابی سے ہمکنار کر دے گی اور ان کے دشمن ان کی آنکھوں کے سامنے نیست ونابود ہو جائیں گے۔ ان شاءاللہ!

....

﴿فَارٰهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى(۲۰) فَكَذَّبَ وَ عَصٰى (۲۱) ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى(۲۲) فَحَشَرَ فَنَادٰى(۲۳) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى(۲۴) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى(۲۵) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى(۲۶)﴾

پھر (موسیٰ نے فرعون کے پاس جا کر) اسے بڑا معجزہ دکھایا تو اس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی، پھر پیٹھ پھیر کر چل دیا (اور فساد پھیلانے کی) کوشش کرنے لگا، چنانچہ سب لوگوں کو جمع کیا (اور بآواز بلند) اعلان کیا کہ میں تمہارا ربِ اعلیٰ ہوں، پس اللہ (صاحبِ جلال و جبروت) نے اس کی گرفت کی، دنیا اور آخرت دونوں کے عبرتناک عذاب میں مبتلا کیا (دنیا میں پانی کے اندر غرق ہوا اور آخرت میں عذابِ دوزخ میں پڑا) بلاشبہ اس واقعہ میں عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے (اور بندگی کی راہ اختیار کرے)

﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى﴾ پس دکھائی (موسیٰ علیہ السلام) نے (فرعون کو) بڑی نشانی۔

فَاَرٰىهُ (ف. اَرٰى. هُ) پس۔ دکھلایا (موسیٰ نے) اسے (فرعون کو) (رَآى، يَرَىٰ) خود دیکھنا، (To See) اور (اَرَىٰ، يُرِىْ) کسی کو دکھانا (To Show) ''هٗ'' کی ضمیر واحد مذکر غائب، فرعون کی طرف جاتی ہے۔ اَلْاٰيَةَ نشانی، اَلْكُبْرٰى بڑی۔ اَلْاٰيَةَ موصوف اور اس کی صفت اَلْكُبْرٰى ہے، صفت اور موصوف کی تذکیر و تانیث ایک ہوتی ہے۔ اَلْاٰيَةَ۔ مونث اور اس کی صفت بھی اَلْكُبْرٰى مؤنث ہے۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے محبت بھرے انداز سے فرعون کو دعوت پہنچائی جس کی تعلیم و تلقین ان کے رب نے ان سے کی تھی اور جس کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی، لیکن یہ محبت بھرا انداز بھی جابر و متکبر فرماں روا کے دل کو...... جو اپنے رب کی معرفت سے خالی تھا...... نرم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تب موسیٰ علیہ السلام نے اس کو عظیم نشانی دکھائی ''عظیم نشانی'' سے مراد...... جیسا کہ دوسرے مقامات پر صراحت ہے...... عَصَا اور یدِ بیضا ہیں۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿فَكَذَّبَ وَ عَصٰى﴾ پس اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔

فَكَذَّبَ (ف. كَذَّبَ) پس، اس نے جھٹلایا، ماضی واحد مذکر غائب (كَذَّبَ، يُكَذِّبُ، تَكْذِيْبٌ) جھٹلانا، وَعَصٰى اور نافرمانی کی فعل ماضی واحد مذکر غائب (عَصٰى، يَعْصِىْ، عِصْيَانٌ)

نافرمانی کرنا، نہ ماننا، یعنی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ حق کو جھٹلایا اور اللہ کی نافرمانی کی۔

﴿ثُمَّ اَدۡبَرَ یَسۡعٰی﴾
پھر پیٹھ پھیری اور (فساد پھیلانے کی) کوشش کرنے لگا۔

ثُمَّ پھر حرفِ عطف، گزشتہ، آیہ مبارکہ سے ربط پیدا کرتا ہے، اَدۡبَرَ اس نے پیٹھ پھیری فعل ماضی واحد مذکر غائب (اَدۡبَرَ، یُدۡبِرُ، اِدۡبَارٌ) پھرنا، پیٹھ پھیرنا، الدُّبُرُ کے معنی پیٹھ (Back) کے ہیں، یَسۡعٰی، کوشش کرتے ہوئے مضارع واحد مذکر غائب (سَعَی، یَسۡعٰی) کوشش کرنا، سعی اور جستجو اردو میں بھی اِنہی معنوں میں آتا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یعنی (فرعون نے) ایمان واطاعت سے اعراض ہی نہیں کیا بلکہ زمین میں فساد پھیلانے اور موسیٰ کا مقابلہ کرنے کی سعی (کوشش) کرتا رہا، چنانچہ جادوگروں کو جمع کر کے ان کا مقابلہ حضرت موسیٰؑ سے کرایا تاکہ موسیٰ کو (نعوذ باللہ) جھوٹا ثابت کیا جاسکے۔'' (احسن البیان)

﴿فَحَشَرَ فَنَادٰی﴾ پس اکٹھا کیا اور اس نے پکارا۔

فَحَشَرَ (ف. حَشَرَ) پس، اکٹھا کیا فعل ماضی واحد مذکر غائب (حَشَرَ، یَحۡشُرُ، حَشۡرًا) جمع کرنا اور لے چلنا، الۡحَشۡرُ، اجتماع، ہجوم، بھیڑ، روزِ قیامت مخلوق کا اجتماع، یَوۡم الۡحَشۡر، روز قیامت۔ (القاموس الوحید)، فَنَادٰی (ف. نَادٰی) پس، اس نے پکارا فعل ماضی، واحد مذکر غائب (نَادٰی، یُنَادِی، نِدَاءٌ) پکارنا، آواز دینا، منادی پکارنے والا، نِدا، آواز، پکار اردو میں استعمال ہوتا ہے۔

﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی﴾ تو کہنے لگا ''میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔''

فَقَالَ (ف. قَالَ) پس، وہ کہنے لگا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (قَالَ، یَقُوۡلُ، قَوۡلًا) کہنا، اَنا ضمیر منفصل، واحد متکلم، رَبُّکُمۡ (رَبُّ. کُمۡ) رب تمہارا، الۡاَعۡلٰی سب سے بلند، بڑا۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

”پھر اس نے (یعنی فرعون نے) اپنی قوم اور اپنی فوج کو جمع کیا اور ان کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ توحیدِ باری تعالیٰ کا انکار اور اپنے معبود ہونے کا یوں اعلان کیا کہ لوگو! میں ہی تمہارا سب سے بڑا معبود ہوں، سورۃ القصص: ۳۸ میں اللہ تعالیٰ نے اُس کے دعوائے الوہیت کو اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے: مَا عَلِمۡتُ لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرِىۡ. لوگو! مجھے معلوم نہیں کہ میرے سوا تمہارا کوئی دوسرا معبود ہے۔“ (تیسیر الرحمٰن، لبیان القرآن)

﴿فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الۡاٰخِرَةِ وَالۡاُوۡلٰى﴾

پس اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ (فَ. اَخَذَ. هُ) پس، پکڑا، اسے اللہ نے (اَخَذَ، يَأۡخُذُ، اَخۡذٌ) پکڑنا، گرفتار کرنا، یہاں ”ف“ سبب کو ظاہر کرتا ہے اس لیے فا سببیہ کہلاتا ہے۔ نَكَالَ الۡاٰخِرَةِ عذاب آخرت کے (میں)، نَكَالَ عذاب، مضاف، الۡاٰخِرَةِ مضاف الیہ، وَالۡاُوۡلٰى اور دنیا کے (میں)۔

﴿اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى﴾

بلاشبہ اس واقعہ میں عبرت ہے، ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔

اِنَّ بلاشبہ، تحقیق، فِىۡ ذٰلِكَ، بیچ اس (بات) کے، لَعِبۡرَةً (لَ. عِبۡرَةً) ضرور بضرور۔ نصیحت ہے، لِّمَنۡ (لِ. مَنۡ) لیے، اس کے (جو)، يَّخۡشٰى، ڈرتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (خَشِىَ، يَخۡشٰى، خَشۡيَةٌ) ڈرنا، خوف کھانا، خشوع اردو میں استعمال ہوتا ہے۔

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

”جب فرعون نے لاٹھی کو سانپ بن کر دوڑتے دیکھ لیا اور اپنی ذلت ورسوائی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی، تو اس کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ ایسی بات نہ کرتا۔ اس کی یہ بات دلالت کرتی ہے کہ جب اس نے عصائے موسوی کو اپنے سامنے دوڑتا دیکھا، تو اس پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی اور اس کا کفر وعناد بڑھتا ہی گیا، اور انجام سے بے خبر موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کے خلاف ہر ممکن تدبیر کرتا رہا، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام، اس کے ظلم سے تنگ آ کر بنی اسرائیل کو لے کر جب راتوں رات مصر سے روانہ ہوئے تو

اس نے اپنی فوج کے ساتھ ان کا پیچھا کیا اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے اسے اور اس کی فوج کو سمندر میں ڈبو دیا، اس کے اسی انجامِ بَدْ کی طرف اللہ تعالیٰ نے آیت (۲۵) میں اشارہ کیا ہے کہ اللہ نے دنیا میں یہ عذاب دیا کہ اسے اور تمام فرعونیوں کو بحرِ قلزم کے حوالے کر دیا اور آخرت میں اسے آگ کا عذاب دے گا۔

(بحوالہ تیسیر القرآن)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) سیدنا موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے، ان کا تعلق قوم بنی اسرائیل سے تھا، انہیں فرعون کے پاس دعوتِ حق کے ساتھ بھیجا گیا جس نے خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا اور جو لوگوں کو ''اَنَا رَبُّكُمُ الاَعلیٰ'' کہا کرتا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے اسے انتہائی نرمی اور لطافت سے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی طرف بلایا، جب وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہا تو موسیٰؑ نے اسے معجزہ بھی دکھایا جو رب کریم کی طرف سے انہیں ملا تھا...... معجزہ یہ تھا کہ جب وہ اپنی لاٹھی زمین پر ڈالتے تو وہ سچ مچ کا اژدہا بن جاتا، اور دوسرے وہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈال کر نکالتے تو وہ سورج کی طرح چمکنے لگتا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مصر میں ان دنوں جادوگروں کا بڑا شور وزور تھا جو جھوٹ موٹ کی شعبدہ بازی سے لوگوں کو خوفزدہ اور مرعوب کر لیتے تھے۔ آخرکار انہیں بھی موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی معجزہ کے سامنے شکست ماننی پڑی اور وہ ایمان سے بہرہ ور ہو گئے، مگر فرعون اپنے کفر پر بدستور قائم رہا، بلکہ اس نے اہل ایمان پر اپنے ظلم وستم کا ہاتھ دراز کر دیا۔

۲) جب کسی شخص کا ظلم انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ رب قدیر کے غضب سے بچ نہیں سکتا ہے، چنانچہ فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو اس وقت ڈبو دیا گیا جب وہ سیدنا موسیٰؑ اور ان کی قوم کے تعاقب میں اس ارادے سے نکلا تھا کہ وہ آج موسیٰؑ اور ان کی قوم کو تباہ و برباد کر دے گا مگر خود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نیست ونابود ہو گیا۔

۳) یہ واقعہ بیان کر کے یہ درس دیا گیا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور ناراضی سے ڈر جائے اور اس کی بندگی واطاعت کا دم بھرے کہیں ان لوگوں کے نقش قدم پر نہ چل پڑے جن کا انجام اس دنیا میں بھی بدترین ہوا ہے اور آخرت میں بھی بدترین عذاب ان کے مقدر میں ہے۔

....

﴿ءَ اَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا(۲۷) رَفَعَ سَمۡکَهَا
فَسَوّٰهَا(۲۸) وَاَغۡطَشَ لَیۡلَهَا وَ اَخۡرَجَ ضُحٰهَا(۲۹)
وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِکَ دَحٰهَا(۳۰) اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَ
مَرۡعٰهَا(۳۱) وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰهَا(۳۲) مَتَاعًا لَّکُمۡ
وَلِاَنۡعَامِکُمۡ(۳۳)﴾

(اے منکرین حق ذرا غور و فکر کرو) کیا تمہاری تخلیق زیادہ دشوار ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اسے بنایا، اس کی چھت (بغیر ستونوں کے) خوب اونچی اٹھائی اور کیسے مناسب انداز سے بنایا، اُس کی رات کو تاریک بنایا اور اس (کے دن کو دھوپ نکال کر) روشن کیا، اس کے بعد زمین کو پھیلا دیا، اس کے اندر سے پانی اور چارہ نکالا، اور پہاڑوں کو زمین میں جمایا یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کی نفع رسانی کے لیے ہے۔

﴿ءَ اَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا﴾

کیا تمہاری تخلیق زیادہ دشوار ہے یا آسمان کی؟ اس (خالق) نے اسے بنایا۔

ءَ ہمزہ استفہام، کیا، اَنۡتُمۡ تم، ضمیر جمع مذکر حاضر، اَشَدُّ، شِدَّةٌ سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے، زیادہ سخت، زیادہ دشوار، خَلۡقًا پیدائش میں، تخلیق میں، اَمِ یا، السَّمَآءُ آسمان، بَنٰهَا (بَنٰی. هَا) اس نے بنایا اسے هَا کی ضمیر واحد مؤنث آسمان کی طرف جاتی ہے، بنٰی، اس نے بنایا ماضی واحد مذکر غائب یعنی اللہ تعالیٰ نے (بَنٰی، یَبۡنِیۡ، بِناءٌ) بنانا، عمارت کھڑی کرنا، دیوار کھڑی کرنا، تعمیر کرنا، بِنَا تعمیر کے معنوں میں اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''تخلیق سے مراد انسانوں کی دوبارہ تخلیق ہے اور آسمان سے مراد وہ پورا عالم بالا ہے جس میں بے شمار ستارے اور سیارے بے حدوحساب شمسی نظام اور اَن گنت کہکشاں پائے جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ تم جو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو کوئی بڑا ہی امر محال سمجھتے ہو، اور بار بار کہتے ہو کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہوں گی، اُس حالت میں ہمارے پراگندہ اجزائے جسم پھر سے جمع کر دیے جائیں اور ان میں جان ڈال دی جائے۔

کبھی اس بات پر بھی غور کرتے ہو کہ اس عظیم کائنات کا بنانا زیادہ سخت کام ہے یا تمھیں ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد دوبارہ اسی شکل میں پیدا کر دینا؟ جس اللہ کے لیے وہ کوئی مشکل کام نہ تھا، اس کے لیے آخر یہ کیوں ایسا مشکل کام ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے؟ حیات بعد الموت پر یہی دلیل قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ یٰسین میں ہے ''اور کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو (پھر سے) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں، وہ تو بڑا زبردست خالق ہے، تخلیق کے کام کو خوب جانتا ہے۔'' (یٰسین:۸۱) اور سورۃ مؤمن میں فرمایا: ''یقیناً آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا، انسانوں کو پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔'' (مومن:۵۷)۔''

(تفہیم القرآن، جلد ششم)

یہ تو کم عقل انسانوں کو سمجھانے کے لیے ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف حکم دینے پر وہ چیز وجود میں آجاتی ہے، اس کا فرمان ہے: اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (یٰسین:۸۲) ''وہ (رب کائنات) تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

﴿رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا﴾

<u>اس کی چھت کو اونچا اٹھایا پھر اسے ہر طرف سے درست کیا۔</u>

رَفَعَ بلند کیا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (رَفَعَ، يَرْفَعُ، رَفْعٌ) بلند کرنا اوپر اٹھانا، سَمْكَهَا

(سَمۡکَ۔ھَا) چھت۔ اس کی (یعنی آسمان کی) السَّمۡکُ، چھت یا چھت کی موٹائی (القاموس الوحید) فَسَوّٰھَا (فَ۔سَوّٰی۔ھَا) پس۔ درست کیا۔ اسے (آسمان کو) ف، پس، عاطفہ ہے، گزشتہ کلام سے ربط پیدا کرتا ہے (سَوَّی، یُسَوِّیُ، تَسۡوِیَۃٌ) درست کرنا، کسی چیز کو اس طرح درست کرنا کہ اس میں کوئی خامی نہ رہے۔

اَیۡ جَعَلُ کُلِّ جُزۡءٍ مَوۡضُوۡعٍ فِیۡ مَوۡضِعِہٖ "یعنی ہر چیز کو اس کے ٹھیک ٹھیک مقام پر رکھ دینا۔" (المراغی)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

"آسمان کا انتظام اللہ تعالیٰ نے ایسا درست و کامل رکھا کہ اس کے نظام میں کہیں رخنہ نہ مل سکے گا۔" (تفسیر ماجدی)

﴿وَاَغۡطَشَ لَیۡلَھَا وَ اَخۡرَجَ ضُحٰھَا﴾

اور اس کی رات کو ڈھانپا اور اس کے دن کو ظاہر کیا۔

وَاَغۡطَشَ اور ڈھانپ دیا، وَ اور عاطفہ، سلسلہ کلام میں ربط کے لیے ہے، اَغۡطَشَ، ماضی واحد مذکر غائب، اس نے تاریک بنایا، لَیۡلَھَا (لَیۡلَ۔ھَا) رات، اس کی، ھا کی ضمیر آسمان کی طرف جاتی ہے، یعنی آسمان کو بھی رب کائنات نے بنایا اور، اس کی رات کو تاریک بنایا، وَ اَخۡرَجَ اور نکالا (اَخۡرَجَ، یُخۡرِجُ، اِخۡرَاجًا) نکالنا، ضُحٰھَا (ضُحٰی۔ھَا) چاشت۔ اس کی، دراصل الضُّحٰی کے معنی سورج کی روشنی دن چڑھنے کے وقت، چاشت، آفتاب کا معنی بھی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دن کو روشن بنایا، یعنی آسمان پر اگر رات سیاہ ہے تو اس کا دن آفتاب سے روشن ہو جاتا ہے۔

﴿وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا﴾ اس کے بعد زمین کو پھیلا دیا۔

وَالۡاَرۡضَ اور زمین کو، وَ، عاطفہ ہے، بَعۡدَ ذٰلِکَ پیچھے اس کے (آسمان کے پیدا کرنے کے بعد)، دَحٰھَا (دَحٰی۔ھَا) بچھایا۔ اسے (یعنی زمین کو) ھَا کی ضمیر زمین کی طرف جاتی ہے۔ "دَحَاھَا: اَیۡ مَھَّدَھَا وَجَعَلَھَا قَابِلَۃً لِلسُّکۡنٰی (المراغی) یعنی زمین کو پھیلایا اور بچھایا اور رہائش کے قابل بنایا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمین کو بچھا دیا، قرآن حکیم کے

بعض مقامات پر پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کو بنایا پھر آسمان کی تخلیق فرمائی۔اس میں کوئی تعارض نہیں ہے،مولانا امین احسن اصلاحی نے بڑے پتے کی بات لکھی ہے:

''قرآن نے آسمان اور زمین کی تعمیر سے متعلق جو تصور دیا ہے، وہ ایک مکان کی صورت میں دیا ہے جس میں آسمان کی حیثیت چھت کی اور زمین کی حیثیت فرش کی ہے، کسی مکان کا نقشہ جب بنایا جاتا ہے تو اس میں چھت اور فرش دونوں بیک وقت مد نظر ہوتے ہیں اور دونوں کا خاکہ ایک ہی ساتھ تیار کر لیا جاتا ہے لیکن تعمیر کے مختلف مراحل میں کبھی فرش اور اس کے متعلقات پر کام ہوتا ہے اور کبھی چھت اور اس کے اطراف پر۔'' (تدبر قرآن، جلد ہشتم)

رب کریم نے اپنی حکمت بالغہ سے جیسے اور جو کچھ بنایا وہ اس کی عظیم قدرت اور کاریگری کا شاہکار ہے۔

﴿اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَ مَرۡعٰهَا﴾ (اس میں سے تمہارے لیے) پانی اور چارہ نکالا۔

اَخۡرَجَ اس نے نکالا یعنی اللہ تعالیٰ نے، فعل ماضی واحد مذکر غائب (اَخۡرَجَ، یُخۡرِجُ، اِخۡرَاجًا) نکالنا، مِنۡهَا (مِنۡ.هَا) سے۔اس (یعنی اس زمین میں سے۔هَا کی ضمیر زمین کی طرف جاتی ہے، مَآءَهَا (مَآءَ.هَا) پانی۔اس کا (زمین کا) بذریعہ سوتوں اور چشموں کے، جہاں زمین کے اندر بور (Bore) کیجیے پانی نکل آتا ہے اور کہیں پہاڑوں سے چشمے جاری فرما دیے، سبحان اللہ! وَ مَرۡعٰهَا، وَ اور، عاطفہ، سابقہ کلام سے ربط کا فائدہ دیتا ہے، مَرۡعٰهَا (مَرۡعٰی.هَا) چارہ۔اس کا (زمین کا)، هَا کی ضمیر زمین کی طرف جاتی ہے (رَعٰی، یَرۡعٰی، رَعۡیًا) جانور کو چرانا، اور مَرۡعٰی، چراگاہ، سرسبز و شاداب جگہ، پھر تمھیں بھی خالق کائنات نے عقل و فہم سے نوازا کہ ہموار زمین پر کھیتی باڑی کر کے اپنے لیے اور اپنے جانوروں کے لیے غلہ، اناج اور پھل، پھول پیدا کر لیتے ہو۔

﴿وَ الۡجِبَالَ اَرۡسٰهَا﴾ اور پہاڑوں کو گاڑ دیا۔

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے ہے، الۡجِبَالَ پہاڑ، اس کا مفرد جَبَلٌ ہے، اَرۡسٰهَا

(اَرْسٰی. هَا) جمایا (گاڑا) اس پر (یعنی زمین پر) هَا کی ضمیر زمین کی طرف جاتی ہے (رَسَا، یَرْسُوْا، رَسُوًا) جم جانا، مضبوطی سے قائم ہونا رَسَا الْجَبَلُ، پہاڑ کا زمین پر گڑا ہوا ہونا، رَسَا السّفِینَۃُ کشتی یا جہاز کا لنگر انداز ہونا، (القاموس الوحید)

اس سے باب افعال (اَرْسٰی، یُرْسِیْ، اِرْسَاءٌ) مضبوط کرنا، گاڑنا، اللہ تعالیٰ قدیر نے پہاڑوں کو زمین پر خوب مضبوط کیا اور گاڑ دیا تاکہ اس کا توازن برقرار رہے۔

﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾

یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے فائدے کے لیے ہے۔

مَتَاعًا فائدہ، لَّكُمْ (لَّ. كُمْ) لیے، تمہارے المتاع، نفع، فائدہ، ہر قابلِ استفادہ چیز، سامانِ تجارت، اسبابِ زندگی، کھانے پینے کی چیزیں (القاموس الوحید) یعنی چراگاہوں اور کھیتوں سے جو تم حاصل کرتے ہو، یہ سب کچھ تمہارے اسباب زندگانی ہیں، نہ صرف تمہارے لیے بلکہ، وَلِاَنْعَامِكُمْ تمہارے مویشیوں کے لیے بھی۔ وَلِ اور لیے، وَ اور، عاطفہ ہے، لام زیر کے ساتھ ''لیے'' کے معنی میں ہے۔ النَّعَمُ، جانوروں پر مشتمل مال و دولت، چوپائے (بطور خاص اونٹ) اس کی جمع اَنْعَامٌ آتی ہے۔ (القاموس الوحید)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) کائنات کا نظم وضبط اس بات کی مضبوط شہادت ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ یا کوئی الَلْ ٹپ واقعہ نہیں ہے بلکہ اس کا خالق و مالک انتہائی مدبر، حکیم، قادر اور قدیر ہے۔

۲) انسان یقیناً اس کائنات میں اشرف المخلوقات ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس پر ان گنت ظاہری اور باطنی انعامات ہیں...... ظاہری طور پر اگر انواع و اقسام کے اناج وثمرات ہیں تو باطنی انعامات عقل و بصیرت، فہم و ذکا، شعور وآگہی اور سب سے بڑھ کر انبیاء کرام کے ذریعے ہدایت اور وحی کا انعام ہے جو وقتاً فوقتاً اسے ملتا رہا اور سب سے آخر خاتم النبیّین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن

ایسی عظیم کتاب کے ساتھ تشریف لائے۔

۳) اللہ تعالیٰ عظیم وبرتر کے لیے کسی چیز کو دوبارہ پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے، وہاں صرف کسی بات کا حکم ہوتا ہے اور وہ فوراً سرانجام پا جاتی ہے۔

....

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى(۳۴) يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى(۳۵) وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى(۳۶) فَاَمَّا مَنْ طَغٰى(۳۷) وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا(۳۸) فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى(۳۹) وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى(۴۰) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى(۴۱)﴾

توجب (قیامت کا) عظیم حادثہ رونما ہوگا، جس دن انسان کو اپنا کیا دھرا یاد آئے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول دی جائے گی، تو جس نے حدّ (بندگی) سے تجاوز کیا تھا اور حیاتِ دنیا کو (آخرت پر) مقدم رکھا تھا اس کی جائے پناہ یہی دوزخ ہوگی اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی۔

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى﴾

توجب (قیامت کا) عظیم حادثہ رونما ہوگا۔

فَاِذَا (فَ.اِذَا) پس جس وقت، جَآءَتِ آئے گی، واحد مؤنث غائب (جَاءَ، يَجِيءُ، جِيئًا و

مَجِيئًا) آنا (to come) اگر اس کے صلہ میں ''ب'' آ جائے تو متعدی ہو کر اس کا معنیٰ 'لانا' ہو جاتا ہے، جَاءَ بِالشَّیءِ (to bring some thing)، الطَّآمَّۃُ آفت، مراد یہاں قیامت ہے، یہ لفظ طَمٌّ سے ہے، طَمَّ، یَطِمُّ، طُمُوْمًا کسی چیز کا زیادہ ہو کر پھیلنا اور زبردست ہو جانا جیسا کہ طَمَّ الْبَحْرُ، دریا امڈ آیا، پانی کناروں سے چھلکنے لگا، اِسی مناسبت سے قیامت کو ''الطَّامَّۃ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عظیم حادثہ ہوگا، بہت بڑی آفت ہوگی۔ اَلطَّآمَّۃُ کی صفت الْکُبْرٰی ہے، بڑی، عربی میں صفت موصوف کا وزن عموماً برابر ہوتا ہے، یعنی موصوف اگر مذکر ہوگا تو اس کی صفت بھی مذکر ہوگی، موصوف اگر مؤنث ہے تو اس کی صفت بھی مؤنث ہوگی۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''حیاتِ دنیا چند روزہ سامانِ لطف وعیش ہے، کائنات میں زندگی اور انسانی حیات کے نظم وانصرام کا جو منصوبہ کارفرما ہے اس کے تحت یہ سامان پوری باریک بینی اور صحت وحکمت کے ساتھ انسان کو ملا ہے، مگر ہے یہ چند روزہ ہی، مدت پوری ہوئی اور ختم ہوا...... پھر 'طامۂ کبری' یعنی قیامت کا عظیم حادثہ برپا ہو گا، یہ حادثہ ہر شے پر چھا جائے گا، ہر شے کو تاخت وتاراج کردے گا۔ یہ چند روزہ سامانِ لطف وعیش! یہ عظیم، محکم، منظّم اور منصوبہ کے تحت بنی کائنات، یہ بلند وبالا آسمان، یہ ہموار زمین، یہ جمے ہوئے پہاڑ، یہ زندہ مخلوقات، یہ زندگی، زندگی کے ہنگامے اور مواقع سب اس حادثہ کی لپیٹ میں آجائیں گے، حادثہ ان سب سے بڑھ کر ہوگا، ان سب پر چھا جانے اور ان سب کو ملیا میٹ کر ڈالنے والا ہوگا۔

انسان نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا تھا اُس وقت ایک ایک کر کے، سب اُسے یاد آ رہا ہوگا، سب چیزیں نگاہوں کے سامنے گھوم رہی ہوں گی، زندگی کے حوادث اور دنیا کی مشغولیات کے باعث وہ کچھ غافل ہو گیا تھا، اپنے کرتوتوں کو بھول گیا تھا، اُس وقت اسے سب کیا دھرا یاد آ رہا ہوگا لیکن بے سود، اب اس یاد سے رنج وحسرت کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوگا، وہ اُس عذاب اور ان مصیبتوں کو سوچ سوچ کر غم واندوہ سے گھل رہا ہوگا جو پیش آنے والی ہوں گی۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى﴾

اس دن یاد کرے گا، انسان جو سعی کی تھی (اس نے دنیا میں)۔

یَوْمَ (جس) دن ظرف زمان، **یَتَذَكَّرُ** یاد کرے گا، مضارع واحد مذکر غائب (**تَذَكَّرَ، يَتَذَكَّرُ، تَذَكُّرٌ**) یاد کرنا، بھولی بسری باتیں ذہن میں لانا (to remember) **الْاِنْسَانُ** بنی نوع انسان، یہ لفظ تمام انسانوں پر محیط ہے، **مَا** جو، اسم موصول، **سَعٰی** کوشش کی، جیسے بھی دوڑ دھوپ کی، جس طرح کے اعمال کمائے (**سَعٰی، يَسْعٰی، سَعْیٌ**) کوشش کرنا۔

﴿وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰی﴾

اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول دی جائے گی۔

وَ اور، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، **بُرِّزَتِ** ظاہر کی جائے گی، ماضی مجہول واحد مؤنث غائب (**بَرَزَ، يَبْرُزُ، بُرُوْزًا**) ظاہر ہونا، نمایاں ہونا، **مُبَارَزَتٌ**، لڑائی، جنگ کے لیے باہر آنا، اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے، **الْجَحِيْمُ** جہنم، دوزخ، **لِمَنْ** (**لِ.مَنْ**) لیے اس کے، جو **ل** حرف جر، **مِنْ** اسم موصول، **يَّرٰی** (جو) دیکھتا ہے مضارع واحد مذکر غائب (**رَاٰی، يَرٰی، رُؤْيَةٌ**) دیکھنا یعنی ہر شخص جہنم کو واضح طور پر دیکھے گا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''دیدۂ بصیرت سے تو آج بھی غیب پر ایمان رکھنے والا دوزخ دیکھ رہا ہے، آخرت میں وہ مومن و کافر سب کے رؤیت و مشاہدہ میں انہی ظاہری آنکھوں سے آجائے گی۔'' (تفسیر ماجدی، ج:۲)

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰی، وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾

پس جس نے سرکشی (اختیار) کی اور دنیا کی زندگی کو مقدم رکھا۔

فَاَمَّا (**ف.اَمَّا**) پس، جس نے ''ف'' پس عاطفہ ہے، سلسلہ کلام سے ربط کے لیے استعمال ہوتا ہے **اَمَّا**، حرف شرط ہے اس کا ترجمہ، لیکن، رہا یہ کہ، **اَمَّا** کے بعد **مَنْ** جملے کو کھولتا ہے، اسم موصول جو، **طَغٰی**، سرکش ہوا، ماضی واحد مذکر غائب (**طَغٰی، يَطْغٰی، طُغْيَانًا**) مناسب حد سے بڑھنا، سرکش ہونا،

نافرمان اور باغی ہونا، دریا کا طغیانی پر آنا اردو میں استعمال ہوتا ہے وَاٰثَرَ اور ترجیح دی، ماضی واحد مذکر غائب یہ لفظ اِیْثَارٌ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو دوسری چیز پر ترجیح دینے کے ہیں، ''ایثار نفس'' اردو محاورہ میں استعمال ہوتا ہے۔ وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا اور اس نے من چاہی زندگی گزاری تو اس کی سزا پوری ہوگی۔

﴿فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی﴾ یقیناً دوزخ ہی اس کی جائے پناہ ہے۔

فَا پس، اَمَّا کے جواب میں استعمال ہوا ہے، اِنَّ یقیناً، بلاشبہ، الْجَحِیْمَ جہنم، هِیَ وہی اس کا، الْمَاْوٰی، ٹھکانہ، جائے پناہ ہے (اَوٰی، یَاْوِیْ) پناہ دینا۔

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی﴾

اور جو کوئی ڈرا اپنے رب کے سامنے جانے سے اور روکا اپنے نفس کو بری خواہشات سے۔

وَاَمَّا اور لیکن، مَنْ خَافَ جو ڈرا، مَنْ اسم موصول (خَافَ، یَخَافُ، خَوْفٌ) ڈرنا، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے گناہوں سے بچنا، خوف اور ڈر اردو میں استعمال ہوتا ہے، مَقَامَ جگہ، مقام، رَبِّهٖ (رَبِّ. ہٖ) رب، اپنے یعنی جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، وَ نَهَی اور روکا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (نَهٰی، یَنْهٰی، نَهْیًا) روکنا، وَ نَهَی النَّفْسَ اور اس نے روکا نفس کو، عَنِ الْهَوٰی بری خواہشات سے هَوٰی کی جمع اَهْوَاءٌ آتی ہے۔ اَهْلُ الْاَهْوَاءِ، بندگانِ نفس، گمراہ لوگ۔ (القاموس الوحید)

یعنی اس شخص نے رب چاہی زندگی گزاری تو اس کی جزا یوں ہے۔

﴿فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی﴾ جنت اس کا ٹھکانا ہوگی۔

فَاِنَّ (فَ. اِنَّ) پس۔ بلاشبہ، الْجَنَّةَ جنت، هِیَ وہی، الْمَاْوٰی اس کا ٹھکانہ ہے۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) یہ دنیا کا کارخانہ رب کریم نے یوں ہی نہیں سجایا بلکہ انسان کو ان گنت انعامات دے کر آزمایا ہے،

ان کے قدردانوں کو ضرور بضرور جزا ملنی چاہیے اور ناقدروں کو سزا۔ اور اس کے لیے آخرت کا دن رکھا گیا ہے۔

۲) موت ایک اٹل حقیقت ہے اور اس کے ساتھ ہی اعمال کی مہلت ختم ہو جاتی ہے، قیامت کبری قائم ہونے سے پہلے ہی راحت یا عذاب کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ ابرار و صالحین کے لیے قبر ہی گوشۂ عافیت بن جاتی ہے جبکہ اَشرار و منکرین کے لیے یہی عذاب کا گھر بن جاتی ہے۔

۳) یہ بے ثبات دنیا فصل بونے کا زمانہ ہے، کل روزِ قیامت فصل کاٹنے کا وقت ہوگا، اور جیسا بوگے ویسا ہی کاٹو گے، کل کلاں اپنے کیے ہوئے اعمال ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔

۴) بات بڑی ہی مختصر ہے، رب چاہی زندگی کامیابی کا راستہ ہے۔ جبکہ من چاہی زندگی ناکامی کی راہ ہے، عقلمند وہی ہے جو اس مختصر سی زندگی کو احکام الٰہی اور اطاعت رسول میں گزار کر حیاتِ ابدی و جاودانی پالے۔

....

﴿یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا (۴۲) فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (۴۳) اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَهٰهَا (۴۴) اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا (۴۵) کَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰهَا (۴۶)﴾

(اے رسول) لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب واقع ہو گی؟ سو اِس کو بیان کرنے سے آپ کو کیا تعلق؟ اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے، آپ تو صرف خبردار کرنے والے ہیں۔ ان کو، جو آخرت سے (رب کے حضور کھڑے ہونے سے) ڈرتے ہیں، جب وہ اسے دیکھیں گے تو انہیں ایسے معلوم ہوگا کہ گویا وہ (دنیا میں) صرف ایک شام یا ایک صبح رہے تھے

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا﴾

(اے رسول) لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب واقع ہوگی۔

يَسْئَلُوْنَكَ (يَسْئَلُوْنَ. كَ) وہ پوچھتے ہیں۔ آپ سے، فعل مضارع جمع مذکر غائب، ''كَ'' ضمیر واحد مذکر غائب، عَنِ السَّاعَةِ قیامت کے بارے میں، عَنْ سے، متعلق حرف جار، یہ بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے، السَّاعَةِ، قیامت حرف جار کے بعد جو لفظ آتا ہے وہ مجرور کہلاتا ہے۔ اَيَّانَ کب، مُرْسٰهَا (مُرْسٰى. هَا) قائم ہونا، اس کا (قیامت کا) رَسَا، يَرْسُوْا، رَسْوًا وَ رُسُوًّا، جم جانا، مضبوطی سے قائم ہونا۔ یعنی اس کا آنا اور قائم ہونا کب ہوگا۔ (المراغی)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''یہ اور اس کے بعد خاتمۂ سورہ کی آیات میں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں کی پروا نہ کریں جو آپ کو زچ کرنے کے لیے قیامت کے ظہور کا وقت پوچھتے ہیں، آپ کا کام اس سے لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے تاکہ جو متنبہ ہونا چاہیں وہ متنبہ ہو جائیں، رہے وہ جو اس کو دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں اور اس کے ظہور کا وقت معلوم کرنے کے درپے ہیں ان کو مطمئن کرنا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے، یہ انہوں نے محض اس کی تکذیب کے لیے ایک بہانہ بنایا ہے۔

مُرْسٰى کے معنی لنگر انداز ہونے کے آتے ہیں، اس لفظ میں یہاں ایک قسم کا طنز مضمر ہے یعنی یہ منکرین پوچھتے ہیں کہ ہم کب سے یہ خبر سن رہے ہیں کہ بس قیامت آیا ہی چاہتی ہے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آئی، آخر اس کا سفینہ ہمارے ساحل میں کب لنگر انداز ہوگا! اس کے انتظار میں تو ہماری آنکھیں پتھرا گئیں!'' (تدبر قرآن، جلد ہشتم)

﴿فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا، اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا﴾

(فرمایا) آپ کو اس بحث سے کیا تعلق؟ اس کا علم تو صرف آپ کے رب کے پاس ہے۔

فِيْمَ (فِيْ. مَ) اس میں، کیا (تعلق) فِيْ میں، حرفِ جر مَا کیا اسم استفہام، مجرور، اَنْتَ تو، آپ،

ضمیر منفصل واحد مذکر حاضر، مِنْ سے، حرف جر ہے، ذِکْرٰهَا (ذِکْرٰ.هَا) ذکر، اس کا (قیامت کا) ذَکَر، یَذْکُرُ، ذِکْرًا، ذکر کرنا، هَا کی ضمیر قیامت کی طرف جاتی ہے۔ اِلٰی رَبِّکَ پاس، آپ کے رب کے، مُنْتَهٰهَا (مُنْتَهٰی.هَا) انتہا، اس کی (یعنی قیامت کی) اَلْاِنْتِهَاءُ اختتام، آخری حد، کمال۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس (قیامت) کی بابت یقینی علم نہیں ہے، اِس لیے، آپ کا اس کو بیان کرنے سے کیا تعلق، اس کی (انتہا) اور یقینی علم تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔'' (احسن البیان)

﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا﴾

آپ تو صرف اس سے ڈرتے رہنے والوں کو آگاہ کرنے والے ہیں۔

اِنَّمَآ اَنْتَ بلاشبہ آپ تو، اِنَّمَا، زورِ بیان کے لیے آتا ہے، اَنْتَ ضمیر منفصل واحد مذکر حاضر۔ مُنْذِرٌ ڈرانے والے، اسم فاعل (اَنْذَرَ، یُنْذِرُ، اِنْذَارٌ) ڈرانا، مَنْ جو، اسم موصول، یَّخْشٰهَا (یَّخْشٰی.هَا) ڈرتا ہے، اس سے هَا کی ضمیر قیامت کی طرف جاتی ہے یعنی قیامت سے ڈرتا ہے (خَشِیَ، یَخْشَی، خَشْیَةً) ڈرتے رہنا، اندیشہ ہونا، اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کا خوف رہنا اور گناہوں سے بچتے رہنا۔

﴿کَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾

کفار جب اس دن کو دیکھ لیں گے، تو ان کا حال ایسا ہوگا جیسے وہ دنیا میں صرف ایک شام یا صرف ایک صبح رہے تھے۔

کَاَنَّهُمْ (کَاَنَّ.هُمْ) کَاَنَّ گویا کہ۔ وہ، کَاَنَّ تشبیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، یَوْمَ (جس) دِن ظرفِ زمان، یَرَوْنَهَا (یَرَوْنَ.هَا) وہ دیکھیں گے۔ اسے (یعنی قیامت کو) مضارع جمع مذکر غائب، هَا کی ضمیر قیامت کی طرف جاتی ہے، لَمْ یَلْبَثُوْٓا وہ نہ رہے تھے، اِلَّا مگر، عَشِیَّةً ایک شام، اَوْ ضُحٰهَا، اَوْ، یا، ضُحٰهَا (ضُحٰی.هَا) صبح ایک، اس کی، هَا کی ضمیر یہاں دنیا کی طرف جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ کا کام رب کریم کا پیغام پہنچا دینا ہے، آپ کی ذمہ داری یہ نہیں کہ لوگوں کو قیامت کی آمد کا یقینی وقت بتائیں، اس کا علم تو صرف آپ کے رب کو ہے، آیت نمبر ۴۶ میں قیامت کی ہولناکی کا بار بار احساس دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ منکرین قیامت جب اپنی آنکھوں سے اس دن کا مشاہدہ کرلیں گے تو مارے رعب و دہشت کے انہیں ایسا لگے گا کہ وہ دنیا میں یا اپنی قبروں میں محض ایک شام یا ایک صبح رہے تھے۔'' (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) منکرین حق نے ہمیشہ قیامت کا انکار کیا ہے اور قرآن حکیم نے ان کے انکار کو کئی مقامات پر نقل کیا ہے۔ سورۃ الجاثیہ میں اس طرح آتا ہے ''وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانہ مار دیتا ہے۔'' (آیت:۲۴) اور صرف یہ لوگ انکار ہی نہیں کرتے بلکہ طنزاً اور مذاقاً بھی کہتے ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو تسلی اور تشفی دی گئی، کہ آپ اس قسم کی باتوں سے کیوں فکر میں مبتلا ہوتے ہیں؟ قیامت کا معاملہ اللہ پر ہے، وہی جانتا ہے کہ یہ کب واقع ہوگی؟ آپ ﷺ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ آپ قیامت کے بارے میں ہر سوال کا جواب دیں اور ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں جنہوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کریں گے۔

۲) منکرین حق کو اس حقیقت کا صرف اس وقت علم ہوگا جب قیامت کا دن آجائے گا، اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی اور دنیا کی یہ زندگی جس کی لذتوں اور مصروفیتوں نے، جس کے غرور اور پندار نے انہیں انجام سے غافل کر دیا ہے، اس وقت بے حقیقت معلوم ہوگی، اور پریشانی کے عالم میں ایسا محسوس ہوگا گویا کہ وہ دنیا میں ایک صبح یا ایک شام سے زیادہ عرصہ نہیں رہے۔

..................o..................

سُوْرَةُ عَبَسَ

اس سورۃ کا پہلا لفظ اس کا علامتی نام ہے، مکی زندگی کا دور اول اس کا زمانہ نزول ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ قریشی سردار ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں بیٹھے تھے۔اس دوران میں عبداللہ بن اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہٗ (نابینا صحابی) حاضر خدمت ہوئے اور آپ ﷺ سے کچھ پوچھنا چاہا، چونکہ آپ صلی اللہ علی وسلم کی توجہ ان سرداروں کی طرف تھی اس لیے آپ ﷺ کو ان کی یہ مداخلت ناگوار ہوئی اور آپ ﷺ نے اُن سے بے رخی برتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ آپ کی یہ فکر کہ قوم کے بااثر افراد کی توجہ سے دین حق کا کام آسان ہو جائے گا، درست نہیں گو آپ کی یہ خواہش اخلاص وللّٰہیت پر مبنی ہے۔

تبلیغ دین کا اصول یہ ہے کہ جو شخص طلب حق کے جذبے کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو، وہ بظاہر کیسا ہی بے اثر، معذور یا کمزور کیوں نہ ہو، اس کی قدر و قیمت اللہ تعالیٰ کے یہاں امراء اور دولتمندوں سے کہیں بڑھ کر ہے، اسی طرح اصول دعوت کے سلسلے میں فرمایا کہ پیغام حق تو سب کو پہنچائیں مگر توجہ ان افراد پر زیادہ مرکوز رکھیں جو طلب حق کی پیاس لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔

دین اسلام تو ایک صاف ستھری دعوت ہے، قرآن رب العالمین کا عظیم کلام ہے جو پاکیزہ صحیفوں میں درج ہے اور اسے معزز اور نیک فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق لکھا اور من وعن خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا اور آپ نے بھی ٹھیک ٹھیک لوگوں کو سنا دیا، جو اسے مان لے اور اس کے احکام پر عمل کرلے وہ بھی بلند ہو جاتا ہے اور اس کے لیے راہ نجات ہے۔

انسان اپنی تخلیق پر غور کرے، رب کریم نے محض اپنی قدرت سے اسے معمولی اور حقیر پانی سے، خوبصورت، عقیل وفہیم، جیتا جاگتا، بنا دیا، پھر جلیل القدر نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عظیم الشان کتاب قرآن حکیم کو نازل فرمایا تاکہ لوگ اس سے بہرہ مند ہو کر اپنی دنیا اور آخرت سنوار لیں اور جس نے زندگی عطا کی ہے، وہی موت دیتا ہے اور پھر دوبارہ اٹھانے پر بھی وہ قادر ہے۔

انسان کو اشیاء خورد ونوش پر توجہ دینی چاہیے کہ کس طرح رب کریم نے اس کے لیے طرح طرح کے اناج، میوہ جات، پھل پھول، سبزیاں پیدا فرمائی ہیں جو اس کے لیے اور اس کے جانوروں کے لیے سامان زیست ہیں۔

جس طرح یہ تمام باتیں حقیقت اور روزمرہ تمہارے مشاہدے میں آتی ہیں اسی طرح روز قیامت بھی اٹل حقیقت ہے جس میں تمام رشتے داریاں ختم ہو جائیں گی...... یہاں تک کہ قریب ترین رشتے، ماں باپ، بہن بھائی خاوند بیوی بھی اجنبی بن جائیں گے اور صرف نیک اعمال ہی انسان کے کام آئیں گے۔

سُوْرَةُ عَبَسَ

آیات:۴۲ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی(۱) اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی(۲) وَ مَا یُدۡرِیۡکَ
لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی(۳) اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی(۴) اَمَّا مَنِ
اسۡتَغۡنٰی(۵) فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی (۶) وَمَا عَلَیۡکَ اَلَّا
یَزَّکّٰی(۷) وَ اَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی(۸) وَ ہُوَ یَخۡشٰی
(۹) فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی(۱۰)

(رسول ﷺ) چیں بہ جبین ہوئے اور اِعراض کیا، اس لیے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا، آپ کو کیا معلوم شاید وہ تزکیہ اختیار کرتا یا موعظت قبول کرتا اور اسے نصیحت کرنا فائدہ ہی پہنچاتا، مگر جو شخص بے پروائی کرتا ہے آپ اُس کی فکر میں ہیں، حالانکہ اگر وہ نہیں سنورتا تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، جبکہ جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ (اللہ سے) ڈرتا ہے، تو آپ اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں

﴿عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی﴾

(رسول ﷺ) چیں بہ جبیں ہوئے اور اعراض کیا۔

عَبَسَ فعل ماضی واحد مذکر غائب (عَبَسَ، یَعۡبِسُ، عَبۡسًا) تیور چڑھنا، پیشانی پر بل پڑنا، ترش رو ہونا، چیں بہ جبیں ہونا (القاموس الوحید) دل کی تنگی سے ماتھے پر بل آ جانے کا نام عَبُوۡسٌ ہے۔(امام راغب)

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے۔ تَوَلّٰی، منہ پھیرا (اِعراض کیا) (تَوَلّٰی،

یَتَوَلّٰی)اِعراض کرنا،منہ پھیرنا۔

﴿اَنْ جَآءَ هُ الْاَعْمٰی﴾

اس لیے کہ آیا ان کے پاس ایک نابینا۔

اَنْ کہ،جَآءَ هُ (جَآءَ.هُ) آیا،اس کے پاس (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس)،(جَاءَ، یَجِیءُ، مَجِیءٌ) آنا،هُ ضمیر واحد مذکر غائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، الْاَعْمٰی نابینا۔اس سے مراد عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں۔

﴿وَ مَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی﴾

آپ کو کیا معلوم شاید وہ تزکیہ اختیار کرتا۔

وَمَا اور کیا،مَا اسم استفہام،یُدْرِیْکَ (یُدْرِیْ.کَ) جانتے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم۔(اَدْرٰی، یُدْرِیْ) جاننا، لَعَلَّهٗ (لَعَلَّ.هٗ) شاید،وہ، یہاں پرهٗ کی ضمیر اس نابینا شخص (عبداللہ بن ام مکتوم) کی طرف جاتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی بات پوچھنے آئے تھے،یَزَّکّٰی وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔فعل مضارع معروف،واحد مذکر غائب۔

﴿اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی﴾

یا موعظت قبول کرتا اور اسے نصیحت کرنا فائدہ ہی پہنچاتا۔

اَوْ یا،یَذَّکَّرُ نصیحت حاصل کرتا۔اصل میں یہ(تَذَکَّرَ، یَتَذَکَّرُ) تھا،یَتَذَکَّرُ قاعدہ ادغام کے تحت یَذَّکَّرُ ہوا، فَتَنْفَعَهُ (فَ.تَنْفَعَ.هُ) پس، فائدہ دیتی اسے، الذِّکْرٰی (یہ) نصیحت، (نَفَعَ، یَنْفَعُ، نَفْعٌ) نفع دینا،فائدہ دینا،تَنفَعُ،فعل مضارع واحد مؤنث غائب هُ کی ضمیر عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف جاتی ہے۔

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی﴾ مگر جو شخص بے پروائی کرتا ہے۔

اَمَّا مگر، مَنْ جو، اِسْتَغْنٰی بے پروائی کرتا ہے (اِسْتَغْنٰی، یَسْتَغْنِیْ، اِسْتِغْنَاءٌ) بے پروا ہونا، باب استفعال، یعنی ایسا شخص جس نے احتیاج نہ رکھی اور دین اسلام کی تبلیغ اور نصیحت سے بے نیازی اختیار کیے رکھی۔

﴿ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی﴾ تو آپ اس کی فکر میں ہیں۔

فَاَنْتَ (فَ. اَنْتَ) پس۔آپ، ضمیر واحد مذکر حاضر، لَهٗ (لَ. ہٗ) لیے، اُس کے (جس نے بے نیازی اختیار کر رکھی ہے)، تَصَدّٰی آپ درپے ہوتے ہیں، آپ فکر میں ہیں۔تَصَدّٰی لِلْاَمْرِ توجہ دینا، کسی کام پر لگ جانا، درپے ہونا، کسی کے لیے فکر مند ہونا، پیچھے پڑنا۔(القاموس الوحید)

﴿وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی﴾

اور نہیں ہیں آپ اِس بات کے ذمہ دار کہ وہ پاک نہیں ہوتا۔

وَمَا عَلَیْکَ اور نہیں ہے (عَلٰی. کَ) اوپر۔آپ کے، ک کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علی وسلم کی طرف جاتی ہے، اَلَّا یَزَّکّٰی کہ وہ پاک نہیں ہوتا۔

﴿وَ اَمَّا مَنْ جَآءَ کَ یَسْعٰی﴾

جبکہ وہ جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔

وَ اَمَّا اور لیکن، مَنْ جو، جَآءَ کَ (جَآءَ. کَ) آیا۔آپ کے پاس، یَسْعٰی دوڑتا ہوا، مضارع واحد مذکر غائب (سَعٰی، یَسْعٰی سَعْیٌ) کوشش کرنا، جستجو کرنا۔

وَ هُوَ اور، وہ ضمیر واحد مذکر غائب، یَخْشٰی وہ ڈرتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (خَشِیَ، یَخْشٰی، خَشْیَةٌ) ڈرنا، خوف محسوس کرنا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا خوف محسوس کرتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے۔

﴿فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی﴾ تو آپ اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔

فَاَنْتَ (فَ. اَنْتَ) پس۔آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)، عَنْهُ (عَنْ. ہُ) سے۔اُس، یعنی اس سے،

تَلَهّٰى بے اعتنائی برتتے ہیں، اس لفظ کا مادہ لَهْوٌ ہے جس کا معنی کھیل کود، تفریح طبع، تفریحی مشغلہ، بہلاوا ہے، تَلَهّٰى عَنْهُ کسی سے منہ موڑ کر اپنے کام میں لگ گیا، بے توجہ ہوا۔ (القاموس الوحید)

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نابینا صحابی عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر بل پڑ گیا کیونکہ آپ اس وقت قریش کے بڑے لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے، اُس وقت اس نابینا کا آنا اور اپنی بات کہنی شروع کر دینا، آپ کو ناگوار ہوا تو رب کریم کی طرف سے وحی نازل ہوئی اور ارشاد ہوا'' اے ہمارے رسول! آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اُس کے آنے سے حرج ہوا، شاید انہیں (عبداللہ ابن ام مکتوم) کو آپ کی باتوں سے دل و جان کی پاکیزگی نصیب ہو جاتی یا قرآن کی آیات وہ سنتے اور سمجھتے تو اس سے ان کو نفع پہنچتا، آپ اُن کو سمجھانے میں لگے ہوئے ہیں جو آپ کی پروا نہیں کرتے اور برائیوں سے پاک ہونا نہیں چاہتے اور نہ سمجھنا ہی چاہتے ہیں۔ آپ کے اوپر اُن کا سمجھانا ضروری نہیں، وہ برائیوں میں لت پت رہنا چاہتے ہیں تو رہنے دیجیے، آپ پر کوئی الزام نہیں لیکن جو اللہ سے ڈر کر آپ کے پاس دوڑا آتا ہے اور آپ کی نصیحت ماننے کو تیار ہے، آپ کا اس سے منہ موڑنا مناسب نہیں۔'' (درس قرآن، جلد ہفتم)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) ان آیات مبارکہ میں دعوت و تبلیغ کے اسلوب اور طریقِ کار کی نشاندہی کی گئی ہے، اگرچہ ان آیات میں داعیِ اعظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے تاہم اس میں ہر داعی الی اللہ کے لیے عظیم موعظت و نصیحت کا سامان موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے سرداروں کو اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے کہ نابینا صحابی عبداللہ ابن ام مکتوم تلاش حق میں طلب اور تڑپ کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جبین اطہر پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے جو کہ بشری تقاضا تھا لیکن رب کریم نے بتایا کہ جو طلبِ صادق، تمنا اور تڑپ کے ساتھ آپ کے پاس چل کر آیا ہے، اُسے خوش آمدید کہیے، اس کی علمی پیاس بجھائیے اور ان لوگوں پر اسے ترجیح

دیجیے جو اگرچہ اپنی قوم کے سردار ہیں مگر ان کا شمار مخالفین میں ہوتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیاسوں کی پیاس بجھانا زیادہ اہم ہے اور ہر داعی کو یہ بات پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

۲) سورہ کے آغاز میں ''عَبَس وَ تَولّٰی'' غیب کے صیغے لائے گئے ہیں اور براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب نہیں کیا گیا ہے اس سے آپ ﷺ کی جلالتِ شان اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

۳) جو شخص دعوت حق پر معاندانہ رویہ اختیار کرتا ہے اس سے ملول خاطر نہ ہونا چاہیے، اُس کے دل کو بدلنے کی ذمہ داری داعی پر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے، داعی کا کام ہمت اور حوصلے سے دعوتِ حق کو بلاکم و کاست پہنچا دینا ہے۔

۴) داعی الی اللہ کے لیے ضروری ہے کہ حق بات مِن و عَن بیان کردے، ان آیات سے آشکارہ ہوتا ہے کہ داعی اعظم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کی ہر بات بیان فرمادی۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی میں سے کوئی بات چھپانا ہوتی تو عتاب والی ان آیات کو چھپاتے۔(بحوالہ ایسر التفاسیر۔ابوبکر جابر الجزائری)

....

﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ(۱۱) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ(۱۲) فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ (۱۳) مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (۱۴) بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ(۱۵) كِرَامٍ بَرَرَةٍ(۱۶)﴾

یاد رکھیے! یہ (قرآن تو) ایک یاددہانی ہے، لہٰذا جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے یہ تو بڑے ہی تکریم والے بلند مرتبہ اور پاکیزہ صحیفوں میں ہے اور ایسے لکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے جو بزرگ اور نیکوکار ہیں۔

﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ﴾

یاد رکھیے یہ (قرآن تو) ایک یاد دہانی ہے۔

كَلَّآ یہ حرف زجر اور تنبیہ کے لیے آتا ہے اور گزشتہ کلام کی نفی کرتے ہوئے اس کے بعد صحیح اور درست بات بیان کی جاتی ہے اس کا ترجمہ ''ہرگز نہیں، بلکہ اصل بات یوں ہے یا پھر یاد رکھیے، حقیقت یہ ہے''، کیا جاتا ہے۔ اِنَّهَا (اِنَّ. هَا) بے شک۔ یہ، ھا کی ضمیر واحد مونث آیات القرآن یا سورۃ کی طرف جاتی ہے، تَذْكِرَةٌ نصیحت ہے۔ یعنی یہ قرآن اللہ کی مخلوق (انسان) کے لیے پند و نصیحت ہے۔ (تفسیر القرطبی)

''اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ'' ''اِنَّ آيَاتِ الْقُرْآنِ مَوْعِظَةٌ وَ تَذْكِيرٌ'' بلاشبہ قرآن کی آیات موعظت اور یاد دہانی ہیں۔ (کلمات القرآن، شیخ حسنین مخلوف)

﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾

تو جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

فَمَنْ (ف. مَنْ) پس۔ جو، شَآءَ چاہے، ماضی واحد مذکر غائب (شَاءَ، يَشَاءُ، مَشِيْئَةٌ) چاہنا، خواہش رکھنا، ذَكَرَهٗ (ذَكَرَ. هٗ) قبول کرے۔ اسے، نصیحت حاصل کرے اس سے (یعنی قرآن حکیم سے) ہٗ کی ضمیر قرآن حکیم کی طرف جاتی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''كَلَّآ یعنی اس طرح کے ناقدروں سے اس طرح چمٹنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے، یہ قرآن بس ایک یاد دہانی ہے، جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور جس کا جی چاہے وہ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے یہ لوگوں کو آگاہ کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر پر ذمہ داری لوگوں تک اس یاد دہانی کو پہنچا دینے کی ہے، یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کو اتار بھی دے، اس پر ذمہ داری اِنذار کی ہے نہ کہ ایک ایک کی ناز برداری کی۔'' (تدبرِ قرآن، جلد ہشتم)

﴿فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ﴾
(یہ قرآن عظیم درج ہے) صحیفوں میں جو عزت والے ہیں۔

فِیْ میں، حرف جار، صُحُفٍ صحیفے مجرور، اس کا مفرد صَحِیْفَةٌ لکھا ہوا ورق، اور صحیفے لکھے ہوئے اوراق، مُّکَرَّمَةٌ، عزت والے، اسم مفعول صُحُفٍ موصوف اور اس کی صفت مُکَرَّمَةٌ ہے۔ (کَرَّمَ، یُکَرِّمُ، تَکْرِیْمٌ) عزت دینا، عزت بخشنا۔

﴿مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ (یہ صحیفے) بلند ہیں، پاکیزہ ہیں۔

(رَفَعَ، یَرْفَعُ، رَفْعٌ) بلند کرنا، اس سے اسم مفعول واحد مؤنث کا صیغہ مَّرْفُوْعَةٌ ہے۔ مُّطَهَّرَةٍ پاکیزہ، اسم مفعول واحد مونث، مَّرْفُوْعَةٍ اور مُّطَهَّرَةٍ، صُحُفٍ کی صفات ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متکبرین سے اِعراض اور بے پروائی برتنے کی جو ہدایات فرمائی گئی ہے، اس کی مزید وضاحت ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہارے شایانِ شان بات یہ نہیں ہے کہ ان مغروروں کے آگے تم اپنے آپ کو جھکاؤ، اسی طرح یہ کلام بھی، جو تم ان کو سنا رہے ہو، ایسی چیز نہیں ہے جو منت وسماجت کے ساتھ پیش کی جائے بلکہ یہ نہایت ہی اشرف، نہایت ہی بلند اور نہایت ہی پاکیزہ و برتر چیز ہے، یہ کوئی ناقص جنس نہیں ہے کہ تمہیں یہ فکر کرنی پڑے کہ کسی نہ کسی طرح یہ بک ہی جائے اگرچہ اس کی خاطر تمہیں خریداروں کی خوشامد ہی کرنی پڑے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے خزانۂ محفوظ کے لعل و گہر ہیں جو تم مفت لٹا رہے ہو، اگر یہ لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ اپنے ہی کو ابدی خسارے میں مبتلا کر رہے ہیں۔'' (تدبر قرآن، جلد ہشتم)

﴿بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ، کِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾
اور ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے جو بزرگ اور نیکوکار ہیں۔

بِاَیْدِیْ (بِ. اَیْدِیْ) ساتھ۔ ہاتھوں کے، یَدٌ، ہاتھ، اس کی جمع اَیْدِیْ ہے یعنی یہ قرآن اُن

(بزرگ) فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ سَفَرَةٍ اس کا مفرد سافِرٌ ہے جس کے معنی قاری اور کاتب کے ہیں، سَفَرَ پڑھنے اور لکھنے دونوں معنی میں آتا ہے۔ (تدبر قرآن) كِرَامٍ بزرگ، جلیل القدر، کریمٌ اس کا مفرد ہے، بَرَرَةٍ، نیک متقی، اس کا مفرد بَارٌّ ہے، یہ ان فرشتوں کی صفات بیان ہوئی ہیں جنہوں نے قرآن مجید کی حفاظت وصیانت کی ہے۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) مبلغ اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رب کریم سے حکم ہوتا ہے کہ آپ دعوت وتبلیغ کے لیے ایسا رویہ ہرگز اختیار نہ کریں جو آپ کے شایان شان نہ ہو، آپ قوم کے ان سرکش اور مغرور سرداروں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے کوئی ایسی صورت اختیار نہ کریں جو آپ کے اور آپ کی دعوت کے مقام سے گری ہوئی ہو۔ آپ کی اصل توجہ کے مستحق تو وہی مؤمن ہیں جو چاہے غریب اور بے کس ہیں لیکن ایمان کی دولت سے مالا مال ہو چکے ہیں اور یہی بات ہر داعی الی الخیر کے لیے ہمیشہ مشعل راہ ہے۔

۲) یہ قرآن تو ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے، یہی وہ قیمتی نعمت ہے جو خالق کائنات نے اپنی رحمت سے انسانوں کی ابدی رہنمائی کے لیے نازل فرمائی ہے، جس سے وہ لازوال زندگی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ تو اب جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں اور جو خواہشات کے بندے بن جائیں وہ راہِ حق کو نہیں پا سکتے ہیں۔

۳) اس عظیم کتاب کی حفاظت کا زبردست انتظام وانصرام ہے، یہ مقدس اوراق میں لکھی ہوئی ''لوح محفوظ'' میں موجود ہے، وہاں سے بزرگ اور نیکوکار فرشتے حزم واحتیاط سے نقل کر کے لائے ہیں اور جبریل امین نے خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر اسے نازل کیا۔

....

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ(۱۷) مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ(۱۸)
مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ(۱۹) ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ(۲۰) ثُمَّ
اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۲۱) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۲۲) كَلَّا لَمَّا
یَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ(۲۳)﴾

(کافر) انسان پر اللہ کی مار، کیسا ناشکر گزار ہے! (اس نے یہ بھی نہ سوچا، کہ اللہ نے) اسے کس چیز سے پیدا کیا ہے؟ نطفہ سے اس کی تخلیق کی، پھر اسے (مناسب) انداز سے بنایا، پھر اس کے لیے (فہم وشعور عطا کر کے زندگی کا) راستہ آسان کر دیا، پھر (زندگی کے بعد) اسے موت دی، پھر وہ اسے قبر میں لے گیا، پھر جب چاہے گا اسے دوبارہ زندہ کر دے گا۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے تھا؟ اللہ تعالیٰ نے اسے جو حکم دیا تھا اس نے اس کی تعمیل نہیں کی

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ﴾

(کافر) انسان پر اللہ کی مار، یہ کیسا ناشکرا ہے؟

قُتِلَ مارا جائے، فعل ماضی مجہول واحد مذکر غائب (قَتَلَ، یَقْتُلُ، قَتْلٌ) مارنا، الْاِنْسَانُ انسان اس سے مراد وہ انسان ہے جو کفر اور ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ اَیْ لُعِنَ الْاِنْسَانُ الْكَافِرُ مَا أَشَدَّ كُفْرَهٗ، یعنی کافر انسان ملعون ہے کہ اس نے کفر میں شدت اختیار کی ہے، (زبدۃ التفسیر من فتح القدیر)

مَآ اَكْفَرَهٗ استفہام توبیخ، اَیْ مَا حَمَلَهٗ عَلَى الْكُفْرِ (تفسیر جلالین) تنبیہ کے طور پر پوچھا جا رہا ہے کہ کس بات نے اسے کفر پر لگا دیا ہے۔

﴿مِنۡ اَیِّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ﴾ (اللہ نے) اسے کس چیز سے پیدا کیا ہے؟

مِنۡ، سے، حرف جر، اَیِّ شَیۡءٍ کسی چیز، مِنۡ اَیِّ شَیۡءٍ کس چیز سے، خَلَقَهٗ (خَلَقَ.ہٗ) پیدا کیا (اللہ نے) اسے (انسان کو) (خَلَقَ، یَخۡلُقُ، خلقًا) پیدا کرنا، اَلۡخَالِقُ پیدا کرنے والا، اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ہے، اس آیہ مبارکہ میں بتلادیا گیا کہ انسان اگر اپنی پیدائش پر غور وفکر کرے تو اپنی اصلیت سے کماحقہ اسے آگاہی حاصل ہو جائے۔

﴿مِنۡ نُّطۡفَةٍؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ﴾

نطفہ سے اس کی تخلیق کی پھر اسے (مناسب) انداز سے بنایا۔

مِنۡ سے، حرف جر، نُّطۡفَةٍ، نطفہ، خَلَقَهٗ (خَلَقَ.ہٗ) اس (یعنی اللہ تعالیٰ) نے پیدا کیا، اسے، ہٗ کی ضمیر انسان کی طرف جاتی ہے، فَقَدَّرَهٗ (ف.قَدَّرَ.ہٗ) پس، اس نے موزوں بنایا، اسے، یعنی شکل و صورت کے لحاظ سے یا عقل وفہم کے لحاظ سے موزوں اور مناسب بنایا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''نہ صرف عملِ تخلیق بلکہ ترکیب انسانی میں تناسب وتوازن اور قویٰ، اعضاوغیرہ کی ساخت، ترتیب ہر شے قدرتِ الٰہی وحکمت کاملہ پر دلیل کا کام دے رہی ہے۔''

﴿ثُمَّ السَّبِیۡلَ یَسَّرَهٗ﴾ پھر اس کے لیے راستہ آسان بنادیا۔

ثُمَّ پھر، حرف عطف، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، السَّبِیۡلَ راستہ، اس کی جمع سُبُلٌ آتی ہے، یَسَّرَهٗ (یَسَّرَ.ہٗ) اس (رب قدیر) نے اس کے لیے آسان فرمادی۔ اس کی رحمت اور قدرت کاملہ سے بطن مادر میں اس کی پرورش کا سروسامان کیا، پھر پیدائش کی راہ آسان فرمادی، پھر اس کی نشوونمو کے لیے والدین کے دل میں انس ومحبت کی لو لگادی، اس طرح وہ زندگی میں پھلنے پھولنے کے قابل ہوا، اور سب سے بڑھ کر زندگی میں اسے ایسی سوجھ بوجھ اور فہم وادراک عطا کیا کہ وہ کھرے اور کھوٹے میں، نیکی اور بدی میں فرق کو پہچان سکے، اگر وہ عقل سلیم کو ضائع نہ ہونے دے تو یقیناً راہ ہدایت سے ہمکنار ہو جاتا

ہے،اس سے بڑھ کر انعام یہ کیا کہ وحی الٰہی سے اس کے لیے روشنی اور ہدایت کا راستہ واضح کر دیا، انبیاء علیھم السلام اسی نور ہدایت کو پھیلانے کے لیے تشریف لاتے رہے، تا آنکہ یہ سلسلہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔ اب یہ بات اس پر ہے کہ ہدایت کی اس راہ کو اختیار کرے اور ابدی کامیابی سے ہمکنار ہو یا خواہشات نفس کا پجاری بن کر تباہی و بربادی کا سامان تیار کرے۔

﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ﴾ پھر اسے موت دی، پھر وہ اسے قبر میں لے گیا۔

ثُمَّ پھر، حرف عطف، اَمَاتَهٗ (اَمَاتَ . هٗ) اس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) موت دی، اسے (یعنی انسان کو) (اَمَاتَ، یُمِیْتُ، اِمَاتَةٌ) مارنا، موت دینا، اَمَاتَ ماضی واحد مذکر غائب، هٗ ضمیر واحد مذکر غائب، فَاَقْبَرَهٗ (فَ . اَقْبَرَ . هٗ) پس، قبر میں اتارا، اسے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''یہ زندگی کے آخری مرحلہ کی طرف اشارہ ہے کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو موت دیتا اور دفن کراتا ہے، ہر پیدا ہونیوالے کے لیے پیدا ہونے کے بعد سب سے زیادہ یقینی چیز موت ہی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس کو ایسے ضابطوں کے اندر جکڑ رکھا ہے کہ موت سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں ہے، اس کی کمند بالکل بے خطا ہے۔

اَقْبَرَهٗ کے معنی کسی کو قبر میں رکھوانا یا دفن کرانا ہے، اس لفظ میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جو مرتا ہے، وہ فنا نہیں ہو جاتا بلکہ قدرت الٰہی اس کو زمین کی تحویل میں دے دیتی ہے، جو شے تحویل میں دی جاتی ہے وہ لازماً ایک دن واپس لی جاتی ہے، چنانچہ جب وقت آئے گا، اللہ تعالیٰ اس امانت کو زمین سے واپس لے گا۔'' (تدبر قرآن، جلد ہشتم)

﴿ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ﴾ پھر جب چاہے گا، اسے دوبارہ زندہ کرے گا۔

ثُمَّ پھر، حرف عاطفہ، اِذَا جب، شَآءَ ماضی واحد مذکر غائب (شَاءَ، یَشَاءُ، مَشِیْئَةٌ) چاہنا، اَنْشَرَهٗ (اَنْشَرَ . هٗ) زندہ کر کے اٹھائے گا، اسے۔

اَنۡشَرہٗ ای اَحۡیَاہُ بَعۡد موتِہٖ۔یعنی انسان کے اس دنیا سے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ فرمائے گا۔(کلمات القرآن، حسنین مخلوف)

جو نیست سے ہست میں لایا، وہ یقیناً دوبارہ ایسا کرنے پر قادر ہے، وہ تو صرف ''کُنۡ'' فرماتا ہے اور وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔اِنَّمَآ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ(یٰسٓ:۸۲)''وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہوجا اور وہ ہوجاتی ہے۔

﴿کَلَّا لَمَّا یَقۡضِ مَاۤ اَمَرَہٗ﴾

ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے جو حکم دیا تھا اس نے اس کی تعمیل نہ کی۔

کَلَّا کلمہ تنبیہ وتوبیخ(جھڑکنا اور باز رکھنا) اور بعض اوقات ذَم(مذمت کرنا) کے معنی بھی دیتا ہے، لَمَّا یَقۡضِ نہ پورا کیا، نہ تعمیل کی، مَاۤ اَمَرَہٗ جس بات کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تھا۔

لَمَّا یَقۡضِ مَاۤ اَمَرَہٗ اَیۡ لَمۡ یَفۡعَلۡ مَا اَمَرَہُ اللّٰہُ بِہٖ بَلۡ قَصَّرَ۔یعنی انسان نے اس حکم کی تعمیل نہ کی جو اللہ تعالیٰ نے اسے دیا تھا بلکہ اس میں کوتاہی اور غفلت کا شکار ہوا۔(کلمات القرآن، الشیخ حسنین مخلوف)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''یہ آیت اوپر والی آیت ''قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ مَاۤ اَکۡفَرَہٗ'' کے بالکل متوازی آیت ہے جس طرح اُس میں ہٹ دھرموں کی ہٹ دھرمی پر اظہار تعجب اور پھر ان کے اپنے وجود سے اس قیامت پر دلیل ہے جس کو وہ ناممکن سمجھ رہے تھے اسی طرح اس آیت میں ان کی کج فہمی پر باندازِ زجر وملامت اور اس کے بعد قیامت اور جزا وسزا پر اس اہتمامِ ربوبیت سے دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے گردوپیش میں پھیلا رکھا ہے اور جو زبانِ حال سے یہ شہادت دے رہا ہے کہ جس انسان کے لیے رب کریم نے یہ خوانِ نعمت بچھایا ہے وہ غیر مسئول نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ اس کے لیے لازماً ایک روزِ حساب آنے والا ہے ﴿لَمَّا یَقۡضِ مَاۤ اَمَرَہٗ﴾ کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک سمجھانے اور دلائل پیش کرنے کا تعلق ہے، اب اس میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے لیکن ان ضدیوں کی ضد اور پندار کا وہی حال ہے جو پہلے تھا، جس دن کے لیے تیاری کی ان کو ہدایت کی جارہی ہے، اب بھی وہ اس سے بے پروا ہیں ''مَاۤ اَمَرَہٗ''

میں وہ تمام احکام واوامر بھی داخل ہیں جو فطرت کی بدیہات میں سے ہیں اور وہ احکام بھی جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے۔(تدبر قرآن، جلد ہشتم)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بنایا اور سجایا اور انسان کو اشرف المخلوقات بنایا بلکہ اسے اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، اسے عقل وشعور اور علم وعرفان ایسی نعمت عطا فرمائی اور ابدی کامیابی کے لیے انبیائے کرام کے ذریعہ ہدایت کا سلسلہ بھی جاری فرمادیا اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب روشن قرآن حکیم سے نوازا، اس نعمت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ''مارا جائے یہ (ناشکرا) انسان'' یہ جملہ انسان کی اس روش پر غصہ اور نفرت کے اظہار کے لیے ہے، اور اس کا سبب یہ بیان فرمایا کہ کیسا ناقدرا اور احسان فراموش ہے کہ اس قدر عظیم نعمت پانے کے بعد بھی اس کا قدردان نہیں ہے۔

۲) انسان میں یہ غرور وتکبر اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی پیدائش پر غور وفکر نہیں کرتا ہے اور نتیجتاً اپنے خالق ومالک کا باغی بن بیٹھتا ہے...... معمولی اور حقیر پانی سے، رب قدیر نے اسے جیتا جاگتا، خوبصورت اور صحت مند انسان بنا دیا اور زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے اسے مختلف صلاحیتوں سے نوازا، وہ کاریگر ایسا کہ لاکھوں اور اربوں انسانوں کی صورت اور آواز میں تھوڑا بہت فرق رکھا یہاں تک کہ انگوٹھوں کے نشانات سے بھی ممیز فرمادیا...... اور پھر کائنات پر غور وفکر کیجیے، فرش سے عرش تک ان گنت نعمتوں کا جال بچھا ہوا ہے اور کسی عظیم کاریگر کی کاریگری کا پتہ چلتا ہے...... یہ وسیع وعریض زمین وآسمان، یہ آفتاب وماہتاب کا طلوع وغروب، یہ موسموں کا تغیر وتبدل، یہ لیل ونہار کی آمد ورفت اور ان میں ترتیب وتناسب سے خالق کائنات کی عظیم کاریگری ہویدا ہوتی ہے، اور پھر مخلوق کی موت وحیات سے کون منکر ہوسکتا ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی موت کے سامنے عاجز اور بے بس نظر آتا ہے، دنیا میں کتنے فرعون پیدا ہوئے مگر موت نے انہیں خاک میں ملادیا، موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا ہے، جس خالق

نے زندگی عطا کی وہی موت دیتا ہے......اور جس نے پہلی بار زندگی دی وہ دوبارہ زندہ کرنے پر
بھی قادر ہے، انسان کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

....

﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ(۲۴) اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ
صَبًّا(۲۵) ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا(۲۶) فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا
حَبًّا(۲۷) وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا(۲۸) وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا(۲۹) وَّ
حَدَآئِقَ غُلْبًا(۳۰) وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا(۳۱) مَّتَاعًا لَّكُمْ
وَلِاَنْعَامِكُمْ(۳۲)﴾

پھر ذرا انسان اپنی غذا ہی کو دیکھے (کہ وہ کیونکر پیدا ہوتی ہے) ہم نے اوپر سے خوب پانی برسایا، پھر ہم نے زمین کو جا بجا پھاڑ دیا، پھر ہم نے اُس میں (طرح طرح) کے اناج اُگائے، اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور میوہ جات اور گھاس (جو) تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے کام آتے ہیں۔

﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ﴾

پھر ذرا انسان اپنی غذا ہی کو دیکھے (کہ وہ کیونکر پیدا ہوتی ہے)۔

فَلْيَنْظُرِ (فَ+ لْ+ يَنْظُرِ) پس، چاہیے، کہ دیکھے، الْاِنْسَانُ انسان، اس سے مراد تمام انسان ہیں، اِلٰى طرف، حرف جر ہے، طَعَامِهٖٓ (طَعَامِ.هٖ) اپنے، کھانے (کے) طعام مجرور، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب یعنی وہ لقمہ جو انسان اپنے منہ میں ڈالتا ہے، وہ کن کن مراحل سے گزرتا ہے......کسان جھاڑ جھنکار

سے اپنے کھیت کو صاف کرتا ہے، ہل چلاتا ہے، بیج بوتا ہے، پانی دیتا ہے پھر بارانِ رحمت کا منتظر رہتا ہے، ہفتوں اور مہینوں اس کی نگہبانی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُس کی کھیتی پھلتی پھولتی ہے اور پک کر تیار ہو جاتی ہے، فصل کی کٹائی اور صفائی ہوتی ہے اور مارکیٹ میں بکنے کے لیے آتی ہے جسے آپ خرید کر گھر لاتے ہیں اور یہ غلہ آپ کی زندگی کا سروسامان ہوتا ہے۔

﴿اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا﴾ ہم نے اوپر سے خوب پانی برسایا۔

اَنَّا (اَنَّ. نَا) بلاشبہ، ہم نے، اَنَّ مشبہ بالفعل، کلام میں زور اور تاکید کے لیے آتا ہے، نَا ضمیر جمع متکلم، اللہ تعالیٰ واحد ہے، اس کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت کے آتا ہے، صَبَبۡنَا، برسایا ہم نے (صَبَّ، یَصُبُّ، صَبٌّ) (پانی) اوپر سے گرانا، انڈیلنا، الۡمَآءَ پانی، صَبًّا (خوب) برسایا دوبارہ صَبًّا لا کر اس کی خوبی کو بیان کیا گیا ہے، یہ عربی زبان کا شاندار اسلوب ہے۔ یعنی اس قدر پانی برسایا کہ تمہارے کھیت سیراب ہو گئے اور تمہاری فصلیں لہلہانے لگیں۔

﴿ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا﴾ پھر ہم نے زمین کو جا بجا پھاڑ دیا۔

ثُمَّ پھر، حرف عطف سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے آتا ہے، شَقَقۡنَا شق کیا (پھاڑا) ہم نے (شَقَّ، یَشُقُّ، شَقًّا) پھاڑنا۔ شگاف بنانا۔ شَقًّا (اچھی طرح) پھاڑنا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”زمین کو پھاڑنے سے مراد اس کو اس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں یا نباتات کی پنیریاں انسان اس کے اندر بوئے یا جو ہواؤں اور پرندوں کے ذریعے سے، یا کسی اور طریقے سے اس کے اندر پہنچ جائیں، وہ کونپلیں نکال سکیں، انسان اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ زمین کو کھودتا ہے یا اس میں ہل چلاتا ہے اور جو تخم اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیے ہیں، انہیں زمین کے اندر اتار دیتا ہے، اس کے سوا سب کچھ اللہ کا کام ہے، اُسی نے بے شمار اقسام کی نباتات کے تخم پیدا کیے ہیں، اسی نے ان تخموں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ پھوٹیں اور ہر تخم سے اس کی جنس کی نباتات اگے اور اسی نے زمین میں یہ

صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کروہ ان تخموں کو کھولے اور ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کی مناسب حال غذا بہم پہنچا کر اسے نشوونما دے، یہ تخم ان خاصیتوں کے ساتھ اور زمین کی یہ بالائی تہیں ان صلاحیتوں کے ساتھ خالق کائنات نے پیدا نہ کی ہوتیں تو کیا انسان کوئی غذا بھی یہاں پا سکتا تھا؟

(تفہیم القرآن۔جلد ششم)

﴿فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا حَبًّا﴾

پھر ہم نے اس میں (طرح طرح) کے اناج اُگائے۔

فَ پس عاطفہ اَنۡۢبَتۡنَا اگائے ہم نے، فِیۡهَا (فِیۡ.هَا) میں۔اس، یعنی اس زمین میں، حَبًّا اناج، غلہ اس کا مفرد حَبّۃٌ ہے۔اناج کی کئی اقسام ہیں......گندم، چاول، چنا، مکئی، باجرہ، دالیں وغیرہ۔

﴿وَّ عِنَبًا وَّ قَضۡبًا﴾ اور انگور اور ترکاریاں۔

وَ اور عاطفہ، سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے، عِنَبًا انگور، یا انگور کی بیل کو کہتے ہیں اس کی جمع أعۡنَابٌ آتی ہے، قَضۡبًا، ترکاری، اس میں ہر قسم کی سبزی آجاتی ہے کہ اس کی ہر نوع اپنی جگہ الگ تاثیر اور فائدہ رکھتی ہے اور جسے ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق استعمال میں لاتا ہے، پھر انگور ایسے قیمتی پھل کا ذکر کیا گیا ہے کہ اطبا کے نزدیک لوگوں کے لیے اس میں بے شمار فوائد ہیں۔

﴿وَّ زَیۡتُوۡنًا وَّ نَخۡلًا﴾ اور زیتون اور کھجور۔

وَ اور، عاطفہ، زَیۡتُوۡنًا زیتون، ایک پھل جو عناب کی شکل کا ہوتا ہے، اسے کھایا جاتا ہے اور اس کا تیل استعمال کیا جاتا ہے، اس کے درخت کو بھی زیتون کہتے ہیں (القاموس الوحید) اطبا کے نزدیک انتہائی مفید پھل ہے اور اس کا تیل کئی بیماریوں میں کام آتا ہے بطور دوا اور غذا استعمال ہوتا ہے۔ وَنَخۡلًا، النَّخۡلَةُ کھجور کا درخت اس کی جمع نَخۡلٌ اور نَخِیۡلٌ دونوں طرح سے آتی ہے، علاقہ عرب کا مشہور پھل ہے اور متعدد اقسام میں پایا جاتا ہے، اس کی غذائیت اور افادیت مسلم ہے۔

﴿وَ حَدَآئِقَ غُلۡبًا﴾ اور گھنے باغات۔

وَ اور، عاطفہ، حَدیقٌ، باغ اور اس کی جمع حَدآئِقُ آتی ہے، غُلْبًا گھنا اور گنجان یعنی یہ گھنے باغ نہ صرف تمہارے لیے پھل پھول مہیا کرتے ہیں بلکہ ہوا کو معتدل اور خوشگوار بناتے ہیں اور ماحول کی زیبائش اور زینت الگ سے ہے۔

﴿وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا﴾ اور طرح طرح کے پھل اور چارے۔

وَ اور عاطفہ، اَلْفَاكِهَةُ مزیدار پھل اس کی جمع فواكِهُ آتی ہے وَّ اَبًّا اور گھاس یعنی تمہارے لیے پھل پھول ہیں تو تمہارے جانوروں کے لیے گھاس پھوس ہے۔

﴿مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾

(یہ چیزیں) تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر ہیں۔

مَّتَاعًا فائدہ (سامان زیست) مال و متاع اردو میں استعمال ہوتا ہے، لَّكُمْ تمہارے لیے، وَلِاَنْعَامِكُمْ (وَلِ. اَنْعَامِ. كُمْ) اور لیے، جانوروں کے، تمہارے یعنی ان اشیائے خورد ونوش سے تم بھی فائدہ اٹھاتے ہو اور تمہارے جانور، گائے بھینس، اونٹ اور گھوڑا وغیرہ بھی جو تمہاری خدمت پر ہمہ وقت مامور ہیں۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”یعنی (یہ سامان) تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ ان جانوروں کے لیے بھی جن سے تم کو گوشت، چربی، دودھ، مکھن وغیرہ سامانِ خوراک حاصل ہوتا ہے او جو تمہاری معیشت کے لیے بے شمار دوسری خدمات بھی انجام دیتے ہیں، کیا یہ سب کچھ اسی لیے ہے کہ تم اس سروسامان سے متمتع ہو اور جس خالقِ کائنات کے رزق پر پل رہے ہو، اسی سے کفر کرو؟“ (تفہیم القرآن جلد ششم)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) قرآن حکیم نے انسان کے سامنے انفس و آفاق کی نشانیاں رکھی ہیں جو ہر روز ہر شخص کے

مشاہدے میں آتی ہیں، یہ غذا جو وہ کھاتا ہے، یہ ہوا جس میں وہ سانس لیتا ہے، یہ پانی جس کا ہر ہر قطرہ اس کے لیے آب حیات بنتا ہے، آسمان سے پانی برستا ہے تو خشک کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، یہ پانی دریاؤں، ندی نالوں کی صورت میں بہتا ہے تو صحراؤں اور خشک زمینوں کو سرسبز وشاداب بناڈالتا ہے۔

۲) زمین سے اگنے والی ہر پتی اور ہر ڈالی کے اندر کاریگری اور حکمت کے وہ بے مثال نمونے موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طاقت اور قدرت کا پتہ چلتا ہے......ایک ہی پانی، ایک ہی ہوا، آفتاب و ماہتاب کی یکساں روشنی میں پلنے بڑھنے والے یہ پھل، پھول ذائقے اور تاثیر میں مختلف، رنگ اور خوشبو میں الگ الگ، شکل وصورت میں جدا جدا اور موسموں کی تبدیلی سے الگ الگ آنے والے میوہ جات اور ترکاریاں رب کائنات کی قدرت کا پتہ دیتی ہیں، دل کی آنکھ بینا ہو تو زبان اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ!**

....

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ(۳۳) یَومَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ(۳۴) وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ(۳۵) وَصَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ(۳۶) لِکُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ(۳۷) وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ(۳۸) ضَاحِکَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ(۳۹) وَ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ(۴۰) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ(۴۱) اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکَفَرَةُ الْفَجَرَةُ(۴۲)﴾

(ارشاد ہوا) پھر جب کانوں کو بہرا کر دینے والا شورِ قیامت برپا ہوگا......اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا،

اس دن ہر کسی کو اپنی ہی پڑی ہوگی جو اسے اوروں سے بے پروا کر دے گی کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے، خنداں وشاداں اور کچھ چہروں پر اُس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی، یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے

﴿فَاِذَا جَآءَ تِ الصَّآخَّةُ﴾

پھر جب کانوں کو بہرا کر دینے والا شورِ قیامت برپا ہوگا۔

فَاِذَا (فَ. اِذَا) پس۔ جب، یہ وقت کو ظاہر کرتا ہے، جَآءَ تِ آئے گا، ماضی واحد مونث غائب (قیامت کا شور) جاء، یجِیءُ مَجِیْئٌ، آنا، الصَّآخَّةُ کان کے پردے پھاڑ دینے والا شور (صَخَّ، یصُخُّ، صَاخَۃٌ) ایسی چیز اور سخت آواز جو کانوں کو پھاڑ ڈالے۔ اس سے مراد قیامت کا شور ہے، سورۃ النّازِعٰت میں لفظ الطَّآمّۃ آیا ہے، یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ صور قیامت کی پہلی کڑک ہی ایسی ہولناک ہوگی کہ کانوں کو بہرہ کر دے گی۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ (منکرین حق) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذارِ (قیامت) سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں لیکن اس دن کیا کریں گے جس دن اللہ تعالیٰ کا منادی اتنے قریب سے ان کو پکارے گا کہ اس کی آواز سب کے کانوں کے پردے پھاڑ دے گی۔'' (تدبر قرآن جلد ہشتم)

﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ، وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ، وَصَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ﴾

اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔

يَوْمَ جس دن، ظرف زمان، يَفِرُّ بھاگے گا، فعل مضارع واحد مذکر غائب (فَرَّ، يَفِرُّ، فِرارٌ) بھاگنا، راہ فرار اختیار کرنا، الْمَرْءُ کوئی شخص، مِن سے، حرف جارہ میں سے ہے جو بعد والے اسم کو زیر دیتے ہیں اَخِيْهِ (اَخِ. هٖ) بھائی، اپنے سے، وَاُمِّهٖ، وَ اور، عاطفہ ہے، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، اُمِّهٖ (اُمِّ. هٖ) ماں اپنی سے، امّ مضاف۔ هٖ مضاف الیہ۔ وَاور، اَبِيْهِ (اَبٌ. هِ) باپ، اپنے سے۔ وَ

اورعاطفہ،صَاحِبَتِهٖ (صَاحِبَةٌ.هٖ)بیوی۔اپنی، وَ اور،بَنِيهِ(بَنِينٌ.هِ) بچے(اولاد)،اپنی۔

﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ﴾

اس دن ہر شخص کو اپنی ہی پڑی ہوگی جو اسے اوروں سے بے پروا کردے گی۔

لِكُلِّ امْرِئٍ ہر شخص کے لیے،مِّنْهُمْ (مِّنْ.هُمْ) سے۔اُن یعنی ان میں سے ہر شخص، يَوْمَئِذٍ (يَوْمَ.اِذٍ) دن۔اس،یعنی قیامت کے روز،شَأْنٌ ایک حالت ہوگی۔يُّغْنِيهِ(يُّغْنِيُ.هِ) بے پروا بنا دے گی،اسے۔دنیا میں یہ رشتے داریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے کے لیے جان تک نثار کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن روزِ قیامت ایک دوسرے کو پہچاننے کے باوجود بے زاری اور بے گانگی کا اظہار کریں گے،اُس وقت ہر شخص کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوں گے اور اس نفسانفسی کے عالم میں صرف نیک اعمال کام آئیں گے۔

﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ﴾ ﴿ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ﴾

کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے،خنداں وشاداں۔

وُجُوهٌ کچھ چہرے،اس کا مفرد وَجْهٌ، چہرہ ہے، يَّوْمَئِذٍ اس روز،مُّسْفِرَةٌ، روشن، چمکنے والے، اس کا مادہ ’س ف ر‘ ہے۔امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:’’السّفر کے اصل معنی ’’كَشْفُ غِطَاء‘‘یعنی پردہ اٹھانے کے ہیں جیسے کہتے ہیں’’سَفَرَ الْعَمَامَةَ عَنِ الرَّأْسِ ‘‘اس نے سر سے عمامہ اتار دیا،اِسی سے لفظ اَسْفَرَ روشن صبح کے لیے استعمال ہوا جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے: وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ (المدثر:۳۴)’’اور(قسم ہے) صبح کی جب روشن ہو۔‘‘(مفردات القرآن)

ضَاحِكَةٌ خنداں (ہنستے ہوئے)ضَحِكَ يَضْحَكُ ضِحْكًا سے اسم فاعل ضَاحِكَةٌ ہنستا ہوا،شگفتہ۔مُّسْتَبْشِرَةٌ شاداں (ہشاش)اس کا مادہ ’ب ش ر‘ ہے،بَشَّرَ يُبَشِّرُ،خوشخبری دینا مُبَشِّرٌ، خوشخبری دینے والا اور مُسْتَبْشِرہ ہشاش بشاش۔

﴿وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ﴾ ﴿تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ﴾ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾

اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی، یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔

وَ وُجُوْهٌ اور بعض چہرے، وَجْهٌ اس کا مفرد ہے، يَّوْمَئِذٍ اس دن، عليها، ان پر هَا کی ضمیر چہروں کی طرف جاتی ہے، غَبَرَةٌ غبار آلود، یعنی بعض چہرے روزِ قیامت غبار آلود نظر آئیں گے، یہ لفظ اردو میں انہی معنوں میں آتا ہے، تَرْهَقُهَا (تَرْهَقُ.هَا) ڈھانپ لیا ہوگا، انہیں یعنی ان چہروں کو ڈھانپ لیا ہوگا، قَتَرَةٌ سیاہی نے (رَهِقَ، يَرْهَقُ) پیچھا کرنا، ڈھانپ لینا، اُولٰٓئِكَ یہی ہیں، اسم اشارہ، هُمْ وہ، الْكَفَرَةُ کافر لوگ، اس کا مفرد کافِرٌ ہے، الْفَجَرَةُ، فاجر (قانون کی پابندی توڑنے والے) اس کا مفرد فَاجِرٌ ہے۔

قرآن حکیم ہمارے سامنے وہ حقائق رکھتا ہے جس کا ہم اس دنیا میں بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں، وہ طلباء جنہوں نے سال بھر محنت کی، ذوق وشوق سے پڑھا لکھا، لگن اور توجہ سے امتحان دیا اور اچھے نتائج کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو رہے، بہتر نتائج کا اعلان سنتے ہی ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں، وہ فرحاں وشاداں گھروں کو لوٹتے ہیں اور ہر طرف سے انہیں مبارک باد کے پیغامات موصول ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ طلبہ جو سال بھر اپنا وقت برباد کرتے ہیں، اپنی کتابیں بند رکھتے ہیں، اسباق میں غیر حاضر رہتے ہیں، والدین اور اساتذہ کے نصائح سے منہ موڑتے ہیں اور کمرۂ امتحان میں الٹے سیدھے جوابات لکھ آتے ہیں، ان کے دل اپنے امتحان کے نتائج پر گواہ ہوتے ہیں اور جونہی اس کا اعلان ہوتا ہے ان کے چہروں پر سیاہی اور اُداسی چھا رہی ہوتی ہے جسے ہر شخص پڑھ سکتا ہے، کچھ ایسا ہی منظر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور نافرمان لوگوں کا ہوگا۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) قیامت کا دن بڑا ہی ہولناک ہے، اس کی دہشت کو ظاہر کرنے کے لیے اسے عربی کے شدید ترین

لفظ ''صَاخّۃ'' سے نمایاں کیا گیا ہے۔ ایسی گرجدار آواز جس سے کان بہرے اور حواس باختہ ہو جائیں، اور انسان بے بسی کی کیفیت میں بھاگتے پھریں، اِس حال میں انسان اپنے قریبی رشتوں تک کو بھول جائے گا، ہر کسی کو فکر ہوگی تو صرف اس بات کی کہ کسی نہ کسی طرح اس کی اپنی جان کا چھٹکارا ہو جائے۔

۲) اس دن لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے...... ایک گروہ کامیاب لوگوں کا اور دوسرا ناکام لوگوں کا، کامیاب لوگ وہ ہوں گے جنہوں نے رب چاہی زندگی گزاری ہوگی، یہ کامیابی کا اعلان سنتے ہی خوشی اور مسرت سے اچھل پڑیں گے اور ان کے چہرے دمکنے لگیں گے اور فرشتے ہر طرف سے سلامتی کے پیغامات دینے لگیں گے۔

ناکام وہ ہوں گے جنہوں نے من چاہی زندگی گزاری ہوگی، ان کے دل تو پہلے ہی گواہ تھے اور اعلان کے ساتھ ہی ان کے چہروں پر سیاہی چھانے لگے گی۔

وہ انسان بڑے ہی بدبخت ہیں جو واضح احکام سننے کے باوجود خواہشات نفس کا شکار رہیں۔

..................o..................

سُوۡرَۃُ التَّکۡوِیۡر

تکۡوِیۡر ، کے معنی لپیٹ لینے کے ہیں، یہ نام ''اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ'' (جب سورج لپیٹ دیا جائے گا) سے ماخوذ ہے۔

اِس سورۃ مبارکہ کا مرکزی مضمون قیامت اور رسالت ہے اور انہی کے بارے میں دلائل وشواہد پیش کیے گئے ہیں۔ابتدائی چھ آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے سورج بے نور ہو جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، فلک بوس پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں غبار کی طرح اڑنے لگیں گے، جنگلوں کے جانور بدحواس ہو کر اکٹھے ہو جائیں گے اور وسیع وعریض سمندر بھڑک اٹھیں گے۔

پھر سات آیات میں دوسرے مرحلے کا ذکر ہے، جب رب کائنات کے حکم سے صور پھونکا جائے گا تو ہر انسان اپنی قبر سے زندہ و بیدار اٹھ کھڑا ہوگا، اس وقت نامہ اعمال کھول دیے جائیں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کے لیے رب کائنات کے حضور پیش ہوگا، آسمان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے، دوزخ، جنت نگاہوں کے سامنے عیاں ہو جائیں گی۔

یہ سارا نقشہ کھینچنے کے بعد یہ کہہ کر انسان کو سوچنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اس وقت ہر شخص کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ دنیا سے کیا کما کر لایا ہے۔

ذکر قیامت کے بعد رسالت کا تذکرہ فرمایا، پہلے متعدد قسمیں کھائیں پھر بتایا کہ حامل قرآن اللہ تعالیٰ کا رسول ہے، یہ کلام جو وہ تمہیں پڑھ کر سناتا ہے یہ نہ اس نے خود تالیف کیا ہے اور نہ کسی نے اسے سکھایا اور پڑھایا ہے بلکہ ایک معزز و محترم فرشتہ جس کی امانت و دیانت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لے کر آیا ہے اور اس نے اسے اس شخص [محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم] کے قلب اطہر پر اتارا ہے۔اس تعلیم سے منہ موڑ کر آخر تم کدھر چلے جا رہے ہو۔

آیات:۲۹ سُوْرَةُ التَّكْوِيْر رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ(۱) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ(۲) وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ(۳) وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ(۴) وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ(۵) وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ(۶) وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ(۷)﴾

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور ستارے بے نور ہو جائیں گے اور جب پہاڑ چلا دیے جائیں گے اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی (مالکوں کو ان کی خبر تک نہ رہے گی) جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی

﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔

اِذَا جب، (ظرفِ زمان) الشَّمْسُ سورج، كُوِّرَتْ لپیٹ دیا جائے گا، فعل مجہول واحد مؤنث غائب، سورج عربی میں مؤنث استعمال ہوتا ہے، كَوَّرَ الشيءَ، گول لپیٹنا، (كوّرَ، يُكوِّرُ)۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''سورج کے بے نور کر دیے جانے کے لیے یہ ایک بے نظیر استعارہ ہے، عربی زبان میں تکویر کے معنی لپیٹنے کے ہیں سر پر عمامہ باندھنے کے لیے ''تَكْوِيْرُ الْعَمَامَه'' کے الفاظ بولے جاتے ہیں کیونکہ عمامہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور پھر سر کے گرد اسے لپیٹا جاتا ہے، اسی مناسبت سے اس روشنی کو جو سورج سے نکل کر سارے نظامِ شمسی میں پھیلتی ہے عمامہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ پھیلا ہوا

عمامہ سورج پر لپیٹ دیا جائے گا یعنی اس کی روشنی کا پھیلنا بند ہو جائے گا۔“ (تفہیم القرآن، جلد ششم)

﴿وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ﴾ اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔

وَ اور عاطفہ، إِذَا جب (ظرف زمان)، النُّجُومُ ستارے اس کا مفرد النّجم ہے، انكَدَرَتْ اس کا مادہ (كَدَرَ) ہے (انكَدَرَ، ينكدِرُ) بے رونق ہو جانا، بکھر جانا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

”آفتاب کی فنا پذیری کی تصریح میں ضرب آفتاب پرستی پر بھی ہے اور ستاروں کی بے نوری اور بے بسی کی تصریح میں ضرب ستارہ پرستی پر بھی ہے۔“ (تفسیر ماجدی، جلد دوم)

﴿وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ﴾ اور جب پہاڑ چلا دیے جائیں گے۔

الْجِبَالُ پہاڑ، اس کا مفرد جَبَلٌ ہے، سُيِّرَتْ چلا دیے جائیں گے، ماضی مجہول واحد مونث غائب (سَيَّرَ، يُسَيِّرُ) چلانا۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

”منکرین قیامت کو جب قیامت کی ہلچل سے ڈرایا جاتا تو وہ اس کا مذاق اڑانے کے لیے یہ سوال کرتے کہ قیامت آئے گی تو کیا وہ پہاڑوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی؟ اس کا جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ اس دن چلا دیے جائیں گے، یہاں صرف چلا دیے جانے کا ذکر ہے لیکن دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل بھی ہے کہ وہ اس طرح اڑتے پھریں گے جس طرح بادل اڑتے پھرتے ہیں۔“ (تدبر قرآن، جلد ہشتم)

﴿وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ﴾

اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی (مالکوں کو ان کی خبر تک نہ رہے گی)۔

الْعِشَارُ اونٹنیاں اس کا مفرد عَشَرَاءُ، وہ اونٹنی جس کو گابھن ہوئے دس ماہ ہو چکے ہوں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

"(سورج، ستارے، پہاڑ) ایسی عظیم چیزوں کی بے ثباتی کے بعد یہ محبوب چیزوں کی بے وقعتی واضح فرمائی ہے کہ اس دن کی ہلچل لوگوں پر ایسی نفسا نفسی کی حالت طاری کر دے گی کہ کسی کی نظروں میں اس کے محبوب سے محبوب مال کی بھی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔

یہ بات قرآن کے اولین مخاطب، اہل عرب کے خاص مذاقِ طبیعت کو پیش نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے۔ اُن کے مال میں سب سے زیادہ قدر کی جگہ ان کے اونٹوں کو حاصل تھی، خاص طور پر وہ اونٹنیاں ان کو نہایت عزیز و محبوب تھیں جن کے حمل پر دس ماہ گزر چکے ہوں اور بچہ جننے کا وقت اب قریب آ لگا ہو، اس طرح کی اونٹنیوں کے مالک ان کی نگہداشت کا قدرتی طور پر خاص اہتمام کرتے، ان کی مستقبل کی بہت سی آرزوؤں کا ان پر انحصار ہوتا، انہی محبوب اونٹنیوں کو بطور مثال ذکر کر کے دنیا کی محبت میں پھنسے ہوئے غافلوں کو ہولِ آخرت کی یاد دہانی فرمائی ہے کہ اس کا پہلا ہی مرحلہ اتنا شدید ہوگا کہ اُس وقت کسی کو اپنی محبوب سے محبوب چیز کا بھی ہوش نہیں رہے گا، گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی لیکن ان کے مالکوں کو خود اپنی اس طرح پڑی ہوگی کہ وہ کسی اور چیز کی طرف، خواہ وہ کتنی ہی محبوب و مطلوب کیوں نہ ہو، توجہ نہیں کر سکیں گے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام پر "تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ" (الحج:۲) "جس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی" کے الفاظ سے سمجھائی گئی ہے، بس یہ فرق ہے کہ یہاں اس دن کے ہول کی حقیقت محبوب مال کی ناقدری سے سمجھائی گئی ہے اور وہاں شفقت مادری کے مردہ ہو جانے سے، درآنحالیکہ یہ جذبہ اتنا قوی ہے کہ اس دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کو مغلوب نہیں کر سکتی۔ (تدبر قرآن، جلد ہشتم)

﴿وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ﴾ اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے۔

اَلْوُحُوْشُ وحشی جانور، اس کا مفرد اَلْوَحْشُ، جنگلی جانور، حُشِرَتْ جمع کیے جائیں گے، ماضی مجہول واحد مؤنث غائب (حَشَرَ، يَحْشُرُ) اکٹھا کرنا، یہ وہ دن ہوگا جب انتہائی اضطراب و اضطرار میں وحشی جانور تک ایک دوسرے کی دشمنی بھول بھال کر مارے مارے پھریں گے۔

﴿وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ﴾ اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے۔

الْبِحَارُ سمندر، اس کا مفرد **بَحْرٌ** ہے، **سُجِّرَتْ** بھڑکائے جائیں گے، ماضی مجہول واحد مونث غائب (**سَجَّرَ، یُسَجِّرُ، تَسْجِیْرٌ**) بھڑکانا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اصل میں لفظ **سُجِّرَتْ** استعمال کیا گیا ہے جو **تَسْجِیْرٌ** سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے، **تَسْجِیْرٌ** عربی زبان میں تنور کے اندر آگ دہکانے کے لیے بولا جاتا ہے، بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی، لیکن اگر پانی کی حقیقت لوگوں کی نگاہ میں ہو تو اس میں کوئی چیز بھی قابل تعجب محسوس نہ ہوگی، یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے کہ اُس نے آکسیجن اور ہائیڈروجن دو ایسی گیسوں کو باہم ملایا ہے جن میں ایک آگ بھڑکانے والی اور دوسری بھڑک اٹھنے والی ہے اور ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادہ پیدا کیا جو آگ بجھانے والا ہے، اللہ کی قدرت کا ایک اشارہ اس بات کے لیے بالکل کافی ہے کہ وہ پانی کی اس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھڑکنے اور بھڑکانے میں مشغول ہو جائیں جو ان کی اصل بنیادی خاصیت ہے۔

(تفہیم القرآن، جلد ششم)

﴿**وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ**﴾ اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی۔

النُّفُوْسُ جانیں، اس کا مفرد **نَفْسٌ** ہے، **زُوِّجَتْ**، آپس میں جوڑ دی جائیں گی، ماضی مجہول واحد مونث غائب (**زَوَّجَ، یُزَوِّجُ، تَزْوِیْجٌ**) ملانا، جوڑنا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یعنی انسان ازسرنو اسی طرح زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ دنیا میں مرنے سے پہلے جسم و روح کے ساتھ زندہ تھے۔''

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اس سورت میں انسان کو غفلت کی نیند سے بیدار کیا گیا ہے...... یہ دنیا کی زندگی بے ثبات اور

عارضی ہے، یہ دنیا کی چہل پہل، گہما گہمی بالآخر ختم ہو جائے گی، یہ چمکتا ہوا آفتاب اور روشن ستارے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائیں گے اوران کی روشنی ختم ہوجائے گی، یہ بلند و بالا پہاڑ جنہیں دیکھ کر انسان خوفزدہ ہو جاتا ہے، دھنی ہوئی روئی کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے، کیا جانور اور کیا انسان از سرنو زندہ کر دیے جائیں گے۔ انسان اس خوفناک منظر کو دیکھ کر حیران و ششدر مارے مارے پھریں گے اور انہیں اپنے مال ومتاع کی خبر تک نہ رہے گی، یہ وسیع وعریض سمندر جو دنیا کے تین چوتھائی حصے کو گھیرے ہوئے ہے شعلوں کا منظر پیش کرر ہا ہوگا۔

۲) اچھے انسان وہ ہیں جو اس خوفناک دن سے پہلے اچھے اعمال سے اپنے آپ کو مزین کرلیں اور اس دن کی ندامت سے بچیں اور آج احکام الٰہی کا اپنے آپ کو پابند بنالیں۔

....

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (۸) بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۹) وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۱۰) وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (۱۱) وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ (۱۲) وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ (۱۳) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّاۤ اَحْضَرَتْ (۱۴)﴾

اور جب زندہ در گور کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ اُسے کس قصور میں قتل کیا گیا؟ اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا اور جب جہنم بھڑکا دی جائے گی اور جب جنت قریب کردی جائے گی، تب ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا عمل لایا ہے؟

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗ دَةُ سُئِلَتْ﴾ اور جب زندہ در گور کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔

وَ اور، عاطفہ، گزشتہ گفتگو سے ربط کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ اِذَا جب (ظرف زمان)، الْمَوْءٗدَةُ زندہ دفن کی گئی لڑکی، اسم مفعول واحد مؤنث (وَأَدَ، یَئِدُ وَأْدًا) زندہ دفن کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: وَأَدَ الرَّجُلُ اِبنَتَهٗ، اس آدمی نے اپنی لڑکی کو زندہ دفن کر دیا، (القاموس الوحید) سُئِلَتْ پوچھا جائے گا فعل مجہول واحد مؤنث غائب (سَأَلَ، یَسئَلُ، سُؤَالًا) پوچھنا، معلوم کرنا، مَسْئَلہ جو بات پوچھی جائے، مَسْئولٌ (اسم مفعول) جس سے سوال کیا جائے۔

﴿بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ کہ اُسے کس قصور میں قتل کیا گیا؟

بِاَیِّ (بِ. اَیِّ) کہ۔ کس، ب حرف جر، اَیِّ اسم استفہام مجرور، حرف جر اور مجرور، مضاف ہوا۔ ذَنْبٍ گناہ مضاف الیہ، قُتِلَتْ۔ اسے قتل کیا گیا، ماضی مجہول واحد مؤنث غائب (قَتَلَ، یَقْتُلُ، قَتلًا) مارنا، قتل کرنا۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''بعض قبائل عرب کا دستور تھا کہ جب کسی کے گھر بچی پیدا ہوتی تو عار سے بچنے کے لیے اسے زندہ درگور کر دیتے یہ ایک بہت بڑا مجرمانہ فعل تھا، جس کا وہ اپنی شدید جہالت و نادانی کے سبب ارتکاب کرتے تھے، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن شدید غضبناک ہوگا، اور شدید غیظ و غضب کی وجہ سے ان کی طرف سے منہ پھیر لے گا اور اُن زندہ درگور کی گئی بچیوں سے پوچھے گا کہ ان ظالموں نے تمھیں کس جرم کی پاداش میں زندہ درگور کر دیا تھا یعنی تم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا اس لیے آج ان ظالموں کو ہم شدید ترین عذاب دیں گے۔ حافظ سیوطی نے اپنی کتاب ''الاکلیل'' میں لکھا ہے یہ آیت دلیل ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا گناہِ عظیم ہے۔'' (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن، جلد دوم)

اس کا ذکر سورۃ النحل میں بھی آتا ہے۔

''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو غصے کے مارے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غم میں ڈوب جاتا ہے، اس خبر کے سبب لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، متردّد رہتا ہے کہ لڑکی کی وجہ سے ذلت کی زندگی جیے یا اسے مٹی میں دبا کر مار دے دیکھو، اُن کا یہ فیصلہ کتنا برا ہے۔''

(ترجمہ آیات:۵۸،۵۹) رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہالت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا اور لڑکی کی پیدائش کو باعث خیر وبرکت قرار دیا اور اسے عزت وعظمت سے نوازا۔

﴿وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾ اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔

وَ اور، عاطفہ، اِذَا جب (ظرف زمان)، الصُّحُفُ صحیفے (لوگوں کے اعمال نامے) اس کا مفرد الصَّحِیْفَۃُ (زندگی کا عمل، اعمال نامہ) ہے۔ الصحیفه کا معنی کاغذ پر لکھا ہوا مضمون، اخبار، نُشِرَتْ کھولے جائیں گے، شائع کیے جائیں گے۔ (القاموس الوحید) (نَشَرَ، یَنْشُرُ) پھیلانا، عام کرنا، خبریں نشر کرنا، ناشر: کتب چھاپنے والا، اردو میں استعمال ہوتا ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''یہاں 'صحف' سے مراد اعمال نامے ہیں اور ان کے 'نشر' کیے جانے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھول دیے جائیں گے اور جو کچھ ان میں ہے لوگ اس سے واقف ہو جائیں گے، اِنسان کے کرتوتوں کی اس طرح فضیحت انسان کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور شدید ہوگی، کتنی چھپی ہوئی برائیاں ہیں جنھیں یاد کر کے انسان شرمسار ہوتا ہے اور لوگوں کے علم میں آجانے پر کانپتا اور شرم سے پانی پانی ہوتا ہے لیکن قیامت کے دن تو پوری زندگی کے اعمال منظر عام پر آجائیں گے اور لوگ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے، اُف مجرم انسان کا کیا حال ہوگا! یہ اُس دن کی ہولناکی کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے، یہ کائناتی انقلاب کی علامتوں میں سے ایک علامت بھی ہے، اس انقلاب کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر ڈھکی چیز کھل جائے گی، ہر پوشیدہ شے عیاں ہو جائے گی اور دلوں کی اچھی بری نیتیں سامنے آجائیں گی۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿وَ اِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتْ﴾ اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا۔

وَ اور، عاطفہ، اِذَا جب (ظرف زمان)، السَّمَآءُ آسمان (کا)، کُشِطَتْ پردہ اٹھا دیا جائے گا (کَشَطَ، یَکْشِطُ، کَشْطاً)، ہٹانا، الگ کرنا، جیسا کہ کَشَطَ الجِلْدَ عَنِ الذَّبِیْحَۃِ، ذبح شدہ جانور سے کھال الگ کرنا۔ (القاموس الوحید)

علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

’’جس طرح مینڈھے بکرے وغیرہ کی کھال (ذبح کے بعد) کھینچ لی جاتی ہے اس طرح آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ اور آسمان اپنی جگہ سے اس طرح الگ تھلگ ہو جائے گا جس طرح ڈھکنا کسی چیز سے الگ ہو جاتا ہے۔‘‘ (تفسیر قرطبی)

﴿وَاِذَا الۡجَحِيۡمُ سُعِّرَتۡ﴾ اور جب جہنم بھڑکا دی جائے گی۔

وَ اور، عاطفہ، اِذَا جب (ظرف زمان)، الۡجَحِيۡمُ جہنم (دوزخ)، سُعِّرَتۡ بھڑکائی جائے گی، ماضی مجہول واحد مؤنث غائب (سَعَّرَ، یُسَعِّرُ تَسۡعِیۡرٌ) آگ بھڑکانا، سَعِیۡرٌ، دہکتی ہوئی آگ۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

’’تَسۡعِیۡرٌ کے معنی بھڑکانے کے ہیں، جہنم تیار تو پہلے سے ہوگی لیکن جب مجرموں کو اس میں ڈالنے کا وقت آئے گا تو وہ ان کو جلانے کے لیے خاص طور پر بھڑکا دی جائے گی پھر جب مجرم اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اپنا مطلوب ایندھن پا کر مزید قوت سے بھڑکے گی۔‘‘ (تدبر قرآن، جلد ہشتم)

سورۃ البقرہ میں اس بات کی اس طرح نشاندہی کی گئی ہے۔

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ (آیت:۲۴) ’’تو ڈرو اس آگ سے، جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر، جو تیار کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔‘‘

یعنی وہاں صرف تم ہی دوزخ کا ایندھن نہ بنو گے، بلکہ تمہارے وہ بت بھی وہاں تمہارے ساتھ موجود ہوں گے جنہیں تم نے اپنا معبود و مسجود بنا رکھا ہے۔ (تفہیم القرآن)

﴿وَاِذَا الۡجَنَّةُ اُزۡلِفَتۡ﴾ اور جب جنت قریب کر دی جائے گی۔

وَ اور، عاطفہ، اِذَا جب (ظرف زمان)، الۡجَنَّةُ جنت، اُزۡلِفَتۡ قریب لائی جائے گی، زُلۡفَةٌ نزدیکی (أَزۡلَفَ، یُزۡلِفُ) نزدیک لانا، پہنچانا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

’’اِزۡلَافٌ‘‘ کے معنی قریب لانے کے ہیں یعنی وہ ان متّقیوں کے قریب لائی جائے گی جو اس کے

مستحق قرار پائیں گے، اِس کی نقاب کشائی اس وقت ہوگی جب لوگوں کی درجہ بندی ہوجائے گی، سورۃ قٓ میں یہ وضاحت بھی فرمادی گئی ہے کہ اس کے قریب لانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ کہیں دور سے قریب لائی جائے گی، وہ دور نہیں ہوگی بلکہ پاس ہی ہوگی۔لیکن وہ قریب ہونے کے باوصف اور قریب لائی جائے گی تا کہ اہل جنت کی تشریف وتکریم کے لیے ایک پیش کش کے طور پر ان کے سامنے پیش کی جائے جیسا کہ فرمایا: وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (سورۃ:قٓ) اور جنت متقین کے لیے قریب لائی جائے گی درآنحالیکہ وہ کچھ دور بھی نہ ہوگی۔(تدبر قرآن، جلد ہشتم)

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ﴾ تب ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا عمل لایا ہے؟

عَلِمَتْ جان لے گا، ماضی واحد مؤنث غائب یہ، نَفْسٌ (جان، شخص) کے لیے صیغہ مونث کا استعمال ہوا ہے۔ مَّآ اَحْضَرَتْ جو اس نے پیش کیا (اپنا اعمال نامہ) (حَضَرَ يَحْضُرُ) حاضر ہونا، سامنے کھڑا ہونا اور (اَحْضَرَ، يُحْضِرُ، اِحْضَارٌ) حاضر کرنا، پیش کرنا یعنی ہر نفس جان لے گا کہ وہ دنیا سے کون سے اعمال کما کر لایا ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اعمال کا جو پشتارہ اس کے ساتھ ہوگا، اُس میں وہ ردوبدل نہ کر سکے گا، اس میں کسی عمل کا اضافہ کر سکے گا اور نہ کوئی عمل کم کر سکے گا، جس وقت اسے اپنے اعمال کا علم ہوگا اُس وقت اس کی بے بسی کا حال یہ ہوگا کہ وہ ہر اس شے سے کٹ چکا ہوگا جس سے وہ اپنی عملی زندگی یا اپنے تصور میں مانوس تھا۔ وہ اپنی دنیا سے کٹ چکا ہوگا اور اُس کی دنیا اس سے، ہر شے مکمل طور پر بدل چکی ہوگی، صرف اللہ جل جلالہٗ کی ذات باقی ہوگی جس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا، کاش لوگ تغیر پذیر کائنات کے بجائے اللہ کی ذات گرامی کو اپنا مقصود بناتے تو کائنات کے یکسر بدل جانے کے بعد وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو پا لیتے۔(فی ظلال القرآن)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) فقہا نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مؤاخذہ مساوی ہے، چاہے لڑکی زندہ دفن کی جائے چاہے

لڑکا، صیغہ مؤنث صرف اس لیے استعمال ہوا ہے کہ عرب میں دستور لڑکی ہی کے دفن کا تھا کیونکہ ان میں سے بعض کے نزدیک لڑکی کی پیدائش باعثِ عار تھی۔

۲) بعض اہل ذوق نے لکھا ہے کہ یہاں بجائے قاتل کے (جس نے لڑکی کو زندہ درگور کیا) خود مقتولہ سے خطاب کرنے میں اشارہ یہ بھی نکلتا ہے کہ قاتل مردود قابل خطاب نہیں، بلکہ سخت ترین سزا کا مستحق ہے۔

۳) ہر شخص کے اعمال اس کے سامنے آجائیں گے اور کوئی چھوٹی بڑی بات ڈھکی چھپی نہ رہے گی۔

۴) یہ فلکیاتی نظام اللہ تعالیٰ کے حکم سے درہم برہم ہو جائے گا، منکرین حق کے لیے دوزخ بھڑکا دی جائے گی جبکہ مؤمنین صادقین کے لیے جنت کو قریب سے قریب تر کر دیا جائے گا گویا کہ جنت ان کے استقبال کے لیے بے تاب ہے۔

....

﴿فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ (۱۵) الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ (۱۶) وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ (۱۷) وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۱۸) اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ (۱۹) ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ (۲۰) مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ (۲۱)﴾

میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کی جو پیچھے ہٹتے، آگے بڑھتے اور نظروں سے اوجھل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور قسم کھاتا ہوں رات کی جب وہ چھا جائے اور صبح کی جب وہ نمودار ہو۔ بلاشبہ یہ (قرآن) ایک بزرگ قاصد (جبرئیل کا لایا ہوا) کلام ہے (ایسا قاصد) جو قوت والا ہے اور عرش کے مالک (اللہ) کے نزدیک بڑے رتبے والا ہے۔ وہاں (عالم بالا میں فرشتوں کا) سردار ہے اور امانت دار ہے۔

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ﴾
میں قسم کھاتا ہوں، پیچھے ہٹ جانے والے (ستاروں کی)۔

فَ پس، لَآ نہیں، نافیہ لکھنے میں آئے گا مگر اس کا ترجمہ نہیں ہوگا (قرطبی)، اُقْسِمُ میں قسم کھاتا ہوں، فعل مضارع واحد متکلم (اَقْسَمَ، یُقْسِمُ، اِقْسَامٌ) قسم کھانا، شہادت میں پیش کرنا، اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی چیز کو اپنی قدرت و طاقت پر شاہد بنا سکتا ہے۔ بِالْخُنَّسِ پیچھے ہٹ جانے والے (ستاروں کی) خَنَسَ، یَخْنِسُ، خَنْساً ستاروں کا چھپ جانا، غائب ہو جانا، اَلْخُنَّسُ وہ ستارے جو متحرک رہیں، (آگے پیچھے چلتے ہیں)۔

حدیث شریف میں آتا ہے: اَلشَّیْطٰنُ یُوَسْوِسُ اِلَی الْعَبْدِ فَاِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ، شیطان بندے کی طرف وسوسے ڈالتا رہتا ہے، بندہ جب اللہ کا ذِکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ شیطان کو خنّاس اسی لحاظ سے کہتے ہیں، سورۃ الناس میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی گئی ہے: ''مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ'' پیچھے ہٹ جانے والے کے وسوسوں کے شر سے (میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں)

﴿اَلْجَوَارِ الْکُنَّسِ﴾
سیدھے چلنے والے اور نظروں سے اوجھل ہونے والے (ستارے)۔

اَلْجَوَارِ سیدھے چلنے والے (آگے بڑھنے والے ستارے) اس کا مفرد اَلْجارِیَۃ، جاری، رواں دواں۔ کُنَّسِ اس کا مفرد کَانِسٌ ہے، کَنَسَ الظَّبیُ کے معنی ہیں: ہرن اپنے مأمن (جھاڑیوں) میں چھپ گیا۔ ''کَنَسَتِ النُّجُوْمُ'' کے معنی ہوں گے کہ سیارے اپنے مدار میں چلے اور چل کر اپنے ٹھکانوں میں روپوش ہو گئے۔ (تدبر قرآن)

﴿وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ﴾ اور (قسم ہے) رات کی جب وہ چھا جائے۔

وَ قسمیہ ہے، اِذَا جب، عَسْعَسَ چھا جائے، عَسْعَسَ الَّیْلُ، رات ہو جانا، رات کا تاریک

ہونا۔(القاموس الوحید)

﴿وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ﴾ اور صبح کی جب وہ نمودار ہو۔

وَ قسمیہ، الصُّبۡحِ صبح، اِذَا جب (ظرف زمان) تَنَفَّسَ (تنفَّسَ، یَتَنَفَّسُ) سانس لینا، نمودار ہونا۔

﴿اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ﴾

بلاشبہ یہ (قرآن) ایک بزرگ قاصد (جبریل کا لایا ہوا) کلام ہے۔

اِنَّهٗ (اِنَّ. ہٗ) بلاشبہ۔ یہ، اِنّ، زورِ بیان کے لیے، ہٗ کی ضمیر قرآن حکیم کی طرف جاتی ہے، لَقَوۡلُ (لَ. قَوۡلُ) ضرور بضرور۔ کلام ہے، لام تاکید کے لیے آیا ہے، قَوۡلُ سے مراد کلام الٰہی (قرآن حکیم)، رَسُوۡلٍ قاصد (یعنی جبرئیل امین)، كَرِيۡمٍ (جو) بزرگ ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام کو جبرئیل امین لے کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر نازل کیا۔

﴿ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ﴾

جو قوت والا ہے اور عرش کے مالک (اللہ) کے نزدیک بڑے رتبے والا ہے۔

ذِیۡ والا، مضاف، قُوَّةٍ قوت، مضاف الیہ یعنی جبریلؑ کی صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قوت والا بنایا ہے۔ عِنۡدَ نزدیک، ذِى الۡعَرۡشِ عرش والے یعنی اللہ تعالیٰ، مَكِيۡنٍ مرتبے والا، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں جبرئیل امین کا بڑا رتبہ ہے۔

﴿مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ﴾ وہاں (عالم بالا میں فرشتوں کا) سردار ہے اور امانت دار ہے۔

مُّطَاعٍ اس کی اطاعت کی جاتی ہے (اَطَاعَ، یُطِیۡعُ، اِطَاعَةٌ) اطاعت کرنا، مُطَاعٍ، اسم مفعول۔ جس کی اطاعت کی جائے (یعنی عالم بالا میں فرشتوں کا) سردار ہے، ثَمَّ اسم مکان بعید، وہاں، اَمِيۡنٍ امانت دار ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی چیز کو بھی اپنی ذات پر بطور گواہی اور شہادت پیش کرسکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہر ذرہ اور ہر پتہ اس کی عظمت اور بڑائی بیان کررہا ہے۔

۲) آسمان پر آفتاب و ماہتاب، ستاروں اور سیاروں کا نظام اتنا منظّم اور مربوط ہے کہ کوئی شخص اس کا منکر نہیں ہوسکتا ہے۔ اجرامِ سماوی کی یہ گردشیں، رات دن کا یہ الٹ پھیر جن میں کبھی بال برابر فرق نہیں آتا اور جو بالکل لگے بندھے قاعدوں اور اصولوں کے مطابق چل رہا ہے، اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اس کا کوئی مدبر اور منتظم ہے جو انہیں انتہائی تدبر اور صحت سے چلا رہا ہے۔

۳) کائنات میں ستاروں کا یہ مربوط نظام اگر پوری باقاعدگی سے قائم ہے اور تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور اس کو حقیقت مانتے ہو تو یہ بات ماننے میں تمھیں کیا رکاوٹ درپیش ہے کہ انھی ستاروں کو ایک نظام میں باندھنے والا خالق اپنا کلام اپنے ایک بندے پر نازل کرے اور اسے انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کرے۔ اگر ستاروں کا نظام قائم کرنا اور چلانا ناممکن نہیں تو کسی کو نبی بنا کر اس پر وحی نازل کرنا اللہ کے لیے کیونکر ناممکن ہوسکتا ہے۔

۴) انبیائے کرام تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے رشد و ہدایت کا پیغام جبریل امین ایسا جلیل القدر فرشتہ لاتا رہا، جس کی امانت و دیانت اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلم ہے اور جسے تمام فرشتوں میں سرداری کا اعزاز حاصل ہے اور اس نے انبیائے کرام تک احکام الٰہی کو بلاکم و کاست مِن وعَن پہنچائے ہیں۔

۵) جس خالقِ کائنات کے حکم سے اس کائنات کا نظم چل رہا ہے۔ آفتاب و ماہتاب اور ان گنت ستارے طلوع و غروب ہوتے ہیں، لیل و نہار کا ترتیب سے سلسلہ جاری وساری ہے اس کے ہاتھ میں انسان اور تمام ذی روح مخلوق کی موت و حیات ہے اور انسان کی حیثیت تمام مخلوقات میں اشرف اور گل سرسبد کی سی ہے اور اسے ہی خلافت ارض کی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور یہ کارخانہ اسی کے لیے بنایا اور سجایا گیا ہے تو لازماً وہ اپنے خالق و مالک کے یہاں مسئول ہے، جس طرح اللہ کے حکم سے دن اور رات ادلتے بدلتے ہیں، ستارے طلوع و غروب ہوتے ہیں اسی طرح اسی کے

حکم سے زندگی کا چراغ روشن اور گل ہوتا ہے، اچھے انسان وہی ہیں جو اپنے مالک کی مرضی کے مطابق زندگی کی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

....

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ(۲۲) وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ(۲۳) وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ(۲۴) وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ(۲۵) فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ(۲۶) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ(۲۷) لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ(۲۸) وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ(۲۹)﴾

(اے اہل مکہ) تمہارے رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) مجنون نہیں ہیں، انہوں نے اسے (یعنی جبریلؑ) کو روشن افق پر دیکھا ہے، اور وہ غیب (کے اس علم کو لوگوں تک پہنچانے) کے معاملہ میں بخیل نہیں ہیں اور نہ یہ (قرآن) کسی شیطان مردود کا قول ہے (تمھیں کیا ہوگیا ہے؟) تم کدھر جا رہے ہو؟ یہ (عظیم کتاب) تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے، تم میں سے ہر اُس شخص کے لیے جو راہِ راست پر چلنا چاہتا ہو اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے۔

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ (اے اہل مکہ) تمہارے رفیق (محمدؐ) مجنون نہیں ہیں۔

وَمَا اور نہیں، مَا نافیہ ہے۔ صَاحِبُكُمْ (صَاحِبُ. كُمْ) رفیق۔ تمہارے، صاحِبُ، رفیق، مضاف، کُمْ، تمہارے، ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ بِمَجْنُوْنٍ مجنون، ب حرف جر زائد ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

”رفیق سے مراد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کو اہل مکہ کا رفیق کہہ کر دراصل انہیں اس بات کا احساس دلایا گیا ہے کہ آپ ﷺ ان کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ انہی کے ہم قوم اور ہم قبیلہ ہیں، انہی کے درمیان آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی ہے اور اُن کے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ آپ کس قدر دانا اور ہوشمند انسان ہیں، ایسے شخص کو جانتے بوجھتے مجنوں کہتے ہوئے انہیں کچھ تو شرم آنی چاہیے۔“ (تفہیم القرآن، جلد ششم)

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ﴾

انہوں نے اسے (یعنی جبریلؑ) کو روشن افق پر دیکھا ہے۔

وَلَقَدْ اور یقیناً، لام تاکید کے لیے آتا ہے، قَدْ حرف تحقیق، رَاٰهُ (رَاٰی. هُ) دیکھا ہے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فعل ماضی واحد مذکر غائب، هُ، اسے (یعنی جبرئیل امین کو) ضمیر واحد مذکر غائب، بِالْاُفُقِ (بِ. الْاُفُقِ) پر۔ آسمان کے کنارے یعنی آسمان کے کنارے پر، الْمُبِيْنِ (جو) روشن ہے۔

﴿وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ﴾

اور وہ غیب (کے اس علم کو لوگوں تک پہنچانے) کے معاملے میں بخیل نہیں ہیں۔

وَ اور، عاطفہ، مَا نہیں، هُوَ وہ اسم ضمیر واحد مذکر غائب یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عَلَى الْغَيْبِ غیب (یعنی وحی) کی بات بتانے میں، بِضَنِيْنٍ، بخیل، ب حرفِ جر ضَنٌّ بخل کرنے کو کہتے ہیں (ضَنَّ، يَضِنُّ) ضَنِيْنٌ، بخیل۔ With holder of (knowledge of) the unseen.

ڈاکٹر محمد لقمان السلفی لکھتے ہیں:

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین کو ان کی اصل صورت میں چھ سو پروں کے ساتھ مشرق کی جانب آسمان کے افق میں پہلی بار بایں طور دیکھا کہ پورا آسمانِ افق ان کے وجود سے بھر گیا تھا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: بظاہر یہ سورت واقعۂ معراج سے پہلے نازل ہوئی تھی، اس لیے کہ اس میں اسی پہلی

رؤیت کا ذکر آیا ہے، دوسری رؤیتِ جبریل کا ذکر سورۃ النجم میں آیا ہے جو سورۃ الاسراء کے بعد نازل ہوئی تھی، وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً أُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (النجم:۱۳-۱۵)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا تھا سدرۃ المنتہٰی کے پاس، اُسی کے پاس جنۃ الماویٰ ہے اور یہاں جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کے ذکر سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان سے اللہ کی وحی اور اس کا کلام حقیقی معنوں میں اور یقینی طور پر لیا، اس میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی جو بیش بہا وحی حاصل کی، اسے پوری وسعتِ قلبی کے ساتھ بے کم وکاست امت تک پہنچا دیا، اس بارے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیا بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ اسے امت کے لیے بیان کر دیا، اگر آپ کاہن ہوتے تو کاہنوں کی طرح بغیر اجرت لیے اسے دوسروں کو نہ بتاتے، اس لیے اے اہل قریش! تمہارا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ محمد ﷺ کاہن ہیں اور قرآن کسی مردود شیطان کا کلام ہے جسے وہ محمد ﷺ کو سکھاتا رہتا ہے۔" (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن، ج:۲)

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ﴾ اور نہ یہ (قرآن) کسی شیطان مردود کا قول ہے۔

وَ اور عاطفہ، مَا نہیں، هُوَ بِقَوْلِ یہ کلام (یعنی قرآن حکیم) شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ شیطان، راندے ہوئے کا (پھٹکارے ہوئے کا) رَجَمَ، يَرْجُمُ، رَجْمًا، پتھر مارنا، سنگسار کرنا، گالی دینا، لعنت بھیجنا، دھتکارنا، رَجْمٌ سے فَعِيْلٌ کے وزن پر رَجِيْمٌ اور یہاں پر معنی مفعول کا دیتا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

"(اہل مکہ) تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی شیطان آ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ باتیں پھونک دیتا ہے، شیطان کا آخر یہ کام کب ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو شرک اور بت پرستی اور دہریت والحاد سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی پرستش اور توحید کی تعلیم دے، انسان کو شترِ بے مہار بن کر رہنے کے بجائے اللہ کے حضور ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس دلائے، جاہلانہ رسموں اور ظلم اور بداخلاقی اور بدکرداری سے منع

کر کے پاکیزہ زندگی، عدل اور تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف رہنمائی کرے۔'' (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿فَاَیْنَ تَذْھَبُوْنَ﴾ (تمھیں کیا ہوگیا ہے؟) تم کدھر جارہے ہو؟

فَاَیْنَ (ف. اَیْنَ) پھر۔ کدھر، تَذْھَبُوْنَ تم جارہے ہو، فعل مضارع جمع مذکر حاضر (ذَھَبَ، یَذْھَبُ ذِھَابٌ) جانا، رخ کرنا۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں۔

''قرآن حیرت وتعجب سے سوال کرتا ہے؟ کہاں جارہے ہو؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو یا کیا فیصلہ کررہے ہو؟ حق سے منہ موڑ کر کدھر جارہے ہو؟ تم جہاں جاؤ گے حق تمہارے سامنے ہوگا، تم اس سے پیچھا نہ چھڑا سکو گے۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾

یہ (عظیم کتاب) تو سارے جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔

اِنْ نہیں ہے، نافیہ، ھُوَ ضمیر واحد مذکر غائب، قرآن حکیم کی طرف ہے، اِلَّا مگر، ذِکْرٌ نصیحت، لِّلْعٰلَمِیْنَ (لِ. الْعٰلَمِیْنَ) لیے، جہان والوں (کے) یعنی یہ محض کتاب نہیں ہے بلکہ یہ تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''قرآن حکیم ایک یاد دہانی ہے، وہ یاد دلاتا ہے کہ ان کے وجود کی حقیقت کیا ہے، ان کی پیدائش کی حقیقت کیا ہے، جو کائنات ان کے گرد و پیش ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، ''لِلْعٰلَمِیْنَ'' سب جہان والوں کے لیے...... یہ دعوت اول مرحلہ ہی سے عالمی دعوت ہے، یہ اس وقت کا اعلان ہے جب اسلامی دعوت مکہ میں محدود و محصور تھی اور کچلی جارہی تھی، اسلامی دعوت کے عالمی ہونے کا تذکرہ تم اسی طرح کی بہت سی مکی آیات میں پاؤ گے، قرآن کے سلسلے میں اس وضاحت کے بعد قرآن انہیں بتاتا ہے کہ ہدایت کی راہ صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو ہدایت کے طالب ہوں۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ﴾

تم میں سے ہر اس شخص کے لیے جو راہ راست پر چلنا چاہتا ہو۔

لِمَنْ (لِ. مَنْ) لیے۔اس شخص کے، لام حرف جر مَنْ مجرور، اسم موصول جو،شَاءَ چاہتا ہے (شَاءَ، يَشَاءُ مَشِيئَةٌ) چاہنا، پسند کرنا، مِنكُمْ (مِنْ. كُمْ) سے،تم یعنی تم میں سے۔اَنْ يَسْتَقِيْمَ یہ کہ وہ سیدھی راہ پر چلے (اِسْتَقَام، يَسْتَقِيْمُ، اِسْتِقَامَةٌ) سیدھے راستہ پر چلنا، راہِ راست اختیار کرنا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”اگر تم اس (ہدایت الٰہی) کو قبول کرو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے کسی دوسرے پر احسان نہیں کرو گے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس کو قبول کرنا یا رد کرنا تمہاری اپنی ہی ذمہ داری ہے، اللہ یا اس کے رسول کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کو تمہارے دلوں میں اتار دیں۔تو جس کو اپنی راہ سیدھی کرنی ہو، وہ سیدھی کر لے، ورنہ اپنی کج روی کے اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔“ (تدبر قرآن، ج: ہشتم)

﴿وَ مَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾

اور تم کچھ چاہ نہیں سکتے جب تک کہ اللہ نہ چاہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔

وَمَا اور نہیں ہے،تَشَآءُوْنَ (جو) چاہتے ہو تم، اِلَّآ مگر (وہی) اَنْ جو،يَّشَآءَ اللّٰهُ چاہتا ہے اللہ، رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (جو) رب ہے سب جہانوں کا۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”یعنی تمہاری چاہت، اللہ کی توفیق پر منحصر ہے، جب تک تمہاری چاہت کے ساتھ اللہ کی مشیت اور اس کی توفیق شامل نہیں ہوگی، اس وقت تک تم سیدھا راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔“ (احسن البیان)

اللہ تعالیٰ کی مشیت ساری مشیتوں پر غالب ہے تمام کائنات میں اسی کا حکم جاری و ساری ہے۔ بقول سید قطب شہید اس طرح کی جو آیات آتی ہیں ان کا منشا فکر ایمانی کو درست کرنا اور اس حقیقت کبریٰ

سے ایمان کو وابستہ کرنا ہے کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اور اللہ نے انسانوں کو خیر وشر میں سے ایک کو اختیار کرنے کی جو آزادی بخشی ہے، کائنات کی ہر منصوبہ سازی اور ہر نظم وتدبیر امر کی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی کا ایک حصہ ہے، یہ اسی کی شان ہے کہ اس نے فرشتوں کو ایسا بنایا ہے کہ وہ احکام الٰہی کی کامل اطاعت کریں اور جو احکام انہیں دیے جاتے ہیں، ان کی بجا آوری پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ یہ فرشتوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے جبکہ انسانوں کے سلسلے میں اس کی مشیت یہ ہے کہ اس نے انہیں قدرت بخشی ہے کہ وہ ہدایت وضلالت کے واضح ہو جانے کے بعد ان دو راہوں میں سے کسی ایک راہ کو اختیار کر سکتے ہیں۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اہل مکہ کو سمجھایا جا رہا ہے کہ (نعوذ باللہ) تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ سمجھتے ہو دراں حالیکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اعلیٰ درجے کی استعداد اور صلاحیت بخشی ہے، ایسی صلاحیت جو ساری کائنات میں کسی اور کے حصے میں نہیں آئی اور آپ کی لسان صدق سے حقائق ومعارف کے پھول جھڑتے ہیں۔

۲) قرآن ایسی عظیم کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر جبریل امین نے نازل کیا، جن کی امانت ودیانت شک وشبہ سے بالاتر ہے اور جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صادق وامین ہونا بھی اپنی جگہ مسلم ہے، اگر جبریلؑ صادق ہیں تو رسول کریم اصدق ہیں، انہوں نے جو وحی جبریل امین سے وصول کی، وہ من وعن لوگوں تک پہنچا دی نہ صرف پہنچائی بلکہ خود اس پر عمل کر کے اخلاق حسنہ کا نمونہ پیش کیا۔

۴) یہ قرآن شیطان مردود کا کلام بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ شیطان تو ہمیشہ برائی اور بے حیائی کی دعوت دیتا ہے اور انسان کا کھلا دشمن ہے، یہ تو رب کریم کا کلام ہے اور پاکیزہ تعلیم پیش کرتا ہے۔ اخلاق عالیہ توحید الٰہی، عبادت وریاضت، احسان ومروت، عفو ودرگزر ایسے پاکیزہ دروس کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

۵) اس حقیقت حال کے واضح ہو جانے کے بعد ادھر ادھر وہی لوگ بھٹکتے ہیں جو عقل وفکر سے عاری اور

دانش وبینش سے فارغ ہیں، جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس نے ہر شبہ دور کر دیا، ہر شک کا ازالہ کر دیا، ہر عذر کو ختم کر دیا اور ہر بات کو روز روشن کی طرح نکھار کر رکھ دیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل وشعور کی دولت ودیعت فرمائی ہے تاکہ وہ کھرے اور کھوٹے، حق اور باطل میں تمیز کر سکے اور انفس وآفاق میں ہدایت کے دلائل اتنے قوی اتنے مضبوط، اتنے گہرے اور اتنے وزنی ہیں کہ کسی دل کے لیے ان کی گرفت سے نکلنا سخت دشوار ہے اِلّا یہ کہ وہ حق سے انحراف کی دانستہ جدوجہد کرے اور اس سے وہی منہ موڑتا ہے جس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا ہو۔

۶) ہدایت اور گمراہی پر بھی اسی کا حکم غالب رہتا ہے جو راہ حق کی طرف بڑھتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ روشنی سے بہرہ ور کرتا ہے اور صراط مستقیم پر گامزن رکھتا ہے، اور جو کفر اور گمراہی پر ڈٹے رہنے کا ارادہ کرتے ہیں انہیں وہ سرکشی اور گمراہی میں ڈھیل دیتا ہے اور جب کبھی وہ اسلام کی روشنی کی طرف بڑھنے کا ارادہ کریں، انہیں وہ اپنی رحمت میں ڈھانپ لیتا ہے۔ ان کی سابقہ خطائیں معاف کر ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہر حال میں غالب رہتی ہے یہاں تک کہ نبی اور ولی بھی اس میں دخیل نہیں ہو سکتے ہیں مثلاً نوح علیہ السلام اپنے لخت جگر کو غرق ہونے سے نہ بچا سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدت سے چاہت کے باوجود اپنے چچا ابو طالب کو اسلام کی طرف مائل نہ کر سکے۔

سُورَةُ الاِنفِطَار

"اِنفَطَر، یَنفَطِرُ، اِنفِطَارًا" کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ یہ نام سورۃ کی پہلی آیت "اِذَا السَّمَاءُ انفَطَرَتْ" سے ماخوذ ہے یعنی جب آسمان پھٹ جائے گا۔

یہ سورت قیام مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی، گزشتہ سورت کی طرح اس میں بھی قیامت کی گھڑی کا ذکر ہے، لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اس گھڑی کو نہ بھولو جو یقیناً آکر رہے گی، آسمان جس میں کوئی دراڑ اور شگاف نہیں اللہ کے حکم سے پھٹ جائے گا، ستارے جو اپنی جگہ قرینے سے سجے نظر آتے ہیں بکھر جائیں گے، سمندر ابل پڑیں گے، زمین اپنے دفینوں کو اگل دے گی، اس وقت ہر شخص کے سامنے اس کا کیا دھرا سب آجائے گا اور زندگی میں جو کچھ اعمال اس نے کمائے وہ سامنے آجائیں گے۔ اسے ان پر انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے گی کیونکہ معتبر فرشتے انسان کے ہر قول وفعل کو ضبط تحریر میں لا رہے ہیں۔

اس قابل وثوق ریکارڈ کے مطابق نیکوں کو ان کی نیکی کا اجر ملے گا اور وہ باغ و بہار میں ہوں گے اور بروں کو ان کی برائی کی سزا ملے گی اور وہ دوزخ میں پھینک دیے جائیں گے، لوگو! اس ہولناک دن سے بچو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، صرف نیک اعمال ہی نجات کا ذریعہ ہوں گے، فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہوگا۔

سُوْرَةُ الاِنفِطَار

آیات:۱۹ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ(۱) وَاِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ(۲)
وَاِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ(۳) وَاِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ(۴)
عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ(۵)﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب ستارے جھڑ جائیں گے، اور جب سمندر بہہ پڑیں گے، اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی، تب ہر جان کو پتہ چل جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔

﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ﴾ جب آسمان پھٹ جائے گا۔

اِذَا جب، ظرفِ زمان، السَّمَآءُ آسمان، انۡفَطَرَتۡ، پھٹ جائے گا اس کا مادہ (ف ط ر) ہے، نئی چیز بنانا۔ گھڑنا، فَاطِرٌ (اسم فاعل) بنانے والا، نئی چیز گھڑنے والا۔ قرآن حکیم میں ہے: اَللّٰھُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (الزمر:۴۶) ''اے اللہ! ارض وسماوات کے پیدا کرنے والے (بغیر نمونے کے بنانے والے)۔''

فِطۡرَتٌ، (فِطۡرَۃٌ) بناوٹ، سرشت، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے: کُلُّ مَوۡلُوۡدٍ یُوۡلَدُ عَلٰی فِطۡرَۃِ الۡاِسۡلَامِ ''ہر پیدا ہونے والا بچہ اسلام کی سرشت پر پیدا ہوتا ہے۔'' فُطُوۡرٌ، شگاف، اِنۡفَطَر، پھٹ جانا، شق ہو جانا۔

﴿وَاِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ﴾ اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔

وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ''وَ'' استعمال ہوا ہے، اِذَا جب، ظرف زمان،

الْكَوَاكِبُ ستارے، اس کا مفرد کَوْکَبٌ ہے۔ اِنْتَثَرَتْ جھڑ جائیں گے (بکھر جائیں گے) اسکا مادہ (ن ث ر) ہے، اِنْتَثَر، یَنْتَثِرُ، اِنْتِثَارٌ، بکھرنا، جھڑنا۔

﴿وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ﴾ اور جب سمندر بہہ پڑیں گے۔

فُجِّرَتْ فعل مجہول واحد مؤنث غائب، اس کا مادہ (ف ج ر) ہے فَجَّرَ، یُفَجِّرُ تَفْجِیْرٌ، زمین پھاڑ کر پانی بہا دینا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

سورہ تکویر میں فرمایا گیا کہ سمندروں میں آگ بھڑکا دی جائے گی اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا، دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے اور یہ بات بھی نگاہ میں رکھی جائے کہ قرآن کی رو سے قیامت کے روز ایک ایسا زبردست زلزلہ آئے گا جو کسی علاقے تک محدود نہ ہوگا بلکہ پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی، تو سمندروں کے پھٹنے اور ان میں آگ بھڑک اٹھنے کی کیفیت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ پہلے اس عظیم زلزلے کی وجہ سے سمندروں کی تہہ پھٹ جائے گی اور ان کا پانی زمین کے اس اندرونی حصے میں اترنے لگے گا جہاں ہر وقت ایک بے انتہا لاوا کھولتا رہتا ہے، پھر اس لاوے تک پہنچ کر پانی اپنے دو ابتدائی اجزاء کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا۔ جن میں سے ایک، یعنی آکسیجن جلانے والی اور دوسری، یعنی ہائیڈروجن، بھڑک اٹھنے والی ہے، اور یوں تحلیل اور آتش افروزی کا ایک ایسا مسلسل ردِّعمل (Chain Reaction) شروع ہو جائے گا جس سے دنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ ہمارا قیاس ہے، باقی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔" (تفہیم القرآن، جلد ششم)

﴿وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ﴾ اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی۔

وَ اور عاطفہ، اِذَا جب، الْقُبُوْرُ قبریں، اس کا مفرد الْقَبْرُ ہے، بُعْثِرَتْ اکھاڑ دی جائے گی، فعل ماضی مجہول واحد مؤنث غائب (بَعْثَرَ، یُبَعْثِرُ، بَعْثَرَةٌ) بکھیرنا، الٹ پلٹ کرنا، چھپی ہوئی چیز کو برآمد کرنا، جانچ پڑتال کے لیے بکھیرنا۔ (القاموس الوحید)

قرآن حکیم کی سورۃ العٰدیت میں آتا ہے: اَفَـلَا يَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِى الۡقُبُوۡرِ (۹) تو کیا وہ (ناشکرا انسان) اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اسے نکال لیا جائے گا۔''

﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ﴾

(تب) ہر شخص جان لے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔

حافظ صلاح الدین یوسف اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یعنی جب مذکورہ امور واقع ہوں گے تو ہر انسان کو اپنے کیے دھرے کا علم ہو جائے گا، جو بھی اچھا یا برا عمل اس نے کیا ہوگا وہ سامنے آجائے گا، پیچھے چھوڑے ہوئے عمل سے مراد اپنے کردار اور عمل کے اچھے یا برے نمونے ہیں جو دنیا میں وہ چھوڑ آیا اور لوگ ان نمونوں پر عمل کرتے ہیں، یا نمونے اگر اچھے ہیں تو اس کے مرنے کے بعد ان نمونوں پر جو لوگ بھی عمل کریں گے، اس کا ثواب اسے بھی پہنچتا رہے گا اور اگر برے نمونے اپنے پیچھے چھوڑ گیا تو جو جو بھی اسے اپنائے گا ان کا گناہ بھی اس شخص کو پہنچتا رہے گا جس کی مساعی سے وہ بُرا طریقہ یا کام رائج ہوا۔'' (احسن البیان)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

دنیا امتحان گاہ ہے، امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے گا، کائنات کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا، یہ کوئی بڑا انقلاب ہوگا، جو اللہ کے حکم سے اس کائنات کے پورے نظام کو الٹ پلٹ کر رکھ دے گا...... یہ بلند و بالا پہاڑ، یہ ہمالہ اور کے ٹو کی چوٹیاں، اس کے حکم سے دھنی ہوئی روئی کی طرح اڑیں گی، یہ آفتاب و ماہتاب اور کئی ستارے اور سیارے جو زمین سے کئی گنا بڑے ہیں، خالق کائنات کے حکم سے ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ سمندر بہہ نکلیں گے اور ان کا پانی شعلوں میں تبدیل ہو جائے گا۔

جس اللہ نے اس عاجز انسان کو ایٹم بم بنانے کی طاقت عطا کر دی ہے اس کے سامنے یہ ساری تبدیلیاں ممکن معلوم ہوتی ہیں بشرطیکہ وہ غور وفکر کرے۔ انسانوں نے جو ایٹم بم چھپا رکھے ہیں اگر وہ اپنے دھماکہ خیز مواد سے پھٹنے لگیں تو نہ معلوم یہ دنیا کتنی بڑی آفت کا شکار ہو جائے۔ ہر سو گھپ اندھیرا چھا

جائے، ہر طرف آگ اور شعلوں کے بادل چھا جائیں، اور یہ زندہ انسان منٹوں اور سیکنڈوں میں موت کا نوالہ بن جائیں۔ یہ اندازہ تو صرف اس قوت کا ہے جو اس وقت تک انسان کے قبضے میں آ چکی ہے اور اسے بھی انسان کی محدود قوت ہی قرار دیا جا سکتا ہے، اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی قوت اور طاقت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے، اس کے حکم سے آج بھی دنیا میں زلزلے کے چند شدید جھٹکے آتے ہیں تو وہ علاقہ اور بستی آناً فاناً صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتی ہے، عقلمندوں کے لیے یہ سامان عبرت ہے۔

....

﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ(٦) الَّذِىْ
خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ(٧) فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ
رَكَّبَكَ (٨) كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ(٩) وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ
لَحٰفِظِيْنَ (١٠) كِرَامًا كَاتِبِيْنَ(١١) يَعْلَمُوْنَ مَا
تَفْعَلُوْنَ(١٢)﴾

اے انسان! تجھے (آخر) کس چیز نے اپنے اس رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟ جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نِک سُک سے درست کیا۔ تجھے متناسب بنایا اور جس شکل میں چاہا، تجھے جوڑ دیا، ہرگز نہیں بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو، حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں

﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ﴾

اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟

یٰۤاَیُّهَا اے، **یَا**، کلمۂ ندا، **اَیُّ**، منادی، کبھی **یَآ** اکیلا استعمال ہوتا ہے جیسا کہ **یا عَبْدَاللّٰہِ** اور کبھی **یآاَیُّهَا** اور یہ اس وقت لاتے ہیں جب **ایّھا** کے بعد اسم ''ال'' کے ساتھ استعمال ہو رہا ہو جیسا کہ **یَا ایُّھَا النَّاسُ، یَا ایُّھَا الْاِنْسَانُ، مَا** کس چیز نے استفہام، **غَرَّکَ** (**غَرَّ. کَ**) مغرور کیا۔ تجھے (**غَرَّ، یَغُرُّ، غُرُوْرٌ**) فریب دینا، دھوکے میں ڈالنا، **بِرَبِّکَ** (**بِ. رَبِّ. کَ**) بارے۔ رب۔ تیرے (کے) یعنی تیرے رب کے بارے میں، **الْکَرِیْمِ** (جو) کریم ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جو بندوں پر انتہائی مہربان ہے۔ **مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ** اَیْ مَا خَدَعَکَ و جرَّاکَ عَلٰی عِصْیَانِہٖ یعنی کس چیز نے تجھے دھوکے میں ڈالا اور اس خالق کائنات کی نافرمانی پر اکسایا؟ (کلمات القرآن، حسنین مخلوف)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''جو تو اس (عظیم محسن) کے ادائے حقوق کی ذرا فکر نہیں کرتا سوال سے مقصود غیرت دلانا ہے، کہ ان نعمتوں کا مقتضا تو یہ تھا کہ تو ادائے شکر کرتا، چہ جائے کہ تو اس کی ناشکری پر آمادہ ہو گیا ہے، **رَبِّکَ الْکَرِیْم** ایک تو رب (جہانوں کا پالنہار) اور اس پر کریم کا اضافہ اسی غیرت کی کیفیت میں اور اضافہ کرنے کے لیے ہے...... جو مالک و مولیٰ ساتھ ساتھ رحیم و شفیق بھی ہو، اس کے بارِ احسان سے تو سر اور بھی ہرگز ہرگز نہ اٹھنا چاہیے، **اَلْانسانُ** انسان سے مراد اس سیاق میں کافر (ناشکرا) انسان ہے۔'' (تفسیر ماجدی)

﴿**الَّذِی خَلَقَکَ فَسَوّٰیکَ فَعَدَلَکَ**﴾

جس (ذاتِ حق) نے تجھے پیدا کیا، تجھے نِک سُک سے درست کیا۔

الَّذِی جس نے، اسم موصول، **خَلَقَکَ** (**خَلَقَ. کَ**) پیدا کیا۔ تجھے (**خَلَقَ، یَخْلُقُ، خَلْقٌ**) پیدا کرنا، **خَلَقَ**، فعل ماضی واحد مذکر غائب۔ **کَ**، ضمیر واحد مذکر حاضر، **فَسَوّٰیکَ** (**فَ. سَوّٰی. کَ**) پس نِک سُک سے درست کیا۔ تجھے، **ف** پس، عاطفہ سلسلہ کلام میں ربط کے لیے ہے، (**سَوّٰی، یُسَوِّی، تَسْوِیَۃٌ**) ہموار اور درست کرنا، **سَوّٰی**، واحد مذکر غائب، اس نے درست کیا، شکل و صورت میں انتہائی موزوں اور متناسب بنایا، **کَ** تجھے، ضمیر واحد مذکر حاضر، **فَعَدَلَکَ** (**فَ. عَدَلَ. کَ**) پس۔ اس نے مناسب بنایا۔ تجھے، **ف** عاطفہ، (**عَدَلَ، یَعْدِلُ، عَدْلًا**) **عَدَل**

الشیءَ عَدْلًا، سیدھا کرنا، برابر کرنا۔ (القاموس الوحید)

﴿فِیٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ﴾

اور جس شکل میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

فِیْ میں، حرف جر، بعد والے حرف کو زیر دیتا ہے اَیِّ استفہامیہ، فِیْ اَیِّ جونسی، صُوْرَةٍ صورت (میں)، مَّا شَآءَ جیسا اس نے چاہا، ماضی واحد مذکر غائب (شَاءَ، یَشَاءُ، مَشِیْئَةٌ) چاہنا، رَکَّبَکَ (رَکَّبَ. کَ) اس نے جوڑا (ترکیب دیا) تجھے (رَکَّبَ، یُرَکِّبُ، تَرْکِیْبٌ) جوڑنا، ترکیب دینا، ربِ کائنات نے کائنات کی ہر چیز کو نظم وضبط سے جوڑا اور ترکیب دیا اور انسان کو تو شکل وصورت کے لحاظ سے بہترین بنایا، ہر عضو کی بناوٹ ایسی عمدہ اور کارآمد ہے گویا کہ بہترین کاریگر کا شاہکار ہے۔

امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

''جسم کی ساخت اور اس کی بناوٹ پر اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت کا مشاہدہ کیجیے......اس میں کوئی چھوٹی ہڈی ہے تو کوئی بڑی، کوئی لمبائی میں بڑی ہے تو کوئی چھوٹی، کوئی منحنی شکل میں ہے تو کوئی گولائی میں، کوئی پتلی ہے تو کوئی چوڑی، کوئی ٹھوس ہے تو کوئی کھوکھلی اور ربِ قدیر نے انہیں کس خوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے اور ہر چیز کو اس کی افادیت کے مطابق بنایا ہے مثلاً دانتوں کو کاٹنے کے لیے نوکدار اور تیز بنایا ہے تو داڑھوں کو پیسنے اور چبانے کے لیے چوڑا بنایا ہے اور انسان کو چونکہ نقل وحرکت کی ضرورت پیش آتی ہے لہٰذا اسے جسم میں چھوٹی بڑی مختلف قسم کی ہڈیاں مختلف شکلوں میں عطا فرمائی ہیں اور ان کے درمیان لچک اور فاصلہ رکھا ہے تاکہ انہیں گھمانے اور حرکت دینے میں آسانی رہے۔'' (مفتاح دار السعادۃ)

قرآن حکیم نے ایک ہی جملے میں اس مضمون کو بیان کر دیا جس پر اب تک ہزارہا صفحات لکھے جا چکے ہیں اور تا قیامت لکھے جاتے رہیں گے۔

﴿کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ﴾

ہرگز نہیں بلکہ (اصل بات یہ ہے) تم لوگ جزا وسزا کو جھٹلاتے ہو۔

كَلَّا یہ کلمہ عربی زبان میں کسی بات پر تنبیہ اور باز رکھنے کے لیے اور بعض اوقات مذمت کے لیے استعمال ہوتا ہے **كَلَّا بَلْ** ہرگز نہیں۔ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) **تُكَذِّبُوْنَ** تم جھٹلاتے ہو، فعل مضارع جمع مذکر حاضر (**كَذَّبَ، يُكَذِّبُ تَكْذِيبٌ**) جھٹلانا، **بِالدِّيْنِ** (**بِ. الدِّيْنِ**) کو۔ قیامت، یعنی قیامت کے (دن کو)۔

یہاں تمام انسانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ تم اپنے وجود اور اپنے آس پاس اللہ تعالیٰ کی قدرت و کاریگری کی بے شمار شہادتیں اور نشانیاں دیکھنے کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوتے، اس کا سبب دراصل یہ ہے کہ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا خوف جاتا رہا ہے اور تم نے دنیا ہی کو اپنا منتہا و مقصود بنا لیا ہے، اس لیے زندگی کے مقاصد سے بے خبر ہو۔

﴿**وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ**﴾ حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں۔

وَ اِنَّ اور تحقیق، **عَلَيْكُمْ** (**عَلٰى. كُمْ**) اوپر تمہارے **عَلٰى**. حرف جار۔ **كُمْ** ضمیر جمع مخاطب، **لَحٰفِظِيْنَ** یقیناً نگران ہیں، لام تاکیدی معنی دیتا ہے۔ **حَافِظٌ** اس کا مفرد ہے، یعنی (یاد رکھو) یقیناً تمہارے اوپر نگران (فرشتے) مقرر ہیں جو تمہارے ہر عمل کو لکھتے ہیں۔

﴿**كِرَامًا كَاتِبِيْنَ**﴾ بزرگ، لکھنے والے۔

كِرَامًا باعزت، بزرگ، اس کا مفرد **كَرِيْمٌ** ہے، **كَاتِبِيْنَ** لکھنے والے۔ اس کا مفرد **كَاتِبٌ** ہے۔

﴿**يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ**﴾ وہ جانتے ہیں (ہر اس چیز کو) جو تم کرتے ہو۔

يَعْلَمُوْنَ وہ جانتے ہیں فعل مضارع جمع مذکر غائب (**عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمٌ**) جاننا، **مَا** جو، اسم موصول، **تَفْعَلُوْنَ** تم (عمل) کرتے ہو (**فَعَلَ، يَفْعَلُ، فِعْلٌ**) کرنا۔ یہ ان فرشتوں کی صفات ہیں جو انسان کا نامۂ اعمال لکھنے پر مامور ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

’’یعنی جزا وسزا نہ صرف واقع ہو کر رہے گی، بلکہ اس کے لیے پورے انتظامات اور ایک مکمل نظام ابھی سے موجود ہے، اللہ کے فرشتے اعمال کی پوری رپورٹ لکھنے کے لیے مقرر ہیں، امین ومتدّین ایسے کہ حق تعالیٰ انہیں ’’معزز‘‘ کے لقب سے پکارتا ہے اور نظر ان کی اتنی گہری کہ باریک سے باریک اور خفی سے خفی عمل ومحرکِ عمل بھی ان سے چھوٹنے نہیں پاتے، ’’حافظین‘‘ اس میں اشارہ ہے کہ ان سے فرو گذاشت (بھول) ممکن نہیں ’’کراماً‘‘ اس میں اشارہ ہے کہ کوئی امر خلاف دیانت یا خلافِ حکم ان سے صادر ہونا ممکن نہیں ’’یَعْلَمُوْنَ مَا تَفعَلُوْنَ‘‘ اس میں اشارہ ہے کہ کوئی عمل، خفی سے خفی بھی ہو، ان کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ (تفسیر ماجدی۔ ج:۲)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسان کا اپنا جسم اور اس کا ہر ہر عضو خالق و مالک کو پہچاننے کے لیے کافی ہے اور اگر وہ فہم وشعور سے تہی دامن نہ ہو جائے تو حق عبودیت یقیناً بجالائے، اور بے اختیار اس کی جبین نیاز اپنے مالک کی چوکھٹ پر سرنگوں ہو جائے اور ہمہ وقت اس کی غلامی کا دم بھرنے لگے، اس بات کو انبیائے کرام اور ان کے متبعین نے ہی سمجھا۔

۲) یہ عالم رنگ وبو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا سجایا ہوا ہے اور ہر چیز اس کی عظمت وکبریائی کا اعلان کر رہی ہے۔ انسان کو اس نے سب سے اشرف اور اپنا نائب بنایا ہے اسے تو بدرجہ اولیٰ خالق کائنات کی بندگی کا نمونہ ہونا چاہیے تھا مگر افسوس کہ وہ فخر وغرور میں سب کچھ بھول گیا اور فریب نفس کا شکار ہو گیا، یا پھر شیطان نے اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ جو کچھ چاہے کرتا رہے۔

۳) اے انسانو! اس بات کو اچھی طرح جان لو کہ تمہاری زندگی کا ہر ہر لمحہ اور ہر ہر عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہو رہا ہے، اور تمہارے ہر چھوٹے بڑے اچھے برے عمل کا نتیجہ بالآخر روزِ جزا وسزا ظاہر ہو کر رہے گا اور اسے انتہائی امین ودیانتدار نیک اور بزرگ فرشتے قلم بند کر رہے ہیں۔

....

﴿اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ(۱۳) وَّ اِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ(۱۴) یَّصۡلَوۡنَهَا یَوۡمَ الدِّیۡنِ(۱۵) وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِیۡنَ(۱۶) وَ مَآ اَدۡرٰىكَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ(۱۷) ثُمَّ مَآ اَدۡرٰىكَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ(۱۸) یَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ؕ وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ(۱۹)﴾

یقیناً نیک لوگ آسائشوں اور نعمتوں میں ہوں گے، اور یقیناً فاجر لوگ جہنم میں ہوں گے، جزاوسزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے، اور وہ جہنم سے غائب نہ رہ سکیں گے (نکل نہ سکیں گے)، اور آپ کیا جانیں کہ روزِ جزاوسزا کیا ہے؟ پھر آپ کو کیا خبر کہ وہ دن کیسا ہے؟ یہ وہ دن ہے جب کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آسکے گا اور اس دن حکم صرف اللہ ہی کا چلے گا۔

﴿اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ﴾ یقیناً نیک لوگ آسائشوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔

اِنَّ یقیناً، بلاشبہ، جملہ کے شروع میں زورِ بیان کے لیے آتا ہے۔ اَلۡاَبۡرَارَ نیک لوگ، برٌّ اس کا مفرد ہے، لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ضرور بضرور نعمتوں میں ہوں گے، لام زبر کے ساتھ تاکیدی معنی دیتا ہے، نَعِیۡمٍ نعمتیں۔ اس کا مفرد نِعۡمَةٌ ہے۔

امام راغب اصفہانی برٌّ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اَلۡبَرُّ، البحر کی ضد ہے، پہلے لفظ کے معنی 'خشکی' جبکہ دوسرے لفظ کے معنی 'سمندر' ہیں، پھر اسی لفظ یعنی سمندر کی وسعت کے لحاظ سے وسیع پیانے پر نیکی کرنے کے لیے یہ عربی زبان میں استعمال ہونے لگا، اس کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ آتا ہے: اِنَّهٗ هُوَ الۡبَرُّ الرَّحِیۡمُ (الطّور:۲۸) ''بلاشبہ وہ احسان کرنے والا، مہربان ہے۔'' اور کبھی بندے کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: بَرَّ الۡعَبۡدُ رَبَّهٗ یعنی بندے نے اپنے رب کی خوب اطاعت کی، چنانچہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف

ہوتو اس کے معنی ثواب عطا کرنے کے ہوتے ہیں اور جب بندے کی طرف ہوتو معنی اطاعت اور فرمانبرداری کے ہوتے ہیں۔

"اَلْبِرُّ" (نیکی) دوقسم پر ہے......اعتقادی اور عملی۔ سورۃ البقرہ کی مندرجہ ذیل آیہ مبارکہ دونوں قسم کی نیکی کے بیان پر مشتمل ہے:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ، وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ، وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ، وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّکٰوةَ، وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا، وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ، اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا، وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرہ:۱۷۷)

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے نبیوں کو دل سے مانے، اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں، یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں، یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بِرٌّ کی تفسیر دریافت کی گئی تو آپ نے جواباً مندرجہ بالا آیت ہی تلاوت فرمائی کیونکہ اس آیت میں عقائد و اعمال اور فرائض و نوافل کی پوری تفصیل موجود ہے۔(مفردات القرآن)

﴿وَّ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ﴾ اور یقیناً فاجر لوگ جہنم میں ہوں گے۔

وَّ اور، اِنَّ یقیناً، اَلْفُجَّارَ (بدکار) لوگ اس کا مفرد فاجِرٌ ہے، (فَجَرَ، یَفْجُرُ، فُجُوْرًا) جھوٹ بولنا، حق بات سے ہٹ جانا، بے حیائی کا مرتکب ہونا، کفر کرنا، "وَّ اِنَّ الْفُجَّارَ" اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ (تفسیر الطبری)، فُجَّارَ، وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا۔ لَفِیْ (لَ۔فِیْ) ضرور بضرور

ہوں گے جَحِیۡمٍ جہنم میں۔

﴿یَّصۡلَوۡنَهَا یَوۡمَ الدِّیۡنِ﴾

جزاوسزا کے دن وہ اس میں (جہنم میں) ڈالے جائیں گے۔

یَّصۡلَوۡنَهَا (یَّصۡلَوۡنَ. هَا) داخل ہوں گے، اس میں یعنی جہنم میں هَا کی ضمیر جہنم کی طرف جاتی ہے (صَلٰی، یَصۡلٰی، صَلۡیًا) داخل ہونا، آگ میں پڑنا یَوۡمَ الدِّیۡنِ، جزا وسزا کا دن۔

﴿وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِیۡنَ﴾ اور وہ جہنم سے غائب نہ رہ سکیں گے۔

وَ. اور، مَا. نہیں، نافیہ، هُمۡ کی ضمیر جمع مذکر غائب کفار کی طرف جاتی ہے، عَنۡهَا (عَنۡ. هَا) اس سے هَا کی ضمیر جہنم کی طرف جاتی ہے، بِغَآئِبِیۡنَ (بِ. غَائِبِیۡنَ) غائب ہونے والے (نکالے جانے والے) غَائِبٌ کی جمع غَائِبُوۡنَ، بِ حرف جر کی وجہ سے غَائِبِین ہوا۔

﴿وَ مَآ اَدۡرٰیکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ﴾ اور آپ کیا جانیں کہ روزِ جزاوسزا کیا ہے؟

وَ مَآ اور کیا، وَ اور عاطفہ سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے ہے، مَآ استفہامیہ ہے، اَدۡرٰیکَ (اَدۡرٰی. کَ) جانیں، آپ (اَدۡرٰی، یُدۡرِی، ادۡرَاءً) جاننا مَا یَوۡمُ کیا ہے دن، الدِّیۡنِ جزاوسزا (کا)۔

﴿ثُمَّ مَآ اَدۡرٰیکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ﴾ پھر آپ کو کیا خبر کہ وہ دن کیسا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”یہ تکرار، (اس دن کی) عظمت، فخامت اور ہولناکیوں کی وضاحت کے لیے ہے۔“ (احسن البیان)

﴿یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا﴾

یہ وہ دن ہے جب کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آسکے گا۔

یَوۡمَ دن، ظرف زمان اس میں فعل محذوف (پوشیدہ) ہے، یعنی اُذۡکُرۡ یاد کرو اس دن کو، لَا تَمۡلِکُ نہیں اختیار ہوگا۔ (مَلَکَ، یَمۡلِکُ، مِلۡکًا) مالک ہونا، اختیار ہونا یہ اردو میں بھی معروف

ہے، نَفۡسٌ کسی شخص کو لِّنَفۡسٍ کسی شخص کے لیے، شَيۡـًٔا کچھ بھی یعنی یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کو کسی دوسرے کے لیے کوئی اختیار نہ ہوگا۔

﴿وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ اور اس دن حکم صرف اللہ کا چلے گا۔

وَالۡاَمۡرُ اور حکم، يَوۡمَئِذٍ اس دن، لِّلّٰهِ، صرف اللہ ہی کا ہوگا، یعنی مخلوق میں سے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوگی، سب کے سب بے بس اور بے اختیار ہوں گے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا: لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ؟ (المؤمن:۱۶)، (اس روز پکار کر پوچھا جائے گا) آج بادشاہی کس کی ہے (سارا عالم پکار اٹھے گا) لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ اللہ سبحانہ وتعالیٰ واحد قہار کی، (اللہ اکبر!)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) قیامت کے روز انسانوں کے دو گروہ ہو جائیں گے...... ایک وہ جنہوں نے اپنے خالق و مالک کو پہچانا، اس کے احکام کو تسلیم کیا اور انہیں حرز جاں بنایا...... اور دوسرے وہ جنہوں نے بغاوت اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا اور اپنی خواہشات کے غلام بنے رہے یا پھر شیاطین کے پھندوں میں گرفتار رہے، یہ دونوں گروہ الگ الگ انجام سے دوچار ہوں گے۔ پہلا گروہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے سرفراز ہوگا...... باغ و بہار، ابدی اور دائمی نعمتوں سے بہرہ ور ہوگا جبکہ دوسرا گروہ کرب و تکلیف، ہمیشہ کی اذیت اور عذاب میں مبتلا رہے گا۔

۲) یہ جزا و سزا کا دن بڑی اہمیت رکھتا ہے...... آج انسانوں کی اکثریت اس سے غافل اور بے پروا ہے...... اس دن کی ہولناکیوں اور سختیوں سے اللہ تعالیٰ نے باخبر کر دیا ہے...... وہاں انسان کے اچھے اعمال کے سوا کوئی چیز نفع نہ دے سکے گی اور نہ ہی کوئی کسی کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکے گا، اس دن حکم صرف اللہ ہی کا ہوگا، سب جھوٹے اقتدار مٹ چکے ہوں گے۔ مظلوموں کی دادرسی ہوگی اور ظالموں کو شکنجے میں جکڑ دیا جائے گا۔

..................o..................

سُوۡرَۃُ الۡمُطَفِّفِیۡن

اَلۡمُطَفِّفِیۡن ''مُطَفِّف'' کی جمع ہے اس کے معنی ہیں ''کمی کرنے والے'' اور یہ نام سورہ کی پہلی آیت میں مذکور ہے، اور اس میں ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے، یہ معاملہ کاروبار کا ہو یا ادائیگی حقوق کا، حق تلفیاں بہرحال معاشرتی زندگی کے امن اور سکون کو برباد کر دیتی ہیں، یہ مکی سورتوں میں سے ہے۔

اس سورۃ کی پہلی چھ آیات میں اس عام بے ایمانی پر گرفت کی گئی ہے جو کاروباری لوگوں میں بکثرت پھیلی ہوئی تھی کہ دوسروں سے اشیا خریدتے تو پورا ناپ تول کر لیتے تھے مگر جب دوسروں کو دینا ہوتا تو ناپ تول میں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کمی کر دیتے تھے، ظاہر ہے کہ ایسی حرکت وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں آخرت میں رب تعالیٰ کے حضور جوابدہی پر پورا یقین نہ ہو اور دنیا اور اس کی منفعتیں ہی ان کا منتہائے مقصود ہو۔

جو لوگ خواہشات نفس کے مطابق زندگی گزارتے ہیں انہیں ڈرایا گیا ہے کہ انہیں بُرے انجام کا سامنا کرنا ہوگا، اس کے برعکس ابرار و صالحین کو خوشخبریاں دی گئی ہیں کہ انہیں جنت میں لازوال اور بے بہا اجر سے نوازا جائے گا۔

آخر میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے اور اس کے ساتھ کفار کو خبردار بھی کیا گیا ہے کہ آج جو لوگ ایمان لانے والوں کی تذلیل کر رہے ہیں، روزِ قیامت یہی مجرم اپنی اس روش کا بہت بُرا انجام دیکھیں گے اور پھر یہی ایمان لانے والے ان مجرموں کا برا انجام دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں گے۔

سُوۡرَۃُ الۡمُطَفِّفِیۡن

آیات:۳۶ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ(۱) الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ
یَسۡتَوۡفُوۡنَ(۲) وَ اِذَا کَالُوۡھُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡھُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ(۳)
اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ(۴) لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ(۵)
یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ(۶)﴾

(ارشاد ہوا) ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے بڑی تباہی ہے، (جن کا حال یہ ہے) کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب اُن کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو اس میں کمی کر دیتے ہیں، کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ (روزِ محشر) زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، ایک بڑے سخت دن میں، جس روز تمام انسان (اٹھیں گے) اور ربّ العالمین کے حضور پیش ہوں گے

﴿وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ﴾ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے بڑی تباہی ہے۔

وَیۡلٌ خرابی ہے، افسوس ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں: " قَالَ الۡأَصۡمَعِیُّ: وَیۡلٌ قُبۡحٌ، وَقَدۡ یُسۡتَعۡمَلُ عَلَی التَّحسُّرِ" اصمعی کا کہنا ہے کہ وَیۡلٌ برے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور حسرت کے موقع پر بولا جاتا ہے۔" (مفردات القرآن)

پھر یہ لفظ ہلاکت، تباہی، عذاب، افسوس اور وادیِ جہنم کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ (لِ. الۡمُطَفِّفِیۡنَ) لیے، کم دینے والوں (کے) مُطَفِّفِیۡنَ، طَفٌّ سے تَطۡفِیۡفٌ، وزن میں کمی کرنا، دھوکہ دینا،

ناپ تول میں کمی کرنا، ادائیگی حق میں کمی کرنا، مُطَفِّفٌ (اسم فاعل) وہ جو وزن میں کمی کرے، وہ جو ادائیگی حق میں کمی کرے، دھوکہ دینے والا، اس کی جمع مُطَفِّفُوْن ہے حرفِ جر کی وجہ سے مُطَفِّفِیْنَ پڑھا گیا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ جملہ صرف خبریہ نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر لعنت اور پھٹکار کا مضمون بھی مضمر ہے، ''تطفیف'' کے معنی ناپ تول میں کمی کرنے کے ہیں یعنی جو لوگ ناپ تول میں کمی کرنے والے ہیں، ان کے لیے تباہی اور ان پر اللہ کی مار اور پھٹکار ہے۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ﴾

(ان کا حال یہ ہے) کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔

الَّذِيْنَ وہ لوگ (جو) اسم موصول، اس کا مفرد الَّذِی ہے، اِذَا جب جس وقت (ظرف زمان) اكْتَالُوْا جمع مذکر غائب، وہ ماپ لیویں (کَالَ، یَکِیْلُ، کَیْلًا) پیمائش کرنا، جیسے کہتے ہیں كِلْتُ فُلَانًا الطَّعَامَ، میں نے فلاں کو کھانے کی چیز یا غلہ ناپ کر دیا، اِكْتَالَ مِنْهُ وَ عَلَيْهِ کسی سے اپنے لیے خود ناپ کر لینا، کَیْلَ بَعِیْرٍ، ایک اونٹ کا بوجھ، مِكْيَالٌ، پیمانہ، ماپ (القاموس الوحید)

يَسْتَوْفُوْنَ پورا پورا لیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب، اس کا مادہ (و ف ی) ہے، وَفٰی، یَفِیْ، وَفَاءً بِعَهْدِه، اپنے وعدہ یا عہد کو پورا کرنا۔ (استَوْفٰی، یَسْتَوْفِی، اِسْتِیْفَاءٌ) پورا پورا حق لینا، پورا پورا حق مانگنا، (حوالہ ایضاً)

یعنی جب دوسروں سے اپنا حق لیں تو بڑے دانا اور ہوشیار بن جائیں، یَسْتَوْفُوْنَ اَیْ یأْخُذُوْنَهَا وَافِيَةً كَامِلَةً یعنی جب کسی سے اپنا حق لیں تو بھرپور طریقے سے لیں۔ (المراغی)

﴿وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾

اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو اس میں کمی کر دیتے ہیں۔

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، كَالُوْهُمْ (كَالُوْ.هُمْ) ماپ کر دیں، انہیں،

كَالُوْا جمع مذکر غائب، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ، اَوْ یا، وَزَنُوْهُمْ (وَزَنُوْا.هُمْ) تول کر دیں، انہیں وَزَنُوا، جمع مذکر غائب، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب (وَزَنَ، یَزِنُ، وَزْنًا) وزن کرنا، وزن کر کے دینا، يُخْسِرُوْنَ، کمی کر دیتے ہیں اس کا مادہ (خ س ر) ہے (أَخْسَرَ، يُخْسِرُ اِخْسَارٌ) الشیءَ، کم کرنا یا کم رکھنا، يُخْسِرُوْنَ اَیْ یَنقُصُوْنَ الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ نہ ان کی پیائش درست ہو اور نہ ہی تول پورا ہو۔(المراغی)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ مول تول میں بڑے خراب تھے تو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیات نازل کیں، اس کے بعد وہ اس بارے میں بڑے صاف ستھرے اور محتاط ہو گئے۔(زبدۃ التفسیر من فتح القدیر......امام شوکانیؒ)

﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ﴾

کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ (روزِ محشر) زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔

اَلَا میں أ تعجب کے لیے اور لَا نافیہ ہے، اَلَا یَظُنُّ کیا یہ نہیں جانتے؟ (ظَنَّ، یَظُنُّ، ظَنًّا) گمان کرنا، خیال کرنا، جاننا، سمجھنا، (القاموس الوحید) اُولٰٓئِکَ یہ لوگ، اسم اشارہ، اَنَّهُمْ (اَنَّ.هُمْ) بلاشبہ، وہ مَّبْعُوْثُوْنَ اٹھائے جائیں گے۔(بَعَثَ، یَبْعَثُ، بَعْثًا) بھیجنا، وفد بھیجنا، بیدار کرنا، موت کے بعد زندہ کرنا، یہاں پر آخری معنیٰ مراد ہیں، مَّبْعُوْثُوْنَ وہ موت کے بعد (اللہ کے حکم سے) زندہ کیے جائیں گے۔اسم مفعول جمع مذکر۔

﴿لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ﴾ ایک بڑے سخت دن میں۔

لِیَوْمٍ (لِ.یَوْمٍ) لیے، ایک (ایسے) دن (کے) عَظِیْمٍ (جو) بڑا (ہے)۔

یعنی ان لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ وہ روزِ قیامت (یوم عظیم) اللہ تعالیٰ کے حضور حساب کتاب کے لیے پیش کر دیے جائیں گے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''روز قیامت کو بڑا دن اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس میں تمام انسانوں اور جنوں کا حساب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں بیک وقت لیا جائے گا اور عذاب وثواب کے اہم ترین فیصلے کیے جائیں گے۔''

(تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾

''جس روز تمام انسان (اٹھیں گے) اور رب العالمین کے حضور پیش ہوں گے۔''

يَّوۡمَ (جس) دن، ظرف زمان، زمانے کو ظاہر کرتا ہے، يَقُوۡمُ کھڑے ہوں گے (قَامَ، يَقُوۡمُ، قِيامًا) کھڑے ہونا، النَّاسُ لوگ، لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ، رب العلمین کے حضور میں یعنی اس دن لوگ رب العالمین کے حضور حساب کتاب کے لیے کھڑے ہوں گے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، وہ زندگی کے تمام دائروں پر محیط ہے......سیاسی، معاشی، اخلاقی، معاشرتی، انفرادی اور اجتماعی تمام شعبہ ہائے زندگی کی صلاح وفلاح کا ضامن بنتا ہے......معاشی نظام کی بنیاد امانت اور دیانتداری پر رکھتا ہے، اس کے بغیر نہ کاروباری ساکھ قائم رہ سکتی ہے اور نہ ہی لوگ اس میدان میں ترقی کر سکتے ہیں بلکہ خائن اور دھوکہ باز لوگوں سے معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ تہہ وبالا ہو جاتا ہے۔

۲) اسلامی زندگی کے دو اہم شعبے ہیں......حقوق اللہ اور حقوق العباد اور ان دونوں کی پاسبانی سے ہی دنیا وآخرت کی کامیابیاں وابستہ ہیں......ایک شخص اگر صوم وصلوۃ کی پابندی کرتا ہے تو اس سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ احسان ومروت اور دیانت اور امانتداری سے بھی پیش آئے، بلکہ اسلامی عبادات سے تو زندگی کے اہم مقاصد کی طرف ہمارا رخ پھر جانا چاہیے......ہم نے اپنے خالق ومالک کی بندگی کا ٹھیک طور پر اگر حق ادا کیا ہے تو ہمیں دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ بھی کرنا چاہیے کیونکہ ہمارے خالق نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔

۳) بعض محققین نے تطفیف (کم کرنا) کو عام اور وسیع معنیٰ میں لیا ہے یعنی کمی اور کوتاہی کو صرف وزن و پیمائش کی چیزوں تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اطاعت وعبادت کی ہر چیز کو اس میں داخل رکھا ہے، جیسے کہ چوری صرف مال ہی میں نہیں ہر شے میں ممکن ہے، (دیکھیے تفسیر ماجدی) مثلاً اگر کوئی شخص کسی محکمہ میں پوری تنخواہ وصول کرتا ہے مگر اپنی ذمہ داریوں سے ٹھیک ٹھیک عہدہ برا نہیں ہوتا، وغیرہ۔

۴) ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم کہاں کہاں پورا پورا حق وصول کرتے ہیں مگر دوسروں کے حقوق تلف کرتے ہیں اور اس وقت ہمارا حال کیا ہو گیا ہے۔ آپس میں حق تلفیاں کرتے ہیں اور اس عارضی اور ناپائیدار زندگی میں معمولی سے فائدہ کی خاطر ابدی اور دائمی زندگی کو خیر باد کہہ دیتے ہیں، کیا ہم سے بڑھ کر بھی کوئی احمق ہوگا؟

....

﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِىْ سِجِّيْنٍ (٧) وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (٨) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (٩) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (١٠) الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (١١) وَ مَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (١٢) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (١٣)﴾

یقیناً فاجروں کے نامۂ اعمال سجّین میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سجّین کیا ہے؟ یہ تو لکھی ہوئی کتاب ہے اس روز (یعنی میدان محشر) تکذیب کرنے والوں کے لیے بربادی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہیں، اور اِسے وہی جھٹلاتا ہے جو حد سے بڑھا ہوا گنہگار ہوتا ہے کہ جب اس کے سامنے ہماری آیات کی تلاوت ہوتی ہے، تو کہتا ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں

﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ﴾

یقیناً فاجروں کے نامۂ اعمال سجین میں ہوں گے۔

كَلَّآ (حرف تنبیہ اور زجر) یقیناً، ہرگز نہیں اِنَّ، تحقیق، بلا شبہ، گرائمر میں حرف مشبہ بالفعل کہلاتا ہے، كِتٰبَ الْفُجَّارِ اعمال نامہ، فاجروں کا (نافرمانوں کا) الفاجر اس کا مفرد ہے، اَلْفُجُوْرُ کے معنی نافرمانی کرنے کے ہیں (فَجَرَ، يَفْجُرُ، فُجُوْرًا، فَهُوَ فَاجِرٌ) [مفردات القرآن] لَفِيْ (لَ. فِيْ) ضرور بضرور، میں، لام تاکیدی معنی دیتا ہے، سِجِّيْنٍ، سجّین (میں)۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''كَلَّا'' مخاطبوں کے اس زعم باطل کی تردید کے لیے بطور زجر (تنبیہ) آیا ہے جس کا اشارہ اوپر والی آیت (٦) میں موجود ہے، یعنی وہ اس فکر سے بالکل نچنت ہیں کہ ان کے سامنے حساب کتاب اور جزاء وسزا کا کوئی مرحلہ آنے والا ہے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان اللہ تعالیٰ فرق کرے گا، بلکہ وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اول تو کوئی دن آنا نہیں ہے اور آیا بھی تو وہ اپنی خاندانی وجاہت اور اپنے دیوتاؤں کی بدولت وہاں بھی اس سے زیادہ عیش لُوٹیں گے، جو عیش یہاں لُوٹ رہے ہیں، ان کو مخاطب کر کے فرمایا ہرگز نہیں، اس قسم کے طفلانہ خیالات میں اپنی عاقبت برباد نہ کرو، اس دن اَبرار اور فجار میں مشرق و مغرب کی دوری ہوگی، فجار کے اعمال نامے ''سجّین'' میں ہوں گے اور اَبرار کا ذکر آگے آرہا ہے کہ ان کے اعمال نامے ''علّیّین'' میں ہوں گے۔'' (تدبر قرآن)

﴿وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ، كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ﴾

اور تم کیا جانو کہ سجّین کیا ہے، یہ تو لکھی ہوئی کتاب ہے۔

وَ اور، عاطفہ ہے، گزشتہ کلام سے وابستہ کرتا ہے۔ مَآ کیا، استفہامیہ ہے۔ اَدْرٰىكَ (اَدْرٰ. كَ) جانو۔تم، مَا سِجِّيْنٌ، کیا ہے سجین، سجین کا مادہ سجن سے ہے جس کے معنی قید یا قید خانہ کے ہیں، اسی مناسبت سے مجرموں کے ریکارڈ آفس کا نام سجین رکھا گیا ہے۔ اس میں سجن کی بجائے سجین حرف 'ی' کی

زیادتی معنی میں شدت پیدا کر رہی ہے، کِتٰبٌ کتاب، مَّرۡقُوۡمٌ لکھی ہوئی (رَقَمَ، یَرۡقُمُ) لکھنا، اس سے اسم مفعول مرقوم ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''وَمَا اَدۡرٰکَ مَا سِجِّیۡن'' یہ اسلوبِ بیان سجّین کے ہول اور خوف کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ تم سمجھے کہ سجّین کیا ہے؟ اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو! وہ تباہ ہوا جس کا نام یا جس کے اعمال اس میں درج ہوئے۔

''کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ'' وہ لکھا ہوا دفتر ہے یعنی اس میں تمام مجرمین کا سارا ریکارڈ بشکلِ تحریر محفوظ کیا جاتا ہے۔ ''بشکل تحریر'' کی قید سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس میں کسی سہو ونسیان کا کوئی امکان ہے اور نہ اس کے حجت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش ہے۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ﴾

اس روز (یعنی میدان محشر میں) تکذیب کرنے والوں کے لیے بربادی ہے۔

وَیۡلٌ تباہی و بربادی (ہے) یَّوۡمَئِذٍ (یَوۡمَ. اِذٍ) دن۔ اس وقت، یَوۡم، ظرف زمان، مضاف، اِذٍ مضاف الیہ، لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ (لِ. مُکَذِّبِیۡنَ) لیے، جھٹلانے والوں (کے) کَذَّبَ، یُکَذِّبُ، تَکۡذِیۡبٌ جھٹلانا، اس سے اسم فاعل مُکَذِّبٌ اس کی جمع مُکَذِّبُوۡن ہے، لام حرف جر کی وجہ سے مُکَذِّبِیۡنَ ہو گیا، ہلاکت اور تباہی ہے اس دن کے جھٹلانے والوں کے لیے، اس کے بعد کی آیت واضح کرتی ہے کہ وہ کس چیز کو جھٹلا رہے ہیں اور جھٹلانے والوں کی اصل حقیقت کیا ہے۔

﴿الَّذِیۡنَ یُکَذِّبُوۡنَ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ، وَ مَا یُکَذِّبُ بِہٖۤ اِلَّا کُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِیۡمٍ، اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہیں اور اسے کوہی جھٹلاتا ہے جو حد سے بڑھا ہوا گنہگار ہوتا ہے کہ جب اس کے سامنے ہماری آیات کی تلاوت ہوتی ہے، تو کہتا ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

الَّذِیْنَ (وہ جو) اسم موصول ہے، یُکَذِّبُوْنَ جھٹلاتے ہیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (کَذَّبَ یُکَذِّبُ، تَکذِیبٌ) جھٹلانا۔ بِیَوْمِ الدِّیْنِ، جزاوسزا کے دن کو، 'بِ' حرف جر ہے اور مختلف معنی دیتا ہے، یہاں پر ''کو'' کے معنی دے رہا ہے، وَمَا یُکَذِّبُ اور نہیں جھٹلاتا، بِهٖٓ (بِ.ہٖ) اس۔کو''ہٖ'' کی ضمیر روز قیامت کی طرف جاتی ہے، اِلَّا مگر، کُلُّ ہر، مُعْتَدٍ حد سے نکل جانے والا (عَدَا، یَعْدُوْ، عَدْوًا، وَ عُدُوًّا) زیادتی کرنا، اسی سے لفظ عَدوٌّ، دشمنی اور کبھی یہ لفظ اِعْتَدَی، یَعْتَدِی فعل سے بھی آتا ہے، ظلم و زیادتی کرنا، اس سے اسم فاعل مُعْتَدٍ زیادتی کرنے والا، حد سے نکل جانے والا کے ہوتے ہیں۔ (القاموس الوحید)

اَثِیْمٍ، گنہگار، مجرم (اَثِمَ، یَأثَمُ، اِثْمًا وَ اَثَامًا) گنہگار ہونا، اَلْاِثْمُ گناہ، قابل سزا جرم اور روز قیامت کو نہیں جھٹلاتا مگر وہ شخص جو حد سے نکل چکا ہو اور مجرم ہو۔ (حوالہ ایضاً)، اِذَا جب، جس وقت، تُتْلٰی پڑھی جائیں فعل مضارع مجہول واحد مؤنث غائب، یہ صیغہ آیات کے لیے استعمال ہوا ہے (تَلَا، یَتْلُوْ، تِلَاوَةً) پڑھنا، پڑھ کر سنانا، عَلَیْهِ (عَلٰی.ہِ) اوپر۔اس کے، اٰیٰتُنَا (اٰیٰتُ.نَا) آیات۔ہماری، قَالَ (تو) کہتا ہے، (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، بات کرنا، اَسَاطِیْرُ تحریر کردہ داستانیں، اس کا مفرد اِسطارٌ اور اُسْطُوْرٌ ہے، اس کا مادہ (س ط ر) ہے، سَطَرَ، یَسْطُرُ، سَطْرًا کتاب لکھنا اور اسی سے، سَطَّرَ الْوَرَقَةَ، کاغذ پر سطریں کھینچنا، و سَطَّرَ الاکَاذِیْب، من گھڑت افسانے لکھنا، اَلْاَساطِیْرُ، بے اصل واقعات گھڑے ہوئے قصے اور افسانے، حیرت انگیز باتیں۔ (القاموس الوحید)

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

'ظلم' حد سے تجاوز اور گناہ و بدعملی کی روش انسان کو روزِ جزا کی تکذیب اور قرآن کی بے حرمتی کی طرف لے جاتی ہے، چنانچہ جب قرآن کی آیات سنائی جاتی ہیں، تو یہ شخص کہتا ہے یہ ''اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ'' (اگلوں کے قصے کہانیاں) ہیں......اس قول کا پس منظر یہ ہے کہ قرآن مجید گزشتہ قوموں کے حالات و واقعات کے تذکرہ سے پُر ہے، یہ واقعات عبرت و نصیحت اور اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی وضاحت کے لیے بیان ہوئے ہیں جو کبھی نہیں ٹوٹتی اور جس کے تحت قومیں ایک متعین اور عام قانون کے مطابق......جس سے انحراف ممکن نہیں......اللہ کی گرفت میں آتی رہی ہیں۔

اس سرکشی، زبان درازی اور دروغ گوئی کے بعد قرآن مجید انہیں زجر و توبیخ کرتا ہے اور ان کے قول کی تردید فرماتا ہے کَلَّا ''ہرگز نہیں'' حقیقت وہ نہیں جو یہ کہتے ہیں...... پھر وہ اس سرکشی اور اس تکذیب کا، واضح اور روشن دلائل سے رد کرتا ہے، ان جھٹلانے والوں کے دلوں کے مسخ اور بے نور ہو جانے کی اصل وجہ کا انکشاف اس سے اگلی آیت (۱۴) میں کرتا ہے۔(فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ ہو، وہ آخرت سے بھی بے خبر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس خالق و مالک نے یہ زندگی عطا کی ہے اسی نے زندگی کے تمام لوازمات اور ان گنت نعمتیں فراہم کی ہیں اور انسان کو یونہی بے کار نہیں پیدا فرمایا، بلکہ اسے افضل و اشرف بنا کر زندگی کے بارے میں اسے مسئول بھی بنایا ہے اور ہر شخص کی زندگی کا باقاعدہ حساب کتاب بھی رکھا ہے اور اس دنیا میں ہر شخص کا اعمال نامہ مرتب ہو رہا ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اسے ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔

۲) قیامت کے روز تمام انسان دو طبقوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے...... ایک اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار...... دوسرے اس کے باغی اور نافرمان، اور ان دونوں کے رجسٹر اور کھاتے الگ الگ ہوں گے، نیک لوگوں کا دفتر ''علّیین'' کے نام سے موسوم ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے اور برے لوگوں کا دفتر ''سجّین'' کے نام سے مدون کیا جا رہا ہے، جس کا ذکر ان آیات میں ہے۔

۳) انصاف کا تقاضا ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب ظالم اور مظلوم، اچھے اور برے، فرمانبردار اور نافرمان چھانٹ کر الگ الگ کر دیے جائیں اور دنیا میں جنہوں نے دوسروں کی حق تلفیاں کیں، لوگوں کے جان و مال پر ڈاکے ڈالے، دل آزاریاں اور زبان درازیاں کیں اور قانون کی زد سے بچ نکلے ایسے ظالموں سے انتقام لیا جائے اور مظلوموں کو عدل فراہم کیا جائے۔

۴) اس دن کی رسوائیوں اور پریشانیوں سے بچنے کے لیے عقلمندی کا تقاضا ہے کہ آج برائیوں کو چھوڑ کر نیکیوں کی راہ اپنائیں۔

....

﴿كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ(۱۴) كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ(۱۵) ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ(۱۶) ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ(۱۷)﴾

یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے زنگ چڑھ گیا ہے، یہی نہیں یہ لوگ اس دن دیدار باری تعالیٰ سے محروم رکھے جائیں گے، پھر یہ لوگ بالیقین جہنم میں جھونکے جائیں گے پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔

﴿كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے زنگ چڑھ گیا ہے۔

كَلَّا (حرف زجر اور تنبیہ)، بَلْ بلکہ، رَانَ زنگ چڑھا ہے (رَانَ، يَرِيْنُ، رَيْنًا) زنگ لگ جانا، گناہوں کی وجہ سے دل کا سخت ہو جانا۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ''الرَّیْن اس زنگ کو کہتے ہیں جو کسی صاف چیز پر لگ جائے، قرآن میں ہے:

كَلَّا سكتة بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ ''نہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے یعنی ان کے مجلّٰی قلوب پر زنگ چڑھ گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتے۔ (مفردات القرآن)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''بَلْ سكتة رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ میں اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے اندر جو دلائل ودیعت فرمائے ہیں اور عقل و دِل کے اندر سوچنے سمجھنے

کی جو صلاحیت بخشی ہے، یہ چیزیں کام اُسی صورت میں آتی ہیں، جب انسان ان کی قدر کرے اور ان سے فائدہ اٹھائے، اگر ان سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ ان کے مقابلہ میں نفس کی خواہشوں ہی کو اپنا رہنما بنا لے اور ان اعلیٰ صلاحیتوں کو ٹھکرا دے تو آہستہ آہستہ آدمی کی بدعملیوں کا زنگ ان پر چڑھنا شروع ہوتا ہے اور بالتدریج اس طرح ان کا احاطہ کر لیتا ہے کہ ان کے اندر کسی صحیح چیز کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ (تدبر قرآن، ج:۸)

اسی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا: ''جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، پھر اگر وہ سچے دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کر لے تو وہ گناہ (نقطہ) اس کے دل سے مٹا دیا جاتا ہے، اور اگر وہ گناہوں میں اضافہ کرتا ہے تو وہ نقطہ بھی بڑھ جاتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی وہ بات ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے آیت ''کَلَّا بَلْ سکتة رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ'' میں ذکر فرمایا ہے۔ (تفسیر طبری)

﴿کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾

یہی نہیں، یہ لوگ اس دن دیدارِ باری تعالیٰ سے محروم رکھے جائیں گے۔

کَلَّآ (حرف تنبیہ) اِنَّهُمْ (اِنَّ. هُمْ) بلاشبہ۔ وہ هُمْ۔ ضمیر جمع مذکر غائب، عَنْ سے (حرف جر)، رَّبِّهِمْ (رَّبِّ. هِمْ) رب اپنے (سے) هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، یَوْمَئِذٍ (یَوْمَ. اِذٍ) دن، اس، یعنی اس دن (روز قیامت) لَّمَحْجُوْبُوْنَ (لَ. مَحْجُوْبُوْنَ) ضرور۔ حجاب میں ہونگے، لام تاکید کے لیے آتا ہے۔ حجاباً سے اسم مفعول مَحْجُوْبٌ کی جمع مَحْجُوبُون۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''(مجرمین کی سزا یہ ہوگی) کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محروم رہیں گے اور ان کے اور اس عظیم سعادت کے درمیان حجابات حائل ہو جائیں گے...... اللہ کا دیدار صرف ان لوگوں کے نصیب میں ہوگا جن کی ارواح صاف شفاف اور رقیق ہوں اور انہوں نے یہ استحقاق پیدا کر لیا ہو کہ ان کے اور ان کے رب کے مابین حجابات اٹھا دیے جائیں۔ انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ قیامہ میں فرمایا ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ، اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۲۲،۲۳) ''اس دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔''

﴿ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ﴾ پھر یہ لوگ بالیقین جہنم میں جھونکے جائیں گے۔

ثُمَّ پھر، حرف عطف، اِنَّهُمْ (اِنَّ. هُمْ) بالیقین۔ وہ، اِنّ کلام میں زور پیدا کرتا ہے، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، لَصَالُوا (لَ. صَالُوا) ضرور۔ داخل ہونے والے ہیں (جھونکے جانے والے ہیں) صَلَى، يَصْلِيْ، صَلْياً آگ میں ڈالنا، جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے: اَلَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (الاعلیٰ:۱۲) وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا۔ (العیاذ باللہ)

﴿ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾

پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

ثُمَّ پھر حرف عطف، سلسلہ کلام کی ترتیب کے لیے آتا ہے، يُقَالُ کہا جائے گا، مضارع مجہول واحد مذکر غائب (قَالَ يَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا، هٰذَا یہ (ہے) اسم اشارہ، مبتدا، الَّذِيْ وہ چیز، خبر، كُنْتُمْ فعل ماضی جمع مذکر غائب۔ تھے تم (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، واقع ہونا، بِهٖ (بِ. هٖ) ساتھ۔ اس کے، یعنی اس بات کو، تُكَذِّبُوْنَ جھٹلاتے تھے (كَذَّبَ، يُكَذِّبُ، تَكْذِيْبٌ) جھٹلانا یعنی فجار سے کہا جائے گا کہ یہ وہی عذاب ہے جس کی تم دنیا میں تکذیب کیا کرتے تھے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) حق بات سے منہ موڑنا، سچائی سے بے رخی اختیار کرنا، ضد اور ہٹ دھرمی، غرور اور تکبر کا نتیجہ ہوتا ہے، اس سے بڑھ کر برائیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا ہونا، انسان کے ضمیر کو مردہ کر دیتا ہے، اسے قرآن حکیم کی اصطلاح میں ''رَانَ'' دل کا زنگ آلود ہونا کہتے ہیں۔

۲) جب برائیاں کسی شخص کے ضمیر میں رچ بس جائیں تو وہ دل کو بھلائی کی طرف مائل ہونے سے روک دیتی ہیں اور ہر غلط کام دل پر ایک سیاہ نشان بن کر اپنا اثر چھوڑتا ہے، اگر توبہ اور اصلاح سے

اس کا علاج کرلیا جائے تو دل سے یہ سیاہی دور ہو جاتی ہے، اور اگر وہ تکبر اور غرور کا شکار رہے اور برائیاں کرتا چلا جائے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کا دل خاک سیاہ ہو جاتا ہے، پھر برائی ہی میں اسے مزا آنے لگتا ہے، کھرے اور کھوٹے کا فرق جاتا رہتا ہے، حق اور باطل میں تمیز رخصت ہو جاتی ہے، کبھی یہ بات انفرادی سطح پر ہوتی ہے اور کبھی اس کا ظہور قومی سطح پر ہوتا ہے۔

۳) جب کوئی قوم بے راہ روی کا شکار ہو جائے اور وہاں آکاس بیل کی طرح برائیاں پھوٹ پڑیں تو یوں سمجھیے کہ عنقریب، اللہ تعالیٰ کا عذاب اس پر آنے والا ہوتا ہے اور اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں...... مہنگائی، بے روزگاری، قحط سالی، نا اہل اور اجڈ حکمراں، دشمنوں کا خوف اور ان کی زیادتیاں وغیرہ۔

۴) یہ تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری کے مظاہر ہیں جبکہ قیامت کے روز ان گناہوں کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے بھی محرومی ہوگی اور جہنم میں بھی جھونکا جائے گا۔

۵) ان آیات کی روشنی میں ہم اپنے کردار کا جائزہ لیں تو یقیناً ہم اپنے آپ کو مجرم پائیں گے، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مسلمان پریشانیوں کا شکار ہیں، کیا ہم اصلاح کی طرف قدم بڑھائیں گے؟

....

﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ (۱۸) وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ (۱۹) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۲۰) يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۱) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (۲۲) عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (۲۳) تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (۲۴) يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۲۵) خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ط وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۲۶) وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (۲۷) عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۸)﴾

یقیناً نیکو کاروں کا نامۂ اعمال عِلّیّین میں ہے اور آپ کو کیا معلوم کہ عِلّیّون کیا ہے؟ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے، جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں، یقیناً نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے، اونچی مسندوں پر بیٹھے (جنت کے عجائب کا) مشاہدہ کر رہے ہوں گے، آپ ان کے چہروں سے نعمتوں کی تروتازگی کو پہچان لیں گے، انہیں سربمہر نفیس شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر ہوگی پس سبقت کرنے والوں کو ان نعمتوں کے حصول کے لیے سبقت کرنی چاہیے، اس (شراب) میں تسنیم کا پانی ملا ہوگا، یہ وہ چشمہ ہے جس کا پانی اللہ کے مقرب بندے پئیں گے

﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ﴾

یقیناً، نیکو کاروں کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔

كَلَّآ (حرفِ زجر وتوبیخ) ہرگز نہیں، اِنَّ یقیناً، كِتٰبَ الْاَبْرَارِ نیکوں کا اعمال نامہ، كِتٰبَ (لکھی ہوئی بات) یعنی اعمال نامہ، الْأَبْرَارَ نیک برٌّ کی جمع، لَفِيْ (لَ.فِيْ) ضرور بضرور۔ میں، عِلِّيِّيْنَ علیین۔یعنی نیک لوگوں کا اعمال نامہ علیوں میں ہوگا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

كَلَّآ زجر وتوبیخ کے لیے آیا ہے یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ یہ لوگ گمان رکھتے ہیں کہ فساق وفجار اور ابرار وصالحین برابر ہوں گے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ (فساق وفجار) کا اعمال نامہ تو سجین (جہنم کی عمیق اور تنگ جگہ ہے) جبکہ (ابرار وصالحین) کا نامۂ اعمال علیین میں ہے اور وہ جنت میں بلند وبالا جگہ ہے، یہ لفظ ''الْعَلُوّ'' بلندی سے مشتق ہے اور اس کی وجہ تسمیہ اپنی بلندی کی وجہ سے ہے۔(صفوة التفاسیر)

﴿وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ؟ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ﴾

اور آپ کو کیا معلوم کہ علیّون کیا ہے؟ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔

وَ اور، عاطفہ، سلسلۂ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے۔ مَآ کیا، اسم استفہام، اَدْرٰىكَ (اَدْرٰ.كَ)

معلوم۔ آپ کو (دَرَی، یَدْرِی، دَرْیًا وَ دِرَایَۃً) جاننا، الدِّرایۃُ، علم، واقفیت، عقل وفہم وَمَا اَدْرَاکَ، تمہیں کیا خبر؟ (القاموس الوحید) مَا عِلِّیُّوْنَ؟ علیون کیا ہے، مقامِ علیین کی عظمت کی وجہ سے استفہامیہ جملہ لایا گیا ہے۔ کِتٰبٌ کتاب (ہے) مَّرْقُوْمٌ لکھی ہوئی، اسم مفعول (رَقَمَ، یَرْقُمُ، رَقْمًا) لکھنا۔

﴿یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں۔

یعنی جو کچھ اس کتاب (یا دفتر) میں لکھا ہوا ہے، قیامت کے روز مقرب فرشتے اس کی شہادت دیں گے کہ یہ جو کچھ لکھا ہے صحیح اور سچ ہے۔

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ، عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ﴾

یقیناً نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اونچی مسندوں پر بیٹھے (جنت کے عجائب کا) مشاہدہ کر رہے ہوں گے۔

اِنَّ بلاشبہ، جملے کے شروع میں لاتے ہیں تو اس میں زور اور تاکیدی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اَلْاَبْرَارَ نیک لوگ اس کا مفرد برٌّ ہے، لَفِیْ نَعِیْمٍ، ضرور بضرور نعمتوں میں ہوں گے (لَ. فِیْ) ضرور۔ ہوں گے، میں، نَعِیْمٌ نعمتیں، عیش وآرام اس کا مفرد نِعْمَۃٌ ہے، عَلَی الْاَرَآئِکِ اوپر۔ مسندوں کے اَرِیْکَۃٌ اس کا مفرد سجی ہوئی مسند یا (مزین تخت)، یَنْظُرُوْنَ دیکھتے ہوں گے (نَظَر، یَنظُر، نظَارۃٌ) دیکھنا، نظارہ کرنا۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''قیامت کے دن یہ نیکو کار ہمیشگی والی نعمتوں اور باغات میں ہوں گے، اپنے ملک و مال کو اور نعمتوں اور راحتوں کو، عزت و جاہ کو، مال و متاع کو، دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے، یہ (خوبصورت) مسندوں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے، یہ خیر وفضل، یہ نعمت ورحمت نہ کبھی کم ہو نہ گم ہو، نہ گھٹے نہ مٹے یہ بھی معنیٰ ہیں کہ اپنی آرام گاہوں میں تختِ سلطنت پر بیٹھے دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوتے رہیں گے۔'' (تفسیر ابن کثیر)

﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾

آپ ان کے چہروں سے نعمتوں کی تروتازگی کو پہچان لیں گے۔

تَعْرِفُ پہچانیں گے آپ، فعل مضارع واحد مذکر حاضر، (عَرَفَ، يَعْرِفُ، عِرْفَانًا و مَعْرِفَةٌ) جاننا پہچاننا، معروف جانا پہچانا، فِيْ وُجُوْهِهِمْ ان کے چہروں سے، وَجْهٌ چہرہ کی جمع وُجُوْهٌ، چہرے۔ هُمْ ان کے، ضمیر جمع مذکر غائب، فِيْ حرفِ جار کی وجہ سے هُمْ کی جگہ هِمْ پڑھا جا رہا ہے، نَضْرَةَ تروتازگی، النَّعِيْمِ نعمتوں (کی) اس کا مفرد نِعْمَةٌ ہے۔

امام شوکانی لکھتے ہیں:

''اہل جنت کو جب تم دیکھو گے تو ان کے شاداں وفرحاں چمکتے دمکتے، ہشاش بشاش، حسین وجمیل چہروں سے فوراً پہچان لو گے اور سمجھ لو گے کہ یہی لوگ نعمتوں سے سرفراز ہوئے ہیں۔'' (زبدة التفسیر من فتح القدیر)

﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ، خِتٰمُهٗ مِسْكٌ﴾

انہیں سربمہر نفیس شراب پلائی جائے گی، جس پر مشک کی مہر ہوگی۔

يُسْقَوْنَ وہ پلائے جائیں گے مضارع مجہول جمع مذکر غائب (سَقٰى، يَسْقِيْ، سَقْيًا) پانی سے سیراب کرنا، مِنْ رَّحِيْقٍ شراب خالص سے (نفیس شراب سے) الرحیقُ ''ایسی پاکیزہ شراب جو مضر اور نقصان دہ اشیاء سے پاک ہو۔'' (فتح القدیر)

مَّخْتُوْمٍ، (مہر زدہ) اسم مفعول (Sealed) (خَتَم، يَخْتِمُ، خَتْمًا) مہر لگانا یہ پاکیزہ شراب مہر زدہ برتنوں میں ہوگی، ان کی سیل کھولنے کا حق صرف ابرار وصالحین کو ہوگا۔ (حوالہ ایضاً)

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ، جس پر مشک کی مہر ہوگی (خِتٰمُ. هٗ) مہر۔ اس کی، یعنی جس برتن میں اہل جنت کے لیے پاکیزہ شراب ہوگی اس برتن کی مہر مشک (Musk) کی ہے، سبحان اللہ! جس برتن کی سیل اس قدر قیمتی ہے اس کا مشروب کتنا لاجواب ہوگا!

﴿وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾

پس سبقت کرنے والوں کو ان نعمتوں کے حصول کے لیے سبقت کرنی چاہیے۔

وَ اور، عاطفہ فِیْ ذٰلِکَ اس بارے میں (اس جنت کے حصول کے لیے) فَلْیَتَنَافَسِ پس چاہیے کہ رغبت کریں، التَّنَافُسُ، ایک فطری جذبہ ہے جس میں آگے بڑھنے اور بڑے لوگوں کے ہم پلہ ہونے کی جائز کوشش کرنا ہے۔ (القاموس الوحید) اَلْمُتَنَافِسُوْنَ رغبت کرنے والے اس کا مفرد اَلْمُتنافِسُ ہے، سمجھایا یہ جا رہا ہے کہ لوگو! تم عارضی دنیا کے پیچھے لگ کر دھن دولت اکٹھی کرنے کی بجائے ابدی جنت کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی سعی و جستجو کرو۔

﴿وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ﴾ اس (شراب) میں تسنیم کا پانی ملا ہوگا۔

وَ اور، عاطفہ، مِزَاجُهٗ (مِزَاجُ. ہٗ) ملاوٹ۔ اس کی تَسْنِیْمٍ تسنیم سے ہوگی۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''مزاج' سے مراد وہ ملونی (آمیزش) ہے جو پینے والے پیتے وقت شراب میں اس کے کیف میں اضافہ یا اس کے اندر اعتدال پیدا کرنے کے لیے ملا لیتے ہیں، فرمایا کہ اس شراب میں ملونی تسنیم کی ہوگی، پھر تسنیم کی وضاحت فرما دی کہ یہ ایک چشمہ ہے جس کے کنارے بیٹھ کر مقربین اس سے لطف اندوز ہوں گے۔'' (تدبر قرآن)

﴿عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾

یہ وہ چشمہ ہے جس کا پانی اللہ کے مقرب بندے پییں گے۔

عَیْنًا وہ چشمہ ہے، یَّشْرَبُ کہ پییں گے (شَرِبَ، یَشْرَبُ شُرْبٌ) پینا، مَشْرُوْبُ، وہ چیز جو پی جائے اس کی جمع مشروبات، اردو میں استعمال ہوتا ہے، بِهَا (بِ. ھا) اس سے یعنی اس چشمے سے، ''ھا'' کی ضمیر چشمے کی طرف جاتی ہے۔ اَلْمُقَرَّبُوْنَ اللہ کے مقرب بندے اس کا مفرد المُقَرَّبُ ہے۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) دین کو جھٹلانے والوں (مکذبین) اور دین کو ماننے والوں (مومنین) کا انجام الگ الگ ہوگا، پہلے خائب وخاسر جبکہ دوسرے فوز وفلاح سے ہمکنار ہوں گے، یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے، یہ بات اللہ تعالیٰ کے عدل کے خلاف ہے۔

۲) کفار کا مقام سجین (جہنم کے نیچے بدترین قید خانہ ہے) تو مومنوں کا مقام علیین (بلند ترین جنت کی پرفضا) جگہ ہے۔

۳) دونوں گروہوں کی جہاں رہنے سہنے کی جگہیں مختلف ہوں گی، اسی طرح کھانے پینے کی اشیاء میں بھی زمین وآسمان کا فرق ہوگا، منکرین کے لیے اگر کھولتا ہوا پانی، پیپ، تھور اور خاردار کانٹے ہوں گے تو مومنین کے لیے شراب طہور، ٹھنڈے اور میٹھے مشروبات کے چشمے، لذیذ میوہ جات اور طرح طرح کی ان گنت نعمتیں ہوں گی۔

۴) لوگوں کو چاہیے کہ اس دنیا میں چمکتے ہوئے سکوں، بنک بیلنس، کاروں اور کوٹھیوں کے لیے دوڑ نہ لگائیں کہ یہ عارضی اور فانی چیزیں ہیں بلکہ احکام الٰہی کی پیروی کرتے ہوئے اعمال صالحہ کی دوڑ لگائیں کہ یہ آخرت کی ابدی اور لازوال نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

....

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
يَضْحَكُوْنَ(۲۹) وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ(۳۰) وَاِذَا
انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ(۳۱) وَاِذَا رَاَوْهُمْ
قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ(۳۲) وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ
حٰفِظِيْنَ (۳۳) فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ

يَضۡحَكُوۡنَ (۳۴) عَلَى الۡاَرَآئِكِ ۙ يَنۡظُرُوۡنَ (۳۵) هَلۡ ثُوِّبَ الۡكُفَّارُ مَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ (۳۶)﴾

مجرم لوگ دنیا میں اہلِ ایمان کا مذاق اڑاتے تھے، جب اُن کے پاس سے گزرتے تو آنکھوں سے اشارے کیا کرتے تھے اور جب اپنے اہل و عیال کی طرف واپس جاتے تو اُن کا مذاق اڑاتے ہوئے واپس جاتے اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے کہ یقیناً یہ لوگ گمراہ ہوگئے ہیں حالانکہ یہ (کافر) اِن (مؤمنوں) پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ تو آج (قیامت کے دن) مومن کافروں پر ہنسیں گے، وہ مسندوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے کہ کفار کو اُن کے کرتوتوں کا بدلہ مل گیا؟

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا كَانُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يَضۡحَكُوۡنَ﴾

مجرم لوگ دنیا میں اہلِ ایمان کا مذاق اڑاتے تھے۔

اِنَّ تحقیق، کلام میں زور پیدا کرتا ہے، الَّذِيۡنَ وہ لوگ جنہوں نے، اسم موصول ہے اَجۡرَمُوۡا جرم کیا فعل ماضی جمع مذکر غائب (اَجۡرَمَ، يُجۡرِمُ، اِجۡرامٌ) جرم کا مرتکب ہونا، كَانُوۡا تھے، فعل ناقص جمع مذکر غائب، مِنَ الَّذِيۡنَ ان لوگوں سے جو، اٰمَنُوۡا ایمان لائے (اٰمَنَ، يُؤۡمِنُ، اِيۡمَانٌ) ایمان لانا، يَضۡحَكُوۡنَ وہ ہنستے، (مذاق کرتے) جمع مذکر غائب (ضَحِكَ، يَضۡحَكُ، ضِحۡكٌ) کسی پر ہنسنا، مذاق اڑانا۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”(مجرمین) اہل ایمان کو حقیر جانتے ہوئے اُن کا استہزاء کرتے اور مذاق اڑاتے تھے۔“ (احسن البیان)

﴿وَاِذَا مَرُّوۡا بِهِمۡ يَتَغَامَزُوۡنَ﴾

جب اُن کے پاس سے گزرتے تو آنکھوں سے اشارے کیا کرتے تھے۔

وَ اور، عاطفہ، اِذَا جب، مَرُّوۡا وہ گزرتے تھے (یعنی مؤمن) ماضی جمع مذکر غائب، (مَرَّ، يَمُرُّ،

مَرُوْرٌ) گزرنا، مرُوُرِ زمانہ، وقت گزرنا، اردو میں استعمال ہوتا ہے، بِهِمْ (بِ.هِمْ) پاس۔ان (کے) یعنی مجرمین کے پاس سے جب مؤمنوں کا گزر ہوتا (تو) یَتَغَامَزُوْنَ وہ آنکھوں سے اشارے کرتے تھے (غَمَزَ، یَغْمِزُ، غَمْزاً) آنکھ سے اشارے کرنا (طعن و تشنیع کی غرض سے)۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

جب مؤمن کفار کے پاس سے گزرتے تو وہ اپنی آنکھوں سے بنظر حقارت انہیں دیکھتے۔(صفوۃ التفاسیر)

﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ﴾

اور جب اپنے اہل وعیال کی طرف واپس جاتے (یعنی مشرکین اور کفار) تو (مؤمنین کا) مذاق اڑاتے ہوئے واپس جاتے۔

وَ اور عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے، اِذَا جب، ظرف زمان، انْقَلَبُوْٓا واپس جاتے تھے (لوٹتے تھے) ماضی جمع مذکر غائب، (اِنْقَلَبَ، یَنْقَلِبُ، اِنْقِلَابٌ) واپس جانا، لوٹنا، اِلٰٓى طرف، اَهْلِهِمُ (اَهْلِ.هِمْ) اہل وعیال۔اپنے، انْقَلَبُوْا واپس جاتے (لوٹتے) فَكِهِيْنَ مذاق کرتے ہوئے، استہزا کرتے ہوئے (فَكِهَ، یَفْكَهُ، فَكَاهَةً، فَكَهًا) مذاقی ہونا، خوش طبع ہونا، فَكِهٌ، مذاق اڑانے والا، مفرد، اس کی جمع فَكِهِيْن. (القاموس الوحید)

یعنی ان منافقین اور مشرکین کا گروہ جب اپنے گھروں کو لوٹتا تو مؤمنوں پر پھبتیاں کستے ہوئے اور انہیں مذاق کرتے ہوئے جاتا۔

﴿وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ﴾

اور جب انہیں (یعنی مسلمانوں کو) دیکھتے تو کہتے کہ یقیناً یہ لوگ گمراہ ہوگئے ہیں۔

وَ اور، عاطفہ، اِذَا جب (ظرف زمان)، رَاَوْهُمْ (رَاَوْ.هُمْ) وہ دیکھتے۔ان کو، یعنی کفار مسلمانوں کو دیکھتے، هُمْ جمع مذکر غائب کی ضمیر مسلمانوں کی طرف جاتی ہے (رَاٰی، یَرٰی، رُؤْیَةً) دیکھنا، قَالُوْٓا تو کہتے (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، اِنَّ بلاشبہ، کلام میں زور پیدا کرتا ہے، هٰٓؤُلَآءِ یہ لوگ، اسم اشارہ جمع مذکر، لَضَآلُّوْنَ، ضرور گمراہ ہیں، لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے، ضَالُّوْنَ کا مفرد ضَالٌّ ہے

گویا کفار، مؤمنوں کو گمراہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ انہوں نے باپ دادا کی اندھی تقلید کو ٹھکرا دیا ہے اور اسلام کی سیدھی اور سچی راہ کو اپنا لیا ہے، اور اس راہ میں ہر مصیبت اور مشکل کو مول لیا ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

’’یعنی [کافروں کے خیال میں] اِن (مسلمانوں) کی عقل ماری گئی ہے، اپنے آپ کو دنیا کے فائدوں اور لذتوں سے صرف اس لیے محروم کر لیا ہے اور ہر طرح کے خطرات اور مصائب اس لیے مول لے لیے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہیں آخرت اور جنت اور دوزخ کے چکر میں ڈال دیا ہے، جو کچھ حاضر ہے، اُسے اِس موہوم امید پر چھوڑ رہے ہیں کہ موت کے بعد کسی جنت کے ملنے کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور جو تکلیفیں آج پہنچ رہی ہیں انہیں اِس خیال خام کی بنا پر انگیز کر رہے ہیں کہ دوسری دنیا میں کوئی جہنم ہوگی جس کے عذاب سے انہیں ڈرایا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَمَآ اُرۡسِلُوۡا عَلَيۡهِمۡ حٰفِظِيۡنَ﴾

حالانکہ یہ (کافر) ان (مؤمنوں) پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔

وَ اور، عاطفہ، مَآ نہیں، نافیہ، اُرۡسِلُوۡا بھیجے گئے، ماضی مجہول جمع مذکر غائب (اَرۡسَل، یُرۡسِلُ، اِرۡسَالٌ) بھیجنا، اَرۡسَلَ سے واحد مذکر مجہول کا صیغہ اُرۡسِلَ اور جمع کا صیغہ اُرۡسِلُوۡا، عَلَيۡهِمۡ (عَلٰی. هِمۡ) اوپر۔ اُن کے، حٰفِظِيۡنَ نگران، اسم فاعل، اس کا مفرد حَافِظٌ ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

اِس میں ان [کافر] لوگوں کی مزید حماقت کی طرف اشارہ ہے، کہ اپنے انجام کی طرف سے تو غافل ہیں اور اہل ایمان کی فکر میں خواہ مخواہ پڑ گئے ہیں۔ (تفسیر ماجدی)

﴿فَالۡيَوۡمَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡكُفَّارِ يَضۡحَكُوۡنَ﴾

تو آج (قیامت کے دن) مؤمن کافروں پر ہنسیں گے۔

فَالۡيَوۡمَ (فَ. الۡيَوۡمَ) پس۔ آج، الَّذِيۡنَ وہ لوگ جو، اسم موصول، اٰمَنُوۡا ایمان لائے (اٰمَنَ، يُؤۡمِنُ اِيۡمَانٌ) ایمان لانا، مِنَ الۡكُفَّارِ کفار پر، يَضۡحَكُوۡنَ ہنسیں گے، مضارع جمع مذکر غائب

(ضَحِکَ، یَضْحَکُ ضِحْکٌ)ہنسنا، مذاق کرنا۔

الاستاد محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

’’آج کے دن یعنی روز قیامت مؤمن کفار پر ایسے ہی ہنس رہے ہوں گے جس طرح دنیا میں کفار مؤمنوں پر ہنستے تھے۔ یہ ہے پورا پورا بدلہ۔‘‘ (صفوۃ التفاسیر)

﴿عَلَی الْاَرَآئِکِ ۙ یَنْظُرُوْنَ﴾ وہ مسندوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔

عَلٰی پر، الْاَرَآئِکِ مسندوں، اس کا مفرد اَلاَرِیْکَۃُ مسند (خوبصورت تخت)، یَنْظُرُوْنَ دیکھ رہے ہوں گے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

’’یعنی یہ مومن روزِ قیامت منکروں اور کافروں کے حال زار سے آگاہ ہوں گے۔‘‘

﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ﴾

کیا کفار کو اُن کے کرتوتوں کا بدلہ مل گیا؟

هَلْ کیا، حرف استفہام، ثُوِّبَ بدلہ دیے گئے، ماضی مجہول واحد مذکر غائب (ثَوَّبَ، یُثَوِّبُ، تَثْوِیْبٌ) بدلہ دینا، انعام دینا، الْكُفَّارُ اس کا مفرد الْکَافِرُ، مَا اس کا (جو) اسم موصول، كَانُوْا تھے وہ، یَفْعَلُوْنَ (جو) عمل کرتے تھے، مضارع جمع مذکر غائب (فَعَلَ، یَفْعَلُ، فِعْلًا) کام کرنا، عمل کرنا۔

علامہ طبری لکھتے ہیں:

کیا کفار کو اس کا پورا پورا بدلہ مل گیا ہے جو وہ اہل ایمان کے ساتھ دنیا میں تمسخر اور مذاق کی شکل میں کیا کرتے تھے۔ (تفسیر طبری)

تفسیر بحر الزخار میں ہے کہ استفہام یہاں مؤمنوں کی پختگی کے واسطے ہے......یعنی بے شک کفار کو بدلہ دے دیا گیا ان حرکات وسکنات کا جو وہ مؤمنوں کے متعلق دنیا میں کیا کرتے تھے۔

(بحوالہ انوار التفسیر، مولانا عبدالرحمٰن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) تمام انسان اس دنیا اور آخرت میں دو بڑے طبقوں میں تقسیم ہیں...... ایک طبقہ اللہ کے اُن فرمانبردار بندوں کا ہے جنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کا حق ادا کیا، اُن کی زندگیاں حزم واحتیاط سے گزریں، وہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی روش پر قائم رہے، ایک طرف اللہ کی بندگی کی تو دوسری طرف اُس کے بندوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا شعار بنایا، یہی لوگ آخرت میں فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے اور ابدی زندگی سے نوازے گئے...... دوسرا طبقہ اللہ کے باغیوں کا ہے، جن کا ہدف صرف یہ مادی دنیا ہے۔ یہ شیاطین کے ساتھی ہیں تمام اخلاقی حدوں کو پامال کرنا، اِن کا شیوہ زندگی رہا۔ دنیا میں تو انہوں نے من چاہی زندگی گزاری، مگر آخرت کے لحاظ سے سراسر نقصان میں رہے اور وہاں پر ابدی تکلیف اور عذاب میں مبتلا ہو گئے۔

۲) دوسرے طبقہ کے یہ لوگ دنیا میں اہل ایمان کو دیکھتے تو ذلت اور حقارت کے ساتھ پیش آتے، ان کا مذاق اڑاتے، اُن پر پھبتیاں کستے اور انہیں جسمانی تکالیف دینے سے بھی گریز نہ کرتے، اہل ایمان کے لیے یہ بڑی صبر آزما گھڑیاں ہوتیں، روز قیامت اللہ تعالیٰ اِن صابر مؤمنوں کو اجر عظیم سے نوازے گا اور متکبر کفار کا معاملہ بڑا عبرتناک ہوگا۔

..................o..................

سُورَةُ الِانشِقَاق

''اَلْاِنشقاق'' کے معنی پھٹ جانے کے ہیں، سورۃ مبارکہ کا نام پہلی آیت کے لفظ اِنشقّتْ سے ماخوذ ہے، قیامت کے وقوع پر، یہ زمین اور آسمان اللہ تعالیٰ کے حکم سے زیر وزبر ہو جائیں گے، اور یہ باوجود شاندار اور مضبوط نظر آنے کے اللہ عزوجل کے حکم کے تابع ہیں اور اس کے فرمان کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں، جب تک وہ انہیں اس شکل میں قائم رکھنا چاہتا ہے، یہ قائم ہیں، جس وقت وہ حکم دے گا کہ ختم ہو جاؤ، یہ ختم ہو جائیں گے، یہ رب کائنات کے حکم کے خلاف نہیں چل سکتے، چنانچہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے کہ آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، زمین اپنے اندر سب چیزیں اُگل کر باہر پھینک دے گی۔

روزِ محشر تمام اولادِ آدم دو گرہوں میں بٹی ہوئی ہوگی ایک گروہ ان خوش نصیبوں کا ہوگا جن کو ازراہ بشارت ان کا صحیفۂ عمل ان کے دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا، ان کی خوشی کی انتہا نہ ہوگی اور وہ کامیابی کی علامت ہوگا۔ دوسرا گروہ اُن بدبختوں کا ہوگا جن کو ان کا نامۂ اعمال پس پشت دیا جائے گا، ذلت ورسوائی کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ چاہیں گے کہ کسی طرح انہیں موت آ جائے مگر یہ حسرت لیے وہ جہنم میں دھکیل دیے جائیں گے، ان کا یہ انجام اس لیے ہوگا کہ وہ دنیا میں اس غلط فہمی میں مگن رہے کہ کبھی رب کائنات کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر ہونا نہیں ہے، حالانکہ ان کا رب ان کے سارے اعمال دیکھ رہا تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ان اعمال کی باز پرس سے چھوٹ جائیں، ان کا دنیا کی زندگی سے آخرت کی جزا و سزا تک درجہ بدرجہ پہنچنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا غروب آفتاب کے بعد شفق کا نمودار ہونا اور دن کے بعد رات کا اور اس میں انسانوں اور حیوانات کا اپنے اپنے بسیروں کی طرف پلٹنا اور چاند کا ہلال سے بڑھ کر ماہ کامل بننا یقینی ہے۔

آخر میں ان کفار کو دردناک سزا کی خبر دی گئی ہے جو قرآن کو سن کر اللہ تعالیٰ کے آگے جھکنے کے بجائے الٹی تکذیب کرتے ہیں اور ان لوگوں کو لازوال اجر اور بے حساب ثواب کی خوشخبری دی گئی جو ایمان لا کر نیک اعمال سے زندگیوں کو آراستہ کر لیتے ہیں۔

سُوْرَةُ الاِنْشِقَاق

آیات:۲۵ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ(۱) وَاَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ(۲)
وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ(۳) وَ اَلۡقَتۡ مَا فِیۡہَا وَ تَخَلَّتۡ(۴)
وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ(۵) یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ
اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡہِ(۶)﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم مان لے گا اور اُسے واجب بھی یہی ہے، اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے، اُسے نکال کر باہر ڈال دے گی اور (بالکل) خالی ہوجائے گی، اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کو لازم بھی یہی ہے۔ اے انسان! تو کمائی کرتا ہوا اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے پھر تجھے اُس کے حضور پیش ہونا ہے۔

﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ﴾ جب آسمان پھٹ جائے گا۔

اِذَا جب جس وقت (ظرف زمان)، السَّمَآءُ آسمان، اِنۡشَقَّتۡ ماضی واحد مؤنث غائب، پھٹ جائے گا۔ (اِنۡشَقَّ، یَنۡشَقُّ، اِنۡشِقَاقٌ) پھٹنا، شگاف پڑنا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"قیامت کے بعد جو جہانِ نو وجود میں آئے گا وہ نئے نوامیس وقوانین کے تحت وجود میں آئے گا، اس وجہ سے اس میں یہ آسمان وزمین جو آج موجود ہیں، ختم ہوجائیں گے اور اُن کی جگہ جیسا کہ قرآن میں

تصریح ہے، دوسرے آسمان و زمین نمودار ہوں گے۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (ابراہیم:۴۸)

”(اِن لوگوں کو اُس دن سے ڈرائیے) جبکہ زمین اور آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے اور سب کے سب اللہ واحد قہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائیں گے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ کے الفاظ سے یہاں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو سورۂ انفطار میں اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے، کائنات کے اِس سب سے بڑے حادثہ کا آج کوئی اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے، قرآن نے اس ہلچل کا ذکر اُن نادانوں کو جھنجھوڑنے کیلیے کیا ہے جو اپنے قلعوں اور محلوں پر بہت نازاں تھے، اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بھلا ان میں کوئی دراڑ کہاں سے پڑ جائے گی؟ ان کو آگاہ فرمایا کہ قلعے اور گڑھیاں، ایوان اور محل تو درکنار سرے سے یہ آسمان و زمین ہی پاش پاش ہو جائیں گے جن کے اندر یہ گھروندے تم نے بنائے ہیں۔ (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ﴾

اور اپنے رب کا حکم مان لے گا اور اُس کو لازم بھی یہی ہے۔

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے ہے، اَذِنَتْ ماضی واحد مؤنث غائب کان رکھے (اس نے) یعنی حکم کی فوراً اطاعت کی (اَذِنَ، یَأذَنُ، اَذَنًا) لمبے اور بڑے کانوں والا ہونا، اَذِنَ لَهٗ وَاِلَیْهِ، کان لگا کر سننا معنی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا (القاموس الوحید) لِرَبِّهَا (لِ.رَبِّ.هَا) واسطے، اپنے، رب کے هَا کی ضمیر آسمان کی طرف جاتی ہے، وَ حُقَّتْ اور اس کے لیے موزوں بھی یہی ہے (کہ حکم سن کر فوری اطاعت کرے) ماضی مجہول واحد مؤنث غائب حَقَّ، یَحِقُّ، حَقٌّ، موزوں ہونا، مناسب ہونا یعنی آسمان کے لیے رب کا حکم سننے اور اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

”وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ“ اَیْ وَاسْتَمَعَتْ لِاَمْرِ رَبِّها وَ اَطَاعَتْ وَ حَقَّ لَهَا اَنْ تَسْمَعَ وَ تُطِیْعَ“ یعنی آسمان نے اپنے رب کے حکم کو سنا اور حکم بجا لایا اور اس پر لازم ہے کہ وہ سنے اور اطاعت

کرے۔“(صفوۃ التفاسیر)

﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ﴾ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔

وَ اور، عاطفہ، اِذَا جب (ظرف زمان)، اَلْاَرْضُ (زمین) مُدَّتْ پھیلا دی جائے گی (مَدَّ،یَمُدُّ، مَدّاً) پھیلانا۔

سید مودودی لکھتے ہیں:

”زمین کے پھیلا دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ سمندر اور دریا پاٹ دیے جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیے جائیں گے اور زمین کی ساری اونچ نیچ برابر کر کے اُسے ایک ہموار میدان بنا دیا جائے گا، سورۃ طٰہٰ میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ”اسے ایک چٹیل میدان بنا دے گا جس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ پاؤ گے۔“ (آیات:۱۰۶،۱۰۷)(تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ﴾

اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال کر باہر ڈال دے گی اور (بالکل) خالی ہو جائے گی۔

وَ اور، عاطفہ، اَلْقَتْ ڈال دے گی (زمین) واحد مؤنث غائب (اَلْقٰی، یُلْقِیْ، اِلْقَاءٌ) پھینکنا، ڈالنا، مَا فِيْهَا جو کچھ بیچ اس کے ہے، مَا جو اسم موصول فِيْهَا (فِی. هَا) میں۔اس۔هَا کی ضمیر زمین کی طرف جاتی ہے۔وَ تَخَلَّتْ اور وہ (زمین) خالی ہو جائے گی۔(تَخَلّٰی، یَتَخَلّٰی، تَخَلِّیٌ) صاف اور خالی ہونا خلاَ اور خلوت یہ الفاظ اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”جتنے مرے ہوئے انسان اُس کے اندر پڑے ہوں گے سب کو نکال کر وہ باہر ڈال دے گی اور اسی طرح اُن کے اعمال کی جو شہادتیں اس کے اندر موجود ہوں گی۔ وہ سب بھی پوری پوری باہر آ جائیں گی، کوئی چیز بھی اُس میں چھپی اور دبی ہوئی نہ رہ جائے گی۔(تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتۡ﴾

اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اُس کو لازم بھی یہی ہے۔

وَ اور، عاطفہ، اَذِنَتۡ ماضی واحد مؤنث غائب کان رکھے (اس نے) یعنی فوراً حکم مان لیا، وَ اور، عاطفہ، حُقَّتۡ، ماضی مجہول واحد مؤنث غائب اس اس کے لیے یہی ہے (حَقَّ، یَحِقُّ، حَقٌّ) موزوں ہونا، لائق ہونا، لازم ہونا حق ہونا، یعنی اپنے رب کے حکم کی ذرا سی بھی نافرمانی نہ کرے، یہ بات اس پر لازم بھی ہے اور اس کے لیے موزوں بھی ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ﴾

اے انسان! تو کمائی کرتا ہوا اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے پھر تجھے اس کے حضور پیش ہونا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا اے، حرف ندا، الۡاِنۡسَانُ انسان (بنی نوع انسان) اِنَّکَ (اِنَّ. کَ) بلاشبہ۔تو، اِنَّ کلام میں زور اور تاکید پیدا کرتا ہے۔ کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، کَادِحٌ کمائی کرنے والا (مشقت اٹھانے والا) اسم فاعل (کَدَحَ، یَکۡدَحُ، کَدۡحًا) محنت کرنا، مشقت اٹھانا، اِلٰی رَبِّکَ طرف اپنے رب کے، کَدۡحًا محنت، مشقت (لے کر) فَمُلٰقِیۡهِ (فَ. مُلٰقِیۡ. هِ) پس، ملنے والا ہے تو، اسے (اپنے رب کو) لَاقٰی، یُلَاقِیۡ، لِقَاءٌ، ملنا، ملاقات کرنا، مُلٰقِی اسم فاعل۔

ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

''اے انسان تو اپنے رب کے پاس اچھے یا برے اعمال لے کر پہنچنے والا ہے، پس تیرے اعمال ایسے ہونے چاہییں جو تجھے اُس کی ناراضی سے بچالیں اور اس کی رضامندی کو پالیں نہ کہ اس کی ناراضی کا باعث بنیں اور تیری تباہی و بربادی ہو جائے۔ (تفسیر طبری)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) قیامت کے وقوع پذیر ہونے سے قبل نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا، نہ اجرام سماوی کا یہ نظم باقی رہے گا اور نہ زمین کی موجودہ شکل و صورت ہی برقرار رہے گی۔ اس نقشے کو پیش کرنے کے ساتھ ایک نہایت اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ آسمان و زمین دونوں اپنے رب کے احکام پر کان

دھریں گے اور اپنے خالق کے حکم پر ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، اسی کے حکم سے وہ وجود میں آئے تھے اور اُسی کے حکم پر بکھر جائیں گے، یہ اتنے مضبوط اور شاندار نظر آنے کے باوجود اللہ عزوجل کے حکم کے تابع ہیں اور اُسی کے فرمان کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔

۲) انسان کو یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ تمام کائنات اور اس کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے گویا کہ یوں کہئے کہ ہر چیز ''مسلم'' ہے، انسان کو تو اس خالق کائنات نے اشرف و افضل بنایا ہے، اور اسے مادی و روحانی ان گنت انعامات سے نوازا ہے۔ اسے تو بدرجہ اولیٰ اطاعت اور فرمانبرداری کا دم بھرنا چاہیے تھا، اور سرکشی و بغاوت کی راہ کسی طرح بھی اُس کے لیے مناسب اور جائز نہیں ہے۔

۳) انسان کا یہ وہم وگمان غلط ہے کہ رہنے سہنے کے لیے صرف یہ دنیا ہی ہے اور وہ یہاں اسی طرح رہے گا، حقیقت یہ ہے کہ محنت و مشقت اٹھاتے اٹھاتے ایک نہ ایک دن وہ یہاں سے چل دے گا اور اُسے اپنے اچھے برے اعمال کے لیے اپنے رب کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔

۴) انسان کی زندگی کی پوری فلم انتہائی صحت وصفائی سے تیار ہو رہی ہے اس زمین کے اوپر ہر شخص جو کچھ کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے محفوظ ہو رہا ہے اور قیامت کے روز نہ صرف شروع سے آخر تک تمام انسانوں کو یہ زمین اُگل دے گی بلکہ وہ تمام اچھے یا برے اعمال بھی سامنے آجائیں گے جو اس زمین کے اوپر وہ کرتا رہا ہے اور اس زمین پر سے دریا اور پہاڑ پاٹ دیے جائیں گے تاکہ وسیع قطعۂ ارضی پر تمام انسان حساب کتاب کے لیے جمع ہو جائیں۔

....

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ(۷) فَسَوْفَ یُحَاسَبُ
حِسَابًا یَّسِیْرًا(۸) وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا(۹) وَ اَمَّا
مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ (۱۰) فَسَوْفَ یَدْعُوْا
ثُبُوْرًا(۱۱) وَّ یَصْلٰى سَعِیْرًا(۱۲) اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ

مَسْرُوْرًا(۱۳) اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ(۱۴) بَلٰٓی ج اِنَّ رَبَّهٗ
كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا(۱۵)﴾

پس جس کو اس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو اس سے جلد ہی آسان سا حساب لے لیا جائے گا اور وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش لوٹ کر آئے گا لیکن جس کا اعمال نامہ پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا، سو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا، بے شک وہ (دنیا میں) اپنے گھر والوں میں خوش خوش رہا کرتا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ وہ قطعاً (ہمارے پاس) لوٹ کر نہ آئے گا۔ کیوں نہیں، اُس کا رب تو اُسے دیکھ رہا تھا

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ، فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا﴾

پس جس کو اس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، تو اُس سے جلد ہی آسان سا حساب لے لیا جائے گا۔

فَاَمَّا مَنْ (فَ.اَمَّامَنْ) پس۔ جس کو، اُوْتِیَ دیا گیا۔ ماضی مجہول واحد مذکر غائب (اٰتٰی، یُؤْتِیْ اِیْتَآءٌ) دینا، عطا کرنا، كِتٰبَهٗ (كِتٰبَ.هٗ) اعمال نامہ۔ اس کا، كِتَاب مضاف "هٗ" ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، بِیَمِیْنِهٖ (بِ.یَمِیْنِ.هٖ) میں۔ داہنے (ہاتھ)۔ اس کے، بِ حرف جر، بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے، یَمِیْن دایاں ہاتھ، مجرور اور مضاف ہے، "هٖ" ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، فَسَوْفَ (فَ.سَوْفَ) پس۔ جلد ہی، یُحَاسَبُ حساب لیا جائے گا اس کا، مضارع مجہول واحد مذکر غائب (حَاسَبَ، یُحَاسِبُ مُحَاسَبَةٌ) محاسبہ کرنا، نفس کا محاسبہ کرنا، اردو میں استعمال ہوتا ہے، حِسَابًا یَّسِیْرًا حساب، آسان، یُسر آسانی، عُسر. تنگی یہ الفاظ اردو میں جانے پہچانے ہیں۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

"جس شخص کے داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا جائے گا، وہ پسندیدہ اور خوش نصیب اِنسان ہوگا، وہ

دنیا میں ایمان اور حسن عمل کا پیکر تھا، اللہ اُس سے راضی ہو جائے گا اور اُس کے لیے نجات کا فیصلہ فرما دے گا، اُس کا ہلکا حساب ہوگا اُس کے حساب میں شدت اور باریک بینی سے کام نہ لیا جائے گا۔ اِن آیات کی تشریح اِس حدیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نماز میں یہ دعا کرتے سنا ''اللّٰهُمَّ حَاسِبْنِي حِسَابًا يَّسِيْرًا'' (اے اللہ! میرا حساب آسان سا لینا)، آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے پوچھا ''حسابِ یسیر'' (آسان حساب) کیا ہے؟ فرمایا آسان اور ہلکا حساب یہ ہے کہ نامۂ اعمال کو دیکھنے کے بعد عفو و درگزر سے کام لیا جائے، اے عائشہ! اس دن جس کا حساب باریک بینی سے ہوگا، وہ ہلاک ہو گیا۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾

اور وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش لوٹ کر آئے گا۔

وَ اور، عاطفہ، يَنْقَلِبُ (اِنْقَلَبَ، يَنْقَلِبُ، اِنْقِلَابٌ) پلٹنا، لوٹنا، انقلاب، کسی چیز کو الٹ دینے کو کہتے ہیں، یہ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ نظام حکومت کی اچانک تبدیلی، سیاسی یا فوجی انقلاب (القاموس الوحید) اِلٰٓى اَهْلِهٖ طرف اپنے اہل کے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''جس کے داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا جائے گا وہ نجات پا جائے گا اور اپنے لوگوں میں، جو اُس سے قبل نجات پا کر جنت میں پہنچ گئے ہوں گے، خوش خوش لوٹے گا، اِس آیہ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے اہل و عیال اور ساتھیوں میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح میں اُس کے ساتھ تھے اور جن سے اُسے محبت تھی وہ سب جنت میں اُس کے ساتھ ایک ہی مقام پر ہوں گے یہ ایک ایسے شخص کی تصویر ہے جو جواب دہی اور حساب کتاب کے شدید موقف سے نجات پا کر، نجات پانے اور جنت میں اپنے احباب و متعلقین سے ملاقات ہو سکنے پر خوشیاں مناتا، اپنے محبوب ساتھیوں کے پاس واپس آئے گا۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ، فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا، وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًا﴾

اور جس کا اعمال نامہ پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا سو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔

وَ اور، عاطفہ، اَمَّا سو، لیکن، حرف شرط، مَنْ اُوْتِیَ جس کو دیا گیا، كِتٰبَهٗ (كِتٰب.هٗ) اعمال نامہ۔ اپنا، وَرَآءَ پیچھے، ظَهْرِهٖ (ظَهْرِ.هٖ) پشت۔ اس کی (کے)، فَسَوْفَ (ف.سَوْف) پس۔ جلد ہی (علامت مضارع) فعل مضارع کے شروع میں آئے تو مستقبل کے لیے خاص کر دیتا ہے، يَدْعُوْا پکارے گا، مضارع واحد مذکر غائب (دَعَا، يَدعُوْ، دَعْوَةٌ) بلانا، پکارنا، کسی کو دعوت پر بلانا اردو میں معروف ہے، ثُبُوْرًا ہلاکت (کو) (ثَبَرَ، يَثْبُرُ، ثَبْرًا) ہلاک ہونا، وَ اور، عاطفہ، يَصْلٰى داخل ہوگا، مضارع واحد مذکر غائب (صَلَى، يَصْلِیْ، صَلْیٌ) آگ میں داخل ہونا، سَعِيْرًا آگ، آگ کی لپیٹ، گویا کہ وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

يَدْ خُلُ نارًا مُسْتَعِرَّةً، يُقَاسِی عَذَا بَهَا وَ حَرَّهَا، وہ بھڑکتے شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا اُسے اُس کے عذاب اور شدت گرمی کا اندازہ ہوگا۔" (صفوۃ التفاسیر)

﴿اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾

بے شک وہ (دنیا میں) اپنے گھر والوں میں خوش خوش رہا کرتا تھا۔

اِنَّهٗ (اِنَّ.هٗ) بلاشبہ۔ وہ، اِنَّ کلام میں زور پیدا کرتا ہے۔ هٗ ضمیر واحد مذکر غائب، كَانَ تھا، فِیْۤ اَهْلِهٖ (اَهْلِ.هٖ) اہل۔ اپنے میں (اپنے اہل میں/ اپنے ہم خیال لوگوں میں)، مَسْرُوْرًا خوش خوش، یعنی دنیا میں وہ اپنے لوگوں میں متکبرانہ اور عیاشی کی زندگی گزارتا تھا۔

﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾

اُس نے سمجھ رکھا تھا کہ وہ قطعاً (ہمارے پاس) لوٹ کر نہ آئے گا۔

اِنَّهٗ (اِنَّ. ہٗ) بلاشبہ۔ وہ، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، اُس مغرور اور متکبر شخص کی طرف جاتی ہے۔ ظَنَّ اس نے گمان کر رکھا تھا (ظَنَّ، یَظُنُّ، ظَنًّا) گمان کرنا، سمجھنا، اَنْ لَّنْ کہ ہرگز نہ (وہ)، یَّحُوْرَ پھر آئے گا (حَارَ، یَحُوْرُ، حَوْرًا) پلٹنا، واپس ہونا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

یعنی اس متکبر شخص نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ وہ اپنے رب کے پاس مرنے کے بعد حساب کتاب کے لیے ہرگز نہ لوٹے گا، اِسی لیے وہ کفر اور سرکشی کی زندگی گزارنے لگا تھا۔ (صفوۃ التفاسیر)

﴿بَلٰٓی اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا﴾ کیوں نہیں، اُس کا رب تو اُسے دیکھ رہا تھا۔

بَلٰٓی، حرفِ جواب، کیوں نہیں، اِنَّ بلاشبہ، رَبَّهٗ (رَبَّ. ہٗ) رب، اُس کا، كَانَ تھا، بِهٖ (بِ. ہٖ) ساتھ۔ اُس کے یعنی اسے، بَصِیْرًا دیکھنے والا۔

علامہ طبری لکھتے ہیں:

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے، کہ ایسا مغرور شخص جس کا گمان تھا کہ وہ اِس دنیا سے پلٹ کر نہ جائے گا کیا اُسے خبر نہ تھی کہ اُس کا رب اُس کے تمام گناہوں اور ان تمام معاملات سے آگاہ ہے جو وہ آگے بھیج رہا ہے (تفسیر طبری)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

روزِ قیامت اپنے اعمال کے انجام کے لحاظ سے تمام انسان دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔

ایک گروہ خوش نصیب لوگوں کا ہوگا جنہوں نے عقل وفکر سے کام لیا، وحی الٰہی کو پہچانا، اور انبیائے کرام کی اطاعت وفرمانبرداری کا راستہ اختیار کیا، اُن کا اعمال نامہ انہیں دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور ان کا حساب کتاب آسانی سے طے پا جائے گا اور وہ خوش وخرم جنت میں بسا دیے جائیں گے جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فرحاں وشاداں رہیں گے۔ یہ کامیابی کی علامت ہوگی۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو خواہشات نفس کے غلام رہے، انبیائے کرام کی ہدایت سے منہ موڑا، اس پر بس نہ کی بلکہ غرور اور سرکشی کی زندگی گزاری۔ روزِ قیامت ان کا اعمال نامہ پس پشت بائیں

ہاتھ میں تھما دیا جائے گا اور یہ اُن کے ناکام اور نامراد ہونے کی علامت ہوگی، اس کے بعد انہیں جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ انتہائی رسوائی اور ذلت کی زندگی ہوگی جس میں وہ کرب اور تکلیف میں رہیں گے۔ پس عقلمند وہ ہیں جو آج کی نہیں بلکہ کل کی فکر کریں۔

....

﴿فَلَآ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ(١٦) وَالَّيۡلِ وَ مَا وَسَقَ(١٧) وَالۡقَمَرِ
اِذَا اتَّسَقَ(١٨) لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ(١٩) فَمَا لَهُمۡ لَا
يُؤۡمِنُوۡنَ(٢٠) وَاِذَا قُرِئَ عَلَيۡهِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا
يَسۡجُدُوۡنَ(٢١) ^السجدة^ بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُكَذِّبُوۡنَ(٢٢)
وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُوۡعُوۡنَ(٢٣) فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ
اَلِيۡمٍ(٢٤) اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ اَجۡرٌ
غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ(٢٥)﴾

مجھے شفق کی قسم، اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ ماہ کامل بن جاتا ہے، تم کو ضرور یکے بعد دیگرے مختلف حالات و مراحل سے گزرتے چلے جانا ہے، پھر انہیں کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اور قرآن سنایا جاتا ہے تو سجدہ ریز نہیں ہوتے بلکہ منکرین (اسے) جھٹلاتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ دلوں میں سنبھالے ہوئے ہیں، لہٰذا انہیں المناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔ بجز اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے، اُن کے لیے اجر ہے جو کبھی موقوف اور منقطع نہ ہوگا

﴿فَلَآ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ﴾ مجھے شفق کی قسم۔

فَلَآ اُقۡسِمُ پس قسم کھاتا ہوں میں فعل مضارع واحد متکلم (اَقۡسَمَ، یُقۡسِمُ، اِقۡسَامٌ) قسم کھانا، حلف اٹھانا ف، پس۔ لَا نے قسم کے لیے مزید تاکید پیدا کردی ہے۔ بِالشَّفَقِ (بِ.شَّفَقِ) شفق ۔کی، شفق وہ سرخی ہے جو افق میں غروب آفتاب کی جگہ ظاہر ہوتی ہے اور غروب سے عشا کے قریب تک برقرار رہتی ہے (القاموس الوحید)

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''لا قسم کی تاکید کے لیے آیا ہے، (رب العزت کا ارشاد ہے) میں تاکیدی قسم کھاتا ہوں آفتاب غروب ہونے کے بعد پھیلی ہوئی سرخی کی۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَالَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ﴾ اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے۔

وَ اور عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، الَّیۡلِ رات کی (قسم)، وَ مَا وَسَقَ اور جو وہ سمیٹ لیتی ہے وَمَا اور جو، مَا موصولہ ہے (وَسَقَ، یَسِقُ، وَسۡقًا) وَسَقَ اللَّیۡلُ الۡاَشۡیَاء رات کا چیزوں کو ڈھانک لینا، (القاموس الوحید)

﴿وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ﴾ اور (قسم) ہے چاند کی جب وہ ماہ کامل بن جاتا ہے۔

وَ اور عاطفہ، الۡقَمَرِ اور چاند کی، اِذَا جب اتَّسَقَ (اِتّسَقَ، یَتَّسِقُ، اِتّسَاقٌ) پورا ہونا، مکمل ہونا، یعنی قسم ہے چاند کی جب وہ ماہ کامل بن جاتا ہے اور اس کی روشنی بھرپور بکھرنے لگتی ہے۔

﴿لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ﴾

تم کو ضرور یکے بعد دیگرے مختلف حالات و مراحل سے گزرتے چلے جانا ہے۔

لَتَرۡکَبُنَّ (لَ.تَرۡکَبُنَّ) ضرور بضرور۔ سوار ہو گے تم (گزرو گے تم) لام، تاکیدی معنی پیدا کرتا ہے اور جواب قسم ہے۔ لَتَرۡکَبُنَّ (رَکِبَ، یَرۡکَبُ، رَکۡبًا) سوار ہونا تَرۡکَبُ، تم سوار ہوگے، تَرۡکَبُنَّ

میں ''ن'' ثقیلہ مزید زور اور تاکیدی معنی پیدا کرتا ہے، اس کے شروع میں لام لگانے سے مزید تاکید پیدا ہو جاتی ہے، یعنی تم ضرور بضرور سوار ہو گے (گزرو گے)، طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (منزل بہ منزل، درجہ بہ درجہ) یعنی مختلف حالات اور مراحل سے گزرو گے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یعنی تمھیں ایک حالت پر نہیں رہنا ہے بلکہ جوانی سے بڑھاپے، بڑھاپے سے موت، موت سے برزخ، برزخ سے دوبارہ زندگی، دوبارہ زندگی سے میدان حشر، پھر حساب وکتاب اور پھر جزا وسزا کی بے شمار منزلوں سے لازماً تم کو گزرنا ہوگا، اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، سورج ڈوبنے کے بعد شفق کی سرخی، دن کے بعد رات کی تاریکی اور اس میں اُن بہت سے انسانوں اور حیوانات کا سمٹ آنا جو دن کے وقت زمین پر پھیلے رہے ہیں اور چاند کا ہلال سے درجہ بدرجہ بڑھ کر بدر کامل بننا، یہ گویا چند وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی علانیہ شہادت دے رہی ہیں کہ جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کے اندر ٹھہراؤ نہیں ہے، ایک مسلسل تغیر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہر طرف پائی جاتی ہے، لہٰذا کفار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موت کی آخری ہچکی کے ساتھ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ پھر انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔

فَمَا (فَ. مَا) پس۔کیا ہے؟ لَهُمْ (لَ. هُمْ) واسطے۔اُن کے، ل حرف جر هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، لَا يُؤْمِنُونَ نہیں، ایمان لاتے (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانٌ) ایمان لانا۔

الاستاذ محمد علی صابونی لکھتے ہیں:

''اس استفہامیہ انداز سے مشرکین کو تنبیہ وتوبیخ کی جارہی ہے کہ وہ اللہ پر ایمان کیوں نہیں لاتے اور قطعی دلائل وبراہین ملنے کے بعد بھی بعد از موت ان کا روز جزا وسزا پر ایمان نہیں ہے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ﴾

اور جب انہیں قرآن سنایا جاتا ہے تو سجدہ ریز نہیں ہوتے۔

وَ اور، عاطفہ، اِذَا جب، (اسم ظرف) قُرِئَ پڑھا جاتا ہے (سنایا جاتا ہے) ماضی مجہول واحد مذکر غائب، (قَرَءَ، یَقْرَءُ قِراءَ ۃً) پڑھنا، کتاب کے الفاظ پر غور کرنا، عَلَیْھِمُ (عَلٰی.ھِمُ) پر۔ اُن، عَلٰی پر، حرف جار ھم، ضمیر جمع مذکر غائب مجرور، لَا یَسْجُدُوْنَ سجدہ نہیں کرتے (سَجَدَ، یَسْجُدُ، سُجُوْدًا) زمین پر پیشانی رکھنا، سجدہ کرنا۔

یعنی جب وہ (مشرکین) قرآن حکیم کو سنتے ہیں تو نہ تو اُن میں خشوع پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ رحمٰن کے آگے جھکتے ہیں۔ (صفوۃ التفاسیر)

﴿بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُکَذِّبُوْنَ﴾ بلکہ منکرین (اسے) جھٹلاتے ہیں۔

بَلِ یوں نہیں بلکہ، عربی زبان میں یہ لفظ اپنے سے قبل عبارت سے اعراض اور اپنے سے بعد عبارت کے اثبات کے لیے آتا ہے، اَلَّذِیْنَ اسم موصول، جنہوں نے کَفَرُوْا کفر کیا، ماضی جمع مذکر غائب (کَفَرَ، یَکْفُرُ، کُفْرًا) کافر ہونا، توحید اور نبوت کا انکار کرنا، دین اور شریعت کو نہ ماننا، یُکَذِّبُوْنَ وہ جھٹلاتے ہیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (کَذَّبَ، یُکَذِّبُ، تَکْذِیْبًا) جھٹلانا، کسی بات کا انکار کرنا، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ کفار سرکشی اور عناد کے سبب دین و شریعت کو جھٹلا رہے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ﴾

اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ دلوں میں سنبھالے ہوئے ہیں۔

وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، اَعْلَمُ خوب جانتا ہے (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، پہچاننا، اِس سے اسم تفضیل کا صیغہ اَعْلَمُ خوب جاننے والا، بِمَا (بِ.مَا) (اس بات کو) جو، یُوْعُوْنَ وہ دل میں رکھتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب (اَوْعَی، یُوْعِی، ایعاءٌ) دل میں رکھنا، دل میں جمع کرنا، یعنی (یہ کفار) اعمال کفریہ کا ذخیرہ، حق سے دشمنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے کینہ اور بغض جو وہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے خوب واقف ہے۔

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ﴾ لہٰذا انہیں المناک عذاب کی خوشخبری دیجیے۔

فَبَشِّرْهُمْ (فَ. بَشِّرْ. هُمْ) پس، خوشخبری دیجیے۔ انہیں فَ۔ پس، لہٰذا۔ یہاں سبب کو ظاہر کرتا ہے۔ بَشِّرْ، انہیں خوشخبری دیجیے، (بَشَّرَ، یُبَشِّرُ، تَبْشِیْرٌ) خوشخبری دینا۔ هُمْ انہیں ضمیر جمع مذکر، بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ عذاب، دردناک کی، رنج والم اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ (اَلِمَ، یَأْلَمُ، اَلَمًا) درد ہونا، تکلیف میں ہونا اَلْاَلِیْم، دردناک، تکلیف دہ۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''کتنی عجیب وغریب ہے یہ خوشخبری، اسے سن کر کون خوش ہو سکتا ہے، کسی خوشخبری دینے والے سے کسی ایسی خوشخبری کا منتظر کون شخص ہو سکتا ہے!

ٹھیک اسی لمحہ جب قرآن کفار کو اس طرح کی خوشخبری سناتا ہے، وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اہل ایمان جو حق کو نہیں جھٹلاتے اور اعمال صالحہ کر کے مستقبل کی تیاری میں منہمک ہیں، کس طرح کا انجام اُن کا انتظار کر رہا ہے اور اس کا تذکرہ اس طرح ہے گویا ان لوگوں کو جھٹلانے والے کفار کے انجام سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

اگلی آیت میں ان مستثنیٰ لوگوں کا ذکر ہے:

﴿اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ﴾

بجز اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے، ان کے لیے اجر ہے جو کبھی موقوف اور منقطع نہ ہوگا۔

اِلَّا مگر (حرف استثناء) الَّذِیْنَ وہ لوگ، جو اسم موصول، اٰمَنُوْا ماضی جمع مذکر غائب، ایمان لائے (اٰمَنَ یُؤْمِن، اِیْمَانًا) ایمان لانا، وَعَمِلُوا اور عمل کیے انہوں نے ماضی جمع مذکر غائب (عَمِلَ، یَعْمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا، الصّٰلِحٰتِ اچھے (نیک) اس کا مفرد اَلصَّالِحَةُ ہے نیک اعمال وہی کہلائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دین وشریعت کے عین مطابق ہوں، لَهُمْ (لَ. هُمْ) لیے، اُن کے، لَ لیے، حرف جار هُم ضمیر جمع مذکر غائب مجرور، اَجْرٌ، اجر ہے (ثواب ہے)، غَيْرُ مَمْنُوْنٍ بے انتہا، نہ ختم

ہونے والا۔

اِس طرح یہ سورت، جس کی عبارت مختصر سی ہے مگر جو انفس و آفاق کے دور دراز میدانوں کی سیر کراتی ہے اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) منکرین حق کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی نشانیاں بیان فرمائی ہیں جنہیں ہر شہری اور دیہاتی، ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، اور اس کا منکر وہی ہو سکتا ہے جس نے عقل و بصیرت کو پس پشت ڈال دیا ہو...... غور کیجیے، دن ختم ہوتا ہے اور شام کی سرخی اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ سورج جس کی چمک دمک نے دن بھر دنیا کو روشن رکھا تھا اب غروب ہو گیا، اس کے بعد رات آ جاتی ہے، رات کی سیاہی ہر سو پھیل جاتی ہے اور ہر چیز کو اپنے اندھیرے کی چادر میں لپیٹ لیتی ہے گویا اس بات کا اعلان ہے کہ جس طرح دن کی روشنی کو قیام نہیں تھا اسی طرح رات کے اندھیرے کو بھی بقا نہیں ہے۔ بعینہ یہی کیفیت زندگی کی ہے...... بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا اور بالآخر موت اور موت کے بعد دوسرے مراحل...... اور جو خالق روزانہ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کو پیدا کرتا ہے، وہ یقیناً زندگی کے بعد موت اور پھر موت کے بعد زندگی بھی عطا کر سکتا ہے۔

۲) قرآن حکیم ایک ایسی حقیقت پیش کر رہا ہے۔ جس کی تصدیق کائنات کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے...... بھلا لیل و نہار کی گردش کا کسے انکار ہو سکتا ہے؟ موت و حیات کا کون منکر ہو سکتا ہے، اِسی طرح یقیناً موت کے بعد نیک اور بد، حق کو ماننے والوں اور حق کے منکرین کا انجام الگ الگ ہوگا۔ ابرار و صالحین کے لیے اگر ابدی باغ و بہار ہے تو مشرکین و کفار کے لیے دائمی عذابِ نار ہے۔ (العیاذ باللہ)

..................o..................

سُوْرَةُ الْبُرُوْج

یہ سورۂ مبارکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُس وقت نازل ہوئی جب کفارِ مکہ نے اسلام قبول کرنے والوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دی تھی۔اس میں رب کریم نے مسلمانوں کو صبر و عزیمت کی راہ اختیار کرنے پر بشارت اور ابدی کامیابی کی نوید دی ہے جبکہ کفار کو انجامِ بد سے ڈرایا ہے اور دائمی عذاب کی اطلاع دی ہے۔پھر مسلمانوں کو اصحاب الْاُخْدُوْد (خندقیں کھودنے والوں) کا قصہ سنایا ہے جنہوں نے ایندھن بھری خندق کو آگ لگا کر اس میں ایمان لانے والوں کو ڈال دیا، اہل ایمان نے اُس وقت آگ کے گڑھوں میں گر کر جان دینا قبول کر لیا لیکن ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا، اِس استقامت اور شہادت پر وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کامیاب اور سرخرو ہو گئے اور ان کی جانبازی وسرفروشی اہل ایمان کے لیے تا قیامت روشنی کا سامان بنی، جبکہ کفار کا رویہ اور اُن کا برا انجام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عبرت و ذلت کا نشان بن گیا۔

سورۃ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کا آسمان اور اس کے اندر آفتاب و ماہتاب اور دیگر سیاروں اور ستاروں کے مضبوط و مربوط نظام نیز قیامت کے وقوع پذیر ہونے اور وہاں شاہد و مشہود کی قسم کھا کر یہ جتلانا مقصود ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر زمانے کا مالک ہے، اس لیے اُس کے نافرمان کبھی اور کہیں بھی اس کے عذاب سے بچ نہیں سکتے ہیں۔

سُورَةُ الْبُرُوج

آیات:۲۲ رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ(۱) وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ(۲)
وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ(۳) قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ(۴) النَّارِ
ذَاتِ الْوَقُوْدِ(۵) اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ(۶) وَّهُمْ عَلٰى مَا
يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ(۷)﴾

قسم ہے برجوں والے آسمان کی اور وعدہ کیے ہوئے دن کی اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی، کہ غارت ہوئے ایندھن والی آگ بھری خندقوں والے، جس وقت وہ لوگ اُس (آگ) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے کرتوت کو دیکھ رہے تھے جو وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے۔

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ قسم آسمان کی جو برجوں والا ہے۔

وَالسَّمَآءِ قسم ہے آسمان کی، و قسمیہ ہے جیسا کہ کہتے ہیں وَاللّٰهِ اللہ کی قسم، قسم کے معنی شہادت اور گواہی کے ہوتے ہیں، ہمارے لیے صرف ایک ہی خالق و مالک کی قسم ہے جو ہمیں ہر وقت دیکھتا ہے، جو ہمارے ماضی، حال اور مستقبل سے آگاہ ہے اس لیے ہم صرف اُسی کو گواہ بناتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی بھی چیز کو گواہ بنا سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کائنات کا ہر ذرہ اور ہر پتہ اُس کی قدرت اور یکتائی کی گواہی دے رہا ہے، ذَاتِ الْبُرُوْجِ (آسمان) برجوں والے کی، اَلْبُرُوْج اس کا مفرد بُرُجٌ ہے۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"اَلْبُرُوْج یہ بُرُجٌ کی جمع ہے جس کے معنی محل کے ہیں، اِسی مناسبت سے ستاروں کے مخصوص

منازل کو بُرُوج کہا گیا ہے۔(مفردات القرآن)

مولانا ثناء اللہؒ امرتسری لکھتے ہیں:

''وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ای ذَاتِ النُّجُوْمِ آسمان برجوں والے کی قسم یعنی وہ آسمان جو ستاروں سے جگمگا رہا ہے۔''(تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن)

﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ﴾ اور اُس دن کی قسم جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

و قسمیہ ہے، وَالْيَوْمِ اور اُس دن (کی) الْمَوْعُوْدِ (جس کا) وعدہ کیا گیا ہے۔اسم مفعول واحد مذکر (وَعَدَ، يَعِدُ، وَعْدًا) وعدہ کرنا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''رب کائنات کا ارشاد ہے کہ میں اُس دن کی قسم کھاتا ہوں جس کا وعدہ کیا گیا ہے اور وہ روزِ قیامت ہے جس کا میں نے اپنی مخلوق سے وعدہ کیا، اور وہ یہ ہے:

اَللّٰهُ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (النساء:۸۷) ''اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تم سب کو روزِ قیامت جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔''(صفوۃ التفاسیر)

﴿وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ﴾ اور شاہد و مشہود کی قسم۔

وَشَاهِدٍ اور دیکھنے والے کی، اسم فاعل واحد مذکر (شَهِدَ، يَشْهَدُ، شَهَادَةً اور شُهُوْدٌ) شہادت دینا، کسی بات کی یقینی خبر دینا، دیکھنا، پانا۔ وَمَشْهُوْدٍ جس کو دیکھا جائے، اسم مفعول اور اس سے مراد روزِ قیامت ہے، لائق ذکر، وہ دن جس میں لوگ انتہائی اہم معاملہ کے لیے جمع ہوں گے۔(القاموس الوحید)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''دیکھنے والے اور دیکھی جانے والی چیز کے بارے میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں، مگر ہمارے نزدیک سلسلہ کلام سے جو بات مناسبت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ دیکھنے والے سے مراد ہر وہ شخص

ہے جو قیامت کے روز حاضر ہوگا اور دیکھی جانے والی چیز سے مراد خود قیامت ہے جس کے ہولناک احوال کوسب دیکھنے والے دیکھیں گے، یہ مجاہد، عکرمہ، ضحاک، ابن نجیح اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے۔" (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ﴾ ہلاک ہوئے خندقوں والے۔

قُتِلَ مارے گئے (ہلاک ہوئے) ماضی مجہول واحد مذکر غائب (قَتَلَ، یَقۡتُلُ، قَتۡلًا) قتل کرنا، مار ڈالنا قَتَلَ سے ماضی مجہول قُتِلَ، اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ خندقوں والے، صاحب کی جمع اصحاب (والے)، الخُدّہ لمبا گڑھا، اس کی جمع اُلۡاُخۡدُوۡد ہے (یہ جملہ بددعائیہ ہے) قُتِلَ ای لُعِنَ، قُتِلَ کے معنی لعنت کیے گئے، "یہ قسم کا جواب ہے، اور جملہ بددعائیہ ہے یعنی اللہ نے خندقوں والوں کو ہلاک کیا اور وہ ملعون ہوئے جنہوں نے لمبائی میں زمین کے اندر گڑھے بنائے اور انہیں ایندھن سے بھر کر آگ جلائی تاکہ مؤمنوں کو اُس میں جلائیں۔" (صفوۃ التفاسیر)

﴿النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ﴾ (یعنی) ایندھن والی آگ۔

النَّارِ کہ آگ (تھی)، ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ بہت ایندھن والی، ذات، ذو کی تانیث ہے، والی کے معنی پیدا ہوتے ہیں الۡوَقُوۡدِ۔ ایندھن، ہر وہ چیز جس میں جلنے سے حرارت وتوانائی پیدا ہو۔

یعنی ایسی آگ جو وافر ایندھن کے جلنے سے بھڑک رہی تھی اور جو کفار نے مومنوں کو جلانے کے لیے خندقوں میں جلائی تھی۔ (حوالہ ایضا) ان مجرموں کے کرتوتوں کا ذکر اس طرح ہوتا ہے:

﴿اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ، وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ﴾

جب وہ (ظالم) اُس کے کنارے بیٹھے تھے اور اہل ایمان کے ساتھ جو (ظلم وستم) کررہے تھے، اُسے خوب دیکھ رہے تھے۔

اِذۡ هُمۡ جس وقت کہ وہ، اِذۡ ظرف زمان، هُمۡ ضمیر جمع مذکر غائب، عَلَيۡهَا اوپر اُس کے یعنی خندقوں

کے اطراف میں ھَا کی ضمیر خندقوں کی طرف جاتی ہے، قُعُوْدٌ بیٹھے تھے، اسم فاعل جمع مذکر، اس کا مفرد قَاعِدٌ ہے، وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، هُمْ وہ ضمیر جمع مذکر غائب، عَلٰی، مَا اس پر، جو وہ، عَلٰی حرف جر، مَا اسم موصول، يَفْعَلُوْنَ کر رہے تھے فعل مضارع جمع مذکر غائب (فَعَلَ، يَفْعَلُ، فِعْلًا) کرنا، بنانا، بِالْمُؤْمِنِيْنَ (بِ. الْمُؤْمِنِيْنَ) ساتھ، مؤمنوں کے، مؤمن کی جمع مؤمنوں اور ب کے آنے سے مؤمنین ہو گیا، شُهُوْدٌ، حاضر، گواہ اس کا مفرد الشَّاهِدُ ہے (شَهِدَ، يَشْهَدُ، شَهَادَةً) گواہی دینا، آنکھوں سے کوئی چیز دیکھنا، شہادت، گواہی، شاہد اور گواہ اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''گڑھے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ بھڑکا کر ایمان لانے والے لوگوں کو اُن میں پھینکا اور اپنی آنکھوں سے ان کے جلنے کا تماشا دیکھا تھا ''مارے گئے'' کا مطلب یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت پڑی اور وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہو گئے اور اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ایک برجوں والے آسمان کی۔ دوسرے روزِ قیامت کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ تیسرے، قیامت کے ہولناک مناظر کی اور اس ساری مخلوق کی جوان مناظر کو دیکھے گی۔ پہلی چیز اِس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جو قادرِ مطلق ہستی کائنات کے عظیم الشان ستاروں اور سیاروں پر حکمرانی کر رہی ہے اس کی گرفت سے یہ حقیر و ذلیل انسان کہاں بچ کر جا سکتے ہیں۔ دوسری چیز کی قسم اِس بنا پر کھائی گئی ہے کہ دنیا میں اُن لوگوں نے جو ظلم کرنا چاہا کر لیا، مگر وہ دِن بہر حال آنے والا ہے جس سے انسانوں کو خبردار کیا جا چکا ہے کہ اُس میں ہر مظلوم کی دادرسی اور ہر ظالم کی پکڑ ہوگی۔ تیسری چیز کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ جس طرح ان ظالموں نے ان بے بس اہل ایمان کے جلنے کا تماشا دیکھا اُسی طرح قیامت کے روز ساری خلق دیکھے گی کہ ان کی خبر کس طرح لی جاتی ہے۔ (تفہیم القرآن، ج:۶)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ایمان ایک ایسی بیش بہا دولت ہے کہ اس کے مقابلے میں دنیا کے سارے خزانے ہیچ ہیں، ایک سچا مسلمان مصائب و مشکلات میں گھبراتا نہیں ہے، وہ اپنے خالق و مالک کی مدد اور اُس کا سہارا تلاش کرتا ہے، یہاں تک کہ اُس کی راہ میں اُسی کی رضا کے لیے اپنی جان کی بازی لگا کر حیاتِ

جاوداں پالیتا ہے، ایسے ہی پاک طینت انسانوں کے بارے میں رب کائنات کا فرمان ہے: ’’جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔‘‘ (البقرہ:۱۵۴)

۲) اللہ تعالیٰ کے یہاں اہل ایمان تو فائز المرام ہو جاتے ہیں جبکہ اِن پاکبازوں پر ناحق ستم ڈھانے والوں کا انجام ابدی ناکامی اور دائمی بربادی ہوتا ہے جیسا کہ اَصۡحَابُ الۡاُخۡدُوۡد کا ہوا۔

....

﴿وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ(۸) الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ(۹)﴾

(کفار) اہل ایمان کے صرف اس لیے دشمن ہو گئے تھے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے جو سب پر غالب، تمام خوبیوں کا مالک ہے، آسمانوں اور زمین کی حکومت اُسی کے لیے ہے اور اللہ تو ہر شے کو دیکھ رہا ہے۔

﴿وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ﴾

(کفار) اہل ایمان کے صرف اس لیے دشمن ہو گئے تھے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے جو سب پر غالب، تمام خوبیوں کا مالک ہے۔

وَ اور، عاطفہ، مَا نہیں، نافیہ، نَقَمُوۡا، وہ دشمن ہوئے فعل ماضی جمع مذکر غائب (نَقَمَ، يَنۡقِمُ، نَقۡمًا) کسی کو سزا دینا، دشمن ہونا، مِنۡهُمۡ (مِنۡ۔هُمۡ) سے، ان یعنی ان سے، اِلَّاۤ مگر (اس وجہ سے)، اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا یہ کہ وہ ایمان لائے (اٰمَنَ، يُؤۡمِنُ، اِيۡمَانًا) ایمان لانا، بِاللّٰهِ (بِ۔اللّٰهِ) اللہ، پر، الۡعَزِيۡزِ اللہ تعالیٰ کا

صفاتی نام، غالب وطاقتور جو کسی سے مغلوب نہ ہو، اَلْحَمِیْدِ، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے، وہ ذات جس کی بہت تعریف کی جاتی ہو۔

﴿الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ﴾

آسمان وزمین کی حکومت اُسی کے لیے ہے اور اللہ ہر شے کو دیکھ رہا ہے اور اس پر نگران ہے۔

اَلَّذِیْ جو (ذات کہ) اسم موصول، لَهٗ اس کے واسطے ہے، مُلْكُ حکومت، السَّمٰوٰتِ آسمانوں (کی)، اس کا مفرد سماءٌ ہے، اگرچہ آسمانوں کی طرح زمین کے بھی مختلف تہہ در تہہ حصے ہیں تاہم اَرْض مفرد استعمال ہوا ہے۔

وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ہر شے کو دیکھ رہا ہے اور اس پر نگران ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے، ان کے معاملات کی چھوٹی بڑی بات کوئی بھی اس سے پوشیدہ نہیں اور اس میں مؤمنوں کے لیے اُس کی رحمتوں کی تسکین اور تشفی ہے اور مجرموں کے لیے ڈر اور دھمکی ہے۔(صفوۃ التفاسیر)

ان آیات مبارکہ کا تعلق گزشتہ سات آیات سے ہے، اُن پر نظر ڈال لیجیے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یہ تھا ان کا واحد جرم، وہ اللہ پر ایمان لائے تھے جو العزیز ہے، جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے اس پر قادر ہے، اَلْحَمِیْد ہے، یعنی ہر حال میں حمد......شکر وثنا کا مستحق ہے، وہ بذات خود محمود ہے، خواہ جاہل اس کی حمد نہ کریں، وہ اس کا مستحق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس کی بندگی کی جائے، وہی تنہا آسمانوں اور زمین کا فرماں روا اور مقتدر اعلیٰ ہے، ہر شے اس کی نظر میں ہے اور ہر چیز کے وقوع کے وقت وہ موجود ہوتا ہے، اہل ایمان اور اصحاب الاخدود کا جو واقعہ پیش آیا، وہ بھی اس کی نظروں کے سامنے اور اس کی موجودگی میں ہوا، یہ چیز اہل ایمان کو سکون وطمانیت بخشتی اور سرکش وظالم کے لیے دھمکی کا کام کرتی ہے، ہاں، ہاں! اللہ دیکھ رہا تھا......اور اللہ کا دیکھنا بالکل کافی ہے۔

اِن مختصر سی آیات کے ساتھ اس واقعہ کا بیان ختم ہو جاتا ہے۔مگر ساتھ ہی ہمارے دل میں اس فعل

شنیع اور اس کے مرتکبین کی خباثت وشناعت سے نفرت وعداوت بھر جاتی ہے، یہ آیات ہمیں اس بات پر ابھارتی ہیں کہ ہم غور کریں کہ اِس حادثہ کے بعد کیا ہوتا ہے، اللہ کے یہاں اس کا کیا وزن ہے اور یہ واقعہ اللہ کے غضب ونفرت اور اس کے انتقام کا، کس درجہ مستحق ہے...... حقیقت یہ ہے کہ واقعہ اس حد پر ختم نہیں ہوا ہے، اللہ کے حساب میں اس کے بعد بہت کچھ ہونے والا ہے۔

حادثہ کا بیان ختم ہوتا ہے مگر دل ہیبت ورعب سے بھر جاتا ہے...... ایمان کی ہیبت ورعب سے جو اِس شدید فتنہ وآزمائش میں غالب آیا! عقیدہ نے زندگی کے مقابلہ میں اپنے وجود کو برقرار رکھا اور انسان نے جسم اور زمین کی ہر جاذبیت وکشش سے آزادی حاصل کر لی!...... یہ بھی تو ممکن تھا کہ اہل ایمان اپنے ایمان کو تباہ کر کے اپنی زندگیوں کو بچا لیتے لیکن آخرت سے پہلے دنیا ہی میں وہ کتنے عظیم خسارے سے دوچار ہوتے، نہیں نہیں نوع انسانی کتنے عظیم خسارے سے ہم کنار ہوتی!...... اگر وہ ایسا کرتے تو ایک عظیم حقیقت کو قتل کر کے عظیم خسارے میں مبتلا ہوتے! وہ عظیم حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ کے بغیر زندگی بے قیمت ہے، آزادی کے بغیر زندگی بے معنی اور خراب ہے اور یہ انتہائی پستی کی حالت ہے کہ ظالم وسرکش افراد انسانی جسموں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد انسانی ارواح پر بھی قابض ومسلط ہو جائیں...... یہ ایک بزرگ اور بلند تر حقیقت ہے، یہ ایک عظیم منفعت ہے جس سے وہ زمین میں رہتے ہوئے ہمکنار ہوئے، آگ اُن کے جسموں کو جلا رہی تھی اور وہ اُس کی شدید اذیت کو محسوس کر رہے تھے مگر اسی حال میں وہ اس بے بہا حقیقت کو پا رہے تھے، آگ اس عظیم حقیقت کا تزکیہ کر رہی تھی، کتنا منفعت بخش تھا یہ سودا! پھر معاملہ یہیں پر تو ختم نہیں ہو جاتا ہے، اُن کا حساب کتاب ان کے رب کے پاس ہونا ہے، ان کے ظالم وسرکش دشمنوں کا بھی اللہ کے یہاں حساب ہونا ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) دعوتِ حق جب بھی بلند ہوئی اُسے ہر زمانے اور ہر دور میں قریباً ایک جیسے مرحلوں سے گزرنا پڑا، داعی حق کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں ہمیشہ غربا ومساکین کا باشعور طبقہ پیش پیش رہا، ان اہل ایمان کی مخالفت کرنے والوں کا گروہ بالعموم وہی ہوتا تھا جو کسی نہ کسی اعتبار سے سیاسی اقتدار یا

مذہبی پیشوائی کا مقام رکھتا تھا۔انہیں اپنی سیادت وقیادت کے چھن جانے کا خوف لاحق رہا۔

۲) ایمان قبول کرنے اوراس کی حقیقت جاننے کے بعداس میں ایسی لذت اور مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے کہ بندہ مؤمن ہر مصیبت برداشت کر لیتا ہے اوراس کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہتا ہے، یہ اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہوتا ہے۔ایمان والوں کی جانی اور مالی قربانیاں انہیں دنیا اور آخرت میں سرخ رو بنا دیتی ہیں اور انہیں تکالیف اور اذیتیں دینے والے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے ہیں۔

....

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَتُوۡبُوۡا فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ(۱۰) اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡکَبِیۡرُ(۱۱) اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ(۱۲) اِنَّهٗ هُوَ یُبۡدِئُ وَ یُعِیۡدُ(۱۳) وَ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ(۱۴) ذُوالۡعَرۡشِ الۡمَجِیۡدُ(۱۵) فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ(۱۶)﴾

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم وستم توڑا اور پھر توبہ نہ کی یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور اُن کے لیے جلتی ہوئی آگ کی سزا ہے، جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے یقیناً اُن کے لیے جنت کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں اور یہی بڑی کامیابی ہے۔یقین رکھو! تمہارے رب کی پکڑ بہت سخت ہے، وہی تو ہے جو اول بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا

اور وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، بڑا محبت کرنے والا ہے، عرش کا مالک ہے، عظمت والا ہے اور جو ارادہ کرے اُسے کر ڈالنے والا ہے

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَتُوۡبُوۡا فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِيۡقِ﴾

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم وستم توڑا اور پھر توبہ نہ کی یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلتی ہوئی آگ ہے۔

اِنَّ یقیناً تحقیق کلام میں زور پیدا کرتا ہے، الَّذِیۡنَ جن لوگوں نے اسم موصول، اس کا مفرد الَّذی ہے، فَتَنُوا ظلم وستم توڑا فعل ماضی جمع مذکر غائب (فَتَنَ، یَفۡتِنُ، فَتۡنًا) مذہب یا رائے سے ہٹانے کے لیے تکلیف دینا، آزمائش کے لیے سختی میں ڈالنا۔ (القاموس الوحید) الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اس کا مفرد الۡمُؤۡمِنُ مؤمن مرد، وَالۡمُؤۡمِنٰتِ اس کا مفرد الۡمُؤۡمِنة، مؤمنہ عورت، ثُمَّ پھر حرف عطف، لَمۡ یَتُوۡبُوۡا نہ توبہ کی انہوں نے لَمۡ حرف جزم ہے، فعل مضارع کے شروع میں آئے تو ماضی کے معنی دیتا ہے اور اس سے ن جمع کا گر جاتا ہے جیسا کہ یَتُوۡبُوۡنَ وہ توبہ کرتے ہیں، اس سے لَمۡ یَتُوۡبُوا، انہوں نے توبہ نہ کی، فَلَهُمۡ (فَ. لَهُمۡ) پس۔ اُن کے لیے ہے، عَذَابُ جَهَنَّمَ عذاب جہنم کا، وَ لَهُمۡ اور ان کے لیے ہے، عَذَابُ الۡحَرِيۡقِ عذاب جلنے کا، الۡحَرِیق، جلتی ہوئی آگ، آگ کا شعلہ (حَرَّقَ یُحَرِّقُ) جلانا۔ حریق اسم فاعل جلانے والا!

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں کو دین حنیف سے ہٹانے کے لیے آگ میں ڈالا، پھر انہوں نے توبہ نہ کی اور نہ ہی اپنے کفر اور سرکشی سے واپس پلٹے ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب ہے، اس کے ساتھ ہی مومنوں کو بشارت سنا دی گئی ہے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

سید قطب شہید نے لفظ ''حریق'' پر کیا ہی عمدہ بات لکھی ہے:

اس آیت میں حَرِیق (جلتی ہوئی آگ اور آگ میں جلنے) کا صراحتاً ذکر ہے حالانکہ عذاب جہنم،

سے بھی یہ مفہوم سامنے آتا ہے یہ صراحت خندق کی آگ اور اس میں جلنے کے مقابلہ میں کی گئی ہے اور ٹھیک اس لفظ سے، جس سے ذہن "**حادثۂ اُخدُود**" کی طرف منتقل ہو سکے، لیکن اس بھڑکتی ہوئی آگ اور اس میں جلنے کا شدت اور مدت، کسی بھی لحاظ سے کیا مقابلہ! دنیا میں جلنا اس آگ سے ہوتا ہے جسے اللہ کی مخلوق جلاتی اور بھڑکاتی ہے آخرت میں جلنا اُس آگ سے ہوگا جسے خالق کائنات جلائے اور بھڑکائے گا، دنیا کی آگ اور اُس میں جلنے کا معاملہ تھوڑی دیر کے لیے ہے جس کے بعد اس کا خاتمہ ہو جائے گا، آخرت کی آگ اور اس میں جلنا ابد الآباد کے لیے ہے جس کی صحیح مدت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ایک بات اور...... دنیا کی آگ میں جلنے سے...... جبکہ حق کے لیے جلا جائے...... اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور وہ عظیم اور بزرگ انسانی حقیقت قائم و برقرار ہوتی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا، آخرت کی آگ میں جلنے کے ساتھ اللہ کا شدید غضب اور انسانیت کی انتہائی ملعون و مذموم پستی انسان کے شامل حال رہتی ہے (فی ظلال القرآن)

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۬ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡکَبِیۡرُ﴾

<u>جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے یقیناً ان کے لیے جنت کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں۔</u>

اِنَّ یقیناً، تحقیق، **الَّذِیۡنَ** جو لوگ (کہ) اسم موصول، **اٰمَنُوۡا** ایمان لائے، ماضی جمع مذکر غائب (**اٰمَنَ، یُؤۡمِنُ، اِیۡمَاناً**) ایمان لانا، **اٰمَنَ** وہ ایمان لایا، **وَ عَمِلُوا** اور انہوں نے عمل کیے ماضی جمع مذکر غائب (**عَمِلَ، یَعۡمَلُ، عَمَلاً**) عمل کرنا، **لَهُمۡ** ان کے واسطے ہے، **جَنّٰتٌ** باغات اس کا مفرد **جَنَّةٌ** ہے، **تَجۡرِیۡ** بہتی ہیں فعل مضارع واحد مونث غائب (**جَرَی، یَجۡرِی، جَرۡیًا**) چلنا، بہنا، **مِنۡ تَحۡتِهَا** ان کے نیچے سے "**ها**" کی ضمیر **جَنّٰتٌ** کی طرف جاتی ہے، **الۡاَنۡهٰرُ** نہریں، اس کا مفرد **نَهۡرٌ** ہے، **ذٰلِکَ** یہ ہے، **الۡفَوۡزُ** کامیابی، **الۡکَبِیۡرُ** بڑی۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

"اہل ایمان جنہوں نے اعمال حسنہ سے اپنے آپ کو آراستہ کیا ان کے لیے کھلتے ہوئے باغات اور

لہلہاتے چمن ہیں کہ وہاں کے قصور و محلات کے نیچے نہروں کا جاری وساری ہونا عظیم کامیابی ہے کہ اس کے بعد کسی فوز و فلاح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' (صفوہ التفاسیر)

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ﴾

یقین رکھو! تمہارے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔

اِنَّ یقیناً، بَطْشَ پکڑ، گرفت، تیرے رب کی، لَشَدِیْدٌ (لَ. شَدِیْدٌ) ضرور بضرور سخت ہے، لام تاکیدی معنی پیدا کرتا ہے۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَ یُعِیْدُ﴾

وہی تو ہے جو اول بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔

اِنَّهٗ (اِنَّ. ہٗ) یقیناً۔ وہی یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ، ہٗ کی ضمیر رب کائنات کی طرف جاتی ہے۔ اَیْ هُوَ جَلَّ وَ عَلَا اَلْخَالِقُ الْقَادِرُ (صفوۃ التفاسیر) یُبْدِئُ وَ یُعِیْدُ وہی تو ہے جو اول بار پیدا کرتا ہے اور دوبارہ پیدا کرے گا۔ هُوَ، وہ یعنی اللہ تعالیٰ اِنَّهٗ میں ہ کی ضمیر رب العزت کی طرف جاتی ہے اور هُوَ کی ضمیر بھی اسی کی طرف جاتی ہے۔ اس سے جملے میں تاکید آ گئی ہے اور اس کا ترجمہ ہوا: وہی تو ہے جو اول بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ یُبْدِئُ، (أَبْدَأَ، یُبْدِیُٔ، اِبْدَاءٌ) شروع کرنا، آغاز کرنا، کسی کام کی ابتداء، مبتدی اردو میں استعمال ہوتے ہیں یُعِیْدُ (اَعَادَ، یَعِیْدُ) لوٹانا، دوبارہ عطا کرنا، اعادہ کرنا دہرانا اردو میں مستعمل ہے۔ وہ (رب) جو مخلوق کو نیست سے ہست میں لایا، وہ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندگی عطا فرمائے گا۔

﴿وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ﴾ اور وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے بڑا محبت کرنے والا ہے۔

وَ اور، عاطفہ ہے، هُوَ وہ، یہ ضمیر رب العزت کی طرف جاتی ہے، اَلْغَفُوْرُ بڑا ہی بخشنے والا، یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا صفاتی نام ہے، اَلْوَدُوْدُ اپنی مخلوق پر انتہائی مہربان اور محبت کرنے والا، یہ بھی اسی مہربان

خالق ومالک کا صفاتی نام ہے۔

اس پر سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اَلْغَفُوْرُ (بہت معاف کرنے والا) کا تعلق اس توبہ سے ہے جس کا ذکر ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوا (پھر انہوں نے توبہ نہ کی) میں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت اوراس کا خاص فضل ہے جس کی نہ حد ہے اور نہ انتہا، یہ اللہ کا وہ دروازہ ہے جو اُس شخص کے لیے کبھی بند نہیں ہوتا جو اللہ کی طرف پلٹ کر آنے والا اور توبہ کرنے والا ہو خواہ اس کا گناہ کتنا ہی بڑا اور معصیت کتنی ہی شدید ہو!

رہی اللہ کی صفت ''اَلْوَدُوْد'' (بہت محبت کرنے والا) اوراس کی محبت (وُدّ) تو اس کا تعلق صرف مومنین اوران کے ایمانی موقف سے ہے، اُن اہل ایمان سے جنہوں نے ہر شے کو تج کر کے اپنے رب کو چن لیا اوراسے اپنا لیا......لطیف، شیریں اور بزرگ شفقت ومحبت ان بندوں سے جو اللہ کو ہر شے پر ترجیح دیتے اوراُس سے محبت کرتے ہیں، اللہ انہیں اتنا بلند، اتنا بلند کرتا ہے کہ قلم اس کے بیان سے عاجز ہے، اِلّا یہ کہ اللہ کا فضل وکرم ہی دست گیری کرے یہ بلند مقام دوستی ومحبت کا ہے۔ رب اور بندہ، مالک اور غلام کے درمیان دوستی! اللہ کی محبت اپنے دوستوں اوراپنے مقرب ومحبوب بندوں سے۔ کتنا بلند ہے یہ مقام اس شیریں محبت کے ایک قطرہ کے مقابلہ میں اس زندگی کی کیا قیمت، جو انہوں نے قربان کی، وہ تو جانے ہی والی تھی، اُس تعذیب کی کیا حیثیت، جو انہوں نے برداشت کی، وہ تو وقتی تھی، اِس محبوب و شیریں محبت کے ایک لمحہ کے مقابلہ میں اِن میں سے کسی شے کی کوئی حیثیت نہیں، زمین پر بسنے والے غلام، جو کسی انسان کی غلامی میں ہوں، اپنے آقا کے منہ سے ہمت افزائی کا ایک لفظ سننے یا اس کے چہرہ پر خوشنودی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا آقا بھی غلام ہے اور وہ بھی غلام ہیں، ذرا سوچو جو اللہ کے بندے اوراس کے غلام ہیں، انہیں کیا کچھ ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ اپنی کریمانہ اور بزرگ و برتر محبت کے ساتھ ان سے اظہار لطف ومحبت کرتا ہے۔ وہ اللہ جو ذوالعرش المجید، عرش کا مالک! اور بزرگ و برتر ہے! بلند مقتدر اعلیٰ، صاحب مجد وشرف اور کریم ہے! اس صاحب عرش، بزرگ وبرتر محبّ آقا کی خوشنودی کے ایک لمحہ کے حصول کی راہ میں زندگی ہیچ ہے! مصائب وآلام ہیچ ہیں، ہر بیش بہا اور نادر شے ہیچ اور بے قیمت ہے!'' (فی ظلال القرآن)

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ اور جو ارادہ وہ کرے اسے کر ڈالنے والا ہے۔

فَعَّالٌ کرنے والا ہے (فَعَلَ، يَفْعَلُ، فَعْلًا) کرنا، کام بنانا اس سے اسم مبالغہ کا صیغہ فَعَّالٌ ہے، لِّمَا يُرِيْدُ جو کچھ وہ چاہے (اَرَادَ، يُرِيْدُ، اِرَادَةً) ارادہ کرنا۔

امام القرطبی لکھتے ہیں: جس بات کا رب العزت ارادہ فرمائے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ (تفسیر القرطبی)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) دعوتِ ایمان قبول کرنے والوں کو جن لوگوں نے ستایا، پریشان کیا، دکھ اور تکالیف دیں، پھر نہ تو انہیں اپنی حرکات پر کبھی ندامت اور پشیمانی ہوئی اور نہ ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور سچے دل سے توبہ کی، اُن کے لیے آخرت میں ابدی عذاب اور دائمی ذلت ورسوائی ہے۔

۲) اس کے برعکس اللہ کے وفادار بندے جنہوں نے اپنی زندگیوں کو ایمان اور اعمال صالحہ سے آراستہ کیا اور اپنے خالق و مالک کی رضا جوئی کے لیے اپنے مخالفین کے ہاتھوں جو مصائب اور مشکلات برداشت کیں، اس کے باوجود حق وصداقت پر ڈٹے رہے، نہ ان کے ایمان میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی اور نہ ہی راہ حق سے اُن کے قدم ڈگمگائے بلکہ جان ومال تک اپنے خالق و مالک کی راہ پر نچھاور کر دیا، انہیں دائمی زندگی اور لازوال ابدی نعمتوں کی خوشخبری دی جا رہی ہے۔

۳) خالق کائنات جہاں اپنے بندوں پر انتہائی مشفق اور مہربان ہے اور بار بار اپنے بندوں کو ان کی خطاؤں پر معاف فرماتا رہتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ سرکش اور باغی لوگ اس کے عذاب اور اُس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے ہیں۔

۴) وہ قوی اور قدیر ہے، اُس نے اس تمام کائنات کو بنایا اور سجایا ہے، اس نے انسان کو اس میں اشرف واعلیٰ بنایا ہے وہی موت وحیات کا مالک ہے، وہی زندگی کے بعد موت دیتا ہے، جس نے اگر پہلی بار زندگی عطا کی تو موت دینے کے بعد دوبارہ زندگی دینے پر بھی قادر ہے۔

....

﴿هَلْ اَتٰـکَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ(۱۷) فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ(۱۸)
بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ تَکْذِیْبٍ(۱۹) وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ
مُّحِیْطٌ(۲۰) بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ(۲۱) فِیْ لَوْحٍ
مَّحْفُوْظٍ(۲۲)﴾

(اے پیغمبر ﷺ) کیا آپ کے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے (یعنی) فرعون اور ثمود (کے لشکروں کی اور اُن سرکشوں کا حشر کیا ہوا؟) مگر جن لوگوں نے کفر (کا راستہ اختیار) کیا ہے وہ (قرآن کو) جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے (یہ لوگ اس کے عذاب سے بچ کر کہاں جا سکتے ہیں؟) (اور یہ کتاب جو انہیں سنائی جا رہی ہے نہ جھوٹی من گھڑت ہے اور نہ شعر و شاعری) بلکہ یہ بڑی شان والا قرآن ہے اور لوح محفوظ میں (نقش) ہے۔

﴿هَلْ اَتٰـکَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ، فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ﴾

(اے پیغمبر) کیا آپ کے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے (یعنی) فرعون اور ثمود (کے لشکروں کی اور ان سرکشوں کا حشر کیا ہوا؟)۔

هَلْ کیا حرف استفہام، اَتٰـکَ (اَتٰی. کَ) پہنچی۔ آپ کے پاس اَتٰی فعل ماضی واحد مذکر غائب، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر (اَتٰی، یَاتِیْ، اِتْیَانٌ) آنا، پہنچنا، حَدِیْثُ بات (خبر)، الْجُنُوْدِ (لشکروں کی) اس کا مفرد جُنْدٌ ہے (لشکر)، فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ فرعون اور ثمود (کے لشکروں کی) (فرعون) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ملک مصر کا ظالم ترین حکمران تھا جس نے بنی اسرائیل پر انتہائی ظلم توڑے بالآخر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور اپنے لاؤلشکر سمیت دریائے قلزم میں غرق ہوا۔ ثمود سیدنا

صالح علیہ السلام کی قوم ہے جسے اپنی طاقت اورزور پر بڑا گھمنڈ تھا مگر نافرمانی اور کفر کی وجہ سے عذاب الٰہی کا شکار ہوگئی۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''(ان آیات میں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے اور صبر واستقامت کی تلقین کی جا رہی ہے کہ آپ کو فرعون اور قوم ثمود کے عناد اور ان کی سرکشی کی خبر دی جا چکی ہے اور ان کے پاس بھیجے گئے رسولوں کے صبر وضبط کی بات بھی بتائی جا چکی ہے کہ انہوں نے ہر تکلیف برداشت کی اور ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی، اس لیے آپ بھی صبر سے کام لیجیے اور میرا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہیے، اور یہ جان لیجیے کہ جو لوگ آپ کی تصدیق نہ کریں گے اور آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، ان کا انجام اسی فرعون اور قوم ثمود کی طرح ہلاکت و بربادی ہوگا۔'' (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ﴾

مگر جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ (قرآن کو) جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

بَلِ یوں نہیں بلکہ (ماقبل سے اعراض اور مابعد کے اثبات کے لیے آتا ہے) اَلَّذِيْنَ جو لوگ (کہ) اسم موصول، كَفَرُوْا (جنہوں نے کفر کیا) کافر ہوئے ماضی جمع مذکر غائب (كَفَرَ، يَكْفُرُ، كُفْرًا) انکار کرنا، کفر کرنا۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ''کفر یا کفران نعمت کے معنی نعمت کی ناشکری کر کے اسے چھپانے کے ہیں، اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا شریعت حقہ یا نبوت کا انکار ہے۔'' (مفردات القرآن) فِيْ تَكْذِيْبٍ جھٹلانے میں پڑے ہیں (كَذَّبَ، يُكَذِّبُ، تَكْذِيْبًا) جھٹلانا، یعنی وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ حق کو جھٹلاتے رہیں گے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یہ کفار نابکار، بجائے اس کے کہ ان واقعات وحکایات پر غور کرتے اور ان سے سبق لیتے، الٹے ان کی تردید و تکذیب ہی میں لگے ہوئے ہیں۔'' (تفسیر ماجدی)

﴿وَّ اللّٰهُ مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ مُّحِيۡطٌ﴾

اور اللہ تعالیٰ تو انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے (یہ لوگ اس کے عذاب سے بچ کر کہاں جاسکتے ہیں؟)

وَّ اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، و. اور عاطفہ، مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ ان کے آگے پیچھے سے (ہر طرف سے) (وَّرَآءِ.هِمۡ) آگے پیچھے۔ان کے، وراء اسم ظرف، هِمۡ ضمیر جمع مذکر غائب کفار اور منکرین حق کی طرف جاتی ہے، مُّحِيۡطٌ گھیرے ہوئے ہے، اسم فاعل (اَحَاطَ، يُحِيۡطُ، اِحَاطَةً) گھیرنا، احاطہ، چار دیواری اردو میں استعمال ہوتا ہے، اِس آیہ مبارکہ میں بتایا جارہا ہے کہ یہ سرکش کفار ہر لمحہ اور ہر لحظہ اس کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ جب چاہے انہیں دردناک عذاب دے سکتا ہے۔

﴿بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ، فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ﴾

بلکہ یہ بڑی شان والا قرآن ہے اور لوح محفوظ میں (نقش) ہے۔

بَلۡ یوں نہیں، بلکہ، هُوَ وہ، قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ قرآن ہے، عظمت والا (شان والا)۔فِىۡ لَوۡحٍ بیچ لوح (کے) مَّحۡفُوۡظٍ (جو) محفوظ ہے۔

احمد مصطفیٰ المراغی لکھتے ہیں:

"یعنی یہ عظیم کتاب جسے یہ کفار جھٹلا رہے ہیں، معزز اور پاکیزہ کتاب ہے اپنے اسلوب اور معنی میں منفرد ہے، ہر طرح کی تحریف سے محفوظ اور ہر طرح کے تغیر اور تبدیلی سے مأمون ہے۔"

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

"(ان آیات میں) مشرکین مکہ کی تردید کی گئی ہے جو قرآن کریم کو کبھی گزشتہ قوموں کے افسانے، کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اللہ تعالیٰ پر افترا پردازی، کبھی شاعری اور کبھی جادو کہتے تھے اور لوگوں کو اس پر ایمان لانے سے روکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قرآن وہ نہیں ہے جو تم اس کے بارے میں کہتے ہو، بلکہ یہ اللہ کی نازل کردہ ایک نہایت معظم و مکرم کتاب ہے جس کی مانند دنیا میں کوئی کتاب نہیں، اور وہ کتاب لوح محفوظ میں شیاطین اور دیگر خلائق کی دسترس سے محفوظ ہے۔" (تیسیر الرحمٰن، لبیان القرآن)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) دعوت حق کو وہی لوگ جھٹلاتے ہیں جو اپنی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں اور اپنے اغراض و مقاصد انہیں عزیز ہوتے ہیں، وہ ان پر کسی قسم کا حرف آنا پسند نہیں کرتے ہیں، یا پھر وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اپنی طاقت اور دولت پر گھمنڈ ہوتا ہے، وہ ان چیزوں کے نشے میں مست رہ کر کسی کو خاطر میں نہیں لاتے جیسے فرعون اور قوم ثمود تھی ...... طاقت اور دولت کا نشہ اکثر لوگوں کو راہِ حق سے دور لے جاتا ہے اور اس سے بڑھ کر وہ لوگوں پر ظلم وستم توڑتے ہیں، انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہیں جیسا کہ فرعون کا بنی اسرائیل سے رویہ رہا، اور عاد وثمود کی قومیں انبیاء کرام کی دعوت حق کو جھٹلاتی رہیں۔

۲) باغی اور سرکش افراد اور قوموں کو ایک خاص مدت تک ڈھیل دی جاتی ہے ان کی اصلاح کے لیے انہیں چھوٹے چھوٹے عذاب اور آزمائشوں میں مبتلا کیا جاتا ہے جیسا کہ فرعون کو بار بار سنبھلنے کا موقع دیا گیا، بالآخر جب سرکشی اور بغاوت حد سے بڑھ جاتی ہے تو ایسے لوگوں کو عذاب الٰہی آگھیرتا ہے، پھر انہیں اس عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا، صفحہ ہستی سے انہیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے اور تاریخ میں ان کو عبرت کے طور پر محفوظ کر دیا جاتا ہے جیسا کہ اِن آیات میں فرعون وثمود کا ذکر آیا ہے۔

۳) قرآن حکیم نسل انسانی کے لیے تا قیامت ہدایت اور رہنمائی کا مکمل اور جامع منشور ہے، یہ انسانی اور شیطانی دستبرد سے محفوظ ہے، عزت اور شان رکھتا ہے اور جو لوگ اس کی پاکیزہ تعلیمات پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں وہ نہ صرف اس دنیا میں سرخرو ہو جاتے ہیں بلکہ آخرت کی کامیابی سے بھی ہمکنار ہوتے ہیں۔

۴) آج مسلمانوں کی ذلت وخواری کا سبب قرآنی تعلیمات سے انحراف ہے اور قریباً تمام اہل دانش اس بات پر متفق ہیں مگر امت کو اس بیماری سے چھٹکارا دلانے کے لیے کوئی نتیجہ خیز کاوش دکھائی نہیں دیتی! کاش تمام اصلاحی جماعتوں کا مطمح نظر انسان کو اپنا ہمنوا بنانا نہ ہو بلکہ اللہ کا بندہ بنانا مطلوب ہو۔

..................o..................

سُوۡرَةُ الطَّارِق

یہ سورت مکی سورتوں میں سے ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پراس کا نزول اس وقت ہوا ہوئی جب قریش مکہ نے کھل کر دعوتِ اسلام کی مخالفت شروع کر دی تھی اور ان کی بھرپور کوشش یہی تھی کہ یہ دعوت کسی طرح بھی پھلنے پھولنے نہ پائے، وہ اس کے لیے ہر تدبیر کو بروئے کار لائے مگر اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کرنا چاہتا تھا اس لیے ان کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔

اس سورت کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ قیامت ضرور قائم ہوگی اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ ضرور مل کر رہے گا اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ انسان خود اپنی تخلیق اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات پر غور وفکر کر لے جب کوئی شخص توجہ اور دل کی گہرائی سے ان باتوں پر غور وفکر کرتا ہے تو لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ تمام بے کار اور عبث نہیں پیدا کیا گیا، کائنات کو دیکھ کر اہل حق کی زبانوں پر یہ کلمات جاری وساری ہو جاتے ہیں: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً (آل عمران:۱۹۱)''اے ہمارے رب، یہ سب کچھ تو نے بے مقصد نہیں بنایا۔''

پھر انسان اپنی پیدائش پر غور کرے کہ حقیر سے قطرہ سے رب کائنات نے اسے کتنا عظیم الشان انسان بنا کر کھڑا کر دیا ہے، پھر اسے ذہنی وفکری، علمی وعقلی صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمایا ہے اور اس کی ہدایت ورہنمائی کے لیے ہر قسم کا سروسامان بھی فراہم کر دیا ہے، ایک طرف اسے علم وعقل کی روشنی دی ہے تو دوسری طرف اس کی ہدایت کے لیے انبیا کرام کو بھیجا جن کی زندگیاں لوگوں کے لیے مشعل راہ بنتی رہی ہیں۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ، وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ، اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذّریات:۲۰-۲۱)''اور زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں، کیا تم عقل وبصیرت سے کام نہیں لیتے ہو؟

انسان کو اس حقیقت سے باخبر کیا گیا ہے کہ جس خالق ومالک نے یہ عظیم الشان کارخانہ بنایا اور سجایا ہے، اس کارخانے میں کوئی کام اس مالک حقیقی سے چھپا ہوا نہیں ہے، ہر وقت اور ہر لمحہ ہر انسان کے اعمال کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے جو اسے روزِ حساب پیش کر دیا جائے گا، اُس دن کوئی چیز چھپی نہ رہے گی۔

آیات:١٧ سُوۡرَۃُ الطَّارِق رکوع:١

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ(١) وَ مَآ اَدۡرٰکَ مَا الطَّارِقُ(٢) النَّجۡمُ الثَّاقِبُ(٣) اِنۡ کُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَیۡهَا حَافِظٌ(٤)﴾

قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا تارہ! کوئی جان ایسی نہیں ہے جس پر نگران مقرر نہ ہو۔

﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ، وَ مَآ اَدۡرٰکَ مَا الطَّارِقُ، النَّجۡمُ الثَّاقِبُ﴾

قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی، اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟ وہ چمکتا ہوا تارا (ہے)۔

وَالسَّمَآءِ قسم ہے آسمان کی، ''وَ'' قسمیہ ہے، السَّمَآءِ آسمان، وہ سقف نیلگوں جو بغیر ستونوں کے رب کائنات نے ہمارے سروں پر معلق کر دیا ہے اور اسے ان گنت ستاروں اور سیاروں سے سجا دیا ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وطاقت پر کہیں ارض وسما کو اور کہیں شمس وقمر اور لیل ونہار کو شاہد اور گواہ بنایا ہے، اس لیے کہ یہ چیزیں اپنی شکل وصورت میں نقل وحرکت میں، طلوع وغروب میں ہر روز انسانی مشاہدے میں آتی ہیں اور اپنے اندر عجائبات رکھتی ہیں اور ہر شخص کو دعوت فکر مہیا کرتی ہیں جو بھی غور وتدبر کرتا ہے وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان کا کوئی نہ کوئی خالق و مالک ہے جو تدبر اور تدبیر سے، نظم اور ضبط سے اس نظام کو چلا رہا ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے۔

وَالطَّارِقِ، اوررات کونمودار ہونے والے کی (**طَرَقَ، یَطْرُقُ، طُرُوْقًا**) رات کوستارے کانمودار ہونا،**النَّجمُ الطَّارِقُ**،رات کوطلوع ہونے والاستارہ (القاموس الوحید)

وَ مَآ اَدْرٰکَ اور تجھے کیا خبر (**دَرَی، یَدْرِی، دَرْیًا**) جاننا، واقفیت حاصل کرنا، اور (**اَدْرٰی، یُدْرِی**) باخبر کرنا،علم میں لانا **وَمَا (ادرا.ک)** اورتمہیں، کیاخبر؟ ماضی واحد مذکر غائب ک، ضمیر واحد مذکر حاضر،**النَّجْمُ الثَّاقِبُ** چمکتا ہوا تارہ (ہے)،**النّجمُ.** ستارہ،اس کی جمع **نجُومٌ** آتی ہے،**الثَّاقِبُ،** چمکتا ہوا (روشن) (**ثَقَبَ، یَثْقُبُ، ثَقَابَةً**) روشن ہونا،اردو میں شہاب ثاقب معروف ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''**طَارِقٌ** کے لغوی معنی تو شب میں آنے والے کے ہیں لیکن یہاں مراد شب میں نمودار ہونے والے ستارے ہیں اس کی وضاحت خود قرآن ہی نے''**النَّجْمُ الثّاقِبُ**''کے الفاظ سے کردی ہے،''**وَمَا اَدْرٰکَ**'' کا سوال اس شہادت کی عظمت واہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہے، مطلب یہ ہے کہ کوئی اس شہادت کو معمولی شہادت نہ گمان کرے، یہ بہت بڑی شہادت ہے بشرطیکہ غور کرنے والے اس پر غور کریں اور سمجھیں،اس کومذاق بنانے کی کوشش نہ کریں۔

''**النّجْمُ الثاقِبُ**'' سے کوئی خاص ستارہ مرادنہیں ہے بلکہ جس طرح''**وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ**'' (النحل:١٦)''اورتاروں سے بھی لوگ راہ یاب ہوتے ہیں'' اوربعض دوسری آیات میں یہ لفظ جنس کے مفہوم میں آیا ہے، اسی طرح یہاں بھی یہ جنس ہی کے مفہوم میں ہے، البتہ ''**ثَاقِبٌ**'' کی صفت سے یہ اشارہ فرمادیا ہے کہ اس سے مراد وہی ستارے ہیں جن کی روشنی ازخود ہم تک پہنچتی ہے اور جن کی جستجو کے لیے ہمیں ترقی یافتہ دوربینوں کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے بلکہ ہر دیکھنے والا ان کو دیکھ اور ان سے وہ سبق حاصل کرسکتا ہے جوقرآن یہاں دینا چاہتا ہے یہ امر یہاں واضح رہے کہ ستارے صرف اتنے ہی نہیں ہیں جتنے ہمیں نظر آتے ہیں یہ تو مشتے نمونہ ازخروارے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا کون جان سکتا ہے کہ کتنے جہان اور کتنے ستارے ہیں۔ع ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' (تدبرقرآن،جلد ہشتم)

﴿**اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ**﴾ <u>کوئی جان ایسی نہیں ہے جس پرنگران مقرر نہ ہو۔</u>

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ نہیں ہے کوئی جان، اِنْ نہیں، نافیہ، كُلُّ نَفْسٍ ہر جان، لَمَّا عَلَيْهَا مگر اس پر ہے، لَمَّا استثنافیہ کہلاتا ہے اور اِلَّا (مگر) کا معنی دیتا ہے، عَلَيْهَا (علی .ھا) اوپر۔اس کے، ھا کی ضمیر جان کی طرف جاتی ہے، حَافِظٌ، اسم فاعل، ایک حفاظت کرنے والا (ہے) (حَفِظَ، يَحْفَظُ، حِفْظًا) حفاظت کرنا، محفوظ کرنا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

حفاظت کرنے والے (نگران) سے مراد خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔جو زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی دیکھ بھال اور حفاظت کر رہی ہے جس کے وجود میں لانے سے ہر شے وجود میں آتی ہے، جس کے باقی رکھنے سے ہر شے باقی ہے، جس کے سنبھالنے سے ہر شے اپنی جگہ سنبھلی ہوئی ہے اور جس نے ہر چیز کو اس کی ضروریات بہم پہنچانے اور اسے ایک مدت مقررہ تک آفات سے بچانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔اس بات پر آسمان کی اور رات کی تاریکی میں نمودار ہونے والے ہر تارے اور سیارے کی قسم کھائی گئی ہے یہ قسم اس معنی میں ہے کہ رات کو آسمان میں یہ بے حد و حساب تارے اور سیارے جو چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان میں سے ہر ایک وجود اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی ہے، جس نے اسے بنایا ہے، روشن کیا ہے، فضا میں معلق رکھ چھوڑا ہے، اور اس طرح اس کی حفاظت و نگہبانی کر رہا ہے کہ وہ اپنے مقام سے گرتا ہے، نہ بے شمار تاروں کی گردش کے دوران میں وہ کسی سے ٹکراتا ہے اور نہ کوئی دوسرا تارا اس سے ٹکراتا ہے۔(تفہیم القرآن، ج:٦)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

١) کائنات کی ہر چیز رب کائنات کی عظمت و کبریائی پر گواہ اور شاہد ہے، ان آیات میں آسمان اور اس پر چمکتے ستاروں کو بطور شہادت کے پیش فرمایا ہے...... یہ آفتاب و ماہتاب اور ان کا وقت پر طلوع و غروب ہونا، یہ ان گنت چمکتے دمکتے ان گنت ستارے اور سیارے اور ان میں کمال کا نظم و ضبط کہ کبھی ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں ہیں خالق کائنات کی بے مثال کاریگری کا پتہ دیتے ہیں، یہ چیزیں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

۲) کائنات کا یہ مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات، اس کی حکمت اور اس کی قدرت کے بارے میں انسان کے اندر یقین اور معرفت پیدا کرنے کا بڑا ہی کامیاب ذریعہ ہے اور اس غور وفکر کے نتیجے میں انسان اس حقیقت کو تسلیم کرے گا کہ یہ سب کچھ بلا مقصد اور بے نتیجہ نہیں بنایا گیا ہے، قرآن حکیم نے جابجا اس حقیقت کو آشکار کیا ہے۔

۳) رب کریم نے اس کائنات میں انسان کو اشرف ترین مخلوق بنایا ہے اور اسے نہ صرف شکل وصورت میں بلکہ عقل وشعور میں سب سے برتر اور بہتر بنایا ہے اور وحی الٰہی کے ذریعے اس کی ہدایت اور رہنمائی کا مکمل سروسامان بھی کردیا ہے، اگر وہ اپنے خالق ومالک کی اطاعت کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اسے ابدی کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے۔ جبکہ نافرمانی پر سزا اور عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

۴) وہ خالق ومالک اس کے اعمال پر ہر وقت نگہبان ہے اور ہر شخص کی زندگی کا مکمل ریکارڈ تیار ہورہا ہے جو روز جزاوسزا اسے سنادیا جائے گا اور اسی پر جزاوسزا کا قانون نافذ ہوگا۔

....

﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ (٥) خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ (٦) يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ (٧) اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ (٨) يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (٩) فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ (١٠)﴾

پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پشت اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے، یقیناً وہ (خالق) اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے، (سو) جس روز (سب) راز فاش ہوجائیں گے تو انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا نہ کوئی اُس کی مدد کرنے والا ہوگا۔

﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾

پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟

فَلْيَنْظُرِ (فَ. لْ. يَنْظُرِ) پس، چاہیے، (کہ) دیکھے، ف، حرف عطف، لام امر، تاکیدی معنی دیتا ہے (نَظَرَ، يَنْظُرُ، نَظْرٌ) دیکھنا، يَنْظُرُ مضارع واحد مذکر غائب مجزوم، الْإِنْسَانُ انسان، بنی نوع انسان، مِمَّ (مِنْ. مَا) سے۔ کیا، یعنی (وہ) کس چیز سے، خُلِقَ پیدا کیا گیا ہے ماضی مجهول واحد مذکر غائب (خَلَقَ، يَخْلُقُ، خَلْقًا) پیدا کرنا، خالِقٌ، پیدا کرنے والا۔

﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ﴾ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا۔

خُلِقَ وہ پیدا کیا گیا ہے، ماضی مجہول واحد مذکر غائب، مِنْ مَّآءٍ پانی سے، مِنْ سے، حرف جر، اپنے بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے، مَاءٍ پانی، اسم، دَافِقٍ اچھلنے والا، اسم فاعل۔

﴿يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ﴾

جو (پانی) پشت اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔

يَّخْرُجُ (جو) نکلتا ہے (خَرَجَ، يَخْرُجُ، خُرُوجًا) نکلنا، مِنْۢ بَيْنِ درمیان میں سے، مِنْ سے، حرف جر، بَيْنَ درمیان، مجرور، الصُّلْبِ پشت (ریڑھ کی ہڈی) التَّرَآئِبِ پسلیاں اس کا مفرد تُرَبَةٌ ہے۔

ان آیات پر سید قطب شہیدؒ نے بڑی عمدہ گفتگو کی ہے، لکھتے ہیں:

''انسان سوچے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا اور کس مقام تک جا پہنچا، وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا ہوا ہے جو پشت اور پسلیوں کی ہڈیوں کے بیچ سے نکلتا ہے...... یہ بات کہ مادہ منویہ ان مقامات میں پیدا ہوتا ہے، یہ ایک مخفی راز تھا جسے صرف اللہ تعالیٰ جانتا تھا یہ بات انسان کے علم میں نہ تھی، یہاں تک کہ جب اس صدی کا نصف ہوا، تو یہ حقیقت جدید سائنس کے ذریعے انسان کے علم میں آئی کہ مرد کا مادہ منویہ، ریڑھ کی

ہڈیوں میں تشکیل پاتا ہے اور عورت کا اس کی پسلیوں کی بالائی ہڈیوں میں، پھر وہ ایک قرار مکین (محفوظ ٹھہراؤ کی جگہ) میں مل جاتے ہیں اور ان سے انسان کی پیدائش ہوتی ہے۔

انسان کے نقطہ آغاز اور اس کی پیدائش کے مابین کتنی عظیم وطویل مسافت ہے......اچھلتے پانی سے، جو پیٹھ اور سینہ کے بیچ سے نکلتا ہے، انسان کی تخلیق و تشکیل تک جو صاحب علم وادراک، دانشور اور انتہائی پیچیدہ عضوی، اعصابی، عقلی اور نفسیاتی ترکیب رکھنے والے جسم کا حامل ہے، کتنا طویل فاصلہ ہے یہ! یہ عظیم وپُر ہیبت مسافت، جسے یہ اچھلتا ہوا پانی عبور کر کے انسانِ ناطق، میں تبدیل ہو جاتا ہے، اِس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ انسان کی ذات سے باہر ایک ہاتھ ہے، جو اس سیال شے کو جس میں نہ کوئی استحکام ہے، نہ ارادہ، نہ قدرت، یہ طویل، حیرت ناک اور عظیم سفر طے کرا کے اس عجیب وغریب انتہا تک لے آتا ہے، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کا ایک محافظ ہے جو اس نطفہ، جو شکل، عقل، ارادہ، قدرت، ہر شے سے خالی ہے، کی اس طویل اور حیرت ناک سفر میں حفاظت ونگرانی کرتا ہے...... حقیقت یہ ہے کہ انسان کو پیدائش سے موت تک جو حیرت ناک واقعات پیش آتے ہیں نطفہ کے اس سفر میں اس سے کئی گناہ زیادہ عجائبات کا ظہور ہوتا ہے۔

یہ واحد خلیہ جو رحم مادر میں پڑتا ہے، خوردبین سے بھی بہت مشکل سے نظر آتا ہے......ایک بار کے انزال کے مادہ منویہ میں یہ خلیات کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں...... یہ ننھی منی سی مخلوق جس میں نہ کوئی استحکام ہوتا ہے، نہ عقل، نہ قدرت، نہ ارادہ، رحم مادر میں استقرار پاتے ہی غذا کی تلاش میں مصروف ہو جاتی ہے۔ دست قدرت جو اس کا محافظ ہے، اس میں کھانے کی بہت زیادہ خاصیت پیدا کر دیتا ہے اور رحم کی چار دیواری کو جو اس کے ارد گرد ہوتی ہے، سیال خون کے جو اس خلیہ کی تازہ غذا کے لیے تیار کیا گیا ہوتا ہے، ایک حوض میں تبدیل کر دیتا ہے، خلیہ کو جونہی اپنی غذا کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے وہ ایک نئے عمل کا آغاز کر دیتا ہے...... تقسیم در تقسیم کا مسلسل عمل، جس سے بے شمار خلیات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ انتہائی سادہ مخلوق، جس میں نہ کوئی استحکام ہے، نہ عقل، نہ قدرت، نہ ارادہ، جانتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کیا کرنا چاہتی ہے۔ دست قدرت جو اس کا محافظ ونگراں ہے، اُسے ہدایت، معرفت، قدرت اور ارادہ کا زادِ راہ عطا فرماتا ہے جس سے اُسے اپنے راستہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے،

یہ خلیہ اس بات کا بھی ذمہ دار ہے کہ اس کے ذریعے وجود میں آنے والے خلیات کے ہر گروپ کو عظیم انسانی جسم کے کسی ایک جز کے لیے مخصوص کر دے...... مثلاً خلیات کا ایک مجموعہ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تشکیل پائے، خلیات کا ایک اور مجموعہ اس طرح رواں دواں ہوتا ہے کہ عضلات کا نظام وجود میں آئے، ایک اور خلیات کا مجموعہ اس طرح اپنا سفر جاری رکھتا ہے تا کہ اعصاب کا نظام تخلیق میں آئے اور خلیات کا ایک اور مجموعہ اس طرح کام کرتا ہے کہ شریانوں کا نظام عمل میں آئے تا آنکہ انسانی جسم کے سارے ڈھانچے اور اس کے بنیادی اجزاء کی تعمیر ہو جائے...... لیکن یہ عمل اتنا سادہ نہیں ہے، اس عمل میں بہت سی دقیق اور باریک تخصیصات ہیں...... کوئی ہڈی، کسی دوسری ہڈی کے، کوئی عضلہ دوسرے عضلہ کے اور کوئی پٹھا دوسرے پٹھے کے مشابہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسے جسم کی تعمیر ہے جس کی صفت میں بہت زیادہ باریک بینی ہے، جس کی تخلیق حیرت انگیز ہے اور جسے مختلف نوعیت کے بہت سے کام انجام دینے ہیں۔ خلیات کا ہر مجموعہ جو انسانی جسم کے کسی حصہ کی تعمیر میں لگا ہے جانتا ہے کہ وہ کس طرح مختلف خصوصیات رکھنے والے اعضا میں بٹ جائے جن میں سے ہر ایک اُس بڑی تعمیر کے کسی ایک مخصوص جز میں ایک متعین عمل کا ذمہ دار ہوگا...... ہر چھوٹا سا خلیہ جب سفر شروع کرتا ہے تو جانتا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اسے کیا شے مطلوب ہے؟ ان میں سے کوئی اس عظیم بھٹکا دینے والی وادی میں اپنے راستے سے نہیں بھٹکتا مثلاً جن خلیات کے ذمہ آنکھ بنانے کا کام ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آنکھ کو پیٹ، پیر یا ہاتھ میں نہیں، صرف چہرے میں ہونا چاہیے، حالانکہ ان میں سے کسی بھی مقام پر آنکھ بن سکتی ہے، اگر پہلا خلیہ جس کے ذمہ آنکھ بنانا ہے اُن میں سے کسی بھی مقام پر آنکھ بنانے کا عمل شروع کر دے تو وہاں آنکھ بن سکتی ہے لیکن یہ خلیہ جب اپنا سفر شروع کرتا ہے تو وہ بذات خود اُس مخصوص مقام پر پہنچتا ہے جو اس پیچیدہ انسانی جسم میں آنکھ کے لیے متعین ہے، کیا خیال ہے تمہارا؟ اس خلیہ سے کس نے کہا کہ انسانی جسم اس خاص مقام پر آنکھ کا محتاج ہے، کسی اور مقام پر نہیں بلا شبہ وہ اللہ ہی کی ذات ہے، وہی بلند و برتر محافظ ہے۔ وہی ان خلیات کا محافظ ہے، وہی انہیں اس پر پیچ اور خطرناک وادی میں راستہ دکھاتا ہے جہاں اللہ کے سوا اور کوئی راستہ دکھا بھی نہیں سکتا۔

یہ خلیات، فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی اس فریم ورک کے اندر رہ کر کام کرتے ہیں جو ان کے

لیےان متعین عناصر نے جوان کے اندر پوشیدہ ہیں، متعین کر دیا ہے...... یہ وراثت کے عناصر ہیں جو ایک مخصوص نوع کی خصوصیات اور بننے والے انسان کے آباء واجداد کی خصوصیات کی تشکیل و تخلیق کے محافظ ہیں......مثلاً آنکھ کا خلیہ، جو تقسیم در تقسیم کے عمل کے نتیجے میں بہت سے خلیات میں تبدیل ہو کر آنکھ بنانے کا کام انجام دیتا ہے، اُس بات کا پورا خیال رکھتا ہے کہ آنکھ ایک مخصوص شکل بنائے، جس کی کچھ متعین خصوصیات ہوں تا کہ وہ انسان کی آنکھ بنے اور کسی جانور کی آنکھ نہ بنے اور انسانی آنکھ بھی اس ٹائپ کی جو اُس کے آباء واجداد کی ہے، جس کی شکل اور جس کی خصوصیات متعین ہیں، آنکھ کی تشکیل میں شکل یا خصوصیات کے پہلو سے معمولی سے انحراف سے آنکھ اُس متعین خط سے ہٹ سکتی ہے جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے تو کون ہے وہ ہستی جس نے اس میں یہ قدرت ودیعت کی؟ کس نے اس خلیہ کو یہ تعلیم دی؟ اس سادہ سے خلیہ کو جس کے پاس نہ عقل ہے، نہ علم، نہ ارادہ، نہ طاقت، یقیناً وہ اللہ ہی ہے اس نے خلیہ کو یہ عجیب وغریب تعلیم دی، تمام انسان اگر انہیں آنکھ یا اس کے کسی جزو کی تخلیق کا کام سونپا جائے، اُس کی تشکیل و تخلیق سے عاجز و درماندہ رہیں گے جبکہ تعلیم ربانی کے تحت ایک خلیہ یا چیز سادہ سے خلیات اس عظیم اور پر پیچ کام کو کر ڈالتے ہیں......اچھلتے پانی سے انسان ناطق بننے تک اس طویل اور حیرت انگیز سفر کی بے شمار صورتوں اور خصوصیتوں میں سے چند کی طرف یہ مختصر سے اشارات ہیں جو بہت جلدی میں کر دیے گئے ہیں، اِن کے ماورا مختلف اعضا اور مختلف نظاموں کی خصوصیات کی تشکیل و تخلیق کے سلسلے میں عجائب و غرائب کا بے انتہا لشکر ہے جس کا احاطہ اس تفسیر میں ممکن نہیں ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿اِنَّهٗ عَلٰى رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ﴾ یقیناً وہ (خالق) اسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔

اِنَّهٗ (اِنَّ. هٗ) یقیناً۔ وہ ''هٗ'' کی ضمیر رب کائنات کی طرف جاتی ہے، ضمیر واحد مذکر غائب، عَلٰى رَجۡعِهٖ اوپر، دوبارہ پیدا کرنے (کے) اس کے، یہاں پر ''هٖ'' کی ضمیر انسان کی طرف جاتی ہے (رَجَعَ، يَرۡجِعُ، رَجۡعًا) واپس لانا، لوٹانا، لَقَادِرٌ (لَ. قَادِرٌ) ضرور بضرور۔ قادر ہے، ہر طرح سے قدرت اور طاقت رکھتا ہے، لام تاکیدی معنی دیتا ہے، جو خالق و مالک انسان کو نیست سے ہست میں لایا وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے پر یقیناً قدرت رکھتا ہے، اس کا تو صرف حکم ہوتا ہے اور وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔

﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ﴾ (سو) جس روز (سب) راز فاش ہوجائیں گے۔

يَوْمَ جس روز (قیامت کے دن) ظرف زمان، تُبْلَى آزمائی جائیں گی، فعل مضارع مجہول واحد مؤنث غائب (بلٰی يَبْلٰی، بَلَاءً) آزمانا، بلا مصیبت ابتلا و آزمائش اردو میں استعمال ہوتا ہے، السَّرَآئِرُ، پوشیدہ باتیں اس کا مفرد سَرِيْرَةٌ ہے، جس دن کہ پوشیدہ باتیں آزمائی جائیں گی یعنی انسانوں کے پوشیدہ راز فاش ہوجائیں گے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

"یعنی ایسا دن کہ دلوں کا امتحان ہوگا اور ان کی پوشیدہ باتیں کھول دی جائیں گی، یہاں تک کہ عقائد اور نیتوں کو آشکارا کیا جائے گا اور کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دیا جائے گا۔" (صفوۃ التفاسیر)

﴿فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ﴾

تو انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا، نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا۔

فَمَا (ف. مَا) پس۔ نہ ہوگی، لَهُ (لَ. هُ) واسطے اس کے، مِنْ قُوَّةٍ کوئی قوت، وَلَا اور نہ کوئی، نَاصِرٍ مددگار۔ یعنی انسان بے بس اور بے سہارا رہ جائے گا۔ انسان کو یا تو اپنی طاقت اور قوت پر گھمنڈ ہوتا ہے یا پھر اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ فلاں فلاں لوگ میری مدد کو پہنچیں گے، لیکن میدان حشر میں یہ دونوں باتیں سلب ہوجائیں گی۔

آیات مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

١) قرآن حکیم نے ان حقائق کو لیا ہے جو ہر عقلمند انسان اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکتا ہے اور وہ غور و فکر کرے تو خالق کائنات کی قدرت و طاقت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی بے بسی اور بے کسی کا بھی اندازہ ہوتا رہتا ہے، یہ انسان جب تکبر و غرور کا شکار ہوتا ہے تو آپے سے باہر ہوجاتا ہے۔ لوگوں پر ظلم و ستم ڈھاتا ہے، لیکن اس کی عجز و درماندگی کا حال یہ ہے کہ آنکھ میں

چھوٹا سا ذرہ پڑ جائے تو کسی کروٹ چین نہیں آتا، بخار آ جائے تو نڈھال ہو جاتا ہے۔

۲) عقلمندی کا تقاضا ہے کہ انسان خالق کائنات کی عظمت وجلال کو تسلیم کرے اور اس کا مطیع وفرمانبردار بندہ بن جائے۔ وہ کچھ نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے اچھلتے ہوئے پانی سے اسے جیتا جاگتا، صحت مند اور عقلمند انسان بنا دیا، جس نے اسے پہلی بار بنایا وہ دوبارہ بھی اسے بنانے پر قادر ہے۔

....

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۱۱) وَ الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۱۲) اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (۱۳) وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۱۴) اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا (۱۵) وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا (۱۶) فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۱۷)﴾

قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی اور (بیج کے پھوٹتے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی کہ یہ (قرآن) قطعی اور فیصلہ کن بات ہے، ہنسی مذاق نہیں ہے، یہ (کفار مکہ) سازش کرنے میں لگے ہیں اور میں بھی تدبیر کر رہا ہوں، پس چھوڑ دو (اے نبی ﷺ) اِن کفار کو اک ذرا کی ذرا ان کے حال پر چھوڑ دو۔

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾ قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی۔

وَ (قسمیہ) السَّمَآءِ آسمان، ذَاتِ الرَّجْعِ، بارش برسانے والے کی۔ ''الرَّجْعِ'' کی تشبیہ بارش کی طرف ہے کہ وہ بار بار زمین کی طرف لوٹتی ہے (اور اسے سرسبز وشاداب بناتی ہے)۔ (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَ الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ﴾ اور (بیج کے پھوٹتے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی۔

وَ قسمیہ، الْاَرْضِ زمین، ذَاتِ الصَّدْعِ پھٹنے والی کی، ذَات کے معنی والی صَدْعٌ کے معنی پھٹنے کے ہیں (صَدَعَ، یَصْدَعُ) پھٹنا، شق ہونا۔ یعنی جب بارش ہوتی ہے تو زمین کے مسامات کھل جاتے ہیں اور وہ پانی جذب کر کے پھول جاتی ہے اور دیکھتے دیکھتے لہلہا اٹھتی ہے، اگرچہ یہاں لہلہا اٹھنے کا ذکر لفظوں میں نہیں ہے لیکن قرینہ اس پر دلیل ہے۔ (تدبر قرآن)

موانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے سامنے یہ حقیقت بالکل واشگاف طور پر موجود تھی کہ بخارات سمندر سے اٹھتے ہیں اور اس کے بعد یہی بخارات ابر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر یہی برستے ہیں، اس لیے اس کو ''ذَاتِ الرَّجْعِ'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ایسے ابر جو اِس امانت کو جو انہوں نے سمندروں سے لی ہے، پھر سمندر کو لوٹا دیتے ہیں۔

زمین کو بھی تمثیل میں پیش کیا ہے، جس میں سبزیاں نکلتی ہیں اور وہ پھٹ جاتی ہے، وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح ابر برستا ہے اور کھیت لہلہا اٹھتے ہیں اور جس طرح زمین بوقلموں (طرح طرح کی) سبزیوں کو اُگلتی ہے، اِسی طرح قرآن فیضان الٰہی ہے اور اس سے دلوں کے کھیت شگفتہ و شاداب ہو جاتے ہیں اور جس طرح بوقلموں سبزیاں زمین سے پھوٹتی ہیں اور انسان ان سے استفادہ کرتا ہے، اسی طرح یہ حق و صداقت کی کونپلیں جن کو قرآن کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، قلب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے پھوٹتی ہیں۔ (تفسیر سراج البیان، ج:۵)

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ﴾ یقیناً یہ (قرآن) قطعی اور فیصلہ کن بات ہے۔

اِنَّهٗ (اِنَّ. هٗ) یقیناً۔ یہ ہے، اِنّ کلام میں زور پیدا کرتا ہے، هٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب، قرآن کی طرف جاتی ہے، لَقَوْلٌ (لَ. قَوْلٌ) یقیناً۔ قول ہے لامِ تاکیدی معنی دیتا ہے، گویا اس جملے میں اِنّ اور لام تاکید نے قرآن حکیم کے قول فیصل ہونے میں کسی شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہنے دی۔

یقیناً یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے۔ (زبدۃ التفسیر من فتح القدیر امام شوکانی)

﴿وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾ اور وہ ہنسی مذاق نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ اور نہیں ہے وہ، هُوَ کی ضمیر واحد مذکر غائب، قرآن حکیم کی طرف جاتی ہے، بِالْهَزْلِ (بِ. الْهَزْلِ) ہنسی، مذاق، (نہیں ہے) اور قرآن حکیم نے جن حقائق و معارف کو بیان کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہیں اور منکرین حق جن باتوں کو جھٹلاتے ہیں عنقریب انہیں اس کا پتہ چل جائے گا۔

فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَـٰٓؤُا مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُ وْنَ (الانعام:۵) جس چیز کا وہ اب تک مذاق اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلق کچھ خبریں انہیں پہنچیں گی۔

﴿إِنَّهُمْ يَكِيدُوْنَ كَيْدًا، وَّ أَكِيدُ كَيْدًا﴾

یہ (کفار مکہ) سازش کرنے میں لگے ہیں، اور میں بھی تدبیر کر رہا ہوں۔

إِنَّهُمْ یقیناً وہ، يَكِيدُوْنَ سازش کرتے ہیں، چالیں چلتے ہیں، جمع مذکر غائب كَادَ، يَكِيدُ، كَيْدًا، دھوکہ دینا، چال چلنا، مکر کرنا، نقصان کا ارادہ کرنا، الْكَيْدُ، ایذا رسانی کا خفیہ ارادہ، خفیہ تدبیر، فریب، دھوکہ، چال، مکر، جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہو تو مراد ہوگا مخلوق کے اعمال پر، برحق جزا کی تدبیر، وَّ أَكِيدُ اور میں تدبیر کرتا ہوں فعل مضارع واحد متکلم۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

"اُن (کفار) کی سازشوں کا بدلہ دیتا ہوں کہ انہیں ڈھیل دے کر عبرتناک سزا دیتا ہوں اور اس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (الاعراف:۱۸۲) وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقے سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی۔ (القاموس الوحید)

﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا﴾

پس چھوڑ دو (اے نبی ﷺ) ان کفار کو اک ذرا کی ذرا ان کے حال پر چھوڑ دو۔

فَمَهِّلِ، (فَ. مَهِّلِ) پس، چھوڑ دو (ڈھیل دو) مَهَلَ، يَمْهَلُ، مَهْلًا، کوئی کام اطمینان سے کرنا،

جلدی نہ کرنا، اَمْهَلَهُ اطمینان سے کام کرنے دینا، جلدی کرنے پر مجبور نہ کرنا، نرمی برتنا، کسی کام کی مہلت دینا، ڈھیل دینا، عربی میں کہتے ہیں مَهْلًا ذرا ٹھہرو، جلدی نہ کرو۔ (القاموس الوحید)

الْكٰفِرِيْنَ، (کفار) حالت نصبی 'ون'، 'ی ن' میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اَمْهِلْهُمْ (اَمْهِلْ. هُمْ) میں بھی ڈھیل دیتا ہوں، انہیں، هُمْ کی ضمیر کفار کی طرف جاتی ہے، رُوَيْدًا تھوڑی سی، اگر حیات دنیا کی پوری مدت بھی اس میں لگ جائے (اور یہ کفار اپنی سازشوں میں مصروف رہیں) تب بھی وہ تھوڑی ہی مدت ہے، آخرت کی ابدالآباد مدت کے مقابلہ میں جس کی انتہا کا کسی کو علم نہیں، دنیوی زندگی کی مدت کی حقیقت کیا ہے! (فی ظلال القرآن)

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے بارے میں فرمایا جو قرآن کریم کی تکذیب کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے خلاف سازشیں کرتے تھے، کہ یہ لوگ اللہ کے دین کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور پھونکوں سے اس کے چراغ کو بجھانا چاہتے ہیں تو وہ جان لیں کہ اللہ بھی ان کے خلاف تدبیر کر رہا ہے اور انہیں جہنم تک پہنچانے کے لیے ان کی رسی کو ڈھیل دی ہے تا کہ کفر و معصیت میں آخری حدوں کو پہنچ جائیں، اس لیے اے میرے نبی ﷺ! آپ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے اور ان کے عذاب کے لیے جلدی نہ کیجیے، انہیں تھوڑی سی مہلت دیجیے بالآخر اپنے انجام بد کو پہنچ کر رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے سورۃ المجادلہ آیت:۲۱ میں فرمایا ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ''اللہ لکھ چکا ہے کہ میں اور میرے پیغامبر یقیناً غالب ہوں گے، یقیناً اللہ قوت والا، زبردست ہے۔'' چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا اور چند ہی سال کے اندر مکہ سے کفر و شرک کا خاتمہ ہو گیا، تمام بتوں کو وہاں سے نکال پھینکا گیا اور وہاں صرف ایک اللہ کی بندگی کی جانے لگی۔ (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسان کو اپنی حیاتِ مستعار کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہونا پڑے گا، آخرت کی اس جوابدہی

کے تصور کو زندہ کرنے کے بعد اس سورۃ مبارکہ میں انسان کو کائنات اور اس کے انتظام پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، کھیتیاں خشک پڑی ہوتی ہیں، اچانک فضا میں بادل نمودار ہوتے ہیں، بارش ہونے لگتی ہے، کھیت لہلہانے لگتے ہیں، پھل، پھول تروتازہ ہو جاتے ہیں، یہ اللہ ہی ہے جس نے انسان کی زندگی برقرار رکھنے کے لیے بارش اور زمین کی اگانے کی صلاحیت کے ذریعہ اس کے تمام سامان زندگی کا انتظام فرمایا۔

۲) جس رب کائنات نے انسان کو ان گنت مادی نعمتوں سے نوازا ہے، اس کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ انسان کی روحانی واخلاقی بالیدگی کا بھی سروسامان فراہم کرے چنانچہ سورہ کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ اس قرآن کو محض ہنسی مذاق نہ سمجھو، یہ تو تمہاری زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کی ابدی بارش ہے اور اس کی روشن ہدایات پر عمل کرنے سے تمھیں حیات جاوداں مل سکتی ہے۔

۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو تسلی اور تشفی دی جا رہی ہے کہ پیغام حق صبر و عزیمت سے دیتے رہیں اور منکرین حق کی شرارتوں اور ریشہ دوانیوں سے مشتعل نہ ہوں اللہ تعالیٰ انہیں عنقریب سزا دے گا۔

۴) آج بھی امت مسلمہ قرآن حکیم کی زریں تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائے اور اتفاق واتحاد کی راہ اختیار کر کے اللہ کی رسی (قرآن حکیم) کو مضبوطی سے تھام لے تو یہی غالب اور دنیا کی سپر پاور ہو گی۔ ان شاء اللہ!

..................o..................

سُوْرَۃُ الاعلیٰ

یہ مکی دور کے ابتدائی زمانہ کی سورۃ ہے، اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق و مالک ہے، اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی قابلیتوں کا اندازہ لگایا، پھر جہاں تک اسے پہنچنا تھا، وہاں تک اس کی رسائی اور رہبری فرمائی، جانوروں اور چوپایوں کے لیے چارہ اور گھاس پیدا کی تو انسانوں کے لیے پھل پھول اور طرح طرح کے اناج اگائے اور اسے خشک اور محفوظ کرنے کے طور طریقے بھی سکھلا دیے۔ پھر انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے سے اس کی روحانی بالیدگی کا سروسامان بھی کر دیا اور ان کی ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام کو روشن ہدایات کے ساتھ بھیجا جن کی پاکیزہ زندگیاں لوگوں کے لیے مشعل راہ بنتی رہیں، خاتم الانبیا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نسلِ انسانیت کے لیے ہادی و رہنما بنا کر مبعوث فرمایا اور ان پر قرآن ایسی عظیم کتاب نازل فرمائی اور جس بزرگ و برتر نے یہ کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی وہی اس کے ضبط و حفظ کی توفیق بھی عطا فرمائے گا اور اس سے وہی لوگ فیض یاب ہوں گے جو پوری توجہ سے اسے سنیں گے اور یہ وہ ہیں جن کے دلوں میں رب کریم کا خوف سمایا ہوگا اور وہ بدقسمت جو غور و فکر نہیں کرتے اس سے محروم رہیں گے۔

آیات:۱۹ **سُورَةُ الاعلیٰ** رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی(۱) الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی(۲) وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی(۳) وَالَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی(۴) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی(۵)﴾

(اے نبی ﷺ) آپ اپنے ارفع و اعلیٰ رب کے نام کی تسبیح کرتے رہیں، جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا اور مناسب اور معقول بنایا، جس نے ہر (چیز کی) تقدیر بنائی پھر (اسے) راہ دکھائی، جس نے سرسبز و شاداب گھاس اور (نباتات) کو پیدا کیا پھر اسے خشک اور سیاہ بنا دیا۔

﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی﴾

(اے نبیؐ) آپ اپنے ارفع و اعلیٰ رب کے نام کی تسبیح کرتے رہیے۔

سَبِّحِ تسبیح کیجیے، (سَبَّحَ، یُسَبِّحُ، تَسۡبِیۡحٌ) اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا، بڑائی اور عظمت کا اظہار کرنا، سبحان اللہ کہنا، قرآن حکیم میں ہے:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ. ''آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کر رہی ہے۔'' السُّبُوۡحُ ہر برائی سے پاک۔ سُبۡحَانَ اللّٰهِ، کلمہ تنزیہہ، اللہ تعالیٰ ہر عیب اور برائی سے پاک ہے۔ (القاموس الوحید)

اسۡمَ نام، رَبِّکَ (رَبِّ. کَ) رب، اپنے، رَبُّ اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں سے ہے جو ہر چیز

کا پالنہار ہے اور اسے حدکمال تک پہنچاتا ہے، پھر اس کی ہر وقت نگہبانی فرماتا ہے،''**ک** ''ضمیر مخاطب کے لیے ہے، **اَلۡاَعۡلٰی** بلند تر، بلند مرتبہ، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''لفظ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں سے پاک اور برتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ شان کے منافی ہیں، اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور ہی تمام علم و معرفت اور تمام قوت و اعتماد کا سرچشمہ ہے، اگر اس میں کوئی خلل پیدا ہوجائے تو انسان صحیح معرفت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ اس کا دل ایمان و توکل کی نعمت، طمانیت و شرح صدر کے نور اور عزیمت و استقامت کی قوت سے محروم ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی یاد ہی ہے جو دل کو ثابت اور روح کو مطمئن رکھتی ہے۔''**اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ** (الرعد:۲۸)''یادرکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

تسبیح کی سب سے اعلیٰ اور معیاری شکل تو نماز، بالخصوص شب کی نماز ہے، لیکن جس طرح سانس انسان کی مادی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کی روحانی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے اس وجہ سے صرف نمازوں کے اوقات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو آباد رکھنا چاہیے تاکہ شیطان کو اس پر غلبہ پانے کا موقع نہ ملے۔ (تدبر قرآن، جلد: ہشتم)

﴿**الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی**﴾ جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا اور نہایت درست بنایا۔

الَّذِیۡ (وہ) جس نے، اسم موصول، **خَلَقَ** پیدا کیا، ماضی واحد مذکر غائب (**خَلَقَ، یَخۡلُقُ خَلۡقٌ**) پیدا کرنا، عدم سے وجود میں لانا، **اَلۡخَالِقُ**، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام، پیدا کرنے والا، موجد، کسی سابق نمونہ کے بغیر کوئی چیز ایجاد کرنے والا، **فَسَوّٰی** (ف. سَوّٰی) پھر اسے درست کیا (**سَوّٰی، یُسَوِّی، تَسۡوِیَةٌ**) ٹھیک کرنا، سیدھا اور درست کرنا، مناسب و معتدل بنانا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں: جس نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا تو ان کی نوک پلک بہترین بنائی

اور بغیر نمونے کے ان میں اس کی کاریگری ہویدا ہے...... بہترین شکل وصورت اور عمدہ ترین حالت و کیفیت۔(صفوۃ التفاسیر)

﴿وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ جس نے ہر (چیز کی) تقدیر بنائی پھر (اسے) راہ دکھائی۔

وَ عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، الَّذِیْ جس نے، اسم موصول، قَدَّرَ تقدیر بنائی، (قَدَّر، یُقَدِّرُ، تَقْدِیْر) مقدر کرنا، فیصلہ کرنا، فَهَدٰی (ف.هَدٰی) پس ہدایت دی، راہ دکھائی، (هَدٰی، یَهْدِی، هُدًی وَ هِدَایَةً) راہ بتانا، رہنمائی کرنا۔

''قدَّر'' اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر بنائی، سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

یعنی ہر چیز کے پیدا کرنے سے پہلے یہ طے کر دیا کہ اسے دنیا میں کیا کام کرنا ہے اور اُس کام کے لیے اس کی مقدار کیا ہو، اُس کی شکل کیا ہو، اُس کی صفات کیا ہوں، اس کا مقام کس جگہ ہو، اس کے لیے بقاء اور قیام اور فعل کے لیے کیا مواقع اور ذرائع فراہم کیے جائیں، کس وقت وہ وجود میں آئے، کب تک اپنے حصے کا کام کرے اور کب کس طرح ختم ہو جائے، اس پوری اسکیم کا مجموعی نام اس کی ''تقدیر'' ہے، اور یہ تقدیر اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کے لیے اور مجموعی طور پر پوری کائنات کے لیے بنائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تخلیق کسی پیشگی منصوبے کے بغیر کچھ یونہی الل ٹپ نہیں ہوگئی ہے، بلکہ اس کے لیے پورا منصوبہ خالق کے پیش نظر تھا اور سب کچھ اس منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے۔

''فهدیٰ'' پس اس نے ہر چیز کو ہدایت اور راہ دکھائی، اس پر سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

یعنی کسی چیز کو بھی محض پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا، بلکہ جو چیز بھی جس کام کے لیے پیدا کی۔ اسے اس کام کے انجام دینے کا طریقہ بتایا با لفاظِ دیگر وہ محض خالق ہی نہیں ہے، ھادی بھی ہے، اس نے یہ ذمہ لیا ہے کہ جو چیز جس حیثیت میں اس نے پیدا کی ہے، اس کو ویسی ہی ہدایت دے جس کے وہ لائق ہے اور اسی طریقہ سے ہدایت دے جو اس کے لیے موزوں ہے، ایک قسم کی ہدایت زمین اور چاند اور سورج اور تاروں اور سیاروں کے لیے ہے جس پر وہ سب چل رہے ہیں اور اپنے حصے کا کام انجام دے رہے ہیں، ایک اور قسم کی ہدایت پانی اور ہوا اور روشنی اور جمادات و معدنیات کے لیے ہے جس کے مطابق وہ ٹھیک

ٹھیک وہی خدمات بجالا رہے ہیں جن کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے، ایک اور قسم کی ہدایت نباتات کے لیے ہے جس کی پیروی میں وہ زمین کے اندر اپنی جڑیں نکالتے اور پھیلاتے ہیں، اس کی تہوں سے پھوٹ کر نکلتے ہیں جہاں جہاں اللہ نے ان کے لیے غذا پیدا کی ہے، وہاں سے اس کو حاصل کرتے ہیں...... تنے، شاخیں، پتیاں، پھل پھول لاتے ہیں اور وہ کام پورا کرتے ہیں جو ان میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے، ایک اور قسم کی ہدایت خشکی، تری اور ہوا کے حیوانات کی بے شمار انواع اور ان کے ہر فرد کے لیے ہے جس کے حیرت انگیز مظاہر جانوروں کی زندگی اور ان کے کاموں میں علانیہ نظر آتے ہیں حتی کہ ایک دہریہ بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مختلف قسم کے جانوروں کو کوئی ایسا الہامی علم حاصل ہے جو انسان کو اپنے حواس تو درکنار، اپنے آلات کے ذریعہ سے بھی حاصل نہیں ہوتا...... پھر ہر انسان کے لیے دو الگ الگ نوعیّتوں کی ہدایتیں ہیں جو اس کی دو الگ الگ حیثیتوں سے مطابقت رکھتی ہیں، ایک وہ ہدایت جو اس کی حیوانی زندگی کے لیے ہے جس کی بدولت ہر بچہ پیدا ہوتے ہی دودھ پینا سیکھ لیتا ہے، جس کے مطابق انسان کی آنکھ، ناک، کان، دل، دماغ، پھیپھڑے، گردے، جگر، معدہ، آنتیں، اعصاب، رگیں اور شریانیں سب اپنا اپنا کام کیے جا رہے ہیں بغیر اس کے کہ انسان کو اس کا شعور ہو یا اس کے ارادے کا ان اعضا کے کاموں میں کوئی دخل ہو، یہی ہدایت ہے جس کے تحت انسان کے اندر بچپن، بلوغ، جوانی، کہولت اور بڑھاپے کے وہ سب جسمانی اور ذہنی تغیرات ہوتے چلے جاتے ہیں جو اس کے ارادے اور مرضی، بلکہ شعور کے بھی محتاج نہیں ہیں دوسری ہدایت انسان کی عقلی اور شعوری زندگی کے لیے ہے جس کی نوعیت غیر شعوری زندگی کی ہدایت سے قطعاً مختلف ہے، کیونکہ اس شعبۂ حیات میں انسان کی طرف ایک قسم کا اختیار منتقل کیا گیا ہے جس کے لیے ہدایت کا وہ طریقہ موزوں نہیں ہے جو بے اختیارانہ زندگی کے لیے موزوں ہے، انسان اس آخری قسم کی ہدایت سے منہ موڑنے کے لیے خواہ کتنی ہی حجت بازیاں کرے، لیکن یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے کہ جس خالق نے اس ساری کائنات میں ہر چیز کے لیے اس کی ساخت اور حیثیت کے مطابق ہدایات کا انتظام کیا ہے، اس نے انسان کے لیے یہ تقدیر تو بنا دی ہوگی کہ وہ اس دنیا میں اپنے اختیار سے تصرفات کرے مگر اس کو یہ بتانے کا کوئی انتظام نہ کیا ہوگا کہ اس کے اختیار کے استعمال کی صحیح صورت کیا ہے اور غلط صورت کیا۔ (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَالَّذِیٓ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی﴾

جس نے سرسبز وشاداب گھاس اور (نباتات) کو پیدا کیا۔

وَ عاطفہ سلسلہ کلام کے لیے، الَّذِیۡ جس نے، اسم موصول، اَخۡرَجَ نکالا (اَخۡرَجَ، یُخۡرِجُ، اِخۡرَاجٌ) نکالنا، باب افعال ہے، الۡمَرۡعٰی، چارہ، (رَعٰی، یَرۡعٰی، رَعۡیًا) جانور کا چرانا، چرنا، الۡمَرۡعٰی، چراگاہ، جانوروں کے لیے گھاس پھوس اور انسان کے لیے پھل پھول، ساگ پات۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اصل میں لفظ مَرۡعٰی استعمال ہوا ہے جو جانوروں کے چارے کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن سیاق عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں صرف چارہ مراد نہیں ہے، بلکہ ہر قسم کی نباتات مراد ہیں جو زمین سے اگتی ہیں۔ (تفہیم القرآن)

﴿فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی﴾ پھر اسے خشک اور سیاہ بنا دیا۔

فَجَعَلَهٗ (فَ. جَعَلَ. هٗ) پس، بنایا، هٗ اسے فَ عاطفہ، جَعَلَ، اس نے بنایا، واحد مذکر غائب هٗ ضمیر واحد مذکر غائب، المرعٰی کی طرف جاتی ہے۔ اَحۡوٰی، حَوَّةٌ سے ماخوذ ہے، سیاہ بھوسہ جسے ہوائیں اڑا کر لے جائیں۔ ''اسود هشيماً تذروه الرياح'' (تفسیر القرآن لکلام الرحمٰن مولانا ثناء اللہ امرتسری)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اے انسانو! اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس بیان کرو کہ کائنات کا ہر پتہ اور ہر ذرہ اس کی حمد وثنا میں مصروف ہے۔ (دیکھیے الاسراء آیت: ۴۴)

۲) وہ ایسا خالق ومالک ہے جس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا، پھر اسے راہ پر لگا دیا (دیکھیے: سورہ طٰہٰ آیت: ۵۰)

۳) اس نے تمھیں ان گنت نعمتوں سے نوازا ہے، اگر تم اس پر غور وفکر کرو تو لامحالہ اس کے شکر گزار بن جاؤ۔

۴) جس طرح سرسبز وشاداب چارہ اور پھل پھول خشک اور سیاہ ہو جاتے ہیں اور جنہیں ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور سیلاب خس وخاشاک کی صورت میں بہالے جاتے ہیں، اِسی طرح جوانی بڑھاپے میں ڈھل جاتی ہے اور طاقت کمزوری کا روپ اختیار کرتی ہے اور بالآخر بے بسی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا حکم آ جاتا ہے تو ہر شخص اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔ گویا کہ ہر بہار کے بعد خزاں کا آنا لازمی ہے۔

....

﴿سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی (٦) اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ وَمَا يَخۡفٰى (٧) وَنُيَسِّرُكَ لِلۡيُسۡرٰى (٨)﴾

ہم آپ کو (قرآن) پڑھا دیں گے تو آپ (اس کو) بھولنے نہ پائیں گے، مگر وہی جو اللہ چاہے گا، وہ جانتا ہے علانیہ کو بھی اور اس کو بھی جو چھپا ہوتا ہے، ہم تمھیں آسان (دین) کے لیے سہولت بخشیں گے۔

﴿سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی﴾

ہم آپ کو (قرآن) پڑھا دیں گے تو آپ (اس کو) بھولنے نہ پائیں گے۔

سَنُقۡرِئُکَ (سَ. نُقۡرِءُ. کَ) قریب ہے۔ ہم پڑھا دیں۔ آپ کو، ''س'' فعل مضارع کے شروع میں آکر اسے مستقبل کے لیے خاص کر دیتا ہے اور قریبی وقت کے اظہار کے لیے آتا ہے، (قَرَءَ، یَقۡرَءُ، قِرَائَۃٌ) پڑھنا، کتاب کے الفاظ پر غور کرنا، (اَقۡرَءَ، یُقۡرِءُ) پڑھانا، نُقۡرِءُ ہم پڑھائیں گے، یہ صیغہ رب العزت کے لیے آیا ہے واحد کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت کے لیے آتا ہے، فعل مضارع جمع متکلم ''ک'' آپ کو۔ ضمیر واحد مذکر حاضر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، فَلَا (فَ. لَا)

پھر۔نہیں، ف عاطفہ لَا، نافیہ تَنْسٰی بھولیں گے آپ، مضارع واحد مذکر حاضر (نَسِیَ، یَنْسٰی، نِسْیَانٌ) بھولنا،نسیان، بھول چوک اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ عظمت والا قرآن ہم آپ کو پڑھائیں گے تو آپ اسے اپنے سینہ مبارک میں محفوظ کرلیں گے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ اب صرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اخذ کر کے قرآن پڑھ لیں، اس کے بعد ان کا رب ذمہ دار ہے کہ جو کچھ اس نے انہیں پڑھایا ہے وہ ان کے دل ودماغ سے فراموش نہ ہوگا۔

یہ خوشخبری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو راحت وطمانیت پہنچانے والی ہے، آپ کو یہ عظیم اور حسین وجمیل قرآن بہت محبوب تھا، اس سے محبت کے جذبے، اس کے لیے شدت حرص اور اس کے سلسلے میں عظیم ذمہ داری وجوابدہی کے احساس کے تحت آپ اس کی، ایک آیت دہراتے، جبرائیلؑ جب آپ کے پاس قرآن لاتے تو آپ اسے ادا کرنے کے لیے جلدی جلدی زبان کو حرکت دیتے، اِس خوف سے کہ مبادا اس کا کوئی لفظ بھول جائیں، یہاں تک کہ آپ کو سکون وطمانیت بخشنے والی عظیم خوشخبری آگئی کہ قرآن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ ذمہ دار ہے۔

ان آیات میں آپ کے بعد آپ کی امت کے لیے خوشخبری ہے، یہ خوشخبری عقیدہ کی اساس وبنیاد کے سلسلے میں سکون وطمانیت عطا کرتی ہے، یہ ہدایت اللہ کی طرف سے ہے، اللہ اپنے نبی ﷺ کے دل میں اسے محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ہے، یہ اللہ کی نگرانی ومحافظت ہے، یہ دین اس کے نزدیک بزرگ ہے اس کی میزان میں اس امر کی بہت اہمیت ہے۔

یہاں بھی اور قرآن میں جس مقام پر بھی کوئی حتمی وعدہ کیا جاتا ہے یا کوئی دائمی قانون بیان ہوتا ہے، اس سے متصل یہ حقیقت ضرور واضح کی جاتی ہے کہ اللہ کی مشیت مطلق ہے اور ہر چیز پر حاوی ہے، وہ کسی چیز کی پابند نہیں حتیٰ کہ وہ اس پابندی سے بھی ماوراہے جو خود اس کے وعدے اور اس کے قانون سے پیدا

ہوتی ہے، وہ قانون اور وعدہ سے بھی بالاتر ہے، قرآن اس حقیقت کو واضح اور ثابت کرنے کی طرف بہت زیادہ متوجہ رہتا ہے...... جیسا کہ اس سے قبل بہت سے مقامات پر گزر چکا ہے...... اسی ذیل کی ہے وہ بات جو یہاں بیان ہوئی ہے۔

﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ مگر جو اللہ چاہے۔

یہ اعلان اس سچے وعدے کے بعد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو بھولیں گے نہیں، یہ اعلان اللہ کی مشیت کے عام اور مطلق ہونے کو واضح کرنے کے لیے ہے تاکہ مؤمن کو یہ معلوم رہے کہ معاملہ اللہ کی مشیت کے دائرہ کار میں ہے اور وہ ہمیشہ اللہ کی طرف متوجہ اور اس سے آس لگاتا رہے حتیٰ کہ اس چیز میں بھی جس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہو، اس طرح قلب اللہ کی مشیت سے مربوط اور متعلق رہے گا اور اس تعلق کے نتیجے میں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ (فی ظلال القرآن)

﴿اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى﴾ وہ جانتا ہے علانیہ کو بھی اور اس کو بھی جو چھپا ہوتا ہے۔

اِنَّهٗ (اِنَّ. هٗ) بلاشبہ۔ وہ، اِنَّ زور بیان کے لیے آتا ہے، هٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے، يَعْلَمُ (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمٌ) جاننا، پہچاننا، الْجَهْرَ ظاہر (کو) دراصل جَهْر زور سے بولنے کو کہتے ہیں (جَهَرَ، يَجْهَرُ جَهْرًا) آواز کے ساتھ بولنا، زور سے بات کرنا، جہری اور سرّی نمازیں اردو میں استعمال ہوتا ہے، جہری وہ نمازیں ہیں جن میں امام بلند آواز سے پڑھتا ہے (مغرب، عشاء، فجر) اور سرّی وہ نمازیں ہیں جن میں قرأت بلند آواز سے نہیں کی جاتی (ظہر، عصر) وَمَا يَخْفٰى وہ جانتا ہے اس کو بھی جو چھپا ہے، وَ عاطفہ (سلسلہ کلام جوڑنے کے لیے ہے) مَا، جو، اسم موصول، يَخْفٰى پوشیدہ، (خَفِيَ، يَخْفٰى، خفاءً، وَخُفيَةً) پوشیدہ ہونا، غائب ہونا۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

”اوپر قرآن مجید کے تحفظ اور اس سے استثناء کر کے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس آیت میں اس کی علت بیان کی گئی ہے اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جو خالق و مالک ظاہر اور

پوشیدہ، ہر شے کو جانتا ہے اور جو معاملہ کے تمام اطراف و جوانب سے آگاہ ہے، اسی کے علم اور اسی کی حکمت کے تحت سب کام انجام پاتے ہیں، اس کی حکمت جو اس کے کامل و جامع علم کی بنیاد پر قائم ہے۔ معاملات کے تمام پہلوؤں کو جاننے کے نتیجے میں جو کچھ چاہتی ہے وہی ہوتا ہے۔(فی ظلال القرآن)

﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى﴾ ہم تمھیں آسان (دین) کے لیے سہولت بخشیں گے۔

وَ عاطفہ، نُيَسِّرُكَ (نُيَسِّرُ. كَ) ہم سہولت دیں گے، آپ کو، (يَسَّرَ، يُيَسِّرُ، تَيسِيرٌ) آسانی پیدا کرنا، نُيَسِّرُ مضارع جمع متکلم رب کائنات کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت استعمال ہوا، کَ، ضمیر واحد مذکر حاضر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آئی ہے، لِلْيُسْرٰى (لِ. اَلْيُسْرٰى) لیے۔ آسانی، لام، حرف جر اور اَيْسَرُ (زیادہ آسان) اسم تفضیل کا مونث صیغہ يُسْرٰى، آسان، سہولت۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نرم اور آسان شریعت سے بہرہ ور کریں گے، جس پر عمل آسان ہو اور جو آسمان سے نازل ہونے والی سہل ترین شریعت ہے......اور یہ شریعت اسلامیہ ہے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

ا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ محسوس فرماتے کہ آپ بہت بڑی ذمہ داری سے نوازے جا رہے ہیں اور اس میں اگر ایک نقطہ کی بھی کمی بیشی ہوگئی تو آپ کو اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ پھر آپ کو لوگوں کی حالت زار کا بھی خیال آتا تھا اور آپ کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد دین مکمل ہو جائے، اس لیے آپ زبان مبارک جلدی جلدی ہلاتے تھے، رب کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور تشفی دی کہ ایسا نہ کریں بلکہ اطمینان اور سکون سے پڑھیں، آپ کے سینہ مبارک میں اسے جمع کرنا اور یاد کرانا اسی خالق و مالک کے ذمہ ہے جو اسے نازل کر رہا ہے۔ سورۃ طٰہٰ کی آیت نمبر 114 میں فرمایا:

''(اے پیغمبرؐ) قرآن (پڑھنے) میں قبل اس کے کہ آپ پر اس کی وحی پوری ہو جلدی نہ کیجیے۔

سورۃ قیامۃ کی آیات 16 تا 19 میں ارشاد ہوا:

’’(اے پیغمبرؐ اس (وحی کو یاد کرنے) کے لیے اپنی زبان کو (جلدی) حرکت نہ دیجیے کہ آپ کو وحی جلدی سے یاد ہو جائے، اس کا (آپ کے سینہ مبارک میں) جمع کرنا اور اس کا (آپ کی زبان مبارک سے) پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے، پس جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو آپ اس کی پیروی کیا کریں۔ پھر اس کا سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔‘‘

قرآن حکیم نازل ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی بے پایاں رحمت ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں اور ہر بستی اور ہر شہر میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں حفاظ کرام موجود ہیں اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں صرف یہی وہ واحد کتاب ہے جو تواتر سے حفظ ہو رہی ہے اور آٹھ دس سال کا بچہ رب کریم کی رحمت سے اسے اپنے سینے میں ضبط کر لیتا ہے اور پھر رمضان المبارک میں سینکڑوں افراد کی امامت کرتے ہوئے اسے سناڈالتا ہے۔

۲) ’’الا ما شاء اللّٰہ‘‘ اللہ جو چاہے وہ کر سکتا ہے، اس کی مشیت سب پر غالب ہے، وہ جو چاہتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے، اس کا یہ فیصلہ ہے کہ آپ قرآن کو نہ بھولیں، اس نے قرآن نازل کیا ہے اور وہی اس کا محافظ ہے، وہ ہمیشہ کے لیے اسے یاد کرنے والوں کے سینے اس کے لیے کھول دے گا اور اس کے معنی و مطالب کو سمجھنے والوں اور اس کے احکام پر عمل کرنے والوں کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی اٹل اور یقینی ہے، اہل حق کے لیے اس کا یہ پیغام ہے۔

’’پھر (جب عذاب کی گھڑی آجاتی ہے تو ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم اپنے رسولوں کو بچا لیا کرتے ہیں اور اس طرح ان لوگوں کو بھی جو ایمان لائے ہوں، ہم نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ (ایسے وقت میں) مؤمنین کو بچالیں۔‘‘ (یونس:۱۰۳)

....

﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى(۹) سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى(۱۰) وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى(۱۱) الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى(۱۲) ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى(۱۳)﴾

تو آپ جہاں تک (سمجھیں کہ) نصیحت کرنا مفید ہے (ان لوگوں کو) نصیحت کرتے رہیے، جو شخص (اللہ سے) ڈرتا ہے، وہ نصیحت قبول کرلے گا اور جو (بے خوف) بد نصیب ہے وہ اس (نصیحت) سے دور بھاگتا ہی رہے گا جو (آخر کار) بڑی (سخت) آگ میں پڑے گا، پھر وہ اس میں نہ مرے گا اور نہ جیے گا۔

﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾

تو آپ جہاں تک (سمجھیں کہ) نصیحت کرنا مفید ہے (ان لوگوں کو) نصیحت کرتے رہیے۔

فَذَكِّرْ (ف. ذَكِّرْ) پس (تو)۔ آپ نصیحت کیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (ذَكَّرَ، يُذَكِّرُ، تَذْكِيْرٌ) نصیحت کرنا، یاد دہانی کرانا، ذکر، ذاکر، مذکور، تذکرہ جیسے الفاظ اردو میں جانے پہچانے ہیں۔ اِنْ نَّفَعَتِ اگر فائدہ دے، اِنْ حرف شرط (نَفَعَ، يَنْفَعُ، نَفْعًا) فائدہ دینا، نفع پہنچانا، نفع، نافع (فائدہ دینے والی چیز) منفعت بخش اردو زبان میں مستعمل ہے، الذِّكْرٰى یاد دہانی، نصیحت، ذَكَرَ يَذْكُرُ کا اسم مصدر۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قرآن کے ذریعے ان کو یاد دہانی کرائیے جو اس سے وعظ و نصیحت حاصل کریں، جیسا کہ رب کریم کا یہ ارشاد بھی ہے ''پس آپ اس قرآن کے ذریعے ہر اس شخص کو نصیحت کیجیے جو میری تنبیہ سے ڈرے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''یہاں سے علم کی نشر و اشاعت کے آداب اخذ کیے جا سکتے ہیں کہ اسے نا اہل تک پہنچانے سے کیا جائے۔'' کسی نے کیا خوب کہا ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی، عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (النجم:۲۹) ''پس اے نبیؐ جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیجیے۔''

سورۃ البقرہ کے آغاز میں ان لوگوں کے بارے میں اس طرح آتا ہے:

''جن لوگوں نے (ان باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکا کر دیا، اُن کے لیے یکساں ہے، خواہ آپ انہیں خبردار کریں یا نہ کریں، بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ (البقرہ:٦)

﴿سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى﴾ جو شخص (اللہ سے) ڈرتا ہے، وہ نصیحت قبول کرلے گا۔

سَيَذَّكَّرُ (سَ. يَذَّكَّرُ) عنقریب۔ نصیحت قبول کرلے گا، ''س'' فعل مضارع سے پہلے آئے تو مستقبل قریب کا معنی دیتا ہے (ذَكَّرَ، يُذَكِّرُ، تَذْكِيرٌ) نصیحت کرنا، یاد کرنا، مَنْ يَّخْشٰى جو ڈرتا ہے، مَنْ جو اسم موصول، يَّخْشٰى ڈرتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (خَشِيَ، يَخْشٰى، خَشْيَةً) ڈرتے رہنا، ڈر ہونا، کھٹکا ہونا، اندیشہ ہونا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اس ذکر و موعظت (قرآن حکیم) سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جس کے دل میں اللہ کا خوف سمایا ہو۔''

﴿وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى﴾

اور جو (بے خوف) بدنصیب ہے، وہ اس (نصیحت) سے دور بھاگتا ہی رہے گا۔

وَ عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، يَتَجَنَّبُهَا (يَتَجَنَّبُ. هَا) وہ پہلو تہی کرے گا۔ اس سے، (اِجْتَنَبَ، يَجْتَنِبُ، اِجْتِنَابًا) بچنا، دور رہنا، پہلو تہی کرنا، کنارہ کش ہونا، اجتناب کرنا اردو

میں بھی استعمال ہوتا ہے "ھا" کی ضمیر واحد مؤنث غائب "اَلذِّکْرٰی" نصیحت کی طرف جاتی ہے۔
اَلْاَشْقَی (وہ جو) سخت بدبخت ہے (بدنصیب ہے) **شَقِیٌّ** بدنصیب سے اسم تفضیل کا صیغہ **اَشْقٰی** زیادہ بدنصیب، شقاوت قلبی دل کی سختی، شقی القلب اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں:

"الذکریٰ (قرآن حکیم) سے کفار میں سے وہی بدنصیب دور رہے گا جو اپنے کفر میں بڑا مضبوط ہے، اللہ تعالیٰ کا منکر اور باغی ہے اور گناہوں میں گھرا ہوا ہے۔" (زبدۃ التفسیر من فتح القدیر)

﴿**الَّذِیْ یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی**﴾

(یہی وہ شخص ہے) جو (آخرکار) بڑی (سخت) آگ میں پڑے گا۔

الَّذِیْ جو، اسم موصول، **یَصْلَی** داخل ہوگا (پڑے گا) فعل مضارع واحد مذکر غائب (**صَلِیَ، یَصْلَی، صَلًی وَ صِلِیًّا**) آگ میں جلنا۔(القاموس الوحید)

النَّارَ آگ، **الْکُبْرٰی** (جو) بڑی ہے، آگ کی صفت الکبریٰ واحد مؤنث آئی کیونکہ یہ عربی میں مؤنث استعمال ہوتی ہے۔

بڑی ہولناک (آگ) اور چھوٹی آگ تو دنیا کی آگ ہے۔(فتح القدیر)

﴿**ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی**﴾ پھر وہ اس میں نہ مرے گا اور نہ جیے گا۔

ثُمَّ پھر، حرف عطف، **لَا یَمُوْتُ** نہ مرے گا وہ (یہ باغی)، **لَا**، نافیہ، **یَمُوْتُ** (**مَاتَ، یَمُوْتُ، مَوْتاً**) مرنا، زندگی کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے آخرت کی طرف لوٹنا، **فِیْهَا** (**فِیْ.هَا**) میں۔ اُس (آگ) یعنی اس آگ میں۔ "هَا" کی ضمیر آگ کی طرف جاتی ہے۔ **وَلَا یَحْیٰی** اور نہ جیے گا (**حَیِیَ، یَحْیَی، حَیَاةً**) زندہ رہنا، 'موت وحیات' اردو میں استعمال ہوتا ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

یعنی نہ اسے موت ہی آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے اور نہ جینے کی طرح جیے گا کہ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل ہو، یہ سزا ان لوگوں کے لیے ہے جو سرے سے اللہ اور اس کے رسول کی نصیحت کو

قبول ہی نہ کریں اور مرتے دم تک کفر وشرک یا دہریت (اللہ تعالیٰ کے انکار) پر قائم رہیں، رہے وہ لوگ جو دل میں ایمان رکھتے ہوں مگر اپنے برے اعمال کی بنا پر جہنم میں ڈالے جائیں گے تو ان کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ جب وہ اپنی سزا بھگت لیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں موت دے دے گا پھر ان کے حق میں شفاعت قبول کی جائے گی اور ان کی جلی ہوئی لاشیں جنت کی نہروں میں لا کر ڈالی جائیں گی اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو اور اس پانی سے وہ اس طرح جی اٹھیں گے جیسے نباتات پانی پڑنے سے اُگ آتی ہیں۔ (تفہیم القرآن، ج:٦)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) داعی الی اللہ کو صبر وعزیمت سے اپنی دعوت کو جاری وساری رکھنا ضروری ہے لیکن اس میں حکمت ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ نصیحت اسی کو کریں جس کو نصیحت کرنا مفید ہو اور اسی وقت کریں جب نصیحت کرنا مناسب ہو اور جس شخص کے بارے میں یہ اندازہ ہو جائے کہ اس کے اندر حق بات قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، اس کے پیچھے پڑنا مناسب نہیں اس لیے کہ دنیا اس کی نظر میں اس قدر سما گئی ہے کہ اسے بھلی بات کسی طرح بھی پسند نہیں ہے بلکہ الٹا اس کا مذاق اڑاتا ہے اور ضد اور ہٹ دھرمی اس کی جبلت میں رچ بس گئی ہے یہی وہ شخص ہے جو آخرت میں ذلت ورسوائی کے عذاب میں گرفتار ہوگا۔

۲) ان آیات میں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کی ایسی منظّم جماعت ضرور موجود رہنی چاہیے جو بغیر طمع اور لالچ کے اسلامی تعلیمات کو پھیلانے میں مصروف رہے اور افرادِ جماعت کی اپنی زندگیاں بھی اسلامی سانچے میں ڈھلی ہوں، اس کا ذکر قرآن حکیم کی سورۃ آل عمران آیت نمبر 104 میں ہے:

”تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں، جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔“

....

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی(۱۴) وَذَکَرَ اسۡمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی(۱۵) بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا(۱۶) وَالۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی(۱۷) اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی (۱۸) صُحُفِ اِبۡرٰھِیۡمَ وَ مُوۡسٰی(۱۹)﴾

بلاشبہ وہی بامراد ہوا جو پاک رہا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ بالعموم دنیا کی زندگی کو (آخرت) پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت (دنیا سے) کہیں بہتر اور زیادہ پائیدار ہے، یہی بات اگلے صحیفوں (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں بھی (لکھی ہوئی) ہے۔

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی﴾ بلاشبہ وہی بامراد ہوا جو پاک رہا۔

قَدۡ حرف، تحقیق کلام، فعل ماضی کے شروع میں لائیں تو نہ صرف زور بیان پیدا ہوتا ہے بلکہ اسے زمانہ حال کے قریب کر دیتا ہے۔ اَفۡلَحَ بامراد ہوا وہ، فلاح پائی اس نے، (اَفۡلَحَ، یُفۡلِحُ، اِفۡلاحٌ) کامیاب ہونا، فلاح پانا، مقصد کو پانا، مراد کو پہنچنا آخرت میں کامیابی حاصل کرنا، باب افعال، مَنۡ تَزَکّٰی جس نے سنوارا، جو پاک ہوا، (جس نے شرک و کفر کی آلودگیوں سے اپنے دل کو صاف کر لیا) تزَکّٰی، یَتَزَکّٰی، پاک وصاف ہونا، اسی سے لفظ زکوٰۃ ہے جس کے معنی ہیں برکت، پاکیزگی، ہر شے کا عمدہ حصہ، نیکی، صلاح، یہ مال کا وہ حصہ ہے جسے مالدار (صاحب نصاب) شریعت کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے غرباء ومساکین کو دے ڈالتا ہے اور یہ مالدار کے مال میں زیادتی، خیر و برکت اور پاکیزگی پیدا کرتا ہے۔ (القاموس الوحید)

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''وہ شخص یقیناً کامیاب ہوگیا جس نے کفر وشرک سے اپنے نفس کو پاک کر کے ایمان سے مزین کر لیا اور اپنے اعمال رحمٰن کے لیے خالص کر لیے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَذَكَرَ اسۡمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ اور (وہ) اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، ذَكَرَ یاد کیا، ماضی واحد مذکر غائب (ذَكَرَ، يَذْكُرُ، ذِكْرًا، وَ ذِكْرٰى) یاد کرنا (دل اور زبان سے) یاد رکھنا۔ ذَكَرَ اللّٰهَ، اللہ کا ذکر کرنا، اس کی تعریف کرنا، اس کی ان گنت نعمتوں پر اس کا شکر بجالانا۔ (القاموس الوحید)

اسۡمَ رَبِّهٖ اپنے رب کے نام کو، اِسۡم، نام رَبِّهٖ (رَبِّ. هٖ) رب۔ اپنے (کا) ہٗ کی ضمیر اس شخص کی طرف جاتی ہے کہ جس نے اپنا تزکیہ کر لیا، اور شرک وکفر کی آلودگیوں سے اپنے آپ کو بچالیا، پھر اپنی جبین نیاز کو اپنے رب کے حضور جھکا دیا، فَصَلّٰى (ف. صَلّٰى) پھر اس نے نماز پڑھی (صَلّٰى، يُصَلِّيْ، صَلَاةً) نماز پڑھنا، دعا کرنا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''(اپنا تزکیہ کرنے والے شخص نے) زبان سے تو اپنے رب کی عظمت وشان بیان کی (اور عمل سے) اس کا حکم مانتے ہوئے خشوع وخضوع سے نماز ادا کی اور نماز اس طرح ادا کی جائے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائی اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ'' نماز اس طرح ادا کرو جس طرح مجھے ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى﴾

حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ بالعموم دنیا کی زندگی کو (آخرت) پر ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت (دنیا سے) کہیں بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔

بَلْ بلکہ، تُؤْثِرُوْنَ تم ترجیح دیتے ہو، فعل مضارع جمع مذکر حاضر (آثَرَ، يُؤْثِرُ، اِيْثَارٌ) ترجیح دینا، ایثار نفس اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، دنیا کی زندگانی، وَالْاٰخِرَةُ اور آخرت، خَيْرٌ بہتر ہے، وَّ اَبْقٰى اور باقی رہنے والی ہے (پائیدار ہے) بقاءٌ سے اسم تفضیل اَبْقٰى۔

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں:

''آخرت دنیا سے کہیں بہتر اور دائمی ہے، مالک بن دینار کا کہنا ہے کہ اگر دنیا سونے (Gold) کی بھی ہوتی تو وہ ختم ہو جاتی اور آخرت سنگریزوں (Stones) کی بھی ہوتی اور باقی رہتی تو لازم تھا کہ باقی رہنے والے سنگریزوں کو فنا ہونے والے سونے پر ترجیح دی جاتی، اور حقیقت یہ ہے کہ آخرت سونا ہے جو دائمی اور ابدی ہے اور اس کے مقابلہ میں دنیا سنگریزے ہیں جو عارضی اور فنا ہونے والی ہے۔''

(زبدۃ التفسیر من فتح القدیر)

﴿اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی، صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی﴾

یہی بات اگلے صحیفوں (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں بھی لکھی ہے۔

اِنَّ بلاشبہ، بے شک، هٰذَا یہ (بات) ہے، اسم اشارہ، لَفِی (لَ. فِیْ) ضرور بضرور، بیچ میں ہے، لام تاکیدی معنی دیتا ہے، فِیْ حرف جر ہے، الصُّحُفِ اس کا مفرد صَحِیْفَةٌ ہے جس کے معنی لکھا ہوا کاغذ یا کاغذ وغیرہ پر لکھا ہوا مضمون ہے، الصُّحُفِ الْاُوْلٰی، پہلے صحیفوں میں، الْاُوْلٰی، اَوَّلُ کی تانیث ہے، صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی (یعنی) سیدنا ابراہیم اور سیدنا موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں بھی (لکھی ہوئی) ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''یعنی اس سورۃ مبارکہ میں اسلامی عقائد کی جو اساسات بیان ہوئی ہیں، ان کی جڑیں گہری اور قدیم ہیں، یعنی ''حق'' اگلے صحیفوں میں بھی مذکور ہے...... ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

حق ایک ہے، عقیدہ ایک ہے، اس کا تقاضا ہے کہ وہ ہستی ایک ہی ہو جہاں سے یہ حق اور یہ عقیدہ آیا ہے، وہ مشیت بھی ایک ہو جس کا تقاضا یہ ہو کہ وہ انسانوں کے پاس رسول بھیجے...... یہ واحد حق ہے جو واحد اصل ہے...... اللہ تعالیٰ کے پاس سے آیا ہے...... نئی نئی ضرورتوں اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت اس کی تفصیلات اور جزئیات میں کچھ کچھ اختلاف ہوتا ہے، مگر اس کی بنیاد ایک ہی ہے، اُس کی اصل اور مرجع بھی ایک ہے...... اور وہ ہے ربِّ اعلیٰ جس نے پیدا کیا، ٹھیک ٹھاک کیا، منصوبہ ٹھہرایا اور رہنمائی کی۔'' (فی ظلال القرآن)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اسلام ظاہر و باطن دونوں کو پاکیزہ اور صاف ستھرا بناتا ہے......طہارت ظاہری میں جسم ولباس کی پاکیزگی ہے تو طہارت باطنی میں فکر وروح کو کفر وشرک، حسد وبغض ایسی بیماریوں سے محفوظ رکھنا ہے، اسی سے یہ پیکر خاکی دنیا اور آخرت میں کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔

۲) قرآن حکیم جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے، ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام نے بیک آواز جو چیز اپنے اپنے عہد نبوت میں لوگوں کے سامنے پیش کی، وہ یہ تھی کہ کامیابی اس شخص کا مقدر ہے جو پاکباز ہے جس نے اپنا ظاہر و باطن نیکی اور تقویٰ سے آراستہ کرلیا ہے۔ جو عاجز اور خاکسار بن کر اپنی جبین نیاز رب ذوالجلال کی چوکھٹ پر جھکاتا ہے، جس کی زندگی ہمہ وقت اپنے مولا و مالک کے لیے وقف ہے اور اس کی غلامی اس کا منتہائے مقصود ہے۔ یہ پیغام بالعموم نسل انسانیت کے لیے ہے اور بالخصوص قریش مکہ کے لیے جو اپنی نسبت سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے بڑے شدومد سے جوڑتے تھے اور یہود مدینہ کے لیے جنہیں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا دعویٰ تھا۔

۳) سیدنا آدم علیہ السلام سے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کا پیغام توحید یکساں رہا اور سب نے لوگوں کو بندگی رب کی دعوت دی، سب کے سب پاکیزگی اور طہارت اختیار کرنے کو زندگی کا نصب العین ٹھہراتے رہے، سب نے لوگوں کے اخلاقی اور روحانی افق کو بلند اور تابناک بنانے کی کوشش کی انہوں نے پیغام حق لوگوں تک من وعن پہنچا دیا اور ان کی اپنی زندگی بھی اسی پیغام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

۲) لوگوں کی اکثریت کا اصل مرض ہمیشہ یہی رہا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی پر فریفتہ رہے، فوری فائدہ اور دنیا کے چمکتے ہوئے حقیر سکے انہیں آخرت سے غافل کرتے رہے، حیات مستعار کے چند دنوں پر وہ ریجھ گئے اور ابدی زندگی کو خیر باد کہہ دیا۔

................o................

سُوْرَۃُ الْغَاشِیَۃ

قیامت کی آمد پر خوفناک منظر ہوگا، لفظ الغاشیہ اس کی ہولناکی کی خبر دیتا ہے کہ یکا یک اس کا خوف اوراس کی دہشت، اس کی مصیبت اوراس کی بے چینی سب پر چھا جائے گی۔

انسانوں کا ایک گروہ تو وہ ہے جس کے حصے میں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہ آئے گا، دنیا میں گناہوں کو کمانے اور برائیوں کو اکٹھا کرنے میں انہوں نے تمام زور وزر صرف کر ڈالا، ایسے لوگوں کا انجام انتہائی تکلیف دہ اور کربناک ہوگا...... کھولتا ہوا پانی، کانٹے دار گھاس پھوس کہ جو کھائے اس کا منہ اور حلق زخمی ہو جائے اور جسم گھلتا چلا جائے۔

انسانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جنہوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنے نفس کو سنوارا اور اس کی رضا کے لیے نیکی اور سلامتی کا راستہ اختیار کیا، وہ دنیا میں مصائب جھیلنے کے باوجود گوہر مقصود کو پا گئے...... روز قیامت فرحاں وشاداں ہوں گے، خوشی سے چہرے چمکتے دمکتے ہوں گے اور باغ و بہار اور ابدی ولازوال نعمتوں سے سرشار رہیں گے۔

اے انسانو! اللہ تعالیٰ کی قدرت کے جلوے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں اور دنیا کا کارخانہ اوراس کی ان گنت نعمتیں تمہارے سامنے اس کی کھلی کتاب ہے، اگر آنکھ بینا ہو تو اسے ہر وقت پڑھ سکتے ہو...... یہ بلند و بالا پہاڑ، یہ بغیر ستونوں کے نیلگوں آسمان اوراس پر ان گنت جگمگاتے ستارے اور یہ وسیع وعریض پھیلی ہوئی زمین جس پر تم چلتے پھرتے اور رہتے سہتے ہو، اِس سے خالق کائنات کی زبردست کاریگری ہویدا ہے...... پھر تمہارے سامنے سینکڑوں اور ہزاروں انسان روزانہ، دنیا میں آتے اور چلے جاتے ہیں، یہ کارخانہ جس ذات نے بنایا اور سجایا ہے، وہی موت وحیات کا مالک ہے، دنیا میں اس نے انسان کو صرف امتحان کے لیے بھیجا ہے انسان کا اصل گھر یہ دنیا نہیں ہے بلکہ وہ جگہ ہے جہاں اس نے جانا ہے اور جانے کا فیصلہ حساب کتاب کے بعد مرتب ہونا ہے۔

آیات:۲۶ # سُوۡرَۃُ الۡغَاشِیَۃِ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ الۡغَاشِیَۃِ(۱) وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَۃٌ(۲) عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ(۳) تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَۃً(۴) تُسۡقٰی مِنۡ عَیۡنٍ اٰنِیَۃٍ(۵) لَّیۡسَ لَہُمۡ طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ ضَرِیۡعٍ(۶) لَّا یُسۡمِنُ وَ لَا یُغۡنِیۡ مِنۡ جُوۡعٍ(۷)﴾

(اے پیغمبر ﷺ) کیا آپ کو ''غاشیہ'' کی خبر پہنچی ہے، کتنے چہرے اس روز اترے ہوئے ہوں گے، محنت سے نڈھال اور تھکے ہارے ہوں گے، دہکتی آگ میں داخل ہوں گے، انہیں کھولتے ہوئے چشمے کا پانی پلایا جائے گا، ان کے لیے کوئی کھانا نہ ہو گا بجز جھاڑ کانٹے کے، جو نہ (ان کو) موٹا کرے گا اور نہ (ان کی) بھوک مٹائے گا۔

﴿ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ الۡغَاشِیَۃِ﴾ (اے پیغمبر ﷺ) کیا آپ کو ''غاشیہ'' کی خبر پہنچی ہے۔

ہَلۡ کیا، حرف استفہام، اَتٰىکَ (اَتٰی. کَ) آئی۔ آپ کے پاس (اَتَی، یَأتِیۡ، اِتیانٌ) آنا پہنچنا، اَتٰی، ماضی واحد مذکر غائب، ''کَ'' ضمیر واحد مذکر حاضر، حَدِیۡثُ خبر، بات چیت، جب یہ لفظ حدیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طور پر استعمال ہو، تو اِس کے معنیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو اور آپ کے فرمودات کے ہوتے ہیں۔ ''اَلۡغَاشِیَۃِ'' کا لفظی معنی ہر طرف سے گھیر لینے والی (غَشِیَ، یَغۡشَی، غشاً) گھیر لینا، ڈھانپ لینا، الغاشیۃ، پردہ، ڈھکنا، دل کا پردہ، قیامت۔ قیامت کو غاشیہ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کی ہولنا کی سب چیزوں پر چھا جائے گی۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''مراد ہے قیامت، یعنی وہ آفت جو سارے جہاں پر چھا جائے گی۔ اس مقام پر یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں بحیثیت مجموعی پورے عالم آخرت کا ذکر ہو رہا ہے جو نظام عالم کے درہم برہم ہونے سے شروع ہو کر تمام انسانوں کے دوبارہ اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت سے جزا و سزا پانے تک تمام مراحل پر حاوی ہے۔'' (تفہیم القرآن)

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾ کتنے چہرے اُس روز اُترے ہوئے ہوں گے۔

وُجُوْهٌ چہرے، اس کا مفرد وَجْهٌ ہے، يَّوْمَئِذٍ (يَّوْمَ. اِذٍ) دن، اس یعنی اس دن يَوْم، اسم ظرف، مضاف، اِذٍ مضاف الیہ، خَاشِعَةٌ اُترے ہوئے (ذلیل و خوار) اسم فاعل صیغہ واحد مؤنث وُجُوهُ کے لیے یہ صیغہ آیا ہے، (خَشَعَ، يَخْشَعُ، خُشُوعًا) عاجزی دکھانا، انکساری کرنا، خود کو چھوٹا اور بے حیثیت بنانا، پست اور ذلیل ہونا، یہ لفظ بندہ مؤمن کے لیے برکت اور رحمت کا باعث ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے رب کے حضور خشوع اور خضوع سے زندگی گزارتا ہے جبکہ کافر تکبر اور غرور کے باعث ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''کچھ چہرے اس دن ذلیل و خوار، رسوا اور لٹکے ہوئے ہوں گے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ محنت سے نڈھال اور تھکے ہارے ہوں گے۔

عَامِلَةٌ کام کرنے والے (محنت سے نڈھال) وُجُوهٌ کی طرف اشارہ ہے، اسم فاعل واحد مونث کا صیغہ آیا ہے (عَمِلَ، يَعْمَلُ عَمَلاً) کام کرنا، مصروف ہونا، اس سے اسم فاعل عَامِلٌ مذکر کے لیے اور عَامِلَةٌ مؤنث کے لیے استعمال ہوتا ہے، نَّاصِبَةٌ تھکے ہارے، یہ بھی وُجُوْهٌ کی صفت واحد مؤنث استعمال ہوتی ہے (نَصِبَ، يَنْصَبُ، نَصَبًا) بہت تھک جانا، محنت و مشقت کرنا، اسم فاعل مذکر نَاصِبٌ اور مؤنث کا صیغہ نَاصِبَةٌ. (القاموس الوحید)

احمد مصطفیٰ المراغی لکھتے ہیں:

''یعنی یہ کفار حالت کفر میں دنیا کے لیے محنت ومشقت اور دوڑ دھوپ کرتے رہے، رب تعالیٰ نے ان سے کوئی عمل قبول نہ کیا اس لیے کہ ان کا کوئی عمل بھی رب کی رضا اور رسول ﷺ کے اتباع میں نہ تھا اس کے برعکس زمین میں فتنہ وفساد پھیلانا ان کا مطمح نظر تھا۔ (تفسیر المراغی)

﴿تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً﴾ دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔

تَصْلٰى داخل ہوں گے (صَلِيَ، يَصْلٰى، صَلِيًّ) آگ میں جلنا، نَارًا آگ، حَامِيَةً دہکتی، بھڑکتی، ناراً (آگ) کی صفت حَامِيَةً، واحد مونث آتی ہے، الحُمّٰى عربی زبان میں بخار کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں جسم گرم ہو جاتا ہے، مَاءٌ حَمِيْمٌ، گرم کھولتا ہوا پانی، اردو زبان میں اسی نسبت سے حَمَّام کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے جہاں نہانے کے لیے گرم پانی ملتا ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں: ''ایسے باغی افراد سخت بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے۔''

﴿تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ﴾ انہیں کھولتے ہوئے چشمے کا پانی پلایا جائے گا۔

تُسْقٰى انہیں پلایا جائے گا، فعل مضارع مجہول واحد مؤنث غائب، یہ صیغہ وُجُوهٌ (چہروں) کی طرف جاتا ہے (سَقٰى يَسْقِي، سَقِيًا) پلانا، ساقی، پانی پلانے والا، مِنْ سے، حروف جارہ میں سے ہے جو اپنے بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے، عَيْنٍ چشمہ، اس کی جمع عُيُوْنٌ آتی ہے، اٰنِيَةٍ کھولتے ہوئے، عَيْنٍ کی صفت ہے، عربی میں صفت اور موصوف کے اعراب یکساں ہوتے ہیں آنٍ، گرم کھولتا (پانی) اس کا مونث اٰنِيَةٌ۔

﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ﴾ ان کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا بجز جھاڑ کانٹے کے۔

لَيْسَ نہیں ہوگا، فعل ناقص واحد مذکر غائب، لَهُمْ (ل. هُمْ) لیے، ان کے، طَعَامٌ کھانا، اِلَّا مگر، مِنْ ضَرِيْعٍ جھاڑ کانٹے (سے) ''الضریعُ'' دوزخ کا ایک خاردار بہت کڑوا درخت جو بہت بدبودار ہوگا۔ (القاموس الوحید)

﴿لَّا يُسۡمِنُ وَ لَا يُغۡنِىۡ مِنۡ جُوۡعٍ﴾

جو نہ (ان کو) موٹا کرے گا اور نہ (ان کی) بھوک مٹائے گا۔

لَّا يُسۡمِنُ نہ موٹا کرے گی (انہیں) (سَمِنَ، يَسۡمَنُ، سِمۡنًا) موٹا ہونا، گوشت اور چربی دار ہونا، السِّمۡنُ، موٹاپا، جسم کی پھلاوٹ (القاموس الوحید) وَ لَا يُغۡنِىۡ اور نہ بچا سکے گا (اسے)، مِنۡ جُوۡعٍ بھوک سے، (غَنِيَ، يَغۡنَى، غناءً) مال دار ہونا، غَنِيَ عَنِ الشيءِ، کسی چیز سے بے نیاز ہونا یعنی دوزخیوں کا کھانا ایسا ہوگا جو انہیں بھوک سے بے نیاز نہ کرے گا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''قرآن مجید میں کہیں فرمایا گیا ہے کہ جہنم کے لوگوں کو زقّوم کھانے کے لیے دیا جائے گا، کہیں ارشاد ہوا ہے کہ اس کے لیے غِسۡلِيۡن کے سوا کوئی کھانا نہ ہوگا اور یہاں فرمایا جارہا ہے کہ انہیں خار دار سوکھی گھاس کے سوا کچھ کھانے کو نہ ملے گا، ان بیانات میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے، ان کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنم کے بہت سے درجے ہوں گے جن میں مختلف قسم کے مجرمین اپنے جرائم کے لحاظ سے ڈالے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب ان کو دیے جائیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ زقوم کھانے سے بچنا چاہیں گے تو غِسۡلِين اُن کو ملے گا اس سے بھی بچنا چاہیں گے تو خار دار گھاس کے سوا کچھ نہ پائیں گے، غرض کوئی مرغوب غذا بہرحال انہیں نصیب نہ ہوگی۔'' (تفہیم القرآن، ج:۶)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) جس طرح زندگی ایک حقیقت ہے، اِسی طرح موت اور قیامت بھی حقیقت ہے، جو خالق و مالک زندگی عطا فرماتا ہے، وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی کا حساب کتاب لینے کے لیے قیامت برپا کرے گا۔

۲) قیامت کے کئی نام قرآن میں آئے ہیں اور سب اس کی مختلف خصوصیات پر دلالت کرتے ہیں، غاشیہ کے معنی ڈھانپ لینے اور چھا جانے کے ہیں، اس کی مناسبت یہ ہے کہ قیامت کے احوال اور شدائد کسی شخص کو بھی مستثنیٰ نہیں کریں گے اور وہ سب پر یکساں چھا جائے گی اور سب کو زندگی کا

حساب دینا ہوگا۔

۳) کفار اور برے لوگ انتہائی تکلیف اور عذاب میں ہوں گے، انگارے اور دہکتی آگ ان کا مسکن ہو گا اور کھانے کے لیے ایسی غذائیں جن کا تصور بھی پریشان کر دیتا ہے۔

۴) ایمان والے اور اچھے لوگ انتہائی راحت اور آرام میں ہوں گے، پھل پھول اور رواں دواں چشموں کے درمیان ان کے رہنے سہنے کی جگہ ہوگی اور ہر سہولت اور آسودگی انہیں مہیا ہوگی، اس کا تصور بھی دل کو سکون و اطمینان بخشتا ہے۔ اب یہ بات انسانوں پر ہے کہ وہ کس راہ کو پسند کرتے ہیں۔

....

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ(۸) لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ(۹) فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ(۱۰) لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً(۱۱) فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ(۱۲) فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ(۱۳) وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ(۱۴) وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ(۱۵) وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ(۱۶)﴾

(روز قیامت) کچھ چہرے تر و تازہ ہوں گے، وہ اپنے اعمال کی جزا سے خوش ہوں گے، عالی مقام جنت میں ہوں گے، وہاں کوئی لغویات نہ سنیں گے، اس میں چشمے بہہ رہے ہوں گے، اونچے تخت (بچھے) ہوں گے اور آبخورے (قرینے سے) رکھے ہوں گے، گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی اور نفیس فرش بچھے ہوں گے

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ (روزِ قیامت) کچھ چہرے تر و تازہ ہوں گے۔

وُجُوْهٌ چہرے، اس کا مفرد وَجْهٌ ہے، يَّوْمَئِذٍ (يَوْمَ. اِذٍ) دن۔ جس، یعنی جس دن، نَّاعِمَةٌ تر و تازہ، اسم فاعل (نَعِمَ، يَنْعَمُ، نَعْمًا وَ نِعِمًا) نرم و نازک ہونا، تر و تازہ ہونا، خوشگوار ہونا، (القاموس

الوحید) عربی زبان میں کہا جاتا ہے نَعِمَ عَیْشُهُ وہ خوشحال اور آسودہ ہے، نَعِمَ بَالُهُ وہ پرسکون اور مطمئن ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''قیامت کے روز مؤمنوں کے چہرے تروتازہ، فرحاں وشاداں اور چمکتے دمکتے ہوں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کے چہروں پر تم خوشحالی کی رونق محسوس کروگے۔ (صفوۃ التفاسیر)

﴿لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ﴾ وہ اپنے اعمال کی جزا سے خوش ہوں گے۔

لِّسَعْيِهَا (لِ. سَعْيِهَا) لیے۔ اپنی کوشش سے، هَا کی ضمیر واحد مؤنث غائب وُجُوهٌ (چہروں) کی طرف جاتی ہے، (سَعَى، يَسْعَى، سَعْيًا) کوشش کرنا، جدوجہد کرنا، رَاضِيَةٌ خوش ہوں گے، اسم فاعل واحد مؤنث (رَضِيَ، يَرْضَى) خوش ہونا، اسم فاعل راضٍ اور راضيةٌ مؤنث کا صیغہ وُجُوهٌ کی طرف جاتا ہے۔

﴿فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ﴾ عالی مقام جنت میں ہوں گے۔

فِيْ میں، حرف جر بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے اور وہ مجرور کہلاتا ہے، جَنَّةٍ جنت، عَالِيَةٍ بلند مقام، یہ جنّةٍ کی صفت بھی ہے، صفت اور موصوف کی اعرابی حالت یکساں ہوتی ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''یعنی قدر ومنزلت والے بلندی پر واقع باغ و بہار میں ہوں گے اور بالا خانوں میں امن اور سلامتی سے رہیں سہیں گے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً﴾ وہاں کوئی لغوبات نہ سنیں گے۔

لَّا تَسْمَعُ نہیں سنیں گے، لَا نہیں، نافیہ، تَسْمَعُ واحد مؤنث غائب (سَمِعَ، يَسْمَعُ، سَمْعًا) سننا، یہ صیغہ، وُجُوهٌ کے لیے آیا ہے، لَا غِيَةً لغو (بےہودہ) بات۔

امام شوکانی لکھتے ہیں:

اہل جنت سے کسی قسم کی کوئی لغو بات نہ سنیں گے اس لیے کہ وہ حکمت اور دانشمندی کے سوا کوئی بات نہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر اس کے سراپا شکر گزار ہوں گے۔ (فتح القدیر)

﴿فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ﴾ اس میں چشمے بہہ رہے ہوں گے۔

فِيهَا (فِيْ. هَا) میں۔ اُس، یعنی اس میں 'ھا' کی ضمیر واحد مؤنث جَنَّةٍ (جنت) کی طرف جاتی ہے، عَيْنٌ چشمہ، اس کی جمع عُيُونٌ آتی ہے، جَارِيَةٌ جاری، رواں دواں جَرَىَ، يَجْرِيْ، جَرْيًا چلنا، رواں ہونا، یعنی جنت کے چشموں کا یہ وصف ہے کہ وہ ہمیشہ جاری وساری رہیں گے اور کبھی خشک نہیں ہوں گے۔

﴿فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ﴾ اس میں اونچے تخت (بچھے) ہوں گے۔

فِيهَا (فِيْ. هَا) میں۔ اُس یعنی اس میں، سُرُرٌ تخت اس کا مفرد سَرِيرٌ آتا ہے، مَّرْفُوعَةٌ بلند و بالا، اسم مفعول صیغہ واحد مؤنث (رَفَعَ، يَرْفَعُ، رَفْعًا) اٹھانا، بلند کرنا، رفعت منزل، رفیع الشان، جیسے الفاظ اردو زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

اس زمانے کے امراء وسلاطین کی نشست اونچے تختوں ہی پر ہوتی تھی، اِس وجہ سے تمثیل میں اسی کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن جنت ہر جنتی کی خواہش کے مطابق ہوگی، وہ جس شکل میں جنت کی آرائش چاہے گا اس کی جنت اسی شکل میں آراستہ ملے گی۔ (تدبرِ قرآن، ج:٨)

﴿وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ﴾ اور آبخورے (قرینے سے) رکھے ہوں گے۔

وَّ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، أَكْوَابٌ آبخورے، اس کا مفرد، كُوبٌ، آبخورہ، گلاس، پیالہ، بے دستہ کوزہ، (القاموس الوحید) مَّوْضُوعَةٌ رکھے ہوئے (وَضَعَ، يَضَعُ،

وَضْعٌ) رکھنا، اس لفظ میں کسی چیز کو قرینے اور سلیقے سے رکھنے کا مفہوم موجود ہے۔

﴿وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ﴾
اور گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی۔

وَ اور، عاطفہ، نَمَارِقُ گاؤ تکیے اس کا مفرد نُمْرَقَةٌ ہے، مَصْفُوْفَةٌ قطار میں لگے ہوئے (صَفَّ، یَصُفُّ، صَفًّا) لائن میں لگنا، صف بندی کرنا، ''الصَّفُّ'' ہر چیز کی سیدھی لائن، قطار، صف بستہ لوگ جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے ''یُقَاتِلُوْنَ فِی سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ'' وہ اللہ کی راہ میں سیسہ پلائی دیوار کی طرح صف بستہ لڑتے ہیں۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

یعنی ایسے گاؤ تکیے جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ترتیب سے رکھا جائے کہ ان پر ٹیک لگائی جاسکے۔ (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَّ زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَةٌ﴾ اور نفیس فرش بچھے ہوں گے۔

وَّ اور، عاطفہ، زَرَابِیُّ نفیس فرش، قالین، غالیچے۔ اس کا مفرد زِرْبِیَّةٌ ہے، مَبْثُوْثَةٌ، بچھے ہوئے اسم مفعول (بَثَّ، یَبُثُّ، بَثًّا) پھیلانا، بچھانا۔

گویا کہ خوبصورت قالینوں پر گاؤ تکیوں کی قطاریں کتنی دلآویز اور شاندار معلوم ہوں گی۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ابرار وصالحین کو روزِ جزا رب کریم کس قدر لازوال نعمتوں سے بہرہ ور فرمائے گا اور یہ بدلہ ہوگا ان کے اچھے اعمال کا جو انہوں نے دنیا میں سرانجام دیے، اس عارضی اور فانی دنیا میں انہوں نے اپنے نفسوں کو پامال کیا، اللہ تعالیٰ کے احکام کو مانا اور اس کے رسول ؐ کے اتباع میں زندگی گزاری جس کے نتیجہ میں ابدی راحت اور دائمی نعمتوں کو پالیا۔

۲) ایک خوشگوار اور حسین زندگی کا قرآن حکیم نے ایسا نقشہ پیش کیا ہے کہ ایک سلیم الفطرت انسان یقیناً

اس کے حصول کی تمنا اور آرزو کرے گا، تھوڑی سی محنت سے کتنا بڑا اجر اور کتنا بڑا انعام ملتا ہے۔" جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جائیں۔"

....

﴿اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ(۱۷) وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ(۱۸) وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ(۱۹) وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ(۲۰)﴾

تو کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے (عجیب وغریب) پیدا کیے گئے ہیں؟ اور آسمان کو نہیں دیکھتے (کہ بغیر ستونوں کے) وہ کیسا بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے (زمین پر) جمائے گئے ہیں؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح بچھادی گئی ہے۔

﴿اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ﴾

تو کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسا (عجیب وغریب) پیدا کیا گیا ہے۔

اَفَلَا کیا پس نہیں، اَ ہمزہ استفہام، "ف" پس زائدہ ہے، کلام میں زور اور تاکید پیدا کرتا ہے، لَا، نہیں "لَا" نافیہ کہلاتا ہے، یَنۡظُرُوۡنَ وہ دیکھتے فعل مضارع جمع مذکر غائب (نَظَرَ، یَنۡظُرُ، نَظَرًا) دیکھنا، غور کرنا، الۡاِبِلِ اونٹ اور اونٹنیاں، یہ لفظ مؤنث ہے اور جمع کے لیے ہے، اس کا مفرد نہیں ہے۔ (القاموس الوحید)

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

"اونٹ اہل عرب کا سب سے اہم اور سب سے قیمتی جانور ہے۔ وہ اس پر سفر کرتے، اس پر اپنا بوجھ لاد کر لے جاتے، اس کا دودھ پیتے اور گوشت کھاتے اور اس کے بالوں اور کھالوں سے کپڑے اور

خیمے تیار کرتے ہیں، یہ جانوران کی زندگی کا اولین ساز و سامان ہے...... پھر اونٹ کی کچھ امتیازی خصوصیات ہیں جو اسے سب جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں، وہ اپنی طاقت، اپنے جثہ کے عظیم اور ضخیم ہونے اور اپنی خلقت کے مضبوط اور محکم ہونے کے باوجود اتنا مسکین ہے کہ ایک بچہ اس کی مہار پکڑ کر جہاں چاہے، اسے لے جاسکتا ہے اور وہ مطیع و منقاد ہو کر چلا جائے گا، زیادہ منفعت بخش ہونے اور انسان کی بہت زیادہ خدمت کرنے کے باوجود اس کا بار بہت کم ہے، اس کا چارہ آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے اور اس کے سلسلے میں انسان کو کم سے کم تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، وہ بھوک، پیاس، مشقت اور شدید حالات کو سب حیوانات سے زیادہ برداشت کرنے والا اور ان حالات سے سب سے زیادہ مانوس ہے، مزید برآں اس کی ہیئت اس طبعی منظر کے عین مطابق ہے جسے اس سورۃ مبارکہ میں پیش کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم اپنے اولین مخاطبین (اہل عرب) کو اونٹ کی تخلیق پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، اونٹ تو ان کے پاس اور ان کے سامنے موجود ہے، نہ اسے کہیں سے لانے کی ضرورت ہے نہ اس کے لیے جدید علم کی حاجت، ''اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ'' کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے بنائے گئے ہیں...... وہ اونٹ کی تخلیق و تشکیل کو نہیں دیکھتے اور اس پر غور و فکر نہیں کرتے؟ وہ کس طرح ٹھیک اس طرز پر بنایا گیا ہے جو اس کے فرائض حیات اور دنیا میں اس کے رول کے عین مطابق ہے، جو اس کے ماحول اور اس کے وظائف و اعمال سے پوری طرح ہم آہنگ ہے...... یہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے اونٹ کو پیدا نہیں کیا ہے نہ اونٹ نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا ہے، اب بس ایک صورت بچتی ہے اور وہ یہ کہ اونٹ کا ایک خالق ہے، جو اپنی صنعت و تخلیق میں منفرد ہے...... یہ اونٹ اپنے وجود اور اپنی خصوصیات سے نہ صرف اپنے خالق کے وجود کے قطعی ہونے کو واضح کرتے ہیں بلکہ وہ اس کے نظم و تدبیر اَمر اور اس کی منصوبہ بندی کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ (فی ظلال القرآن)

﴿وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ﴾

اور آسمان کو نہیں دیکھتے (کہ بغیر ستونوں کے) وہ کیسے بلند کیا گیا ہے۔

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، اِلَی السَّمَآءِ طرف، آسمان کے، اِلَی،

حروف جارہ میں سے ہے جو اپنے بعد والے اسم کو زیر دیتے ہیں اور وہ مجرور کہلاتا ہے، **السَّمَاءِ**، مجرور ہے، **كَيْفَ** کیسے؟ اسم استفہام، **رُفِعَتْ** بلند کیا گیا، ماضی مجہول، صیغہ واحد مؤنث غائب، (**رَفَعَ، يَرْفَعُ، رَفْعًا**) اوپر اٹھانا، بلند کرنا۔ ارتفاع، رفیع القدر، [عالی مقام، بلند حیثیت] ایسے الفاظ اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔

سید قطبؒ شہید نے اس پر بھی عجیب گفتگو کی ہے:

''قرآن نے انسانی قلب کو آسمان کی طرف بار بار متوجہ کیا ہے لیکن آسمان کی طرف سب سے زیادہ متوجہ ہونے والے صحرا کے باشندے ہیں، ان کے لیے آسمان میں ایک خاص کشش، ایک مخصوص ذائقہ اور لطف ہے...... گویا کہ آسمان صرف صحرا میں ہوتا ہے۔

آسمان اپنے روشن اور واضح دن کے ساتھ، آسمان پر کشش، خوش آئند اور جادو اثر وقتِ عصر کے ساتھ، آسمان اپنے عجیب وغریب، منفرد اور روح پرور غروب کے ساتھ، آسمان اپنی طویل وعریض شب، چمکتے ستاروں اور ساکن گفتگو کے ساتھ، آسمان اپنے خوبصورت، زندہ اور روشن طلوع کے ساتھ...... یہ ہے صحرا کا آسمان!

کیا یہ لوگ اس آسمان کی طرف نہیں دیکھتے؟ کیا وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ وہ کیسے بلند کیا گیا ہے؟ کس نے اسے ستون کے بغیر بلند کیا ہے؟ کس نے اس میں اَن گنت ستاروں کو بکھیر دیا ہے؟ کس نے اس میں یہ رونق، یہ حسن و جمال اور یہ موزونیت اور یہ معنویت رکھی ہے؟ ان لوگوں نے تو آسمان کو بلند نہیں کیا ہے اور آسمانوں نے خود بھی اپنے آپ کو بلند نہیں کرلیا ہے، ناگزیر ہے کہ کوئی اسے بلند کرنے والا ہو، ناگزیر ہے کہ کوئی اس کا خالق ومُبدِع ہو، اِس کے لیے کسی علم اور کسی ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں ہے، گہری نظر اور عمیق فکر ہی اس نتیجہ تک پہنچنے کے لیے کافی ہے۔ (فی ظلال القرآن)

﴿وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ﴾

اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے (زمین پر) جمائے گئے ہیں؟

وَ اور عاطفہ، **اِلَى الْجِبَالِ** طرف، پہاڑوں کے، **جِبَال** کا مفرد **جَبَلٌ** ہے، **كَيْفَ** کیسے، اسم

استفہام، نُصِبَتْ گاڑے گئے (ہیں) فعل ماضی واحد مؤنث غائب (نَصَبَ، یَنْصِبُ، نَصْبًا) کھڑا کرنا، گاڑنا، جھنڈا نصب کرنا (گاڑنا) اردو میں مستعمل ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یعنی کس طرح انہیں زمین پر میخوں کی طرح گاڑ دیا گیا ہے، تاکہ زمین حرکت نہ کرے، نیز ان میں جو معدنیات اور دیگر منافع ہیں، وہ اس کے علاوہ ہیں'' (تفسیر احسن البیان)

﴿وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ﴾

اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح بچھا دی گئی ہے۔

وَ اور، عاطفہ، اِلَى الْاَرْضِ طرف زمین (کے) كَيْفَ کیسے، اسم استفہام، سُطِحَتْ بچھائی گئی (ہے) فعل ماضی واحد مؤنث غائب (سَطَحَ، يَسْطَحُ، سَطْحًا) پھیلانا، بچھانا، ہموار کرنا، رہائش اور کھیتی باڑی کے قابل بنانا، سَطْحُ الْاَرْضِ، زمین کا بالائی ہموار حصہ، سطح بمعنی چھت، ہر چیز کا اوپر کا حصہ اردو میں مستعمل ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے، پانی اپنی سطح ہمیشہ ہموار رکھتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''الابل، السّماء، الجبال، الارض، ان چار چیزوں کی تخصیص وتصریح اس لیے ہے کہ مخاطب اول عرب تھے اور عرب کا سابقہ انھی چاروں سے ہر وقت رہتا تھا، صحرا میں پھرتے پھراتے رہتے تو ساتھ اونٹ ہوتے تھے، اور اطراف میں پہاڑ، اوپر نظر اٹھائی تو آسمان، نظر نیچی کی تو زمین...... ان کے سامنے بحر اوقیانوس اور دریائے گنگا کا نام لینے کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ آیت میں ضمناً یہ بھی آ گیا کہ نہ آسمان، نہ زمین، نہ پہاڑ، نہ جانور کوئی بھی شائبہ، معبودیت والوہیت اپنے اندر نہیں رکھتا، جیسا کہ مشرک قوموں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ یہ سب تمام تر مصنوع ومخلوق ہیں اور خود وجود صانع عالم پر ایک دلیل...... الابل اونٹ کا وجود، راجپوتانہ، سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد، منگولیا، مشرقی ترکستان، ایشیائے کوچک، عراق، شام، فلسطین، مصر، طرابلس، مراکش وغیرہ، افریقہ اور ایشیا کے اکثر علاقوں میں جیسی نعمت ہے اور عرب کے سارے علاقوں میں وہ جو غیر معمولی نعمت کی حیثیت رکھتا ہے وہ ہر صاحبِ خبر پر روشن ہے۔ (تفسیر ماجدی)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اس کائنات میں جو چیز بنائی گئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی کاریگری اور حکمت کا پتہ دیتی ہے اور اس مقصد کے لیے بالکل ٹھیک بنائی گئی ہے جو اُسے انجام دینا ہے، مثلاً اونٹ کے پاؤں چپٹے اور گدی نما ہوتے ہیں کہ وہ ریت میں دھنسنے نہ پائیں اور گھوڑے کے پاؤں سخت اور سم والے ہوتے ہیں کہ کھردری اور پختہ زمین پر زخمی نہ ہونے پائیں۔ انسان اپنے جسم پر غور وفکر کرے، ہر ہر عضو میں خالق کی قدرت نمایاں ہوتی ہے، منہ میں دانت سخت اور نوکیلے بنائے ہیں کہ غذا کو چبا سکیں جبکہ آنکھ کی پتلی نرم بنائی ہے اور اس کی حفاظت کا کس خوبی سے سروسامان کر دیا ہے۔ پھر زمین کو ہموار کر دیا تاکہ انسان اس پر شاہراہیں اور مکانات تعمیر کرے اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں بنا دیا کہ وہ ہلنے نہ پائے۔

۲) اب قابل غور بات یہ ہے کہ یہ ساری تخلیق یوں ہی بے مقصد ہے؟ کیا رب کائنات نے انسان کے لیے ان گنت انعامات یوں ہی مہیا فرما دیے ہیں؟ اور کیا یہ سارا انتظام ربوبیت بغیر کسی مقصد کے ہے؟ انسان کے لیے یہاں نعمتیں تو بے شمار ہیں لیکن کیا اس پر ذمہ داری کچھ بھی نہیں ہے؟ یہ وہ پہلو ہیں جو سوچنے کے قابل ہیں، جس خالق و مالک نے انسان کو طرح طرح کے انعامات سے نوازا ہے، اُسی نے اس کے لیے ہدایت اور رہنمائی کا سروسامان بھی مہیا فرما دیا ہے۔ انبیائے کرام کو بھیجا، ان نفوس قدسیہ کی پاکیزہ زندگیاں دوسروں کے لیے نمونہ بنیں اور سب سے آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور انہیں قرآن حکیم ایسی عظیم کتاب عطا فرمائی تاکہ لوگ اس کی پیروی کر کے دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

....

﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ (۲۱) لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۲۲) اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ (۲۳) فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ (۲۴) اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ (۲۵) ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (۲۶)﴾

اچھا تو (اے نبی ﷺ) نصیحت کرتے رہیے، آپ تو نصیحت کرنے والے ہی ہیں، آپ کچھ ان پر نگران نہیں ہیں، ہاں! جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا، تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا، بے شک ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے، پھر ہمارے ذمے ہے ان سے حساب لینا۔

﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ﴾ اچھا تو (اے نبی ﷺ) نصیحت کرتے رہیے۔

فَذَكِّرْ (ف. ذَكِّرْ) پس۔ آپ نصیحت کیجیے (ذَكَّرَ، يُذَكِّرُ، تَذْكِيْرٌ) یاد دہانی کرانا، وعظ و نصیحت کرنا، اس سے فعل امر ذَكِّرْ صیغہ واحد مذکر حاضر نصیحت کیجیے اِنَّمَآ (اِنَّ. مَآ) بلاشبہ جو، اِنَّمَآ کلمہ حصر ہے جو معنی کو مقید کر دیتا ہے، اس کا معنی ''صرف'' اردو میں کیا جاتا ہے، اَنْتَ 'تو' اور عزت کے طور پر 'آپ'، ضمیر منفصل واحد مذکر حاضر، مُذَكِّرٌ نصیحت کرنے والا، اسم فاعل۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اس بات سے اور اُس بات سے ان کو نصیحت کرتے رہیے، انہیں آخرت سے اور آخرت میں جو عذاب وثواب ہے، اس سے یاد دہانی کرائیے، انہیں کائنات سے اور جو کچھ کائنات میں ہے، اس کے ذریعہ نصیحت کیجیے، ''اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ'' آپ تو صرف یاد دہانی کرانے والے ہیں، بس یہ ہے آپ کی ذمہ داری اور یہ ہیں آپ کی ذمہ داری کی حدود، اس زندگی میں آپ کا رول بس یہی ہے، آپ کا کام صرف تذکیر و تبلیغ کرنا ہے، آپ اِسی کام کے مکلّف ہیں، آپ کو اس کام کی توفیق دی گئی ہے اور یہ کام آپ کے لیے آسان کر دیا گیا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

قرآنِ حکیم نے انبیاء ورسل کی ذمہ داری پیغام حق لوگوں تک بلا کم وکاست پہنچا دینا قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِیۡنَ یُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَ یَخۡشَوۡنَہٗ وَ لَا یَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ (الاحزاب:۳۹)

”جواللہ کے پیغامات (لوگوں تک) پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور ایک اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔“

خاتم المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے:

یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ وَ اِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَہٗ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ۶۷)

”(اے رسول ﷺ) جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کی رسالت کا حق ادا نہ کیا، اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے بچائے گا۔“

پھر اگلی آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوا:

﴿لَسۡتَ عَلَیۡھِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ﴾ آپ ان پر کوئی نگران نہیں ہیں۔

لَسْتَ نہیں ہیں آپ فعل ناقص ماضی واحد مذکر حاضر، عَلَیۡھِمۡ (عَلٰی۔ھِمۡ) پر، ان یعنی ان پر، بِمُصَیۡطِرٍ نگران، اسم فاعل، لفظ دراصل مُسَیۡطِرٌ تھا، سین کو صاد سے بدل دیا گیا، مُسَیۡطِرٌ سے مُصَیۡطِرٌ ہوا، اس کے معنی ہیں وہ شخص جسے کسی کام پر مسلط کیا گیا ہو یعنی نگران۔

ابوبکر جابر الجزائری لکھتے ہیں:

”آپ کو ان لوگوں پر اس لیے مامور نہیں کیا گیا ہے کہ آپ انہیں ایمان اور استقامت کے لیے زبردستی منوائیں۔“ (ایسر التفاسیر)

﴿اِلَّا مَنۡ تَوَلّٰی وَ کَفَرَ ۙ فَیُعَذِّبُہُ اللّٰہُ الۡعَذَابَ الۡاَکۡبَرَ﴾

ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا، تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔

اِلَّا مگر، مَنْ جس نے، اسم موصول، تَوَلّٰی منہ موڑا (تَوَلّٰی، یَتَوَلّٰی، الشیُٔ) دور ہونا، پیٹھ پھیرنا، تَوَلَّی فُلَانٌ ھَارِبًا پیٹھ پھیر کر بھاگنا (القاموس الوحید) وَ کَفَرَ اور کفر کیا، راہ حق کا انکار کیا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (کَفَرَ، یَکْفُرُ کُفُرًا) کفر کرنا، انکار کرنا، فَیُعَذِّبُہُ اللّٰہُ (فَ.یُعَذِّبُ.ہُ) پس، عذاب دے گا، اسے (یعنی منکر کو) اللہ تعالیٰ (عَذَّبَ، یُعَذِّبُ، عَذَابًا) عذاب دینا، سزا دینا، الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ، عذاب، بہت بڑا، الْعَذَابَ موصوف، الْاَکْبَرَ، اس کی صفت ہے، صفت اور موصوف کی اعرابی حالت یکساں ہوتی ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''عذاب اکبر سے مراد جہنم کا دائمی اور ابدی عذاب ہے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَھُمْ، ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَھُمْ﴾

بے شک ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے، پھر ہمارے ذمے ہے ان سے حساب لینا۔

اِنَّ یقیناً، بلاشبہ، مشبہ بالفعل، اِلَیْنَآ (اِلَیْ.نَا) طرف، ہمارے، اِلَیْ حرف جر، نَا ضمیر جمع متکلم مجرور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے، اِیَابَھُمْ (اِیَابَ.ھُمْ) لوٹنا، ان کا (آبَ، یَؤُوبُ، اَیْبًا، وَ اِیَابًا) لوٹنا، دنیا سے (لوٹ کر آنا) ھُمْ کی ضمیر جمع مذکر غائب، تمام بنی نوع انسان کی طرف جاتی ہے اور خصوصاً یہاں پر منکرین حق کی طرف جاتی ہے، ثُمَّ پھر، حرف عطف، اِنَّ یقیناً، بلاشبہ، عَلَیْنَا (عَلَیْ.نَا) پر، ہم یعنی ہم پر ہے (یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ) کے ذمے ہے حِسَابَھُمْ (حِسَابَ.ھُمْ) حساب، ان کا یعنی کفار کا۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یہ ہے اللہ کے رسول اور ان کے بعد ہر داعی کے رول کی حد، خوب جان لو، تم صرف یاد دلانے اور تبلیغ کرنے والے ہو، اِس کے بعد ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے، انہیں لوٹ کر لازماً اس کے پاس جانا ہے، اس سے انہیں کوئی مفر نہیں، وہی ان سے حساب لے گا اور وہی انہیں جزا یا سزا دے گا، اِس سے بچنے کی کوئی شکل نہیں۔

البتہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ تذکیر وموعظت میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اس راہ کی رکاوٹیں دور کی جائیں تاکہ دعوتِ حق بآسانی سب لوگوں تک پہنچ سکے اور تذکیر کی تکمیل ہو سکے...... یہی ہے اسلام میں جہاد کا رول، جیسا کہ قرآن مجید اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے یکساں طور پر واضح ہے، اس میں نہ افراط صحیح ہے اور نہ تفریط۔ (فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم کی دولت ودیعت فرمائی ہے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی عطا کی ہے، اگر وہ انفس وآفاق پر غور وفکر کرے تو خالق کائنات کی ان گنت نشانیاں ہر طرف بکھری پڑی ہیں اور وہ یقیناً اس مالک کی معرفت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ رب کائنات نے انسان کو صحیح بات بتانے اور سیدھا راستہ دکھانے کے لیے اپنی ہدایت اپنے رسولوں کے ذریعے بھیجی۔

۲) ان نفوس قدسیہ کو حکم ہوتا ہے کہ پیغام حق لوگوں تک پہنچاتے رہیں، اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب آئیں انہیں صبر وتحمل سے برداشت کریں اور یہی بات ہر داعی الی اللہ کے لیے زادِ راہ ہے، دعوت کا فریضہ بہر حال جاری وساری رہنا چاہیے، راہ حق پر لانا داعی کا کام نہیں، اسے تو اللہ کی رضا کے لیے اپنے مشن کو جاری رکھنے کا حکم ہے، جو لوگ حق وصداقت کو تسلیم کرلیں، ان کے لیے اجر عظیم ہے اور جو ٹھکرا دیں، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جوابدہ ہیں، اور وہ اس کے عذاب سے کسی طرح بھی بچ نہیں سکتے ہیں۔

..................o..................

سُورَةُ الْفَجر

اس سورۃ مبارکہ کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لوگ اسلام قبول کر رہے تھے اور انہیں طرح طرح سے ستایا جا رہا تھا۔ اس میں اہل مکہ کو عاد اور ثمود اور فرعون ایسے ظالموں کے انجام سے ڈرایا جا رہا ہے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ﷺ جس بات سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہیں اس کے دلائل وشواہد زمین وآسمان کے چپے چپے میں موجود ہیں، رب کائنات کی عظمت وشان ہر طرف جھلکتی ہے، اگر آنکھ بینا ہو تو دانا شخص اس کا خوانِ کرم ہر طرف بچھا ہوا پاتا ہے۔

یہ زندگی اور اس کا ہر ہر لحہ امتحان ہے، اس امتحان میں کامیابی کا راز بھی بتلا دیا گیا ہے، رب کائنات پر ایمان اور صبر وشکر کی زندگی کامیابی کی نوید ہے جبکہ کفر کی روش اور فخر وغرور اور ہوس زر وزمین ناکامی کا راستہ ہے۔ جن لوگوں نے دھن دولت کو مقصد زیست بنایا، تباہی وبربادی ان کا مقدر ٹھہری جیسا کہ عاد وثمود کا انجام ہوا اور جن لوگوں نے احکام الٰہی سے زندگیوں کو آراستہ کیا اور یتامیٰ ومساکین کی خدمت کرتے رہے، وہ فائز المرام ہوئے۔

سُورَةُ الْفَجر

آيات:۳۰ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالۡفَجۡرِ (۱) وَلَیَالٍ عَشۡرٍ (۲) وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ (۳) وَالَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ (۴) ہَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ (۵)﴾

قسم ہے فجر اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور رات کی جب وہ ڈھلنے لگے، کیا عقلمندوں کے لیے ان چیزوں میں کوئی دلیل ہے؟۔

﴿وَالۡفَجۡرِ، وَلَیَالٍ عَشۡرٍ﴾ قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی۔

وَ قسمیہ ہے، واؤ کے معنی کبھی ''اور'' اور کبھی 'قسم' کے ہوتے ہیں، وَلَیَالٍ عَشۡرٍ اور دس راتوں کی، وَ، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے لَیَالٍ، راتیں اس کا مفرد لَیۡلٌ ہے عَشۡرٍ دس کا ہندسہ۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہاں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ اس دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں کہ اس کائنات کا مدبر حقیقی اللہ وحدہ لاشریک ہے اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے، وہ جب چاہتا ہے ایک چیز کو نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو اوجھل کر دیتا ہے، وہی جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے، مجال نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے یا اس کے اختیار میں مداخلت کر سکے۔

''وَالۡفَجۡرِ'' فجر سے مراد وہ وقت ہے جب رات کی تاریکی کا پردہ چاک ہوتا ہے اور دن کی روشنی

مشرقی افق سے نمودار ہوتی ہے، روزے کے احکام کے ضمن میں سورۃ البقرہ میں فرمایا ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (البقرہ:۱۸۷) ''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے۔''

لفظ 'فجر' کے مقابل میں لفظ 'صبح' سے مراد جو وقت ہے وہ نہ صرف فجر پر بلکہ طلوع آفتاب کے بعد کے وقت پر محیط ہے، اس لیے '**وَالْفَجْرِ**' کے ہم معنی صبح کے لفظ سے جہاں قسم کھائی گئی ہے وہاں وضاحت کے لیے الفاظ بڑھائے گئے ہیں مثلاً: **وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ** (التکویر:۱۸) ''شاہد ہے صبح جب وہ سانس لیتی ہے'' یا **وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ** (المدثر:۳۴) ''شاہد ہے صبح جب وہ ہویدا ہو جائے۔''

یہ معیّن ہونے کے بعد کہ فجر سے مراد آغازِ صبح کا وہ وقت ہے جب شب کی تاریکی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، اس آیت میں قسم کا موقع ٹھیک وہی قرار پاتا ہے جو سورۃ مدثر میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے: **وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ، وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ، اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ** (المدثر:۳۳ تا ۳۵) ''شاہد ہے رات جب وہ منہ موڑ چلے اور صبح جب وہ نمودار ہو جائے کہ یہ (قیامت) عظیم حوادث میں سے ہے۔''

سورۃ مدثر کی تفسیر میں مذکورہ آیہ مبارکہ کے ذیل میں واضح کیا گیا ہے کہ رات کی تاریکی جب اپنے ڈیرے ڈالے ہوتی ہے تو اس میں صبح کا نام ونشان نہیں ہوتا، فجر کا وقت ایک بڑے تغیر کا پیغام لاتا ہے جس میں تاریکی کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے اور عالم ایک نیا روپ اختیار کر لیتا ہے، ٹھیک یہی حال قیامت کے ظہور کا بھی ہوگا، یہ دنیا رات کی مانند ہے جس کی تاریکی، صبح قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے، جس طرح رات کے بعد فجر ایک متعین نظام الاوقات کے تحت نمودار ہوتی ہے، اسی طرح ایک وقت آئے گا جب قیامت اچانک وارد ہو جائے گی، اس وقت سب دیکھ لیں گے کہ جس چیز کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ سامنے آگئی۔

یہاں ''والفجر'' کی قسم سے قرآن نے متنبہ کیا ہے کہ فجر کا وقت ہر روز ظہورِ قیامت کا مشاہدہ ایک تمثیلی رنگ میں کراتا ہے، جس طرح تم رات سوتے اور صبح کو آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح مر جانے کے بعد تمہارے اوپر وہ وقت بھی آئے گا جب صور پھونکا جائے گا اور تم صبح قیامت کو اٹھ بیٹھو گے اور ایسا محسوس

کروگے کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہو، لہٰذا قیامت کے ظہور کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ احادیث میں صبح کو اٹھنے کی جو دعا سکھائی گئی ہے، اس میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔" (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ اور دس راتوں کی۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"سلسلۂ بیان نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں، پہلی دس راتیں وہ ہیں جن میں چاند ایک باریک ناخن کی شکل سے شروع ہو کر ہر رات کو بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری دس راتیں وہ جن میں رات کا بڑا حصہ چاند سے روشن رہتا ہے۔ آخری دس راتیں وہ جن میں چاند چھوٹے سے چھوٹا اور رات کا بیشتر حصہ تاریک سے تاریک تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ مہینے کے خاتمے پر پوری رات تاریک ہو جاتی ہے۔" (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ اور جفت اور طاق کی۔

وَ عاطفہ اور قسمیہ، الشَّفْعِ، جفت، وَ اور عاطفہ، الْوَتْرِ طاق۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"جفت وطاق کا ذکر دس راتوں کے ذکر کے بعد آیا ہے اور دس راتیں ہمارے نزدیک چاند کے عروج ومحاق کی ہیں جو اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں کہ ہر چیز کی باگ اللہ وحدہ لاشریک کے ہاتھ میں ہے، اس لیے کہ بعض مہینوں میں یہ راتیں جفت ہوتی ہیں، بعض میں طاق لیکن کسی کے امکان میں نہیں کہ جفت کو طاق یا طاق کو جفت بنا دے خواہ اس کی کتنی ہی تمنا رکھتا ہو، عید کے چاند کے لیے لوگ نہ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں کہ انتیس (29) کو نظر آجائے لیکن وہ تعمیل اپنے رب ہی کے حکم کی کرتا ہے، لوگوں کے جذبۂ شوق اور جوشِ استقبال کی اسے ذرا پروا نہیں ہوتی۔" (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ﴾ اور رات کی جب وہ ڈھلنے لگے۔

وَ اور عاطفہ، الَّيْلِ رات، اِذَا يَسْرِ جب ڈھلنے لگے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یعنی گزرتی ہوئی رات کی...... گویا کہ یہ لفظ ٹھیک فجر کے مقابلہ میں ہے۔'' (تفسیر ماجدی)

﴿هَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ﴾

کیا عقلمندوں کے لیے ان چیزوں میں کوئی دلیل ہے؟

هَلۡ کیا، حرف استفہام، فِیۡ ذٰلِکَ اس بات میں، فِیۡ حرف جر، ذٰلِکَ، اسم اشارہ مجرور، قَسَمٌ (قسموں کی دلیل)، لِّذِیۡ حِجۡرٍ عقلمندوں کے لیے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''حِجۡرٌ کے معنی عقل کے ہیں، لفظ حجر اور عقل دونوں کا لغوی مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے، اِن دونوں ہی کے اندر روکنے اور باندھنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ عقل انسان کو اِن چیزوں سے باز رکھنے کے لیے ایک باطنی لگام ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ اس وجہ سے اس کو حجر سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

اس آیت کا استفہامیہ اسلوب اپنے اندر زجر و ملامت کا مفہوم بھی رکھتا ہے اور اِتمام حجت کا بھی، مطلب یہ ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے عقل جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے تو اس کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ ان نشانیوں سے سبق حاصل کرے جو اس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی زبانِ حال سے اصلی راہ اور منزل کی نشان دہی کر رہی ہیں نہ کہ اس بات پر ضد کرے کہ جب وہ منزل سامنے آجائے گی تب وہ مانے گا کہ بے شک جن لوگوں نے اس سے خبردار کیا تھا انہوں نے سچ کہا تھا، اس وقت ماننا بھی تو حسرت کے سوا اس کو اِس سے کیا فائدہ پہنچے گا۔'' (تدبرِ قرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) ان آیات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جس خالق و مالک کے ہاتھ میں اس کائنات کا نظام ہے اسی کے حکم سے دن کے بعد رات چھا جاتی ہے اور رات کے بعد دن طلوع ہوتا ہے، وہی موت وحیات کا مالک ہے، اگر اس نے زندگی عطا کی ہے تو وہی مارنے کی بھی قدرت رکھتا ہے اور پھر دوبارہ زندہ

کرنے پر بھی قادر ہے ایسے ہی جیسے کہ وہ دن کے بعد رات لے آتا ہے۔

۲) اس حقیقت کی بھی یاددہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ دنیا اپنے انجام کے اسی طرح قریب آ لگی ہے جس طرح سحر کے وقت بس اتنی سی کسر رہ جاتی ہے کہ کب سپیدہ صبح نمودار ہو اور رات کی گیرائی ختم ہو جائے۔ ڈھلنے والی رات اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ انسانی زندگی بھی بالآخر ڈھل کر رہے گی، دن کی چکا چوند روشنی کے بعد غروبِ آفتاب میں اس بات کی نشاندہی ہے کہ زندگی کی شام آ کر رہے گی۔

۳) صرف عقل وفکر سے کام لینے سے ہی حقیقت تک رسائی ہوسکتی ہے، قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر انسانوں کو سوچ بچار سے کام لینے کی دعوت دی ہے، جو لوگ فکر مستقیم کو روشن رکھتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں اور جو اسے پس پشت ڈال دیتے ہیں ناکامی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

....

﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ(٦) اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ(٧) الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ(٨) وَ ثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ(٩) وَ فِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ(١٠) الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ(١١) فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ(١٢) فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ(١٣) اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ(١٤)﴾

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے اونچے اونچے ستونوں والی قوم، (عادِ ارم) کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ جس کی مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی اور قومِ ثمود کا (کیا حشر ہوا؟) جو وادیوں میں پتھروں کو تراشتے تھے (کہ ان

میں عمارات تعمیر کریں) اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (کیا ہوا)؟ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے (اپنے اپنے) علاقوں میں سرکشی اختیار کی تو ان میں فتنہ وفساد کی انتہا کر دی پھر آپ کے رب نے اُن پر عذاب کے تازیانے برسائے، بے شک آپ کا رب (ظالموں) کی تاک میں ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ﴾

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے (قوم) عاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟

اَلَمْ تَرَ کیا آپ نے نہیں دیکھا، أ ہمزہ استفہام، لَمْ نہیں، حرف نفی، تَرَ دیکھا (آپ نے) فعل مضارع واحد مذکر حاضر، اصل میں تَرَی تھا لَمْ کی وجہ سے 'ی' ساقط ہوگئی (رَاٰی، یَرٰی، رؤیَةً) آنکھ سے دیکھنا، ادراک کرنا، کسی واقعہ پر غور وفکر کرنا، اردو میں ''رؤیت ہلال'' (نئے چاند کا دیکھنا) مستعمل ہے، کَیْفَ، کیسے، اسم استفہام، فَعَلَ کیا (معاملہ کیا) فعل ماضی واحد مذکر غائب، رَبُّکَ (رَبُّ. کَ) رب، آپ کا، بِعَادٍ (بِ. عَادٍ) ساتھ عاد (کے)، سیدنا ہود علیہ السلام کی قوم جسے عادِ ارم بھی کہا جاتا ہے، اس قوم کا وصف اگلی آیہ مبارکہ میں آتا ہے۔

﴿اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ ارم بلند ستونوں والے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''قوم عاد کا ذکر پچھلی سورتوں میں، بار بار مختلف پہلوؤں سے گزر چکا ہے، یہاں ان کا ذکر ''اِرَمَ'' کی نسبت سے ہوا ہے، اِرَمَ اُن کے ان اجداد میں سے ہیں، جن سے ان کی عسکری اور تعمیری ترقیوں کا آغاز ہوا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو اِرم بن سام بن نوحؑ سے چلی۔'' (تدبر قرآن)

ذَاتِ الْعِمَادِ بلند ستونوں والے۔ ذَاتِ والے، والی عِمَاد بلند ستون اس کا مفرد عَمَدٌ ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

’’عادارم سے مراد وہ قدیم قومِ عاد ہے جسے قرآن مجید اور تاریخ عرب میں ’’عادِاولیٰ‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔سورۃ نجم میں فرمایا: وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰى (۵۰) اور یہ کہ اس نے قدیم قوم عاد کو ہلاک کیا یعنی اس قومِ عاد کو جس کی طرف سیدنا ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے اور جس پر عذاب نازل ہوا تھا۔اس کے مقابلے میں تاریخ عرب اس قوم کے ان لوگوں کو جو عذاب سے بچ کر بعد میں پھلے پھولے تھے عادِاُخریٰ کے نام سے یاد کرتی ہے، قدیم قومِ عاد کو اِرم اِس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو اِرَم بن سام بن نوح علیہ السلام سے چلی تھی۔

اس شاخ کی کئی دوسری ضمنی شاخیں تاریخ میں مشہور ہیں جن میں سے ایک ثمود ہیں جن کا ذکر قرآن میں آتا ہے اور دوسرے آرامی ہیں جو ابتداءً شام کے شمالی علاقوں میں آباد تھے اور جن کی زبان آرامی سامی زبانوں میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔

’’عاذ‘‘ کے لیے ’’ذَاتُ الْعِمَادِ‘‘ (اونچے ستونوں والے) کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے اور دنیا میں اونچے ستونوں پر عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انہی نے شروع کیا تھا، قرآن مجید میں دوسری جگہ ان کی اس خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: سیدنا ہودؑ نے ان سے فرمایا: اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (الشعراء:۱۲۸-۱۲۹)’’(تمہارا کیا حال ہے) کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔‘‘(تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ﴾

جس کی مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی۔

الَّتِيْ وہ اسم موصول ارم کی طرف اشارہ ہے، لَمْ يُخْلَقْ نہ پیدا کی گئی، مضارع مجہول واحد مذکر غائب، لَمْ کی وجہ سے ’ق‘ پر جزم آیا ہے (خَلَقَ، يَخْلُقُ، خَلْقًا) پیدا کرنا، ایجاد کرنا، يَخْلُقُ سے لَمْ يُخْلَقْ نہ پیدا کی گئی، مِثْلُهَا (مِثْلُ. هَا) مثل، اس کے، مانند، اس کے یعنی قوم ارم کی مانند، فِي الْبِلَادِ دوسرے شہروں میں (علاقوں میں) اس کا مفرد بَلَدٌ ہے (شہر، علاقہ)۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اہل مکہ کو ڈرایا اور دھمکایا جا رہا ہے کہ قبیلہ عاد ایسے لوگ قوت اور طاقت میں، جسامت اور طوالت میں اور شان وشکوہ میں ان سے کہیں بڑھ کر تھے۔ انہوں نے ہود علیہ السلام کی مخالفت کی تو ان کے ان برے اعمال کی وجہ سے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا...... اللہ تعالیٰ کا ان پر عذاب آیا، ان کی بلند و بالا عمارتیں زمین بوس ہوگئیں اور صفحۂ ہستی سے انہیں نیست ونابود کر دیا گیا۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَ ثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾

اورقوم ثمود کا (کیا حشر ہوا؟) جو وادیوں میں پتھروں کو تراشتے تھے (کہ ان میں عمارتیں تعمیر کریں)

وَ اور عاطفہ، ثَمُوْدَ (قوم ثمود) سیدنا صالح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح اور ہدایت کے لیے بھیجا، الَّذِیْنَ اسم موصول، جَابُوا تراشتے تھے، ماضی جمع مذکر غائب (جَابَ، یَجُوْبُ، جَوْبًا) چٹان میں سوراخ کرنا، کاٹنا، الصَّخْرَ سخت پتھروں کو (چٹانوں کو) اس کا مفرد صَخْرَةٌ ہے، بِالْوَادِ (بِ. الْوَادِ) وادیوں میں ب کے معنی کبھی ''ساتھ'' اور کبھی ''میں'' کے ہوتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''عاد کے بعد بالاجمال ثمود کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔ یہ لوگ عاد ہی کے بقایا میں سے تھے اور تعمیر وتمدن کے شوق میں ان کے وارث ہوئے، چنانچہ ان کو عادِ ثانیہ بھی کہا گیا ہے ''وَادِی القریٰ'' ان کا مسکن تھی۔ اس کے پہاڑوں میں انہوں نے اپنے اَسلاف کے طریقہ پر پہاڑوں کو تراش تراش کر اپنے گھر بنائے، جس کی طرف "جَابُوْا الصَّخْرَ" کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں

''وادی قُریٰ'' حجاز اور تبوک کے درمیان ہے، مفسرین کا کہنا ہے کہ قوم ثمود ہی وہ پہلی قوم ہے جنہوں نے پہاڑوں اور چٹانوں کو توڑا اور اپنی قوت کے بل بوتے پر بڑی بڑی سلیں الگ کر کے ان میں گھر بنا دیے، اس طرح وادی قریٰ میں سینکڑوں اور ہزاروں بستیاں آباد کر لیں۔'' (صفوۃ التفاسیر)

قرآن حکیم میں ان کا ذکر سورۃ الحجر میں اس طرح آتا ہے: وَکَانُوا یَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا

اٰمِنِیۡنَ (۸۲) فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّیۡحَةُ مُصۡبِحِیۡنَ (۸۳) فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ (۸۴) ''وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے ایک زبردست دھماکے نے اُن کو صبح ہوتے آلیا اور ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی۔'' ان پر اللہ کا عذاب ان کی بغاوت و نافرمانی کے باعث آیا تھا۔

﴿وَ فِرۡعَوۡنَ ذِی الۡاَوۡتَادِ﴾ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (کیا ہوا)؟

وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، فِرۡعَوۡنَ زمانۂ قدیم میں مصر کے بادشاہ کا لقب (القاموس الوحید) یہاں پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا فرعون مراد ہے جس نے بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے، ذِی الۡاَوۡتَادِ جو میخوں والا تھا، ذِیۡ کے معنی والا کے ہیں یہ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ذی شان (شان و شوکت والا) الۡاَوۡتَادِ میخیں اس کا مفرد وَتَدٌ ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

ذِی الۡاَوۡتَادِ کے لفظی معنی تو میخوں والے کے ہیں لیکن یہاں 'اوتاد' بطریق کنایہ فرعون کی فوجوں کی تعبیر کے لیے آیا ہے، فوجیں بالعموم خیموں میں رہتی ہیں اور خیمے میخوں سے نصب کیے جاتے ہیں، اس وجہ سے عربی میں یہ تعبیر معروف ہے، فرعون کی فوجوں کی کثرت کا ذکر تورات میں بھی ہے اور قرآن میں بھی کئی مقامات میں ہے۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

سورۃ البقرہ میں اس کے عبرتناک انجام کا ذکر اس طرح آتا ہے: وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَیۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ (۵۰) ''(اے بنی اسرائیل) یاد کرو وہ وقت، جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمہارے لیے راستہ بنا دیا اور تمہیں اس میں سے بخیریت گزار دیا اور تمہاری آنکھوں کے سامنے فرعون کو اس کے لاؤ لشکر سمیت غرقاب کیا۔''

﴿الَّذِیۡنَ طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ، فَاَكۡثَرُوۡا فِیۡهَا الۡفَسَادَ﴾

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے (اپنے اپنے) علاقوں میں سرکشی اختیار کی اور ان میں فتنہ و فساد کی انتہا کر دی۔

الَّذِيْنَ اسم موصول (یہ لوگ) جنہوں نے، **طَغَوْا** سرکشی کی، فعل ماضی جمع مذکر غائب (طَغیٰ، يَطْغیٰ، طُغْيَانًا) مناسب حد سے بڑھنا، سرکش ہونا، طاغوت، اللہ تعالیٰ کے ہر نافرمان اور شیطانِ سرکش کو کہتے ہیں، اردو میں طغیانی کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جب دریا اپنے کناروں سے چھلک جاتا ہے تو اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ **فِي الْبِلَادِ** شہروں میں، بستیوں میں، بِلاد کا مفرد بَلَدٌ ہے، **فَاَكْثَرُوْا** (ف. اَكْثَرُوْا) پس انہوں نے زیادتی کی (اَكْثَرَ، يُكْثِرُ) کثیر بنانا، زیادہ کرنا، اردو میں اکثر، کثرت کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، **فِيْهَا** (فِيْ. هَا) میں، ان یعنی ان شہروں اور (بستیوں میں) ھا کی ضمیر شہروں اور بستیوں کی طرف جاتی ہے، **الْفَسَادَ** فتنہ وفساد، یہ لفظ اردو میں بھی معروف ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''یہ ظالم اور سرکش...... عاد، ثمود اور فرعون ظلم اور سرکشی میں حد سے بڑھ گئے تھے اور انہوں نے احکام الٰہی کو توڑ ڈالا تھا، انہوں نے اپنے شہروں اور بستیوں کو ظلم وستم کی آماجگاہ بنا دیا تھا، نافرمانی اور بغاوت ہر طرف پھیل چکی تھی۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾

تو آپ کے رب نے ان پر عذاب کے تازیانے برسائے۔

فَصَبَّ (ف. صَبَّ) پھر۔ مارا، برسایا (صَبَّ، يَصُبُّ، صَبًّا) اوپر سے پانی ڈالنا، انڈیلنا، صَبَّ عَلَيهِ العَذَابَ، سخت عذاب اور تکلیف دینا (القاموس الوحید)

''**فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ** پھر برسایا اُن پر آپ کے رب نے، **سَوْطَ عَذَابٍ** کوڑا عذاب کا، السَّوْطُ، چمڑے کا کوڑا، چابک، تازیانہ، شدت، سختی سَوْط کے اصل معنی باہم خلط ملط ہونے کے ہیں، کوڑا لگنے سے گوشت اور خون خلط ملط ہوتا ہے، اس لیے اسے سوط کہنے لگے، اور سَوْطَ عذاب وہ شدید عذاب ہے جو ہلاکت وتباہی کا موجب بنے، مفسرین کا کہنا ہے کہ لفظ ''صَبّ'' کا استعمال مجرمین کے لیے عذاب کی سرعت اور تیزی کی طرف اشارہ ہے، قوم عاد کو تیز آندھی سے اور قوم ثمود کو شدید اور خوفناک آواز سے جبکہ فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو اللہ تعالیٰ نے پانی کی طوفانی لہروں میں غرق کر دیا۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿اِنَّ رَبَّکَ لَبِالۡمِرۡصَادِ﴾ بے شک آپ کا رب ظالموں کی تاک میں ہے۔

اِنَّ یقیناً، بلاشبہ، کلام میں زور پیدا کرتا ہے اور عربی گرامر میں حرف مشبہ بالفعل کہلاتا ہے۔
رَبَّکَ (رَبَّ. کَ) ربّ۔آپ کا لَبِالۡمِرۡصَادِ (لَ. بِ. الۡمِرۡصَادِ) ضرور بضرور تاک میں ہے۔
لام تاکیدی معنی دیتا ہے، بِ حرف جر اور مِرۡصَاد (تاک میں) مجرور ہے (رَصَدَ، یَرۡصُدُ، رَصَدًا) کسی کی تاک میں لگنا، نگاہ رکھنا۔عربی محاورہ میں کہتے ہیں: ھُوَلَکَ بِالۡمِرۡصَادِ، وہ تمہاری تاک میں ہے، تمہارے انتظار میں ہے تاکہ تم اس سے بچ کر نہ نکل سکو (القاموس الوحید) اَلۡمَرۡصَدُ، رصدگاہ، ستاروں کی گردش دیکھنے کی جگہ اردو میں استعمال ہوتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''(لوگو! یاد رکھو! اللہ تعالیٰ) اگلے سرکشوں کو تو ہلاک کر چکا ہے اور جو لوگ اب موجود ہیں وہ ان سے بھی غافل نہیں ہے۔'' (تفسیر ماجدی)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) تاریخ کے ایسے واقعات انسان کی آنکھیں کھولنے کے لیے اپنے اندر بڑا اسبق رکھتے ہیں۔ مال و دولت کا غرور ہو یا طاقت و زور کا گھمنڈ قطعاً بے معنی چیزیں ہیں، اس سے بڑھ کر ظلم و جور ہے جو رب کائنات کو سخت ناپسند ہے۔

۲) ظالموں اور مجرموں کے لیے دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرتناک عذاب کے نمونے نظر آتے رہتے ہیں اور آخرت کا عذاب نہ معلوم کتنا سخت اور شدید ہوگا۔ پانی کتنی بڑی نعمت ہے، اگر اللہ کے حکم پر طغیانی کی صورت اختیار کر لے تو یہ عذاب بن جاتا ہے، ہوا کتنی بڑی نعمت ہے اگر یہ اس کے حکم سے طوفان کی شکل اختیار کر لے تو عذاب بن جاتی ہے۔ یہ عذاب عاد و ثمود کی بستیوں پر آیا اور فرعون اور اس کا لاؤ لشکر لہروں کی نذر رہوا۔

....

﴿فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ۬ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِ (۱۵) وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ ۙ۬ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ (۱٦)

انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے عزت اور نعمت دے کر آزماتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری عزت بڑھادی اور جب وہ اس کے رزق میں تنگی کرکے اسے آزماتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کردیا۔

﴿فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ۬ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِ﴾

''انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے عزت اور نعمت دے کر آزماتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دی۔''

فَاَمَّا (ف. اَمَّا) پس۔ یہ کہ،اَمّا، حرف شرط وتفصیل ہے اور کبھی تاکید کے معنی دیتا ہے،الۡاِنۡسَانُ انسان، آدمی اس کی جمع اناس ہے،اِذَا جب ظرف زمان، وقت کو ظاہر کرتا ہے،مَا ابۡتَلٰىهُ اس کو آزماتا ہے(اِبۡتَلٰى، يَبۡتَلِىۡ، اِبۡتلاءٌ) آزمائش میں ڈالنا،''ہٗ''کی ضمیر انسان کی طرف جاتی ہے جس کی آزمائش کی جارہی ہو،رَبُّهٗ (رَبُّ. هٗ) رب۔اس کا،''ہٗ''کی ضمیر پھر اسی انسان کی طرف ہے جس کی آزمائش ہو رہی ہے،ابتلاء وآزمائش اردو زبان میں معروف ہے،فَاَكۡرَمَهٗ (ف. اَكۡرَمَ. هٗ) پس۔وہ عزت دیتا ہے، اسے (یعنی اللہ تعالیٰ)،اسی (انسان کو) جس کی آزمائش ہو رہی ہے ہٗ کی ضمیر اس کی طرف جاتی ہے، (اَكۡرَمَ، يُكۡرِمُ، اِكۡرامٌ) عزت دینا، شرف بخشنا، اکرام واحترام اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، وَنَعَّمَهٗ (وَ. نَعَّمَ. هٗ) اور نعمت عطا فرماتا ہے (اللہ تعالیٰ)، اسے (نَعَّمَ، يُنَعِّمُ) خوشحال بنانا، انعام دینا، انعام واکرام سے نوازنا اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے،''ہٗ'' کی ضمیر واحد مذکر غائب اسی شخص کی طرف لوٹتی ہے جس کی انعام واکرام کے ساتھ آزمائش ہو رہی ہے،فَيَقُوۡلُ (ف. يَقُوۡلُ) تو، وہ (شخص) کہنے لگتا ہے

(قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، بولنا، قول وقرار اردو میں بھی مستعمل ہے، رَبِّیْ میرے رب (نے)، اَکْرَمَنِ مجھے عزت دی ہے۔ اصل میں اَکْرَمَنِیْ تھا، آخر میں "ی" کو حذف کر دیا گیا۔ گویا کہ یہ شخص مال و دولت کی فراوانی کو ہی اپنے رب کے ہاں عزت ووجاہت کی علامت خیال کرنے لگا تھا خواہ وہ اعمال صالحہ کے لحاظ سے کچھ بھی نہ تھا۔

﴿وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰـهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ ۵ۙ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَهَانَنِ﴾

اور جب وہ اس کے رزق میں تنگی کر کے اسے آزماتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔

وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کے لیے ہے، اَمَّآ اِذَا مگر جب، اِبْتَلٰـهُ (اِبْتَلٰی. ہٗ) وہ آزماتا ہے، فعل ماضی واحد مذکر غائب (یعنی اللہ تعالیٰ) اسے (اس شخص کو) جس کی آزمائش ہو رہی ہے "ہٗ" کی ضمیر واحد مذکر غائب اسی شخص کی طرف جاتی ہے، فَقَدَرَ (ف. قَدَرَ) پس۔ تنگ کر دیتا ہے (اللہ تعالیٰ) فعل ماضی واحد مذکر غائب (قَدَرَ، یَقْدِرُ، قَدْرًا) یہ لفظ کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے مثلاً قَدَرَ عَلَیْه، قابو یافتہ ہونا، طاقت رکھنا، جیسا کہ قرآن میں آتا ہے اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ (البلد:۵) "کیا (غافل انسان نے) سمجھ رکھا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پا سکے گا۔" قَدَرَ الشَّیْءَ قَدْرًا، اندازہ لگانا، مقدار مقرر کرنا، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (الطلاق:۳) "اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک حساب رکھا ہے۔" قَدَرَ فُلَانًا، قدر کرنا، رتبہ دینا، جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ" (الانعام:۹۱) اس کا معنیٰ "اللہ کا کسی معاملہ کو کسی کے لیے مقدر کرنا اور اس کے حق میں فیصلہ کر دینا۔" بھی ہے۔ قَدَرَ الرِّزْقَ عَلَیْهِ کسی کے رزق میں تنگی کرنا، کمی کرنا جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ [الفجر:۱۶] (القاموس الوحید) فَیَقُوْلُ (ف. یَقُوْلُ) تو (وہ شخص) کہتا ہے، رَبِّیْۤ اَهَانَنِ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا، یہ لفظ دراصل اَهَانَنِیْ تھا، "ی" کے حذف ہونے سے اَهَانَنِ رہ گیا، اس کا مادہ "هَوْنٌ" ہے، اس کے معنی حقارت وذلت کے ہیں اور وقار وانکساری کے بھی ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان:۶۳) اور رحمٰن کے (حقیقی بندے) تو وہ ہیں جو زمین پر وقار وانکساری سے چلتے ہیں (اَهَانَ،

یُھِیۡنُ، اِھَانَۃٌ) ذلیل کرنا، معمولی سمجھنا، اہانت، ذلت اور رسوائی، اردو میں مستعمل ہے۔ یعنی رزق میں تنگی شقاوت اور رسوائی کی علامت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے، اصل رسوائی تو اس کے احکام سے روگردانی کا نام ہے۔

سید قطبؒ شہید نے ان آیاتِ مبارکہ پر بڑی عمدہ گفتگو فرمائی ہے:

''اللہ تعالیٰ جب انسان کو مختلف حالات......رزق کی کشادگی و تنگی اور دولت و افلاس وغیرہ...... سے آزماتا ہے تو اس کے تصورات عام طور پر اسی طرح کے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ جب اسے نعمتیں بخشتا ہے اور دولت و منصب عطا کر کے اسے عزت دیتا ہے تو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ دولت و عزت کے ذریعہ اس کی آزمائش ہو رہی ہے اور اس کے نتیجہ میں اسے جزا یا سزا ملنے والی ہے، وہ اپنی دولت اور اپنے باعزت مقام کو اس بات کی دلیل خیال کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اِعزاز و اکرام کا مستحق ہے اور وہ اللہ کا منتخب اور برگزیدہ بندہ ہے، یہ نادان آزمائش کو جزا اور امتحان کو نتیجہ خیال کرتا ہے، وہ دنیا کے ساز و سامان کو اللہ تعالیٰ کے اِعزاز و اِکرام کا ثبوت سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس جب اللہ تعالیٰ اس پر رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ اس آزمائش کو سزا اور اس امتحان کو عذاب سمجھتا ہے اور رزق کی تنگی سے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وہ اللہ کی نظر میں ذلیل و خوار ہے، اگر اللہ کو اسے ذلیل و خوار نہ کرنا ہوتا تو وہ اسے رزق کی تنگی میں مبتلا نہ کرتا۔

انسان دونوں حالتوں میں غلطی پر ہے......تصور میں بھی غلطی، انداز اور پیمانے میں بھی غلطی...... حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے رزق کی کشادگی یا تنگی اس کی طرف سے اس کے بندے کی آزمائش ہے تا کہ یہ ظاہر ہو کہ وہ نعمتیں پا کر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا کبر و غرور میں مبتلا ہو کر آپے سے باہر ہوتا ہے، پریشانی اور تکلیف میں صبر کرتا ہے یا بے صبری و بے قراری کا مظاہرہ کرتا ہے......جیسی کچھ اس کی روش ہو گی، اسی کے مطابق اسے بعد میں بدلہ ملے گا......کسی شخص کو دنیا کا سامان بخشا گیا یا وہ محروم رکھا گیا، یہ جزا و سزا نہیں ہے......اللہ تعالیٰ کے یہاں انسان کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ اس کے پاس دنیوی سرو سامان کس قدر ہے، نہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دینے یا نہ دینے سے یہ استدلال کرنا چاہیے کہ وہ بندے سے خوش یا ناخوش ہے، اللہ نیک اور بد دونوں کو بخشتا ہے اور وہی نیک و بد دونوں کو محروم کرتا ہے، دنیا میں اس کی بخشش اور عدمِ بخشش قابل لحاظ نہیں ہے، وہ دیتا ہے تا کہ دے کر

آزمائے، وہ محروم رکھتا ہے تاکہ محروم رکھ کر آزمائے......اصل چیز جو قابل اعتماد ہے، وہ اس آزمائش کا رزلٹ ہے۔

انسان کا دل ایمان سے خالی ہوتا ہے تو وہ اللہ کے دینے اور نہ دینے کی حکمت سمجھ نہیں پاتا، نہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی میزان میں کن چیزوں کی قدر و قیمت ہے اور اس کے پیمانے کیا ہیں؟ لیکن جب اس کا دل ایمان سے معمور ہو جاتا ہے تو اس کا رابطہ اللہ سے ہو جاتا ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے یہاں کیا کچھ ہے......اس کی میزان میں دنیا کے حقیر ساز و سامان بے وزن ہو جاتے ہیں، آزمائش کے بعد جو جزا ملنے والی ہے، وہ اس کے لیے بیدار و مستعد ہو جاتا ہے، رزق کی کشادگی اور تنگی دونوں حالتوں میں اس جزا کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر مطمئن رہتا ہے اور دنیا کی ظاہری اور کھوکھلی قدر و قیمت کی حامل اشیاء کے بغیر اللہ کی میزان میں اپنی قدر و قیمت کو جان لیتا ہے۔

قرآن مکہ میں ایسے لوگوں کو خطاب کر رہا تھا......اور ایسے لوگ جاہلیت کے ہر دور اور ہر سماج میں پائے جاتے ہیں جن کا رابطہ زمین سے بلند تر اور وسیع تر کسی عالم سے نہیں ہوتا، جو روزی کی فراخی اور تنگی کے معاملہ میں اپنے رب کے بارے میں اسی طرح کا خیال رکھتے تھے، لوگوں کی قدر و قیمت کو جانچنے کے لیے ان کے پاس یہی پیمانے تھے، دولت اور جاہ و منصب ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھے، ان کے سوا ان کے پاس کوئی اور پیمانہ نہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ دولت سے شدید محبت رکھتے تھے اور دولت سے اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حرص و طمع اور بخل کی گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا تھے، قرآن اس معاملے میں ان کی قلبی کیفیات سے پردہ اٹھاتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ رزق کی فراخی و تنگی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی آزمائش و ابتلا کو، نہ سمجھنے کی اصل وجہ یہی حرص و طمع اور بخل کی بیماریاں ہیں۔" (فی ظلال القرآن)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) راحتوں میں شکر اور مصیبتوں میں صبر زندگی کے وہ ارفع و اعلیٰ پیمانے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہیں اور جن پر اس نے انعام و اکرام کی خوشخبری دی ہے۔

۲) مال ودولت کی فراوانی یا تنگدستی اور مفلسی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت یا عدم قبولیت کے پیمانے نہیں ہیں وہاں تو تقویٰ وطہارت اوراس کے احکام کی بجا آوری اوراطاعت ہی معیارِفضیلت ہیں۔

۳) اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندوں کو مال دے کرآزماتا ہےاورکبھی انہیں غربت وافلاس میں جانچتا ہے، بندۂ مؤمن ان دونوں حالتوں میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہےاورصبروشکراس کی زندگی کا نصب العین ٹھہرتا ہے جبکہ کافران دونوں حالتوں میں غروراور بےصبری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

۴) حقیقت یہ ہے کہ نہ اس زندگی کی نعمتیں اصل نعمتیں ہیں اور نہ یہاں کی تنگی اور پریشانی اللہ تعالیٰ کی ناخوشی اورعذاب کی پہچان ہے۔ یہاں ہر حال میں انسان کا امتحان ہورہا ہے۔پھرکون ہے جواس میں پورااترنے کی کوشش کررہاہے؟

....

﴿كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ(١٧) وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ(١٨)وَ تَأْكلونَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا(١٩)وَ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا(٢٠)﴾

ہرگزنہیں! تم لوگ یتیم کا اکرام نہیں کرتے اورمسکین کوکھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے اورمیت کے ترکےاور وراثت کا مال ہضم کرجاتے ہواور مال ومنالِ دنیاوی سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہو

﴿كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ﴾ ہرگزنہیں!تم لوگ یتیم کا اکرام نہیں کرتے۔

كَلَّا ہرگزنہیں (حرف تنبیہ اورزجر) بَلْ بلکہ، لَّا تُكْرِمُوْنَ تم عزت نہیں کرتے، لَّا نافیہ تاکیدی معنی دیتا ہے، تُكْرِمُوْنَ اکرام کرتے ہو، فعل مضارع جمع مذکر حاضر (اَكْرَمَ، يُكْرِمُ، اِكْرَامٌ) باب افعال، عزت کرنا، اکرام کرنا، الْيَتِيْمَ یتیم، نابالغ بچہ جس کا والد فوت ہوجائے اس کی جمع یتامیٰ آتی ہے،

اسلام نے جس محبت اور پیار کے ساتھ یتامیٰ سے محبت کا سبق دیا ہے وہ تاریخ اسلام کا روشن باب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی یتیمی کا دور دیکھا، سورۃ ضحیٰ میں اس یتیمی کا ذکر کرنے کے بعد آپ ﷺ کو حکم ہوتا ہے: فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ. ''کسی یتیم پر سختی نہ کیجیے''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سوز اور محبت سے یتامیٰ کی خدمت کی وہ سیرت کا مستقل باب ہے اور یہ خوشخبری بھی دی کہ یتیم کی دلجوئی کرنے والا میرے ساتھ جنت میں اتنا قریب ہوگا جس طرح ہاتھ کی دو انگلیاں ہیں۔

﴿وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾

اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے۔

وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، لَا نہ نافیہ، تَحٰٓضُّوْنَ تم رغبت دلاتے ہو، ایک دوسرے کو ترغیب دیتے ہو۔ فعل مضارع جمع مذکر حاضر (حَضَّ، يَحُضُّ، حَضًّا) کسی کام کے لیے خوب زور دینا، ابھارنا، اکسانا جیسا کہ سورۂ ماعون میں آتا ہے: وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ''(منکر اور بخیل شخص) مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا ہے'' اور باب تفاعل کی صورت میں (تَحَاضَّ، يَتَحَاضُّ، تَحَاضٌّ) ایک دوسرے کو رغبت دلانا، عَلٰى طَعَامِ کھانا کھلانے پر، الْمِسْكِيْنِ (مسکین کو) مسکین کی تعریف اس طرح کی گئی ہے، غریب وفادار، وہ شخص جس کے پاس بال بچوں کے لیے کفایت بھر سامان زیست نہ ہو۔ اور جو گلی کوچوں میں مانگتے پھرتے ہیں انہیں سائل کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی بلند تعلیمات میں سے یہ بھی ہے کہ ''وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ. سائل کو بھی نہ جھڑکو [سورۂ ضحیٰ] بلکہ خوش اسلوبی سے اسے سمجھا دو۔'' گویا کہ مسکین وہ شخص ہے جو خودداری اور عزت نفس کی بنا پر لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور گھر کے اخراجات آمدنی سے زیادہ ہیں، ایسے لوگوں کو تلاش کر کے ان کی خدمت کرنا بہت بڑا اجر وثواب ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یعنی حقیقت امر وہ نہیں جو ایمان سے خالی انسان خیال کرتا ہے، رزق کی فراخی اللہ تعالیٰ کے یہاں معرز و محترم ہونے کی دلیل نہیں، نہ رزق کی تنگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں

ذلیل وخوار ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اللہ کی بخشش اور اس کی دی ہوئی دولت کا حق ادا نہیں کرتے، تم یتیم کی، جو صغیر السّن ہے اور والد کے فوت ہونے کے بعد محافظ اور سرپرست سے محروم ہو گیا ہے، عزت و قدر نہیں کرتے ہو...... تم غریبوں کو...... جو تمہارے درمیان موجود ہیں اور ضرورت مند ہونے کے باوجود سوال نہیں کرتے...... کھلانے پلانے پر ایک دوسرے کو آمادہ نہیں کرتے ہو...... قرآن غریبوں کو کھلانے پلانے کے سلسلے میں ایک دوسرے کو نہ ابھارنے اور تاکید نہ کرنے کو قبیح فعل اور شدید برائی قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ فرائض و واجبات اور عمومی خیر کے کاموں کے سلسلے میں ایک دوسرے کو متوجہ کرنا اور ان کی کفالت کرنا سماج کی مشترکہ ذمہ داری ہے...... اور یہ اسلام کی اہم خصوصیت ہے۔

تم آزمائش کی حقیقت سے ناواقف ہو، آزمائش میں کامیابی کا حصول تمہارے پیش نظر نہیں ہے جس کا راستہ یہ تھا کہ یتیم کی عزت کرنے اور غریبوں کے کھلانے پلانے کی ایک دوسرے کو تاکید کرتے، لیکن تم اس کے برعکس بدترین لالچ میں مبتلا ہو، تم ترکہ کا سارا مال ہڑپ کر جاتے ہو، تمہیں دولت سے بے پناہ محبت ہے اور تمہارے دلوں میں محتاجوں کو کھلانے پلانے اور ان کی عزت کرنے کا کوئی داعیہ نہیں رہ گیا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے، مکہ میں دولت جمع کرنے کی شدید حرص سے اسلام کو سابقہ پیش تھا...... اس چیز نے ان کے دلوں کو انتہائی سخت اور بے رحم بنا دیا تھا۔ وہ یتیموں، خصوصاً یتیم لڑکیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی دولت کو مختلف طریقوں سے ہڑپ کر لیتے اور جیسا کہ ہم ''فی ظلال القرآن'' میں مختلف مواقع پر واضح کر چکے ہیں، میراث کے سلسلے میں ان کی لوٹ کھسوٹ بہت زیادہ تھی۔ اسی طرح مال سے محبت عام تھی اور سودی کاروبار کے ذریعہ دولت سمیٹنے کا عمل مکی سماج میں کھلم کھلا جاری تھا...... یہ برائیاں ہر دور اور ہر مقام کے جاہلی سماج کی خصوصیت رہی ہیں...... آج بھی صورت حال یہی ہے۔

ان آیات میں ان کی قلبی کیفیات کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ان کیفیات و اعمال کی شدید مذمت اور ان پر سخت تنقید کی گئی ہے، یہ بات لفظ ''کَلَّا'' (ہرگز نہیں) کی تکرار سے بھی واضح ہوتی ہے اور انداز بیان اور آیات کے آہنگ سے بھی...... آیات کی آواز میں جو شدت ہے، اس سے ان کے حرص کی شدت کی تصویر کشی ہوتی ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿وَ تَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا،وَ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾

اورتم وراثت کے مال کوسمیٹ سمیٹ کرکھا جاتے ہواورتم لوگ مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو۔

وَ اور، تَأْكُلُوْنَ تم کھا جاتے ہوفعل مضارع جمع مذکر حاضر(اَكَلَ، يَأْكُلُ، اَكْلًا) کھا جانا ''ماکولات'' اشیائے خوردنی اردو میں استعمال ہوتا ہے،التُّرَاثَ وراثت،فوت ہونے والے کا مال اور جائیداد،اَكْلًا لَّمًّا کھانے کے درپے (یتامیٰ کا مال ہڑپ کرتے رہنا)، وَ اور،تُحِبُّوْنَ تم محبت کرتے ہوفعل مضارع جمع مذکر حاضر(اَحَبَّ، يُحِبُّ، حُبًّا)پسند کرنا،محبوب ہونا،حُبِّ مال اورحُبِّ جاہ(شان و شوکت)ایسے الفاظ اردو میں استعمال ہوتے ہیں،الْمَالَ مال ومتاع اردو میں بھی معروف ہے حُبًّا جَمًّا بہت زیادہ محبت،حُبًّا کی مزید صفت جَمًّا،جی بھر کر،بہت زیادہ۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''یعنی تم وراثت کے مال کوحریص بن کرکھاتے ہو،تمھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ یہ حرام ہے یا حلال ہے؟اہل عرب نہ صرف وراثت میں اپنا حصہ کھا جاتے بلکہ غیروں کے مال پربھی قبضہ جماتے،اس میں نہ عورتوں کوشامل کرتے اورنہ ہی چھوٹے بچوں کوبلکہ صرف مرد ہی حقدار ٹھہرتے اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہوتے،انہیں ڈرایا اوردھمکایا جارہاہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ زمین توڑکرریزہ ریزہ کردی جائے گی اورتمہیں اپنے رب کے حضوراپنے اعمال کے لیے پیش کردیا جائے گا۔''(صفوۃ التفاسیر)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسان جب مال ودولت کی ہوس میں گرفتار ہوتا ہے تو نتیجتاً بہت سی اخلاقی خوبیوں سے تہی دامن ہو جاتا ہے......انسانیت،شرافت،ہمدردی اورمحبت کے جذبات اس کے اندر سے مٹ جاتے ہیں،وہ اپنے سامنے بے سہارا لوگوں کودیکھتا ہے،یتامی اورمساکین اس کے سامنے نان جویں کے لیے ترس رہے ہوتے ہیں،لیکن اس کی میزانواع واقسام کے کھانوں سے سجی ہوتی ہے اورفالتو کھانا گھروں

کے باہر پھینک دیا جاتا ہے مگر کسی غریب اور بے کس کو کھانا کھلانے کی اسے توفیق نہیں ملتی۔

۲) ''اہل زر'' کے نزدیک مال و دولت کا جمع کرنا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے، وہ ہر جائز اور ناجائز ذرائع سے اسے اکٹھا کرنا زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ کسی یتیم کی مدد کرنا، کسی بیوہ کی خبر لینا اور خلوص دل سے ان کی مدد کرنا، ان کے نزدیک بے کار اشغال ہیں، بلکہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا افسا دلوگوں کے مال پر نظر رکھنا ہے، کسی یتیم اور بے سہارا کے مال کو سمیٹنا، اس کے مکان اور زمین کو ہڑپ کر لینا، اس طرح ناحق زر، زمین کا وارث بن جانا ان کے نزدیک معمولی سی بات ہے، ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں دردناک عذاب ہے، جس کا ذکر اگلی آیات میں ہے۔

....

﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا(۲۱) وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا(۲۲) وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى(۲۳) یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ(۲۴) فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ(۲۵) وَّ لَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ(۲۶) یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ(۲۷) ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً(۲۸) فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ(۲۹) وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ(۳۰)﴾

ہرگز نہیں (اس دن کو نہ بھولو، جس دن) زمین کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ اور آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آکر موجود ہو جائیں گے اور اس دن جہنم کو سامنے لایا جائے گا، اس دن (منکر حق) انسان کو (حقیقت) سمجھ میں آ جائے گی مگر اس وقت سمجھ میں آنے کا کیا فائدہ؟ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے

لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا!

پھر اس دن اللہ جو عذاب دے گا، ویسا عذاب دینے والا، کوئی نہیں۔ وہ جیسا باندھے گا، ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔ (اس وقت صالح انسان کو آواز آئے گی) اے نفس مطمئنہ! چل، اپنے رب کی طرف چل، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، تو میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا!

﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾

ہر گز نہیں (اس دن کو نہ بھولو، جس دن) زمین کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔

كَلَّآ ہرگز نہیں (کلمۂ زجر و تنبیہ) اِذَا جب (ظرف زمان) وقت کو ظاہر کرتا ہے، دُكَّتِ الْاَرْضُ توڑی جائے گی زمین، ماضی مجہول واحد مؤنث غائب (دَكَّ، يَدُكُّ، دَكًّا) دھکیلنا، جھکا دینا، منہدم کرنا، اجاڑ و ویران کرنا، زمین کے نشیب و فراز کو دور کر کے ہموار کرنا (القاموس الوحید)، دَكًّا دَكًّا ریزہ ریزہ۔

﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾

اور آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آ کر موجود ہو جائیں گے۔

وَّجَآءَ اور آئے گا، ماضی واحد مذکر غائب (جَاءَ، يَجِئُ) آنا، رَبُّكَ (رَبُّ. كَ) رب۔ آپ کا، وَالْمَلَكُ اور فرشتے، صَفًّا صَفًّا صف در صف۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اصل الفاظ ہیں ''جَاءَ رَبُّكَ'' جن کا لفظی ترجمہ ہے۔ ''آپ کا رب آئے گا'' لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے لامحالہ اس کو ایک تمثیلی اندازِ بیان ہی سمجھنا ہوگا جس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کی سلطانی و قہاری کے آثار اس طرح ظاہر ہوں گے جیسے دنیا میں کسی بادشاہ کے تمام لشکروں اور اعیانِ

سلطنت کی آمد سے وہ رعب طاری نہیں ہوتا جو بادشاہ کے بنفس نفیس خود دربار میں آجانے سے طاری ہوتا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍم بِجَهَنَّمَ ۙ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰی لَهُ الذِّکْرٰی﴾

اور اس دن جہنم کو سامنے لایا جائے گا، اس دن (منکر حق) انسان کو (حقیقت) سمجھ میں آجائے گی، مگر اس وقت سمجھ میں آنے کا کیا فائدہ؟

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، جِایْٓءَ لائی جائے گی، ماضی مجہول واحد مذکر غائب، یَوْمَئِذٍ (یَوْمَ. اِذٍ) دن، اس یعنی قیامت کے دن، بِجَهَنَّمَ (بِ. جَهَنَّمَ) جہنم۔کو، یَوْمَئِذٍ اس، دن، یَّتَذَکَّرُ یاد کرے گا (تَذَکَّرَ، یَتَذَکَّرُ، تَذَکُّرٌ) یاد کرنا، نصیحت پکڑنا، وَ اَنّٰی لَهُ اور کیا حاصل ہوگا، اسے، اَنّٰی، اسم استفہام، الذِّکْرٰی یاد (کرنے سے)۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اصل الفاظ ہیں ''یَوْمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰی لَهُ الذِّکْرٰی'' اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس روز انسان یاد کرے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہے اور اس پر نادم ہوگا۔ مگر اس وقت یاد کرنے اور نادم ہونے کا کیا فائدہ؟ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس روز انسان کو ہوش آئے گا، اسے نصیحت حاصل ہوگی، اس کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ جو کچھ اسے انبیاء (علیہم السلام) نے بتایا تھا وہی صحیح تھا اور ان کی بات نہ مان کر اس نے حماقت کی، مگر اس وقت ہوش میں آنے اور نصیحت پکڑنے اور اپنی غلطی کو سمجھنے کا کیا فائدہ؟'' (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ﴾

وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا!

یَقُوْلُ وہ کہے گا، فعل مضارع واحد مذکر غائب (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، قول وقرار اردو میں مستعمل ہے، یٰلَیْتَنِیْ (یا. لَیْتَ. نِیْ) اے۔ کاش۔ میں، یا کلمہ ندا، لَیْتَ حرف تمنا، نِیْ ضمیر متکلم،

قَدَّمْتُ پہلے سے بھیج دیتا (دنیا میں اعمال صالحہ سرانجام دیتا) ماضی واحد متکلم (قَدَّمَ، يُقَدِّمُ، تَقْدِيْمٌ) پہلے بھیجنا، آگے کرنا اردو میں قدم کو اس لیے قدم کہتے ہیں کہ وہ آگے کی طرف اٹھتا ہے، پیش قدمی کرنا بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، لِحَيَاتِيْ (لِ. حَيَاتِ. یْ) لیے۔ زندگی۔ اپنی (کے) یعنی میں اپنی زندگی کے لیے کوئی نیک اعمال کی پونجی پہلی زندگی میں اکٹھی کر لیتا۔

سید قطب شہید فی ظلال القرآن میں لکھتے ہیں:

''[غافل انسان روز قیامت کہے گا] اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ کر کے آگے بھیجا ہوتا...... آخرت کی زندگی ہی وہ حقیقی زندگی ہے جس کے لیے ''حیات'' کا لفظ موزوں اور زیبا ہے اور یہی اس قابل ہے کہ انسان اس کے لیے تیاری کرے اور اس کے لیے پیشگی جدوجہد اور عمل کا ذخیرہ کر لے...... یٰلَيْتَنِيْ ''اے کاش'' ایک تمنا ہے جس میں حسرت کا پہلو واضح اور نمایاں ہے اور یہی وہ زیادہ سے زیادہ شے ہے جو آخرت میں انسان کے بس میں ہوگی، اس دردناک حسرت اور اس بے فائدہ تمنا کے بعد قرآن ان کے انجام کی اس طرح تصویر کشی کرتا ہے'':

﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ، وَّ لَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ﴾

پھر اس دن اللہ جو عذاب دے گا، ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں اور وہ جیسا باندھے گا، ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔

فَيَوْمَئِذٍ (ف. يَوْمَ. اِذٍ) پس، اس، دن، لَّا يُعَذِّبُ نہ عذاب دے گا، فعل مضارع واحد مذکر غائب، (عَذَّبَ، يُعَذِّبُ، تَعْذِيْبٌ) عذاب دینا، عَذَابَهٗ (عَذَابَ. هٗ) عذاب۔ اس کا، اَحَدٌ، کسی نے (کوئی بھی) یعنی اس دن اس جیسا کوئی عذاب نہ دے سکے گا، وَّ لَا يُوْثِقُ اور نہ جکڑے گا (وَثَقَ، يَثِقُ، وَثَاقَةً) پائیدار اور مضبوط ہونا، اس سے لفظ میثاق، عہد و پیمان، قول و قرار، معاہدہ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور (اَوْثَقَ، يُوْثِقُ، ایثاقًا) اَلْاَسِيْرَ وَ نَحْوَهٗ، قیدی وغیرہ کو رسی سے مضبوط باندھنا، وثاق باندھنے کی رسی اور بیڑی کو کہتے ہیں۔ (القاموس الوحید)

وَثَاقَهٗ (وَثَاقَ. هٗ) جکڑنا۔ اس جیسا اَحَدٌ، کسی نے یعنی اس دن اس جیسا کوئی جکڑ نہ سکے گا۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا اور جس طرح وہ [مجرمین کو] جکڑے گا ویسا کوئی نہیں جکڑ سکتا، وہ اللہ ہے، قہار و جبار ہے، وہ مجرمین کو ایسا انوکھا اور منفرد عذاب دے گا جس طرح کا عذاب دینا کسی کے بس میں نہیں ہے اور سرکشوں کو اس طرح جکڑ بند کرے گا کہ اس جیسا جکڑ بند کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔

یہاں مجرموں کی قید و بند اور ان کی تعذیب کا ذکر عاد و ثمود اور فرعون کے ظلم، سرکشی اور زمین میں ان کے فساد پھیلانے کے مقابلہ میں ہے۔.....اس ظلم و فساد کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ لوگوں کو سخت سزائیں دیتے اور انہیں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑتے تھے.....تو اے نبی ﷺ! اور مردِ مؤمن! تمہارا رب ان تمام لوگوں کو پابند سلاسل کرے گا اور عذاب دے گا جو لوگوں کو قید و بند میں مبتلا کرتے اور عذاب دیتے ہیں.....لیکن کہاں یہ قید و بند اور کہاں وہ قید و بند! کہاں یہ عذاب اور کہاں وہ عذاب! مخلوق قید و بند اور تعذیب کے سلسلے میں جو کچھ کر سکتی ہے وہ بہت ہلکا ہے، کائنات کا خالق و فرماں روا قید و بند اور تعذیب کے سلسلے میں جو کچھ کر سکتا ہے وہ بہت ہولناک ہے، جو افراد انسانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں ان کی قید و بند اور ان کی تعذیب کے سلسلے میں وہ سب کچھ ہوگا جو ہونا چاہیے۔

ہاں! ہاں! ان کو اس طرح جکڑا اور باندھا جائے گا اور ان کو ایسا ایسا عذاب دیا جائے گا کہ انسانی خیال و گمان کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی!

اس ہیبت ناک، پرہول منظر اور قید و بند اور عذاب کے درمیان ملاءِ اعلیٰ سے مردِ مؤمن کو ندا آتی ہے۔

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ، وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾

اے نفس مطمئنہ! چل، اپنے رب کی طرف چل تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، تو میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا!

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، اے نفسِ مطمئنہ! اے مطمئن جان، یَا حرف ندا، اَيَّةُ، مُنادی پر

''ال'' کا اضافہ مذکر کے لیے ایُّھَا اور مونث کے لیے اَیَّتُھَا، آتا ہے، چونکہ نفس عربی میں مؤنث استعمال ہوتا ہے اس لیے اس کے لیے اَیَّتُھَا آیا ہے۔ یٰٓاَیَّتُھَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ، اے مطمئن جان! کس قدر روحانیت اور اعزاز و اکرام ہے! کیسی تعریف ہے اور سکون سے لبریز کلمات ہیں...... ارۡجِعِیۡٓ اِلٰی رَبِّکِ اپنے رب کی طرف لوٹ آ...... قید و بند کی اس فضا کے بیچ کس قدر آزادی اور نرمی ہے!...... ہاں! زمین سے اپنے سفر اور اپنے گھوارے سے اپنی جدائی کے بعد، اس ہستی کی طرف لوٹ آ، جہاں سے تیری زندگی کا آغاز ہوا تھا...... رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً، تو اس سے خوش، وہ تجھ سے خوش!...... لوٹ آ اپنے رب کے پاس، اس تعلق، معرفت اور نسبت کے ساتھ جو تیرے اور تیرے رب کے مابین ہے...... فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ، آ میرے بندوں میں شامل ہو جا...... یعنی میرے مقرب بندوں میں شامل ہو جا تا کہ قربِ الٰہی حاصل ہو...... کتنی خنکی اور شرینی ہے جو پوری فضا کو محبت اور رضا و خوشی اور خوشنودی سے بھر دیتی ہے...... وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ اور میری جنت میں داخل ہو جا...... میری آغوشِ رحمت میں آ جا...... اس محبت و شفقت میں، جو ان آیات مبارکہ میں ہے، جنت کی ہوائیں آغاز ہی میں چل رہی ہیں ''یٰٓاَیَّتُھَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ، '' کی ندا سے آغاز ہوتا ہے ''مطمئن جان! وہ جان جو اپنے رب سے مطمئن ہے...... جو اس کے راستہ سے مطمئن ہے، جو اللہ کی قضا و قدر سے مطمئن ہے...... جو راحت و مصیبت، رزق کی فراخی و تنگی، اللہ تعالیٰ کے دینے اور نہ دینے ہر حال میں مطمئن ہے، مطمئن ہے اس لیے کہ یہ پاکیزہ روح شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوتی...... مطمئن ہے اس لیے کہ یہ راہِ راست سے منحرف نہیں ہوتی...... مطمئن ہے اس لیے کہ راستہ میں ٹھٹک کر کھڑی نہیں ہوتی، مطمئن ہے تو قیامت کے ہولناک اور پر خوف دن میں ہراساں اور خائف نہیں ہوتی...... یہ ندا ہے۔ اس کے بعد جو آیات آتی ہیں ان سے ساری فضا امن، رضا، خوشنودی اور طمانیت سے بھر جاتی ہے، ساتھ ہی آیات کا خنک اور نرم رو ترنم محبت، قرب اور سکینت کی لہریں بکھیرتا ہے۔

ہاں یہ جنت ہے! یہ اپنے خنک اور خوشگوار انفاس کے ساتھ ان آیات کے بیچ سے جھلکتی ہے اور اللہ تعالیٰ، رحمٰن و کریم کی بزرگ اور حسین و جمیل تجلیات اس پر اپنے انوار بکھیر رہی ہیں۔'' (فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) دنیا کی رنگینیاں اوراس کی چہل پہل انسانوں کی اکثریت کواحکام الٰہی اورآخرت سے غافل بنادیتی ہے......اگرچہ چھوٹے موٹے زلزلے، حادثات اورانسانوں کا مرنا غفلت اور بے پروائی کو دور کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں مگر پھربھی اکثریت اس سے عبرت حاصل نہیں کرتی، زیادہ تر لوگ مال ودولت اورچمکتے ہوئے عارضی سکوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

۲) قرآن حکیم باربارمتنبہ کرتا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی چندروزہ اور بالکل عارضی ہےاور یہ حیات مستعار سراسرامتحان ہے، جولوگ احکام الٰہی کے پابندہوگئےاوراس کے رسولوں کی اطاعت کی، وہ کامیابی سے بہرہ ورہوئے اورجنہوں نے شیطان اورنفس کی پیروی کی اور یہ مختصروقت لہوولعب میں گزاردیا وہ ناکام ہوگئے۔

۳) قرآن کہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے قیامت آئے گی تو وہ دن بڑا بھیانک ہوگا، زمین کی موجودہ شکل قائم نہیں رہے گی، خالق کائنات کے حکم سے تہہ وبالا ہوجائے گا، بلندوبالا پہاڑ اورفلک بوس عمارتیں زمین کے برابرہوجائیں گی اوراس پرتمام بسنے والے پیوندزمین ہوجائیں گے۔

۴) ربّ کائنات کادربارہوگا،اس کے حضورفرشتے قطاراندرقطارکھڑے ہوں گے جواس کےاحکام بجا لانے کے لیے تیارہوں گے، دنیاکےتمام انسان اس کے حکم سے زندہ ہوکراس کے دربارمیں حاضر ہوجائیں گےاورحساب کتاب کادن قائم ہوگا۔

۵) جنت اورجہنم آنکھوں کے سامنے دکھائی دینےلگیں گی، نیکوں کے لیے راحت اورمسرت کا سامان ہوگااور بروں کے لیےحسرت اورافسوس کےسوا کچھ نہ ہوگا۔

..................o..................

سُورَةُ الْبَلَد

یہ مکی سورت ہے اور دعوت کے ابتدائی دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، اس سورۃ مبارکہ کے مضامین کا گزشتہ سورۃ ''الفجر'' سے گہرا ربط ہے، گزشتہ سورت میں انسان کے غرور وتکبر اور ناشکری کا جائزہ لیا گیا تھا کہ مال ملنے پر وہ اترانے لگتا ہے اور مال کی کمی پر وہ ناشکری کا مظاہرہ کرتا ہے، اسی طرح زندگی کی اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال دیتا ہے، غرباء ومساکین کا اسے پاس ولحاظ نہیں رہتا بلکہ ان پر ظلم و ستم ڈھاتا ہے اور ان کے مال کو ہڑپ کر جاتا ہے، افراد ہوں یا اقوام جب وہ اخلاقیات کو نظر انداز کر دیتی ہیں تو ان کا انجام برا ہوتا ہے جیسا کہ قارون اور فرعون کا ہوا یا عاد وثمود ایسی طاقتور قوموں کا ہوا۔

اس سورۃ مبارکہ میں بھی انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی کہ زندگی گزارنے کے لیے دو راستے ہیں......نیکی اور سچائی کا راستہ جس پر چلنے کا انجام دائمی اور ابدی راحت کی صورت میں نکلتا ہے، دوسرا ابدی اور برائی کا راستہ جس کا انجام دکھ اور اذیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ پر چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے برے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

سورۃ کے آغاز میں شہر مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرنے والے مصائب اور پوری اولاد آدمؑ کی حالت کو اس حقیقت پر گواہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے راحت اور آرام کی جگہ نہیں ہے بلکہ سراسر محنت اور مشقت کا مقام ہے، کامیاب وہی لوگ ہیں جو زندگی کو خالق کائنات کے احکام کے مطابق گزارتے ہیں، غربا ومساکین سے محبت رکھتے ہیں، یتامیٰ اور بیوگان کی سرپرستی کرتے ہیں، ایمان کے ساتھ صبر وسلامتی کی راہ اختیار کرتے ہیں، یہی وہ دشوار گزار گھاٹی ہے جسے وہ عبور کر کے ساحل مراد سے ہمکنار ہو جاتے ہیں اور جو اس راہ کو چھوڑ کر نفس کے فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں، شیطان کے بہکاوے میں آ جاتے ہیں، ناکامی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

آیات:۲۰ # سُوۡرَةُ الۡبَلَد رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ(۱) وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ(۲) وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ(۳) لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ كَبَدٍ(۴) اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ اَحَدٌ(۴)﴾

(ارشادربّ العالمین ہے) میں اس شہر (مکہ معظّمہ) کی قسم کھاتا ہوں اور آپ اسی شہر میں رہتے ہیں اور قسم کھاتا ہوں باپ (یعنی آدم علیہ السلام) کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی، درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا؟

﴿لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ﴾

(ارشادرب العالمین ہے) میں اس شہر (مکہ معظّمہ) کی قسم کھاتا ہوں۔

لَآ قسم سے پہلے لا مخاطب کے باطل خیال کی تردید کے لیے لایا جاتا ہے یعنی جو تم نے خیال باندھ رکھا ہے وہ صحیح نہیں بلکہ ہم قسم کے ساتھ کہتے ہیں کہ حقیقت وہ ہے جو ہم بیان کرتے ہیں۔ اِس کی مثالیں جس طرح عربی زبان میں بکثرت موجود ہیں اسی طرح ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے، آپ کسی شخص کی بات کی فوری تردید کرنا چاہیں تو کہتے ہیں 'نہیں' اللہ کی قسم، اصل بات یوں ہے۔'' اُقۡسِمُ میں قسم کھاتا ہوں، فعل مضارع واحد مذکر متکلم (اَقۡسَمَ، یُقۡسِمُ، اِقۡسَامًا) حلف اٹھانا، قسم کھانا، اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، بِهٰذَا الۡبَلَدِ اس شہر کی (یعنی مکہ معظّمہ کی)۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

’’یہاں ’’البلد‘‘ سے مراد مکہ مکرمہ ہے اور قسم کو اس حال کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس شہر میں موجود ہیں، جس سے اشارہ اس طرف ہے کہ مکہ کی قسم اس لیے کھائی جا رہی ہے کہ آپ ﷺ وہاں موجود ہیں یعنی آپ کا وہاں رہنا مکہ کے لیے باعث شرف ہے لیکن اس حقیقت کو اہل مکہ نے نہیں سمجھا اور آپ کو وہاں سے نکال دینے کا فیصلہ کر لیا۔ (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

﴿وَاَنْتَ حِلٌّ ۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ اور آپ اسی شہر میں رہتے ہیں۔

وَ اور، اَنْتَ آپ، ضمیر واحد مذکر حاضر، حِلٌّ رہتے ہیں، اترنا، رہنا، حَلٌّ حِلٌّ، بمعنی حلال، مباح، جائز۔

محترم صوفی عبدالحمید سواتی لکھتے ہیں:

’’ایک معنی تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شہر مکہ میں اترے ہوئے ہیں (مقیم ہیں) اور دوسرا معنی یہ ہے کہ یہاں پر آپ کے لیے لڑائی حلال (مباح) ہے، یعنی آج تو آپ مجبوراً اس شہر کو چھوڑ رہے ہیں، مگر ایک وقت آئے گا جب اس امن والے شہر میں آپ کے لیے لڑائی مباح (حلال) ہوگی، اور آپ اس میں فاتحانہ داخل ہوں گے، آپ کے سامنے کوئی فخر و غرور نہ چل سکے گا اور پھر فتح مکہ والے دن ایسا ہی ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، یہ شہر حرمت والا ہے، یہاں پر لڑائی جائز نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے تھوڑی دیر کے لیے صرف میرے لیے حلال قرار دی، اس کے بعد قیامت تک وہی قانون نافذ ہے، کہ اس امن والے شہر میں لڑائی حلال نہیں ہے۔‘‘ (معالم العرفان فی دروسِ القرآن)

﴿وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ﴾

اور قسم کھاتا ہوں باپ (یعنی آدمؑ) کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی۔

وَ قسم ہے، وَالِدٍ والد کی (یعنی آدمؑ کی) وَ مَا اور اس کی (جو)، وَلَدَ پیدا ہوئی یعنی اولاد۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''چونکہ مطلقاً باپ اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور آگے انسان کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے باپ سے مراد آدم علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد سے مراد وہ تمام انسان ہیں جو دنیا میں پائے گئے ہیں اور اب پائے جاتے ہیں اور آئندہ پائے جائیں گے۔(تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡ كَبَدٍ﴾

درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔

لَقَدۡ درحقیقت، لام جوابِ قسم، قَدۡ حرف تحقیق، خَلَقۡنَا ہم نے پیدا کیا ہے، فعل ماضی جمع متکلم، اللہ تعالیٰ واحد ہے اور اس کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت کے آتا ہے، الۡاِنۡسَانَ (انسان کو) اس سے مراد تمام انسان ہیں جو اب تک پیدا ہوئے یا قیامت تک پیدا ہوں گے۔ فِىۡ كَبَدٍ محنت ومشقت میں۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''اَلۡكَبَدُ، جگر کو کہتے ہیں، اَلۡكُبۡدُ والۡكُبَادُ کے معنی دردِ جگر کے ہیں پھر انسان کا جگر چونکہ وسط جسم میں ہوتا ہے اس لیے تشبیہ کے طور پر وسط آسمان کو كَبِدُ السَّمَآءِ کہا جاتا ہے، نیز اَلۡكَبَدُ کے معنیٰ مشقت اور جگر سوزی کے ہیں۔'' (مفردات القرآن)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ ہے وہ بات جس پر وہ قسمیں کھائی گئی ہیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں، انسان کے مشقت میں پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مزے کرنے اور چین کی بانسری بجانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے یہ دنیا محنت اور مشقت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اس حالت سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ شہر مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی، تب یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا، اس شہر مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں حتیٰ کہ یہاں جنگل کے جانوروں کے لیے امان ہے مگر ان کے

لیے نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ اَحَدٌ﴾

کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا؟

أَ کیا، کلمہ استفہام، یہاں پر زجر و توبیخ کے لیے استعمال ہوا ہے، یَحۡسَبُ وہ گمان کرتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (حَسِبَ، یَحۡسَبُ، حِسۡبَانًا) گمان کرنا، خیال کرنا، اَنۡ لَّنۡ یہ کہ ہرگز نہ، یَّقۡدِرَ قدرت رکھتا ہے، فعل مضارع، واحد مذکر غائب (قَدَرَ، یَقۡدِرُ، قُدۡرَةً) قادر ہونا، طاقت رکھنا، قدرت اور طاقت اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، عَلَیۡهِ اس پر، اَحَدٌ کوئی ایک۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

"کیا یہ مغرور، ظالم، فاسق و فاجر شخص جو اپنی قوت کے نشے میں سرشار ہے، اسے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ، عظیم و برتر اس پر غالب و قادر ہے۔" (صفوۃ التفاسیر)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) اس سورۃ مبارکہ کی اِبتدا "لا" سے ہو رہی ہے جس کا مفہوم "نہیں" ہے، یہ ایک لفظ شروع میں بول کر مخاطبوں کے خیالات اور عقائد کو کھلے طور پر غلط بتانا مقصود ہے یعنی زندگی کے حقائق وہ نہیں ہیں جو یہ لوگ سمجھ رہے ہیں بلکہ اصل حقائق وہ ہیں جو اس کائنات کا خالق و مالک بیان کر رہا ہے۔

۲) قسم بمعنی شہادت کے ہے، ہمارے لیے صرف رب کائنات کی قسم جائز ہے، اس لیے کہ وہ ذاتِ واحد ہمہ دان اور ہمہ بین ہے، وہی ہمارے حال، ماضی اور مستقبل سے واقف ہے۔ وہی ہمارے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے، رب العالمین خالق کائنات ہے اور اس کا ہر ذرہ اور ہر پتہ اس کی ربوبیت پر گواہ اور شاہد ہے۔

۳) اللہ تعالیٰ نے شہر مکہ اور اس میں مقیم خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھا کر ان کی عظمت و حرمت میں اضافہ فرمایا ہے اور ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تسلی و

تشفی دی ہے کہ آج اگر قریش مکہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو تکالیف اور اذیتیں دے رہے ہیں تو بالآخر اللہ تعالیٰ یہیں پر آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو عزت وعظمت سے نوازے گا۔

۴) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ گھبرائیں نہیں اور پریشان نہ ہوں اس لیے کہ انسان مشقت جھیلنے، محنت اور سعی و جہد کرنے، حالات کا مقابلہ کرنے اور شدائد ومصائب برداشت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے، جو شخص کسی عظیم مقصد اور بلند مشن کے لیے جدوجہد کرتا ہے اِس کی طرح وہ شخص نہیں ہوسکتا جو کسی پست اور حقیر مقصد کے لیے تگ ودو کرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا مشن سب سے ارفع واعلیٰ ہے، آپ داعی الی الخیر ہیں۔

۵) ظالم اور سرکش، مال ودولت کے غرور میں آخرت سے بے نیاز ہوجاتا ہے اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ بس یہ دنیا ہی سب کچھ ہے اس ناداں کو کیا خبر کہ کائنات کا خالق و مالک بڑا ہی قدرت والا ہے، اس کی گرفت اور پکڑ اتنی شدید ہوتی ہے کہ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔

....

﴿يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا(٦) اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗ اَحَدٌ(٧) اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ(٨) وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ(٩) وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ(١٠)﴾

وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا، کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں عطا کیے اور دونوں نمایاں راستے اسے نہیں دکھا دیے؟

﴿يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ وہ کہتا ہے کہ میں نے بہت مال خرچ کر ڈالا۔

يَقُوْلُ وہ کہتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا قول وقرار اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، اَهْلَكْتُ میں نے ضائع کیا، اڑا دیا فعل ماضی واحد متکلم (اَهْلَكَ، يُهْلِكُ) ہلاک کرنا، ضائع کرنا، تہلکہ ہر اس امر کو کہتے ہیں جس کا انجام ہلاکت ہو، مَالًا لُّبَدًا مال کو متواتر، مَالًا کی صفت لُّبَدًا ہے دراصل لَبَدٌ اور لُبُوْدٌ کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے، کسی چیز کے ساتھ چپک جانے اور کسی انسان کے گرد جمع ہو جانے کے ہیں پھر بطورِ استعارہ مَالٌ لَابِدٌ ڈھیروں مال کو کہا جاتا ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اَنْفَقْتُ مَالًا لُّبَدًا'' میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا، نہیں کہا بلکہ ''اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا'' کہا جس کے لفظی معنی ہیں ''میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا'' یعنی لٹا دیا یا اڑا دیا۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ کہنے والے کو اپنی مال داری پر کتنا فخر تھا کہ جو ڈھیر سا مال اس نے خرچ کیا، وہ اس کی مجموعی دولت کے مقابلے میں اتنا ہیچ تھا کہ اس کے لٹا دینے یا اڑا دینے کی اسے کوئی پروا نہ تھی اور یہ مال اڑا دینا تھا کس مد میں؟ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود مترشح ہوتا ہے، بلکہ اپنی دولت مندی کی نمائش اور اپنے فخر اور اپنی بڑائی کے اظہار میں، قصیدہ گو شاعروں کو بھاری انعامات دینا، شادی اور غمی کی رسموں میں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی دعوت کر ڈالنا، جوئے میں ڈھیروں دولت ہار دینا، جوا جیت جانے پر اونٹ پر اونٹ کاٹنا اور خوب یار دوستوں کو کھلانا، میلوں پر بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان وشوکت کا مظاہرہ کرنا، تقریبات میں بے تحاشا کھانے پکوانا اور اذنِ عام دینا کہ جس کا جی چاہے آئے اور کھائے، یا اپنے ڈیرے پر کھلا لنگر جاری رکھنا کہ دور دور تک یہ شہرت ہو جائے کہ فلاں رئیس کا دسترخوان بڑا وسیع ہے، یہ اور ایسے ہی دوسرے نمائشی اخراجات تھے جنہیں جاہلیت میں آدمی کی فیاضی اور فراخدلی کی علامت اور اس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا، انہی پر ان کی تعریفوں کے ڈنکے بجتے تھے، انہی پر ان کی مدح کے قصیدے پڑھے جاتے تھے اور وہ خود بھی ان پر دوسروں کے مقابلے میں اپنا فخر جتاتے تھے۔'' (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ﴾ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے نہیں دیکھا؟

أَ کیا، حرف استفہام، یَحْسَبُ وہ خیال کرتا ہے (گمان کرتا ہے) حَسِبَ یَحْسَبُ حِسَابًا خیال کرنا، گمان کرنا، حساب لگانا، شمار کرنا حساب، محاسبہ وغیرہ کے الفاظ اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں، اَنْ لَّمْ یہ کہ نہیں، اَنْ، کہ مصدریہ، لَمْ حرف نفی، نہیں، یَرَهٗ (یَرَ. هٗ) دیکھا۔ اسے، اَحَدٌ کسی نے (رَآی، یَرَیٰ، رُؤْیَةً) آنکھ سے دیکھنا، ادراک رکھنا، رائے رکھنا، اعتقاد و گمان کرنا (القاموس الوحید) رؤیت ہلال، نئے چاند کا دیکھنا اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''کیا یہ فخر جتانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اوپر کوئی خالق و مالک بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ کن ذرائع سے اس نے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا اور کس نیت، کن اغراض اور کن مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے ہاں اس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخر کی کوئی قدر ہوگی؟ اس کا خیال ہے کہ دنیا کی طرح اللہ بھی اس سے دھوکا کھا جائے گا۔'' (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ، وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ﴾

کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں عطا کیے؟

أَ کلمۂ استفہام، کیا (تنبیہ کے لیے)، لَمْ حرف نفی، نہیں، نَجْعَلْ بنایا، ہم نے، لَّهٗ (لَ. هٗ) لیے، اس کے، عَيْنَيْنِ، دو آنکھیں۔ تثنیہ، اس کا مفرد عَيْنٌ، وَلِسَانًا اور ایک زبان، وَّ شَفَتَيْنِ اور دو ہونٹ۔ تثنیہ، اس کا مفرد شَفَةٌ ہے۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو باور کرانا چاہا ہے کہ وہ یقیناً انہیں دوبارہ زندہ کرنے اور ان کا حساب لینے پر قادر ہے، وہ تو وہ ہے جس نے اسے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے، اس نے اسے دو آنکھیں دی ہیں جن کے ذریعہ وہ دیکھتا ہے اور زبان اور دو ہونٹ دیے ہیں جنہیں حرکت دے کر وہ بولتا ہے اور جن کے ذریعہ وہ اپنے منہ کا اندرونی حصہ اور دانتوں کو چھپاتا ہے، تاکہ اس کی شکل و صورت اچھی لگے۔ اور آخرت کی کامیابی کے لیے اس نے اسے خیر و شر دونوں راہیں دکھادی ہیں اور ان میں سے ایک

راہ اختیار کرنے کی صلاحیت دے دی ہے۔

ان نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنتا اور انہیں ارتکاب معاصی کے لیے استعمال نہ کرتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اپنی خواہش نفس کی پیروی کرتا رہا اور نیکی وتقویٰ کی دشوار گزار راہ پر چل کر منزل کو پانے کی کوشش نہیں کی، یعنی نفس اور شیطان کی نافرمانی کر کے اللہ کی اطاعت و بندگی میں نہیں لگا اور اس راہ کی کٹھنائیوں سے کتراتا رہا اور حصول جنت کی کوشش نہیں کی۔''

(تیسیر الرحمٰن، لبیان القرآن)

﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ دونوں نمایاں راستے اسے نہیں دکھا دیے؟

هَدَى، يَهْدِي، هُدًى و هِدَايَة، کسی کو راہ بتانا، راہنمائی کرنا، راستہ بتانا، راستہ دکھانا (القاموس الوحید) 'ہ' کی ضمیر انسان کی طرف جاتی ہے، النَّجْدَيْنِ دو راستے اس کا مفرد نَجْدٌ ہے۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ''النَّجْدُ کے لفظی معنی بلند اور سخت جگہ کے ہیں۔''

''وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ'' اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیے، اس آیہ مبارکہ میں نجدَین کا لفظ حق و باطل، صدق و کذب اور حسن و قبح کے لیے بطور مثال ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں راستے واضح کر دیے ہیں جیسا کہ ایک اور مقام پر فرمایا:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَ اِمَّا كَفُوْرًا (الدھر:۳) ''بلاشبہ ہم نے (انسان کی) راہ راست کی طرف راہنمائی کر دی ہے چاہے تو وہ شکر گزار بنے اور چاہے تو ناشکری کرے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) غافل اور نادان انسان حصولِ مال کے لیے اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر دیتا ہے، وہ ہر جائز اور ناجائز طریقوں سے مال جمع کرتا ہے، پھر اس دھن دولت کا غلط استعمال کرتا ہے۔ وہ اس غرور میں رہتا ہے کہ اب اس پر کوئی قابو نہیں پا سکتا، وہ اللہ کا دیا ہوا مال غلط جگہوں پر خرچ کرتا ہے اور اس کا خرچ کرنا رضائے الٰہی کے لیے نہیں بلکہ نمود و نمائش اور شہرت و ناموری کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

۲) اللہ تعالیٰ نے انسان کو عظیم بنایا ہے......سوچ بچار کرنے کے لیے دل و دماغ، دیکھنے کے لیے بینائی کی قوت، بولنے کے لیے ہونٹ اور زبان، کام کاج کے لیے ہاتھ اور پاؤں، غرضیکہ انسان اس کی تخلیق کا شاہکار ہے۔ جسم و جان کی ان گنت نعمتوں پر اگر وہ غور کرے تو بے اختیار اس کی زبان سے کلماتِ شکر جاری وساری ہو جائیں اور سب سے بڑی نعمت جو اسے رب کائنات نے عطا کی ہے وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے اور حق اور باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت ہے۔ سلامتی فکر کا تقاضا ہے کہ وہ نیکی کو اختیار کرے اور بدی کو چھوڑ دے، راہ حق پر جم جائے اور راہ باطل سے کنارہ کش ہو جائے، اس طرح یقیناً وہ راہ ثواب کو پالیتا ہے اور دنیا اور آخرت کی بھلائیوں سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔

....

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ(۱۱) وَ مَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ(۱۲) فَکُّ رَقَبَةٍ(۱۳) اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ(۱۴) یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ(۱۵) اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ(۱۶)﴾

پھر وہ گھاٹی میں داخل ہی نہیں ہوا اور آپ کیا جانیں کہ (عقبہ) گھاٹی کیا ہے؟ وہ غلامی سے کسی کو چھٹکارا دلانا، یا قحط اور گرانی کے ایام میں کسی رشتہ دار یتیم یا خاک میں پڑے مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ پھر وہ گھاٹی میں داخل ہی نہیں ہوا۔

فَلَا (ف. لَا) پس۔ نہیں، اقْتَحَمَ وہ داخل ہوا (قَحَمَ، یَقْحُمُ، قُحُوْمًا) اپنے کو مشکل میں ڈالنا، اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ کسی گھاٹی یا گڑھے کو پار کرنے کا خطرہ مول لینا۔ (القاموس الوحید)

الْعَقَبَةَ پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ۔ (مفردات القرآن)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”’اِقتِحام‘ کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی سخت اور مشقت طلب کام میں ڈالنا، اور ’عقبہ‘ اس دشوار گزار راستے کو کہتے ہیں جو بلندی پر جانے کے لیے پہاڑوں میں سے گزرتا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو راستے جو ہم نے اسے دکھائے ان میں سے ایک بلندی کی طرف جاتا ہے مگر مشقت طلب اور دشوار گزار ہے، اس میں آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشوں اور شیطان کی ترغیبات سے لڑ کر چلنا پڑتا ہے اور دوسرا آسان راستہ ہے جو کھڈوں میں اترتا ہے مگر اس سے پستی کی طرف جانے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ بس اپنے نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے، پھر آدمی خود نشیب کی طرف لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ آدمی جس کو ہم نے دونوں راستے دکھا دیے تھے، اس نے ان میں سے پستی کی جانب جانے والے راستے کو اختیار کر لیا اور اس مشقت طلب راستے کو چھوڑ دیا جو بلندی کی طرف جانے والا ہے۔“ (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَ مَآ اَدۡرٰىکَ مَا الۡعَقَبَۃُ﴾ اور آپ کیا جانیں کہ گھاٹی کیا ہے؟

وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، مَآ (کیا) استفہامیہ، اَدۡرٰىکَ (اَدۡرٰی.کَ) جانیں۔ آپ اَدۡرٰی، یُدۡرِیۡ، دِرۡیَۃً، باخبر کرنا، علم میں لانا مَا الۡعَقَبَۃُ کہ وہ گھاٹی کیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”یہ اندازِ سوال کسی چیز کی عظمت وشان یا اس کی ہولناکی کے اظہار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے...... یہاں مقصود مخاطبوں کو یہ بتانا ہے کہ تم صرف چند رسوم ادا کر کے (وہ بھی نمود و نمائش کے لیے) اللہ کے مقرب اور چہیتے بننے کے خواب دیکھ رہے ہو حالانکہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے گھاٹیاں پار کرنی اور بازیاں کھیلنی پڑتی ہیں، مال کے پجاری بن کر تم اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتے، اگر یہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو آؤ سنو کہ اس کے لیے تمہیں کیا کیا کام کرنے ہیں۔“ (تدبر قرآن)

﴿فَکُّ رَقَبَۃٍ﴾ وہ غلامی سے کسی کو چھٹکارا دلانا ہے۔

فَکُّ رَقَبَةٍ، آزاد کرنا، گردن کو (غلامی سے نجات دلانا) (فَکَّ، یَفُکُّ، فَکًّا) کھولنا، ڈھیلا کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے فَکَّ الحُزْمَةَ، پیکٹ کھولنا، فَکَّ النُّقُوْدَ بڑے سکہ کو چھوٹے سکوں میں بدلنا، ریزگاری بنانا، فَکَّ الْعُقْدَةَ، گرہ کھولنا، فَکَّ الْغُلَّ اَوِ القَیْدَ، بیڑی یا ہتھکڑی کھولنا، فَکَّ الْاَسِیْرَ قیدی کو رہا کرنا، آزاد کرنا۔ (القاموس الوحید)

رَقَبَةٍ، گردن (کا) رقبہ کا لفظی معنی تو گردن ہے، استعارتًا اس سے مراد شخص، ذاتِ انسانی، غلام یا مکاتب کے لیے جاتے ہیں، اِعْتَقَ رَقَبَةً غلام یا باندی کو آزاد کرنا، (القاموس الوحید)

﴿اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ﴾

یا کھانا کھلانا اس دن میں (جو) فاقے اور بھوک کا ہے۔

اَوْ حرف عطف، اِطْعَامٌ کھانا کھلانا (اَطْعَمَ، یُطْعِمُ، اِطْعَامٌ) کھلانا، فِیْ یَوْمٍ ایسے دن میں، ذِیْ مَسْغَبَةٍ بھوک والے (ایام قحط اور فاقہ میں) (سَغَبَ، یَسْغُبُ، سَغْبًا) بھوکا اور تھکا ہوا ہونا، سخت بھوک لگنا، المَسْغَبَة، قحط، فاقہ مستی۔ (القاموس الوحید)

﴿یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾ یا کسی رشتہ دار یتیم کو۔

یتیم کے معنی نابالغ بچہ کے شفقت پدری سے محروم ہو جانے کے ہیں، انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں یُتم کا اعتبار ماں کی طرف سے ہوتا ہے اور جانور کے چھوٹے بچے کے بن ماں کے رہ جانے کو یتم کہا جاتا ہے۔ ذَا مَقْرَبَةٍ قرابتدار کو (مفردات القرآن) (قَرُبَ، یَقْرُبُ، قُرْبًا) کسی چیز سے قریب و نزدیک ہونا، قریبی، رشتہ دار، اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، الْقِرَابَةُ، رشتہ داری، آپس داری۔ عربی میں کہا جاتا ہے هُمْ ذُوْ قَرَابَتِی، وہ میرے رشتہ دار ہیں۔ (القاموس الوحید)

﴿اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴾ یا خاک میں پڑے ہوئے مسکین کو۔

اَوْ یا، عاطفہ سلسلہ کلام کے لیے۔ مِسْکِیْنًا، مِسْکِیْن اس لفظ کا مادہ (س ک ن) جس کے معنی

ٹھہرنے کے ہیں، السُّکُون حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو کہتے ہیں، کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''سَکَنَ فُلَانٌ مَکَان کذا'' (اس نے فلاں جگہ رہائش رکھ لی) اسی اعتبار سے جائے رہائش کو ''مَسْکَنٌ'' کہا جاتا ہے اس کی جمع مساکِن آتی ہے۔

اسی طرح ''الْمِسْکِیْن'' بعض کے نزدیک وہ شخص ہے ''مَنْ لَّا شَیءَ لَهٗ'' (جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو) اور یہ فقیر سے ابلَغ ہے [یعنی بنسبت فقیر کے زیادہ نادار ہوتا ہے] لیکن آیت ''وَ اَمَّا السَّفِیْنَةُ فَکَانَتْ لِمَسَاکِیْنَ'' اور کشتی غریب لوگوں کی تھی، اس آیہ مبارکہ میں ان لوگوں سے کشتی کے چھن جانے کی حالت میں انہیں مسکین کہا گیا ہے یا اس لیے کہ ان کی احتیاج اور مسکنت کے مقابلے میں کشتی کی کچھ بھی حیثیت نہ تھی۔ (مفردات القرآن)

گویا کہ مسکین وہ شخص ہوتا ہے جس کی آمدنی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے مقابلے میں بہت کم ہو اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں اسے عار ہو، مساکین کی خدمت اور مدد بہت بڑا اجر وثواب ہے، ذَا مَتْرَبَةٍ خاک میں پڑے ہوئے کو (مراد ہے فقر وفاقہ اور غربت وافلاس میں)، ذَا والا، مَتْرَبَةٍ خاک یعنی غریب اور مسکین، التُّربَةُ، مٹی، زمین کی اصل۔ (القاموس الوحید)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اوپر چونکہ (ریاکار) کی فضول خرچیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی بڑائی کی نمائش اور لوگوں پر اپنا فخر جتانے کے لیے کرتا ہے، اس لیے اب اس کے مقابلے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کونسا خرچ اور مال کا کونسا مصرف ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، مگر اس میں نفس کی کوئی لذت نہیں ہے بلکہ آدمی کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے، وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کرے یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کرے یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکالے یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی تاوان کے بوجھ سے لد گیا ہو تو اس کی جان اس سے چھڑائے، اس طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت وافلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بجتے

اور نہ ان کو کھلا کر آدمی کی دولتمندی اور دریا دلی کے وہ چرچے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شاندار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتے ہیں مگر اخلاق کی بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ اسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔'' (تفہیم القرآن)

ان آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بیان فرمائے ہیں مثلاً فَكُّ رَقَبَةٍ (گردن چھڑانے) کے بارے میں آپ ﷺ کی بہ کثرت احادیث روایات میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے ایک ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچالے گا۔ (بخاری و مسلم بحوالہ تفہیم القرآن)

علی بن حسین (امام زین العابدین) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا کہ کیا تم نے ابوہریرہؓ سے یہ حدیث خود سنی ہے؟ انہوں نے کہا ''ہاں'' اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بلایا اور اسی وقت اسے آزاد کر دیا، صحیح مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے ان کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔

مساکین کی مدد کے فضائل بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ کثرت احادیث مبارکہ میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک ابوہریرہؓ کی یہ حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اَلسَّاعِي عَلَى الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِيْنَ كَالسَّاعِي فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اَحْسَبُهُ، قَالَ كَالْقَائِم لَا يَفْتَرُ وَ كَالصَّائِم لَا يَفْطَرُ'' بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا (اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ) مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے اور وہ شخص جو پے در پے روزے رکھے اور کبھی روزہ نہ چھوڑے۔ (بخاری، مسلم بحوالہ تفہیم)

یتامیٰ کے بارے میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ارشادات ہیں، سہل بن سعد کی روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے، جنت میں اس طرح ہوں گے...... یہ فرما کر آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو

اٹھا کر دکھایا اور دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔'' (بخاری، بحوالہ تفہیم)

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور مسکین کو کھانا کھلا۔'' (مسند احمد، بحوالہ ایضاً)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسان نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل سے اس دنیا میں بلند و بالا پہاڑوں کو سر کیا، دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کیا، دریاؤں کو پایاب بنایا، سمندروں کی گہرائیوں میں پہنچا، فضاؤں کو مسخر کیا مگر افسوس کہ نفس کی گھاٹیوں کو عبور کرنے میں آج تک ناکام رہا حالانکہ اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے اس کی عزت وعظمت کا راز اسی میں ہے۔

۲) غلامی کے خلاف جہاد کرنا، اللہ کے غلاموں کو بندوں کی غلامی سے چھڑانا، قحط اور بھوک کے زمانہ میں اپنے رشتہ داروں اور غیروں کی مالی امداد کرنا، غرباء اور مساکین کا سہارا بننا...... یہ ہیں وہ بلندی کے کام جنہیں قرآن حکیم کی زبان میں ''الْعقبه'' کہا گیا ہے۔

....

﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ(۱۷) اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ(۱۸) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ(۱۹) عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ(۲۰)﴾

پھر یہ بھی کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر و ثبات کی اور لطف و مہربانی کی تلقین کرتے رہے، یہی لوگ اَصحابُ الیمین ہیں اور وہ لوگ

جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ اصحاب الشمال ہیں انہیں آگ میں ڈال کر جہنم کا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔

﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾
پھر یہ بھی کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر و ثبات اور لطف و مہربانی کی تلقین کرتے رہے۔

ثُمَّ پھر، حرف عطف، سلسلہ کلام میں تسلسل کے لیے ہے، كَانَ ہوا وہ، فعل ناقص ماضی واحد مذکر غائب (كَانَ، يَكُوْنُ) ہونا، مِنَ الَّذِيْنَ ان لوگوں میں سے، مِنْ، سے حروف جارہ میں سے ہے الَّذِيْنَ وہ لوگ، اسم موصول، اٰمَنُوْا ایمان لانا، وَ اور، عاطفہ، تَوَاصَوْا وصیت کرتے رہے ایک دوسرے کو (تَوَاصَى، يَتَوَاصِىُ، تَوَاصِىٌ) ایک دوسرے کو وصیت کرنا، وصیت اور وصیت کرنا اردو زبان میں بھی استعمال ہوتے ہیں، بِالصَّبْرِ صبر کی، وَ تَوَاصَوْا اور وصیت کرتے رہے ایک دوسرے کو، بِالْمَرْحَمَةِ رحم کرنے کی، لطف و مہربانی کی۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”ان اوصاف کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی مؤمن ہو، کیونکہ ایمان کے بغیر نہ کوئی عمل، عملِ صالح ہے اور نہ وہ اللہ کے ہاں مقبول ہوسکتا ہے، قرآن مجید میں بہ کثرت مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابل قدر اور ذریعۂ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو مثلاً سورۂ نساء میں فرمایا ”جو نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔“ (نساء:١٢٤) سورۂ نحل میں فرمایا: ”جو نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور ہو وہ مؤمن، تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔“ (النحل:٩٧) اور ایسے لوگوں کو ان کا اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے۔ سورۂ مومن میں فرمایا: ”اور جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔“ (مومن:٤٠) قرآن پاک کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عمل صالح کے اجر اور اس کی

جزائے خیر کا ذکر کیا گیا ہے وہاں لازماً اس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ عمل بلا ایمان کو کہیں بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا ہے اور نہ اس پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔

اس مقام پر یہ اہم نکتہ بھی نگاہ سے مخفی نہ رہنا چاہیے کہ آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ "پھر وہ ایمان لایا" بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "پھر وہ ان لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ محض ایک فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ ایمان لا کر رہ جانا مطلوب نہیں ہے، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہر ایمان لانے والا ان دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جائے جو ایمان لائے ہیں تاکہ اس سے اہل ایمان کی ایک جماعت بنے، ایک مؤمن معاشرہ وجود میں آئے اور اجتماعی طور پر ان بھلائیوں کو قائم کیا جائے جن کا قائم کرنا اور ان برائیوں کو مٹایا جائے جن کا مٹانا ایمان کا تقاضا ہے۔" (تفہیم القرآن، ج:٦)

اس آیہ مبارکہ میں ایمان کے بعد ایک صالح معاشرے میں بسنے والوں کی دو اہم خصوصیات کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ اس کے بغیر معاشرتی زندگی پھلتی پھولتی نہیں ہے...... پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں اور دوسری یہ کہ وہ ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کریں۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"جہاں تک صبر کا تعلق ہے، ہم اس سے پہلے بارہا اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ قرآن مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے اس کے لحاظ سے مؤمن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے...... اللہ تعالیٰ کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے۔ اللہ کے احکام کی اطاعت اور پیروی میں صبر کی ضرورت ہے۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں اللہ کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مؤمن بخیریت نہیں گزر سکتا۔ پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و

عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک وقوم اور دنیا بھر کے شیاطین جن وانس کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آجاتی ہے ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے، اب یہ ظاہر بات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہوگا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا۔ بخلاف اس کے اگر ایک مؤمن معاشرہ ایسا موجود ہو جس کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اس معاشرے کے قدم چومیں گی، بدی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی، انسانی معاشرے کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائے گا۔

رہا رحم، تو اہل ایمان کے معاشرے کی امتیازی شان یہی ہے کہ وہ ایک سنگدل، بے رحم اور ظالم معاشرہ نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کے لیے رحیم، شفیق اور آپس میں ایک دوسرے کا ہمدرد وغمخوار معاشرہ ہوتا ہے، فرد کی حیثیت سے بھی ایک مؤمن اللہ کی شانِ رحیمی کا مظہر اور جماعت کی حیثیت سے بھی مؤمنوں کا گروہ اللہ کے اس رسول کا نمائندہ ہے جس کی تعریف میں فرمایا گیا: وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (الانبیاء:۱۰۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑھ کر جس بلند اخلاق صفت کو اپنی امت میں فروغ دینے کی کوشش فرمائی ہے، وہ یہی رحم کی صفت ہے، مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ذیل ارشادات ملاحظہ ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں اس کی کیا اہمیت تھی:

لَا یَرۡحَمُ اللّٰهُ مَنۡ لَا یَرۡحَمُ النَّاس (بخاری، مسلم)

"اللہ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔"

الرَّاحِمُوۡنَ یَرۡحَمُهُمُ الرَّحۡمٰن، اِرۡحَمُوۡا مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ یَرۡحَمۡکُمۡ مَنۡ فِی السَّماءِ (ابوداؤد، ترمذی)

"رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔"

رَجُلٌ رَحِیۡمٌ رَقِیۡقُ الۡقَلۡبِ لِکُلِّ ذِی قُرۡبٰی و مُسۡلِمٍ (مسلم)

”وہ شخص جو ہر رشتہ دار اور ہر مسلمان کے لیے رحیم اور نرم دل ہو (وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے)۔“

مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَ لَمْ يَعْرِفْ حَقَّ كَبِيْرِنَا فَلَيْسَ مِنَّا (ابوداؤد)

”جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھایا اور ہمارے بڑے کا حق نہ پہچانا، وہ ہم میں سے نہیں۔“

ان ارشادات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نیک اعمال کرنے والوں کو ایمان لانے کے بعد اہل ایمان کے گروہ میں شامل ہونے کی جو ہدایت قرآن مجید کی اس آیت میں دی گئی ہے، اس سے کس قسم کا معاشرہ بنانا مقصود ہے۔“ (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿أُولَٰئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ﴾ یہی لوگ اصحاب الیمین ہیں۔

أُولَٰئِكَ یہی ہیں، اسم اشارہ، اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ دائیں ہاتھ والے (خوش نصیب) گویا کہ ان کے دائیں ہاتھ میں ان کا اعمال نامہ دیا جانا ان کی خوش نصیبی کی علامت ہے، جیسا کہ ایک اور مقام پر آتا ہے: فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (الواقعہ:٨) ”دائیں بازو والے سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

”جو لوگ ان اچھی خوبیوں سے آراستہ ہوں گے وہ اہل جنت میں سے ہوں گے، ان کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے اور ابدی و دائمی جنت سے نوازے جائیں گے۔ (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ﴾

اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ اصحاب الشمال ہیں۔

وَ اور، عاطفہ، الَّذِيْنَ وہ لوگ اسم موصول جمع مذکر، كَفَرُوْا جنہوں نے کفر کیا جمع مذکر غائب (كَفَرَ، يَكْفُرُ كُفْرًا) کفر کرنا، انکار کرنا، بِاٰيٰتِنَا (بِ. آيٰتِ. نَا) ساتھ، آیات، ہماری (سے) آیات کا مفرد آيَةٌ اس سے قرآن حکیم کی آیات اور انفس و آفاق کی نشانیاں مراد ہے ”نا“ ضمیر جمع متکلم، ربّ کائنات کی طرف جاتی ہے ”ربِّ واحد“ کی طرف جمع کی ضمیر عزت وعظمت کے لیے آئی ہے، هُمْ وہ ہیں ضمیر جمع

مذکر غائب، اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ بائیں ہاتھ والے (بدنصیب لوگ)۔

احمد مصطفیٰ المراغی لکھتے ہیں:

''یعنی وہ لوگ جنہوں نے نہ صرف انفس وآفاق کی نشانیوں کو نظر انداز کیا بلکہ انبیاء ورسل کی زبانی آیات اللہ سے بھی منہ موڑا وہ اصحاب الشمال کہلائے جیسا کہ قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ان کا ذکر کیا ہے:

وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ (۴۱) مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ (۴۲) وَ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ (۴۳) لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیۡمٍ (۴۴) اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ (۴۵) وَکَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ (۴۶)[الواقعہ] اور بائیں بازو والے، بائیں بازو والوں کی بد نصیبی کا کیا پوچھنا، وہ لُو کی لپیٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ، یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ (تفسیر المراغی)

﴿عَلَیۡهِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَةٌ﴾

انہیں آگ میں ڈال کر جہنم کا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ (اَللّٰهُمَّ اَجِرۡنَا مِنَ النَّارِ)

عَلَیۡهِمۡ (عَلٰی۔هِمۡ) اوپر۔ اُن کے، نَارٌ آگ، مُّؤۡصَدَةٌ چاروں طرف سے بند (وَصَدَ، یَصِدُ) جمنا، قائم رہنا، اَوۡصَدَ، یُؤۡصِدُ، اِیۡصَادٌ باب افعال، بند کرنا، راستہ روکنا جیسا کہ کہا جاتا ہے فَوَقَعَ الۡجَبَلُ عَلٰی بَابِ الۡكَهۡفِ فَاَوۡصَدَهٗ پہاڑ کا کچھ حصہ غار کے دروازہ پر گرا اور اس کا راستہ بند کر دیا۔ (القاموس الوحید)

علامہ طبری لکھتے ہیں: ''ایسی جگہ جو اُن پر ہر طرف سے بند ہوگی۔'' (تفسیر طبری)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) انسان کی حقیقی کامیابی کے لیے صرف اتنی باتیں کافی نہیں ہیں جن کا ذکر اس سے قبل آیات مبارکہ میں آچکا ہے...... انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ کی غلامی میں لانا، غربا ومساکین

کی خدمت محتاجوں اور ناداروں کی مدد، بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری یقیناً عظیم کام ہیں مگران تمام امور میں رب کائنات کی رضا مندی اور اس پر پختہ ایمان ہی آخرت کے اجر کو یقینی بناتا ہے، پھر ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ ہی کے احکام کو جاری وساری کیا جائے......خواہ وہ معاشرت ہو یا معیشت، سیادت ہو یا سیاست، انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی معاملات سب کے سب اسی کے احکام کے تابع ہو جائیں، ایمان والوں کی جماعت میں شامل ہونا ضروری ہے اور پوری امت کا ایک جماعت بن کر رہنا بھی ضروری ہے۔ اسلام میں ہر نیکی کے لیے ایمان شرط ہے، اس کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی ہے، ایمان ہی نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔

۲) ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب اور خوش نصیب لوگ صرف اس بات پر مطمئن نہیں رہتے کہ وہ خود نیکی کا کام کریں بلکہ وہ اپنے گھروں اور اردگرد کے ماحول کو اسی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں، وہ اس راہ میں مصائب و مشکلات سے گزرتے ہیں مگر ایمان کی وجہ سے ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آتی، وہ ایک دوسرے کو صبر و ثبات کی نصیحت کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آتے ہیں، اسی کی دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہیں یہی لوگ دنیا و آخرت میں کامیاب ہیں اور اس راہ سے ہٹ کر جو راستہ بھی اختیار کیا جائے گا اس کا انجام حسرت اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔

..................o..................

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

یہ سورہ مبارکہ دعوت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی، اس وقت قریش مکہ کا عناد اور سرکشی دعوت حق کے خلاف زوروں پر تھے، انہیں صالح علیہ السلام کی قوم ِثمود کا واقعہ سنایا گیا ہے کہ کس طرح اس قوم نے اپنے نبی کی مخالفت کی اور کس انجام بد سے دوچار ہوئی، اگر تم بھی خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرو گے تو اسی انجام سے دوچار ہو جاؤ گے جس سے قوم ثمود ہوئی ہے اور یہ قاعدہ کلیہ قیامت تک لوگوں کو سمجھا دیا گیا ہے کہ جو لوگ بھی احکام الٰہی اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روگردانی کریں گے، سرکشی و عناد کی راہ اختیار کریں گے وہ نقصان اور خسارے میں رہیں گے۔

اس سورۃ میں آفتاب و ماہتاب، لیل و نہار، ارض و سما اور نفس انسانی کی قسم کھا کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ ان سب کا خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے اور یہ سب چیزیں اس کی کبریائی و عظمت پر گواہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جسم و جان اور عقل و فکر کی نعمتیں عطا کر کے اسے بے خبر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ایک فطری الہام کے ذریعے اس کے لاشعور میں نیکی اور بدی میں فرق اور بھلے اور برے کی پہچان کی صلاحیت بھی رکھ دی ہے، اب یہ اس پر ہے کہ وہ اچھے خیالات کو قوت دیتا ہے یا برے خیالات کو پروان چڑھاتا ہے، کامیابی سے بہرہ ور ہوتا ہے یا ناکامی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے، وہ انسان کی نیک سرشت کو عملی سانچے میں ڈھالتا ہے، دنیا و آخرت کی کامیابیوں سے بہرہ ور کرتا ہے، ابدی و دائمی کامیابی کی نوید سناتا ہے، جس طرح "والشمس" میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آفتاب دنیا کو روشن کرتا ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو "سِرَاجًا منیرًا" کہا گیا ہے جس کی کرنیں انسانوں کی روح و اخلاق کو جلا بخشنے کا پیغام دیتی ہیں۔

سُوْرَةُ الشَّمْس

آیات:۱۵ رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا(۱) وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا(۲) وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا(۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا(۴) وَالسَّمَآءِ وَ مَا بَنٰهَا(۵) وَالْاَرْضِ وَ مَا طَحٰهَا(۶) وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا(۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا(۸)﴾

(رب کریم کا ارشاد ہے کہ) سورج اور اس کی روشنی کی قسم، اور چاند کی قسم جبکہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے، اور دن کی قسم جبکہ وہ (سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے، اور رات کی قسم جبکہ وہ (سورج کو) ڈھانپ لیتی ہے، اور آسمان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بنایا، اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے پھیلایا، اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا سنوارا پھر اسے نیکی بدی کا شعور دیا۔

﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا، وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا﴾

کہ سورج اور اس کی روشنی کی قسم اور چاند کی قسم جبکہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔

وَالشَّمْسِ اور قسم ہے سورج کی، وَ قسمیہ ہے عبارت میں اُقسِمُ چھپا ہوا ہے گویا کہ عبارت یوں ہے "اُقْسِمُ بِالشَّمْسِ" میں قسم کھاتا ہوں سورج کی، ضُحٰهَا اور قسم ہے اس کی روشنی (دھوپ) کی۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

ضُحٰی دن کے شروع میں سورج کے بلند ہونے کا وقت ہے، مبرد کہتے ہیں کہ لفظ ضُحٰی ضَحَّ سے نکلا ہے اور اس کے معنی آفتاب کی روشنی ہے اور اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں (رب کریم کا ارشاد ہے) میں قسم کھاتا ہوں سورج اور اس کی پھیلی ہوئی روشنی کی جب یہ دنیا روشن ہوجاتی ہے اور تاریکی چھٹ جاتی ہے۔(صفوۃ التفاسیر)

﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا﴾ اور چاند کی قسم جبکہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔

وَ اور قسمیہ ہے، یہاں بھی عبارت میں اُقسِمُ چھپا ہوا ہے، مفہوم اس طرح ہے ''اُقْسِمُ بِالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا'' میں قسم کھاتا ہوں چاند کی جب وہ سورج چھپنے کے بعد نکلتا ہے (اس کے پیچھے آتا ہے) (تَلا، يَتْلُوْا، تُلُوًّا) پیچھے آنا، نقش قدم پر چلنا، تابع ہونا، پیروی کرنا۔(القاموس الوحید) ''هَا'' کی ضمیر سورج کی جانب لوٹتی ہے کیونکہ وہ عربی زبان میں مؤنث اور چاند مذکر استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ''طَلَعَتِ الشّمسُ اور طَلَعَ القمرُ'' کہا جاتا ہے، گویا کہ غروب آفتاب کے بعد چاند طلوع ہوتا اور اللہ کے حکم سے اپنی روشنی بکھیرنے لگتا ہے، اس کی روشنی گھٹنے بڑھنے لگتی ہے، چودھویں کا چاند (البدر) پورے آب و تاب سے نکلتا ہے، پھر وہ روز بروز گھٹنے لگتا ہے یہاں تک کہ ماہ کے آخر میں نئے چاند (الہلال) کے ظہور سے قبل ایک دو روز کے لیے اللہ کے حکم سے نظر آنا بند ہوجاتا ہے۔ اس کا گھٹنا بڑھنا انسانوں کے لیے ماہ و سال کی تاریخوں کا حساب رکھنے میں مددگار بنتا ہے، غور طلب بات یہ ہے کہ چاند اور سورج اور دیگر ستارے اپنے محور میں گردش کرتے ہیں اور احکام الٰہی کے پابند ہیں کیا مجال کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ نہ سورج چاند کی حدود میں مداخلت کرتا ہے، نہ چاند اپنے وقت سے پہلے ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتا ہے نہ دن کی یہ تاب ہے کہ وہ وقت سے پہلے برآمد ہوجائے اور نہ رات کی یہ طاقت ہے کہ وہ دن کو اپنے فرائض کی بجا آوری سے پہلے برخاست کردے، قرآن حکیم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔:

لَا الشَّمْسُ يَنبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ، وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسین:۴۰) ''نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے

اورسب ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

﴿وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا، وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا﴾

اوردن کی قسم جبکہ وہ (سورج کو) نمایاں کردیتا ہےاوررات کی قسم جبکہ وہ (سورج کو) ڈھانپ لیتی ہے۔

وَ قسمیہ ہے، النَّهَارِ دن، اِذَا جب، جَلّٰهَا (جَلّٰ.هَا) روشن کرے (نمایاں کرے) سورج کو ''ھا'' کی ضمیر سورج کی طرف جاتی ہے کیونکہ وہ عربی زبان میں مؤنث استعمال ہوتا ہے، جَلَّى النَّهَارُ الظُّلْمَةَ دن کا تاریکی کودور کرنا (القاموس الوحید)، وَالَّيْلِ اور قسم ہے رات کی، لیل ونہار (دن رات) اردو میں استعمال ہوتے ہیں، اِذَا يَغْشٰهَا جبکہ وہ (سورج کو) ڈھانپ لیتی ہے،'ھا' کی ضمیر سورج کی طرف جاتی ہے (غَشِيَ، يَغْشَى، غَشًا) تاریک ہونا، پردہ ڈالنا، الغاشیہ، پردہ الْغاشیہ قیامت کو بھی کہتے ہیں۔(القاموس الوحید)

حقیقت یہ ہے کہ رات کا تمام چیزوں پر تاریکی کا پردہ ڈال دینا اور دن کا پورے آب وتاب سے چمکنا دونوں یکساں نہیں ہیں، لیل ونہار کا یہ اختلاف اہل فکرونظر کے لیے رب کائنات کی قدرت کا بہت بڑا نشان ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ، اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ (النور:۴۴)

''رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کررہا ہے، اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے۔''

پھر ایک اور مقام پر فرمایا:

''(اے نبی ﷺ) ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کردے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لادے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے پوچھو، کبھی تم نے سوچا کہ اگر قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کردے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھیں رات لادے تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرسکو؟'' [القصص:۷۱-۷۲]

جہاں دن رات کے اختلاف سے اللہ تعالیٰ کی قدرت عیاں ہے وہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں نیکی میں قدم اٹھانے والا اور اپنی زندگی کو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری میں

گزارنے والا یقیناً اس شخص سے مختلف ہے جو سرکشی اور برائی پر آمادہ رہتا ہے اور نافرمانی اور غداری سے زندگی گزارتا ہے، قرآن حکیم ان دونوں قسم کے لوگوں کا اس طرح موازنہ کرتا ہے:

''انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے، پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھہراتا ہے تا کہ اس کی راہ سے گمراہ کرے (اے نبی ﷺ) اس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اٹھالے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔ کیا اس شخص کی روش بہتر ہے یا اس شخص کی جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ ان سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ (الزمر: ۸-۹)

﴿وَالسَّمَآءِ وَ مَا بَنٰهَا، وَالْاَرْضِ وَ مَا طَحٰهَا﴾

اور آسمان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بنایا اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے پھیلایا۔

وَالسَّمَآءِ اور قسم ہے آسمان کی، وَ مَا بَنٰهَا اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا (بَنَى، يَبْنِيُ، بِنَاءً وَ بُنيانًا) عمارت کھڑی کرنا، تعمیر کرنا (حسی و معنوی دونوں قسم کی بناوٹ) جیسا کہ کہا جاتا ہے بَنَى الرِّجَالَ اس نے افراد تیار کیے، بَنَى عَلَى كَلَامِهِ، اس نے کلام کو نمونہ بنایا، البناء، عمارت، عمارت کی ساخت، البنّاء، معمار، راج۔ (القاموس الوحید) وَالْاَرْضِ اور قسم ہے (و، قسمیہ ہے) زمین کی، وَ مَا طَحٰهَا اور اس ذات کی جس نے اس کو پھیلایا ہے (طَحَا، يَطْحُوْا) پھیلانا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی قدرت وعظمت کی شہادت دی ہے کہ اس نے بغیر ستونوں کے نیلگوں مضبوط آسمان بنا دیا ہے، ''مَا'' اسم موصول ہے یہاں پر ''مَنْ'' کا معنی دیتا ہے یعنی قسم ہے آسمان کی اور جس نے اسے بنایا ہے۔ اس سے مراد رب العالمین ہے دلیل اس کی اس کے بعد والی آیت ہے، جس

میں فرمایا ''فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا'' یعنی وہی عظیم الشان رب جس نے آسمان کو بنایا، اسی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اسے عقل وفکر سے نوازا پھر اس نے زمین کو اس طرح پھیلا دیا کہ انسانوں اور حیوانوں کے لیے چلنا پھرنا، کھیتی باڑی کرنا آسان ہوگیا۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا﴾

اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا سنوارا۔

وَنَفْسٍ اور قسم ہے نفسِ انسانی کی (جان کی)، وَ مَا سَوّٰهَا اور جس نے اسے بنایا سنوارا ''ھا'' کی ضمیر نفس انسانی کی طرف جاتی ہے (سَوّٰی، یُسَوِّی) ٹھیک کرنا، سیدھا اور درست کرنا، مناسب اور معتدل بنانا، نِک سُک سنوارنا۔

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں:

''رب کائنات نے انسان کو بنایا اور اس کے اعضاو جوارح کو متناسب بنایا، جسم وروح اور فکر وشعور کا حسین امتزاج پیدا فرمایا، اور اس میں فطرت ودیعت فرمائی، جیسا کہ حدیث مبارک میں آتا ہے ''کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ'' کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی اور عیسائی بنا لیتے ہیں۔ [زبدۃ التفسیر من فتح القدیر]

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا﴾ پھر اسے نیکی بدی کا شعور دیا۔

فَاَلْهَمَهَا (فَاَلْهَمَ. هَا) پھر سمجھ دی۔ اس (نفس کو) ''ھا'' کی ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے۔ (اَلْهَمَ، یُلْهِمُ، اِلْهَامٌ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں بات ڈالنا، الہام اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ فُجُوْرَهَا (فُجُوْرَ. هَا) بدی۔ اس (نفس میں) (فَجَرَ، یَفْجُرُ، فَجْرًا، فُجُوْرًا) بے پروائی کے ساتھ گناہوں میں مبتلا رہنا، بدکار ہونا، گناہ کرنا، بدکاری کرنا، الفاجر، گنہگار، بدکار۔ (القاموس الوحید)

وَ تَقْوٰهَا (تَقْوٰی. هَا) نیکی۔ اس (نفس میں) یعنی انسانی نفس کو بدی اور نیکی، اچھائی اور برائی کی پہچان کرادی گئی۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور اس کی ہر چیز کو بنایا اور سنوارا اور ہر چیز اس کی قدرت اور حکمت کا پتہ دے رہی ہے...... دل کی آنکھ بینا ہو تو اس کی قدرت کے مظاہر ہر طرف بکھرے پڑے ہیں...... یہ سر بفلک پہاڑ، یہ نیلگوں آسمان، یہ وسیع وعریض زمین، یہ آفتاب اور اس کی چمکتی ہوئی روشنی، یہ ماہتاب اور اس کی دلآویز دھیمی چاندنی جو آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے، رب عظیم وقدیر کی کاریگری اور قدرت کے نشان ہیں۔

۲) قرآن حکیم نے انسان کے سامنے غور وفکر کے لیے وہ چیزیں رکھی ہیں جو روزانہ اس کے مشاہدے میں آتی ہیں، اسے بار بار دعوت دی ہے کہ ان پر ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچ بچار کرتا رہے اور اپنے رب کی نشانیوں کو پہچان کر اس پر ایمان لائے۔

۳) ان تمام چیزوں کی قسم کھا کر یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اس خالق نے انسان کو نیکی اور بدی میں فرق کرنے کی سمجھ عطا کر رکھی ہے لہٰذا انسان کو ان دونوں چیزوں میں سے اس چیز کو اپنانا چاہیے جس کا انجام بہتر ہے اور یقیناً یہ نیکی کا راستہ ہے جس پر چل کر انسان کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

۴) کوئی انسان یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ اسے نیکی بدی کا علم ہی نہیں تھا۔ یہ علم تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے کہ وہ نیکی بدی میں فرق کر سکتا ہے۔

....

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰـهَا(۹) وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا(۱۰)
كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ(۱۱) اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا(۱۲) فَقَالَ
لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰـهَا(۱۳) فَكَذَّبُوْهُ

فَعَقَرُوْهَا، فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰيهَا (۱۴) وَلَا يَخَافُ عُقْبٰـهَا (۱۵)﴾

یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو دبا دیا، (قومِ) ثمود نے اپنی سرکشی کے باعث (صالح علیہ السلام کو) جھٹلایا اور جب اس قوم کا سب سے بدبخت شخص (قدّار) اٹھ کھڑا ہوا تو اللہ کے رسول (صالح علیہ السلام) نے ان کو اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کی باری سے (بھی) خبردار کیا پھر (بھی) انہوں نے اپنے رسول (علیہ السلام) کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، چنانچہ ان کے رب نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل فرمایا اور ان سب کو ملیامیٹ کر دیا اور اللہ کو (ان کی) اس ہلاکت کے انجام سے کوئی اندیشہ نہیں۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔

قَدْ تحقیق کلام کے لیے آتا ہے، یقیناً، اَفْلَحَ فلاح پا گیا (اَفْلَحَ، يُفْلِحُ، اِفْلَاحٌ) باب افعال، فعل ماضی واحد مذکر غائب، فلاح پانا، کامیاب ہونا، مَنْ جو جس نے اسم موصول، زَكّٰهَا (زَكّٰى.هَا) پاکیزہ بنالیا (سنوار لیا)، اس (نفس) کو "ھا" کی ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے (زَكّٰى، يُزَكِّيْ زَكَاءً) بڑھانا، نشوونما دینا، پاک وصاف کرنا، اصلاح کرنا، نیک بنانا (القاموس الوحید)

﴿وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، قَدْ یقیناً، تحقیق کلام کے لیے، خَابَ نامراد ہوا (خَابَ، يَخِيْبُ، خَيْبَةً) ناکام ہونا، نامراد ہونا، نقصان اٹھانا، گھاٹے میں رہنا، (القاموس الوحید) مَنْ جو، جس نے، حرف موصول، دَسّٰهَا (دَسّٰ.هَا) دبا دیا۔ اسے (نفس کو) دَسَّ، يَدُسُّ دَسًّا، چھپانا، دبانا، مکروفریب کرنا، اردو زبان میں دسیسہ کاری بمعنی مکروفریب استعمال ہوتا ہے۔

سید مودودیؒ آیات ۶-۱۰ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

’’کہ اسے اعضا اور حواس اور ذہنی قوتوں کے متناسب امتزاج سے ہموار کر کے خالق نے اس کے اندر بھلائی اور برائی، دونوں کے میلانات، رجحانات اور محرّکات رکھ دیے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور الہامی طور پر اسے ان دونوں کا فرق سمجھا دیا ہے کہ ایک فجور ہے اور وہ بری چیز ہے اور دوسرا تقویٰ ہے اور وہ اچھی چیز ہے، اب اگر سورج اور چاند، دن اور رات، زمین اور آسمان یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان کے اثرات اور نتائج ایک دوسرے سے لازماً مختلف ہیں تو نفس کا فجور اور تقویٰ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود یکساں کیسے ہو سکتے ہیں، انسان خود اس دنیا میں بھی نیکی اور بدی کو یکساں نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا، خواہ اس نے اپنے بنائے ہوئے فلسفوں کی رو سے خیر و شر کے کچھ بھی معیار تجویز کر لیے ہوں، بہر حال جس چیز کو بھی وہ نیکی سمجھتا ہے، اس کے متعلق وہ یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ قابل قدر ہے، تعریف اور صلے اور انعام کی مستحق ہے بخلاف اس کے جس چیز کو بھی وہ بدی سمجھتا ہے اس کے بارے میں اس کی اپنی بے لاگ رائے یہ ہے کہ وہ مذمت اور سزا کی مستحق ہے، لیکن اصل فیصلہ انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے جس نے انسان کا فجور اور تقویٰ اس پر الہام کیا ہے، فجور وہی ہے جو خالق کے نزدیک فجور ہے اور تقویٰ وہی ہے جو اس کے نزدیک تقویٰ ہے اور خالق کے ہاں اِن دونوں کے دو الگ نتائج ہیں، ایک کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اپنے نفس کا تزکیہ کرے وہ فلاح پائے اور دوسرے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو دبا دے وہ نامراد ہو۔

تزکیہ کے معنی پاک کرنا، ابھارنا اور نشو و نما دینا ہے۔ سیاق و سباق سے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے اس کو ابھار کر تقویٰ کی بلندی پر لے جائے اور اس کے اندر بھلائی کو نشو و نما دے وہ فلاح پائے گا، اس کے مقابلہ میں دَسّٰهَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا مصدر تدسیہ ہے اس کے معنی دبانے، چھپانے، اغوا کرنے اور گمراہ کر دینے کے ہیں۔ سیاق و سباق سے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص نامراد ہو گا جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رجحانات کو ابھارنے اور نشو و نما دینے کی بجائے ان کو دبا دے، اس کو بہکا کر برائی کے رجحانات کی طرف لے جائے اور فجور کو اس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اس کے نیچے اس طرح چھپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر

مٹی ڈال دینے کے بعد چھپ جاتی ہے۔" (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ﴾

(قوم) ثمود نے اپنی سرکشی کے باعث (صالح علیہ السلام کو) جھٹلایا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ جھٹلایا قوم ثمود نے (كَذَّبَ، يُكَذِّبُ، تَكْذِيْبٌ) جھٹلانا، قوم کے لیے ماضی واحد مونث غائب کا صیغہ آیا ہے، یہ سیدنا صالح علیہ السلام کی قوم تھی جو نافرمانی کی وجہ سے عذاب الٰہی کا شکار ہوئی، بِطَغْوٰىهَآ (بِ. طَغْوٰ. هَآ) اپنی۔ سرکشی۔ سبب، یہاں پر "ب" سبب کا معنی دیتا ہے، "ھا" کی ضمیر قوم ثمود کی طرف جاتی ہے (طَغٰی، يَطْغِىْ، طَغْيًا وَ طُغْيَانًا) مناسب حد سے بڑھنا، سرکشی اختیار کرنا "طاغوت" ہر سرکش، باغی، شیطان اور اللہ تعالیٰ کے نافرمان کو کہتے ہیں جب دریا کا پانی کناروں سے اُمڈ کر پھیل جاتا ہے تو اسے "طغیانی" کہتے ہیں، یہ لفظ اردو میں جانا پہچانا ہے۔

﴿اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا﴾ جب اس قوم کا سب سے بد بخت شخص (قدار) اٹھ کھڑا ہوا۔

اِذْ جب ظرف زمان، انْبَعَثَ اٹھ کھڑا ہوا، فعل ماضی واحد مذکر غائب اس کا مادہ بَعَثَ ہے معنی بھیجنا، اَشْقٰهَا (اَشْقٰى. هَا) بڑا بد بخت۔ اس قوم کا، "ھا" کی ضمیر قوم ثمود کی طرف جاتی ہے، الشَّقِيُّ بد بخت، بدحال، پریشان حال، ناکام و نامراد، اسی سے اَشْقٰى اسم تفضیل انتہائی بد بخت، "شقاوت قلبی" (دل کی سختی) اردو میں معروف ہے۔

یعنی قوم ثمود نے اپنے نبی صالح علیہ السلام کی نہ صرف نافرمانی کی بلکہ اپنے لیڈر قدّار بن سالف کو اس نافرمانی اور سرکشی میں آگے کر دیا اور وہ اللہ کی اونٹنی کو مار ڈالنے کے لیے آگے بڑھا۔

﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا﴾

تو اللہ کے رسول (صالح علیہ السلام) نے ان کو اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کی باری سے (بھی) خبردار کیا۔

فَقَالَ (فَ.قَالَ) پس کہا (قَالَ، يَقُولُ. قَوْلًا) کہنا، قول و قرار، اردو میں مستعمل ہے، لَهُمْ ان سے هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، قوم ثمود کے افراد کی طرف جاتی ہے، رَسُوْلُ اللّٰهِ اللہ کے رسول، رَسُوْل، مضاف، اللّٰه مضاف الیہ، نَاقَةَ اللّٰهِ اللہ کی اونٹنی، نَاقَةُ، مضاف، اللہ مضاف الیہ، وَ سُقْيٰهَا (وَ.سُقْيٰ.هَا) اور اس کے پانی پینے کی (باری) "ها" کی ضمیر واحد مؤنث غائب اونٹنی کی طرف جاتی ہے (سَقَى، يَسْقِيْ، سَقْيًا) پانی پلانا، ساقی پانی پلانے والا۔

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا﴾

پھر (بھی) انہوں نے (صالح کو) جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔

فَكَذَّبُوْهُ (فَ.كَذَّبُوْا.هُ) پس۔ انہوں نے (قوم ثمود کے لوگوں نے) انہیں، ہٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب سیدنا صالح علیہ السلام کی طرف جاتی ہے، فَعَقَرُوْهَا (فَ.عَقَرُوْا.هَا) پس، انہوں نے کاٹ ڈالیں کونچیں، اس کی، "ھا" کی ضمیر واحد مؤنث غائب اونٹنی کی طرف جاتی ہے (عَقَرَ، يَعْقِرُ) ذبح کرنا، اونٹ کی کونچیں کاٹنا۔

﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰىهَا﴾

چنانچہ ان کے رب نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل فرمایا اور ان سب کو ملیا میٹ کر دیا۔

فَدَمْدَمَ (فَ.دَمْدَمَ) پس۔ ہلاکت ڈالی، عَلَيْهِمْ ان پر، رَبُّهُمْ ان کے رب نے، بِذَنْبِهِمْ (بِ.ذَنْبِ.هِمْ) بسبب۔ گناہ۔ ان (لوگوں کے)، هُم ضمیر جمع مذکر غائب، فَسَوّٰىهَا (فَسَوّٰى.هَا) پس۔صفایا کر دیا۔اس قوم کا (سَوّٰى، يُسَوِّيْ) بلاتفریق سب کو برابر سزا دینا "ھا" کی ضمیر ثمود کی طرف جاتی ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ ثمود کے لوگوں نے سیدنا صالح علیہ السلام کو چیلنج دیا تھا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی پیش کرو، اس پر صالحؑ نے ایک اونٹنی کو معجزے

کے طور پر ان کے سامنے حاضر کر دیا اور ان سے کہا کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے، یہ زمین میں جہاں چاہے گی چرتی پھرے گی، ایک دن سارا پانی اس کے لیے مخصوص ہوگا اور دوسرے دن تم سب کے لیے اور تمہارے جانوروں کے لیے رہے گا۔ اگر تم نے اس کو ہاتھ لگایا تو یاد رکھو کہ تم پر سخت عذاب نازل ہو جائے گا، اس پر وہ کچھ مدت تک ڈرتے رہے، پھر انہوں نے اپنے سب سے زیادہ شریر اور سرکش سردار کو پکارا کہ اس اونٹنی کا قصہ تمام کردے اور وہ اس کام کا ذمہ لے کر اٹھ کھڑا ہوا، سورۃ اعراف میں ہے کہ اونٹنی کو مارنے کے بعد ثمود کے لوگوں نے حضرت صالحؑ سے کہا کہ اب لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے، سورۂ ہود میں ہے کہ صالحؑ نے ان سے کہا تین دن اپنے گھروں میں اور مزے کرلو، اس کے بعد عذاب آجائے گا اور یہ ایسی تنبیہ ہے جو جھوٹی ثابت نہ ہوگی۔ (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا﴾

اور اللہ کو (ان کی) اس ہلاکت کے انجام سے کوئی اندیشہ نہیں۔

وَلَا يَخَافُ اور نہ خائف ہوا وہ (رب قدیر)، وَ اور عاطفہ، لَا نہ نافیہ يَخَافُ وہ خوف کھاتا ہے (خَافَ، يَخَافُ، خَوْفًا) ڈرنا، گھبرانا، عُقْبٰهَا (عُقْبٰى. هَا) انجام۔ ان کے سے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

رب قدیر کو قوم ثمود کی تباہی و بربادی سے مطلق خوف نہ ہوا جیسا کہ دنیا کے بادشاہ اور سردار اپنے کیے کے انجام پر خائف و پریشان رہتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے اس بات پر کوئی باز پرس نہیں کرسکتا ہے جو وہ کرتا ہے۔ (صفوۃ التفاسیر)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

١) قرآن حکیم چھوٹے چھوٹے جملوں میں کامیابی کی نوید دیتا ہے، غور کیجیے ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا'' کتنے مختصر اور جامع الفاظ ہیں کہ جس نے اپنا نفس سنوار لیا وہ یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوگیا، وہ شخص ابدی اور دائمی زندگی سے بہرہ ور ہوگیا، اس نے اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی جنت میں اپنا ٹھکانہ بنالیا۔

۲) یہ نفس کیسے سنورتا ہے؟ اس کا جواب بھی قرآن حکیم نے بڑا ہی مختصر دے دیا ہے ’’جو شخص خالق کائنات پر ایمان لایا اور جو شاہراہ عمل پر گامزن ہوگیا‘‘ پھر وہ شخص جس نے اپنے نفس کو کفر، شرک، حسد، بغض ایسے اعمال قبیحہ سے آلودہ نہ ہونے دیا اور پھر ساری زندگی اطاعتِ الٰہی اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بسر کردی۔

۳) اس کے برعکس جو خواہشات کا غلام بن گیا اور شیطان کو اپنا ساتھی بنالیا اور پھر ہر جائز و ناجائز بات کو زندگی کا دستور العمل بنالیا، ناکامی اس کا مقدر ٹھہری۔

۴) قومِ ثمود کے ذکر میں خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شان کو واضح کر کے فرمایا کہ آپ کا اتباع اور اطاعت ہی فلاح اور کامرانی کی ضمانت ہے، اگر صالح علیہ السلام کی قوم نے نافرمانی کی تو وہ حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے نیست و نابود کردی گئی، اہل مکہ! آج اگر تم بھی یہی روش اختیار کرو گے تو تمہارے لیے بھی ویسی ہی تباہی و بربادی ہوگی، تم دنیا اور آخرت میں رسوا ہوجاؤ گے، یہ آیات دورِ حاضر کی امت مسلمہ کے لیے بھی لمحات فکریہ مہیا کرتی ہیں۔

..................o..................

سُورَةُ الَّيل

اس سورۃ مبارکہ میں رب کریم نے لیل ونہار اور نر و مادہ کی قسمیں کھا کر ان حقائق کو ثابت کرنے کے لیے بطور دلیل یہاں بیان کیا ہے جن کو مان لینے کی دعوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے، جس طرح رات اور دن اور نر و مادہ میں اختلاف ہے اور اسے ہر شہری، دیہاتی، پڑھا لکھا اور اَن پڑھ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے اسی طرح اپنے عمل اور کردار کے لحاظ سے اس دنیا میں انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں...... نیک اور بد، اچھے اور برے، شریف النفس اور رذیل النفس، اللہ کے بندے اور شیطان کے ساتھی۔ جس طرح دونوں کی سعی اور اعمال مختلف ہیں لازمی ہے کہ دونوں کا انجام اور نتائج بھی مختلف ہوں۔ ان میں پہلا گروہ صدق وصفا کا پیکر، سچائی اور صداقت کا خوگر، اور اللہ کی رضا کے لیے اسی کی راہ میں خرچ کرنے والا جیسا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ایسے ہی باکردار صحابہ کرامؓ کا گروہ سچے دل سے شامل ہے جنہوں نے نہ صرف خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچے دل سے تصدیق کی بلکہ اپنے جان و مال سے وفاداری کا ثبوت بھی بہم پہنچایا، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنت کا راستہ آسان بنا دیا جہاں دائمی راحت اور ابدی آرام ہے۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ نے دعوتِ حق کو جھٹلایا، مال و دولت کو ہی زندگی کا مقصود ٹھہرایا اور اسے تجوریوں میں سمیٹ سمیٹ کر رکھا اور سچائی کی دعوت کو نہ صرف ٹھکرایا بلکہ مخالفت پر کمر باندھ لی جیسا کہ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے کیا تو اللہ نے ان کے لیے جہنم کا راستہ آسان بنا دیا جہاں دائمی عذاب اور ابدی تکلیف ہے، اب انسان کو اختیار ہے کہ جو راہ چاہے اختیار کرے۔

آیات: ۲۱ # سُوۡرَةُ الَّیۡل رکوع: ۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی(۱) وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی(۲) وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی (۳) اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی (۴)﴾

قسم ہے رات کی جب وہ چھپا لیتی ہے۔اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن ہو جاتا ہے اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیا، (کہ) یقیناً تمہاری مساعی اور اعمال مختلف ہیں۔

﴿وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی﴾ قسم ہے رات کی جب وہ چھپا لیتی ہے۔

وَ قسمیہ، الَّیۡلِ رات، اِذَا جب، یَغۡشٰی وہ ڈھانپ لیتی ہے، چھپا لیتی ہے۔ ماضی واحد مذکر غائب۔عربی میں لیل ونہار مذکر استعمال ہوتے ہیں، غَشِیَ، یَغۡشٰی، غِشَا، تاریک ہونا، چھپا لینا، چھا جانا۔یعنی رات جب چھا جاتی ہے تو دن کی تمام چمک دمک اور روشنی واجالے کو اپنی تاریکی میں چھپا لیتی ہے۔

﴿وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی﴾ اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن ہو جاتا ہے۔

وَ قسمیہ، النَّهَارِ دن، اِذَا جب، تَجَلّٰی وہ روشن ہو جاتا ہے، ماضی واحد مذکر غائب (تَجَلّٰی یَتَجَلّٰی، تَجَلِّیٌّ) روشن ہونا یعنی جب دن خوب روشن ہو جاتا ہے تو وہ رات کی تمام تر تاریکی کو پاٹ دیتا ہے اور ہر چیز کو نمایاں کر دیتا ہے۔

﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ﴾ اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیا۔

وَ عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، مَا جس (ذات حق) نے اسم موصول، خَلَقَ پیدا کیا (خَلَقَ، یَخْلُقُ، خلقًا) پیدا کرنا، خَالِقٌ پیدا کرنے والا، اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ہے، الذَّكَرَ نر (Male) وَ اور، الْأُنثَىٰ مادہ (Female)۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''رات جبکہ زمین پر چھا جاتی ہے، اسے ڈھانک لیتی اور اپنی تاریکی سے اسے چھپا لیتی ہے، دن، جبکہ وہ ظاہر اور روشن ہوتا ہے اور اس کی روشنی سے ہر چیز ظاہر اور روشن ہو جاتی ہے...... یہ دو وقت گردشِ فلک ایک دوسرے کے متقابل، صورت میں ایک دوسرے کی ضد، خصوصیات میں ایک دوسرے کے برعکس اور آثار و نتائج میں ایک دوسرے کے مقابل ہیں...... اسی طرح اللہ تعالیٰ اس بات کی بھی قسم کھاتا ہے کہ اس نے انواع کو دو متقابل جنسوں کی شکل میں پیدا کیا ہے ''وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَ الْأُنثَىٰ'' اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیا۔ رات اور دن اللہ تعالیٰ کی دو عام اور کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جو قلب انسانی کے لیے اپنے اندر فوری کشش رکھتی ہیں، مزید یہ کہ غور و فکر کے نتیجہ میں یہ نشانیاں ان حقائق کی طرف راہنمائی کرتی ہیں جو ان مظاہر کے اندر اور ان کے پیچھے ہیں...... انسان کا دل رات اور دن کی گردش سے...... رات سے جبکہ وہ ہر شے کو ڈھانک لیتی ہے اور سب چیزوں پر چھا جاتی ہے اور دن سے جبکہ وہ واضح اور روشن ہو جاتا ہے، خود بخود متاثر ہوتا ہے۔ یہ گردش لیل و نہار اس سے کچھ گفتگوئیں اور اشارہ کرتی ہے۔ وہ اس کائنات کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جس کے اسرار نا معلوم ہیں...... وہ ان مظاہر کے بارے میں باتیں کرتی ہے جن پر انسان کا کوئی اختیار نہیں...... پھر وہ اس طاقت کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہے جو اس کے پیچھے ہے اور جو کائنات میں وقت کو اس طرح گردش دے رہی ہے جس طرح کہ ایک سادہ سے پہیہ کو گردش دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ گردشِ لیل و نہار یہ بھی بتاتی ہے کہ کائنات میں ہر دم تغیر و تبدل ہے، یہاں کسی کو ایک لمحہ کے لیے بھی ثبات و قرار نہیں۔

اور رات اور دن پر غور و فکر کیجیے تو آپ قطعیت کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ایک ہاتھ ہے جو

اس آسمان کو گردش دیتا اور رات اور دن کو اس نظم، اس درستی اور اس باریک بینی سے بدلتا رہتا ہے۔آپ اس حقیقت کو بھی پالیں گے کہ جو آسمان کو گردش دے رہا ہے وہی حیاتِ انسان کو بھی گردش دے رہا ہے اس نے انسانوں کو الل ٹپ زندگی گزارنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا ہے اور نہ انہیں عبث اور بے مقصد پیدا کیا ہے۔(فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ)

رب کائنات کے منکر اور دنیا کو گمراہ کرنے والے لوگ اس حقیقت کے سلسلے میں خواہ کتنا ہی مخالفانہ رویہ اختیار کریں اور لوگوں کی توجہات کو اس سے پھیرنے کی کتنی ہی کوششیں کریں انسانی دل اس کائنات اور اس کے اشارات اور اس کے تغیرات سے ربط قائم ہوتے ہی اس حقیقت کو خود بخود پا لیتا ہے جس طرح کہ غور وفکر کے بعد وہ اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ کائنات کا ایک منتظم و مدبر خالق ہے جس کے وجود کے اعتراف سے بچنے کی کوئی صورت نہیں خواہ کتنی ہی لغو بیانی اور انکار کی کتنی ہی کوشش کی جائے۔

یہی معاملہ نر اور مادہ کی تخلیق کا ہے، انسان اور دودھ پلانے والے جانوروں میں نطفہ رحم کے اندر استقرار پاتا ہے اور ایک خلیہ اور ایک بیضہ کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے، پھر نتیجہ کا یہ اختلاف کیوں ہے؟ کون اسے کہتا ہے کہ نر ہو جا اور کون اس سے کہتا ہے کہ مادہ ہو جا؟ ان عوامل کے انکشاف سے، جن کے باعث ایک نطفہ نر اور دوسرا مادہ بن جاتا ہے، معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا، کیونکہ یہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے عوامل جن سے ایک نطفہ یہاں نر بنا اور اس طرح کے عوامل جن سے ایک نطفہ وہاں مادہ بنا کیوں یکجا ہوئے؟ سوال یہ ہے کہ کچھ کے نر اور کچھ کے مادہ ہونے کا واقعہ پوری زندگی کی روش کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہو گیا؟ اور پھر مزید توالد و تناسل کے ذریعہ زندگی کا تسلسل قائم ہونے کی ضمانت کیونکر رونما ہوئی؟

کیا سب کچھ ''اتفاق'' ہے لیکن اتفاق کا بھی ایک قانون ہے، اس کی رو سے اتنے بہت سے موافق عوامل کا 'اتفاق' سے یکجا ہونا محال ہے، اسی لیے اس کے علاوہ کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ نر اور مادہ کی تخلیق کے سلسلے میں ایک منتظم و مدبر ہستی کو تسلیم کیا جائے، جو مقررہ حکمت و غایت کے تحت یہ سب کچھ کر رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کے نظام میں ''اتفاق'' کی کوئی گنجائش ہے اور نہ واقعات کے آپ سے آپ ظہور پذیر ہونے کی۔

پھر نر اور مادہ صرف انسان اور دودھ پلانے والے جانوروں تک محدود نہیں ہیں، نر اور مادہ تمام زندہ اشیاء میں......جن میں نباتات بھی شامل ہے،...... پائے جاتے ہیں، مخلوقات کے سلسلے میں یہ ایسا یکساں اصول ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا...... ہاں ایک ہی ہستی ہے جو واحد و منفرد ہے، جس کا کوئی جوڑا نہیں اور وہ اللہ تعالیٰ خالق و مالک سبحانہ وتعالیٰ کی ہستی ہے جس کے مثل کوئی نہیں۔

یہ ہیں کائنات کے ان مظاہر اور اس حقیقت انسانی کے اشارات جن کی اللہ سبحانہ وتعالیٰ قسم کھا رہا ہے......بعض اشارات وحقائق! حقیقت یہ ہے کہ ان امور کی اِن حقائق کے سلسلے میں رہنمائی عظیم ہے اور اشارات عمیق، یہی وجہ ہے کہ اس سورت نے حیات دنیا اور حیاتِ آخرت میں عمل اور جزا کی حقیقت کو بیان اور واضح کرنے کے لیے ان امور کو فریم ورک اور تمہید کے طور پر استعمال کیا ہے۔" (فی ظلال القرآن)

﴿اِنَّ سَعۡيَكُمۡ لَشَتّٰى﴾ (کہ) یقیناً تمہاری مساعی اور اعمال مختلف ہیں۔

اِنَّ یقیناً کلام میں زور پیدا کرتا ہے، سَعۡيَكُمۡ (سَعۡيَ. کُمۡ) کوشش۔ تم لوگوں کی (سَعٰی، يَسۡعٰی، سَعۡيا) کوشش کرنا سعی اور کوشش اردو میں جانے پہچانے الفاظ ہیں، لَشَتّٰى (لَ. شَتّٰی) ضرور بضرور۔ مختلف ہیں، لام تاکیدی معنی دیتا ہے، (شَتَّتِ الاَشۡيَاءُ، يُشَتِّتُ شتًا) بکھرنا، منتشر ہونا، الشَّتِيۡت، متفرق۔ (القاموس الوحید)

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

"یہ قسم کا جواب ہے (جس طرح لیل ونہار، نر اور مادہ میں فرق ہے) اسی طرح تمہارے اعمال مختلف ہیں، تم میں سے بعض نیک اور پرہیزگار ہیں اور بعض بدبخت اور گنہگار ہیں، اور بعد کی آیات میں دونوں گروہ کے انجام بھی مختلف بتائے گئے ہیں۔ (صفوۃ التفاسیر)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) جس طرح رات اور دن یکساں نہیں ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضامندی میں زندگی گزارنے والا اور اس کی ناراضی مول لینے والا یکساں نہیں ہو سکتے ہیں۔

۲) نیکوں کے لیے ان کی نیکیوں کا لازوال صلہ اور اجر ہے جبکہ بدوں کے لیے ان کی برائیوں کی سزا اور عذاب ہے، گویا کہ یہ مختصر سی زندگی ''زبردست امتحان'' ہے اور اس میں انسان کو کامیابی اور ناکامی دونوں راہوں سے اچھی طرح آگاہ کر دیا گیا ہے اور انفس و آفاق کے تمام دلائل اسے کھول کھول کر بیان کر دیے گئے ہیں تاکہ یہ عقل و فکر سے کام لے اور کتاب و حکمت کی روشنی سے بہرہ ور ہو کر اپنی دنیا اور عاقبت سنوار لے۔

....

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى(۵) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى(۶) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى(۷) وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى(۸) وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى(۹) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى(۱۰) وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى(۱۱)﴾

پھر جس نے اپنا مال دیا اور پرہیز گاری اختیار کی اور اچھی بات کی تصدیق کی، تو ہم اس کے لیے راحت کے سامان مہیا کر دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا اور اچھی بات کو جھٹلایا تو اس کے لیے مشکلات کے سامان مہیا کر دیں گے اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى﴾

پھر جس نے اپنا مال دیا اور پرہیز گاری اختیار کی۔

فَاَمَّا مَنْ پس جس نے، اَعْطٰى دیا، عنایت کیا (اَعْطٰى، يُعْطِيْ عَطَاءً) دینا، عطا کرنا، یہ لفظ اردو میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی غریبوں یتیموں اور مسکینوں پر اپنا مال خرچ کیا تاکہ اللہ کی

رضامندی حاصل ہو، وَاتَّقٰی اور پرہیز گاری اختیار کی (اِتَّقٰی، یَتَّقِیُ) بچنا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے پرہیز کرنا، تقویٰ کا تعلق دل سے ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے لبریز رہے اور کسی بھی ایسے کام کی طرف متوجہ نہ ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا خدشہ ہو۔

﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی﴾ اور اچھی بات کی تصدیق کی۔

وَ عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے، صَدَّقَ اور سچ مانا (تصدیق کی) صَدَّقَ، یُصَدِّقُ، تَصْدِیْقًا سچا ماننا، سچا ٹھہرانا، تصدیق کرنا، یہ اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے، بِالْحُسْنٰی (بِ. اَلْحُسْنٰی) کی۔ اچھی بات۔ یعنی اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب قرآن مجید کو برحق ماننا اور اس کی اطاعت کی۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ انسانی مساعی کی ایک قسم ہے جس میں تین چیزیں شمار کی گئی ہیں اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام خوبیوں کی جامع ہیں...... ایک یہ کہ انسان زر پرستی میں مبتلا نہ ہو بلکہ کھلے دل سے اپنا مال، جتنا کچھ بھی اللہ نے اسے دیا ہے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی مدد کرنے میں صرف کرے، دوسرے یہ کہ اس دل میں اللہ کا خوف ہو اور وہ اخلاق، اعمال، معاشرت، معیشت، غرض اپنی زندگی کے ہر شعبے میں ان کاموں سے پرہیز کرے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کے موجب ہوں تیسرے یہ کہ وہ بھلائی کی تصدیق کرے بھلائی ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے جس میں عقیدے، اخلاق اور اعمال تینوں کی بھلائی شامل ہے۔ عقیدے میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی شرک اور دہریت اور کفر کو چھوڑ کر توحید، آخرت اور رسالت کو برحق مانے اور اخلاق واعمال میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی سے بھلائیوں کا صدور محض بے شعوری کے ساتھ کسی متعین نظام کے بغیر نہ ہو رہا ہو بلکہ وہ خیر وصلاح کے اس نظام کو صحیح تسلیم کرے جو اللہ کی طرف سے دیا گیا ہے جو بھلائیوں کو ان کی تمام شکلوں اور صورتوں کے ساتھ ایک نظم میں منسلک کرتا ہے جس کا جامع نام شریعت الٰہیہ ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی﴾ تو ہم اس کے لیے راحت کے سامان مہیا کر دیں گے۔

فَسَنُیَسِّرُهٗ (ف. سَ. نُیَسِّرُ. هٗ) پس۔ عنقریب۔ ہم آسان کر دیں گے۔ اس کے لیے، ''ف'' گزشتہ گفتگو کے جواب کے لیے ''س'' مستقبل قریب کے لیے (یَسَّرَ، یُیَسِّرُ) آسان بنانا نُیَسِّرُ ہم آسان بنائیں گے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ وحدہ لاشریک کے لیے فعل مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ بطور عزت آیا ہے، یُسرٰی عربی میں آسانی کو، عُسرٰی تنگی کو کہتے ہیں، هٗ کی ضمیر اس شخص کی طرف جاتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کی راہ میں مال لٹاتا ہے اور سچی بات کی تصدیق کرتا ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ ہے مساعی کی اس قسم کا نتیجہ، آسان راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جو انسان کی فطرت کے مطابق ہے جو اس خالق کی مرضی کے مطابق ہے جس نے انسان کو اور ساری کائنات کو بنایا ہے جس میں انسان کو اپنے ضمیر سے لڑ کر نہیں چلنا پڑتا، جس میں انسان اپنے جسم و جان اور عقل و ذہن کی قوتوں پر زبردستی کر کے ان سے وہ کام نہیں لیتا جس کے لیے یہ طاقتیں اس کو نہیں بخشی گئی ہیں بلکہ وہ کام لیتا ہے جس کے لیے درحقیقت یہ اس کو بخشی گئی ہیں، جس میں انسان کو ہر طرف اس جنگ، مزاحمت اور کشمکش سے سابقہ پیش نہیں آتا جو گناہوں سے بھری ہوئی زندگی میں پیش آتا ہے، بلکہ انسانی معاشرے میں ہر قدم پر اس کو صلح و آشتی اور قدر و منزلت میسر آتی چلی جاتی ہے، ظاہر بات ہے کہ جو آدمی اپنا مال اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی بھلائی کے لیے استعمال کر رہا ہو، جو ہر ایک سے نیک سلوک کر رہا ہو، جس کی زندگی جرائم، فسق و فجور اور بدکرداری سے پاک ہو، جو اپنے معاملات میں کھرا اور راستباز ہو، جو کسی کے ساتھ بے ایمانی، بدعہدی اور بے وفائی نہ کرے، جس سے کسی کو خیانت، ظلم اور زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، جو ہر شخص کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے اور کسی کو اس کے سیرت و کردار پر انگلی رکھنے کا موقع نہ ملے وہ خواہ کیسے ہی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہو، بہرحال اس کی قدر ہو کر رہتی ہے، اُس کی طرف دل کھنچتے ہیں، نگاہوں میں اس کی عزت قائم ہو جاتی ہے، اس کا اپنا قلب و ضمیر بھی مطمئن ہوتا ہے اور معاشرے میں اس کو وہ وقار حاصل ہوتا ہے جو کبھی کسی بدکردار آدمی کو حاصل نہیں ہوتا، یہی بات ہے جو سورۂ نحل میں فرمائی گئی ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ

اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً ''یعنی جو شخص نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور ہو وہ مومن اسے ہم اچھی زندگی بسر کرائیں گے۔ (آیت:۹۷) اور اسی بات کو سورۂ مریم میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ''یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے رحمان ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔ (آیت:۹۶) پھر یہی وہ راستہ ہے جس میں دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کے لیے سرور ہی سرور اور راحت ہی راحت ہے، اِس کے نتائج عارضی اور وقتی نہیں بلکہ ابدی اور لازوال ہیں۔

اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم اسے اس راستے پر چلنے کے لیے سہولت دیں گے، اس کا معنی یہ ہے کہ جب وہ بھلائی کی تصدیق کر کے یہ فیصلہ کرے گا کہ یہی راستہ میرے لائق ہے اور برائی کا راستہ میرے لائق نہیں ہے اور جب وہ عملاً مالی ایثار اور تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے یہ ثابت کر دے گا کہ اس کی یہ تصدیق سچی ہے تو اللہ تعالیٰ اس راستے پر چلنا اس کے لیے سہل کر دے گا۔ اس کے لیے پھر گناہ کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے گا، مالِ حرام اس کے سامنے آئے گا تو وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ نفع کا سودا ہے بلکہ اسے یوں محسوس ہوگا کہ یہ آگ کا انگارہ ہے جسے وہ ہاتھ میں نہیں لے سکتا، بدکاری کے مواقع اس کے سامنے آئیں گے تو وہ انہیں لطف اور لذت حاصل کرنے کے مواقع سمجھ کر ان کی طرف نہیں لپکے گا بلکہ جہنم کے دروازے سمجھ کر ان سے دور بھاگے گا، نماز اس پر گراں نہ ہوگی بلکہ اسے چین نہیں پڑے گا جب تک وقت آنے پر وہ اس کو ادا نہ کرے، زکوٰۃ دیتے ہوئے اس کا دل نہیں دکھے گا بلکہ اپنا مال اسے ناپاک محسوس ہوگا جب تک وہ اس میں سے زکوٰۃ نکال نہ دے، غرض ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو اس راستے پر چلنے کی توفیق و تائید ملے گی حالات کو اس کے لیے سازگار بنایا جائے گا اور اس کی مدد کی جائے گی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے سورۃ ''البلد'' میں اسی راستے کو دشوار گزار گھاٹی کہا گیا ہے اور یہاں اس کو آسان راستہ قرار دے دیا گیا ہے اِن دونوں باتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے یہ آدمی کو دشوار گزار گھاٹی ہی محسوس ہوتی ہے جس پر چڑھنے کے لیے اسے اپنے نفس کی خواہشوں سے، اپنے دنیا پرست اہل و عیال سے، اپنے رشتہ داروں سے، اپنے دوستوں اور معاملہ داروں سے اور سب سے بڑھ کر شیطان سے لڑنا پڑتا ہے کیونکہ ہر ایک اس

میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور اس کو خوفناک بنا کر دکھاتا ہے لیکن جب انسان بھلائی کی تصدیق کر کے اس پر چلنے کا عزم کر لیتا ہے اور اپنا مال اللہ کی راہ میں دے کر اور تقویٰ اختیار کر کے عملاً اس عزم کو پختہ کر لیتا ہے تو اس گھاٹی پر چڑھنا اس کے لیے آسان اور اخلاقی پستیوں کے کھڈ میں لڑھکنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَ اَمَّا مَنۢ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰی، وَ كَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی، فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡعُسۡرٰی﴾

<u>اور جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا اور اچھی بات کو جھٹلایا، تو اس کے لیے مشکلات کے سامان مہیا کر دیں گے۔</u>

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے، اَمَّا لیکن، حرف شرط و تفصیل، مَنۢ بَخِلَ جس نے بخل کیا (بَخِلَ، يَبۡخَلُ) بخل کرنا، کنجوسی کرنا، یعنی غربا و مساکین کی مدد نہ کی، وَاسۡتَغۡنٰی، اور بے پروا رہا (اِسۡتَغۡنٰی، يَسۡتَغۡنِيۡ) بے پروا ہونا، وَ كَذَّبَ اور جھٹلایا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (كَذَّبَ، يُكَذِّبُ، تَكۡذِيۡبًا) کسی بات کا انکار کرنا، جھٹلانا، کذب بیانی، جھوٹا بیان اردو میں استعمال ہوتا ہے، بِالۡحُسۡنٰی (بِ. الۡحُسۡنٰی) کو، اچھی بات، ''ب'' کا معنی کبھی ساتھ اور یہاں معنی ''کو'' کے بنتے ہیں، اَحۡسَنُ بہتر، عمدہ اور اس کا مؤنث الۡحُسۡنٰی اپنے کام، اچھی حالت، فَسَنُيَسِّرُهٗ (فَ. سَ. نُيَسِّرُ. هٗ) پس، عنقریب، ہم آسان کر دیں گے، اس کے لیے، لِلۡعُسۡرٰی مشکلات کا سامان۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''جو شخص اپنی جان اور اپنے مال کو بخل کر کے بچا بچا کر رکھتا ہے اور اپنے اور اس کی ہدایت سے بے رخی اور بے نیازی اختیار کرتا ہے اور اس کی دعوت اور اس کے دین کو جھٹلاتا ہے، وہ اپنے آپ کو فساد اور بگاڑ کے اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں تک کوئی شخص پہنچ سکتا ہے، وہ اس بات کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کو اس کے لیے دشوار بنا دے، وہ اسے ہر دشواری کو اختیار کرنے کی توفیق دیتا اور ہر سہولت سے اسے محروم کر دیتا ہے اسے ہر ہر قدم پر دقت اور مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہر قدم کے بعد راہ حق و ہدایت سے دور سے دور تر ہوتا چلا جاتا اور شقاوت و بدبختی کی دشوار گزار راہ پر چڑھتا چلا جاتا ہے،

اگر چہ وہ یہی خیال کرتا ہے کہ وہ فلاح و کامرانی کی راہ پر گامزن ہے، وہ ٹھوکریں کھاتا ہے اور ہر ٹھوکر کے نتائج بد سے بچنے کے لیے مزید ٹھوکر کھاتا ہے جو اسے اللہ اور اس کی رضا کی راہ سے اور دور کر دیتی ہے، حق سے پے در پے انحراف اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھانے کے نتیجہ میں جب وہ گرتا اور تباہ و برباد ہوتا ہے تو اس کا مال، جو اس نے کنجوسی کر کے بچا بچا کر رکھا تھا اور جس کے زعم میں اس نے اللہ اور اس کی ہدایت سے بے رخی برتی تھی، اُس کے ذرا کام نہیں آتا، قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى﴾

اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

وَمَا اور نہ، يُغْنِىْ کفایت کرے گا، فعل مضارع واحد مذکر غائب (کام آئے گا) اَغْنٰى، يُغْنِىْ کفایت کرنا، کام آنا، عَنْهُ (عَنْ. هُ) سے، اس، مَالُهٗ اس کا مال یعنی اسے اس کا مال کفایت نہ کرے گا، اِذَا جب، تَرَدّٰى گرے گا وہ نیچے تَرَدّٰى، يَتَرَدّٰى کھائی یا کھڈ وغیرہ میں گرنا، گڑھے میں گرنا، بلندی سے گرنا۔ (القاموس الوحید) یہاں گرنے سے مراد جہنم میں گرنا ہے۔

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں:

"وہ مال جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا اور اسے خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتا تھا، آج اس کے جبکہ وہ جہنم میں گر رہا ہے، کچھ کام نہ آیا۔ (زبدۃ التفسیر من فتح القدیر)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) زندگی کا ایک رخ وہ ہے جس کی طرف اللہ کے رسول ﷺ بلاتے ہیں اور وہی صراط مستقیم ہے۔ وہی اسلام ہے اور وہی ازل سے 'الدِّین' یعنی زندگی گزارنے کا سیدھا اور سچا راستہ جس کا آغاز سیدنا آدم علیہ السلام سے ہوا اور جس کی دعوت مختلف ادوار میں انبیاء علیہم السلام دیتے رہے اور جس کی تکمیل خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِسی دعوت پر ہوئی، صرف اور صرف یہی کامیابی کا راستہ ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی راستے ہیں وہ لوگوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں یا پھر

شیطان نے انہیں سجھائے ہیں، یقیناً یہ ناکامی کے راستے ہیں۔

۲) پہلا راستہ یعنی ''صراط مستقیم'' یا اسلام عقلی اور نقلی لحاظ سے درست اور عین فطرت کے مطابق ہے۔اس میں زندگی کو صحت اور صفائی سے، پاکیزگی اور طہارت سے، حق وصداقت سے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے بندوں کی خدمت میں گزارنا ہے اور یہی ارفع واعلیٰ مقاصد حیات ہیں جبکہ دوسرا راستہ شیطان کی پیروی میں، خواہشات نفس کی بندگی میں، فسق وفجور، بخل اور کنجوسی میں اور حق وصداقت کی مخالفت میں گزارا جاتا ہے، یہ شرف انسانیت سے گری ہوئی باتیں ہیں۔

۳) پہلا راستہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہے اس میں ایثار وقربانی، شرافت اور نیکی، امانت و دیانت اور احسان و مروت کے پھول کھلتے ہیں، اگرچہ اس راہ میں تکالیف اور مشکلات ہی کیوں نہ ہوں لیکن رب کریم اس راہ پر چلنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا فرما دیتا ہے اور دنیا وآخرت میں انہیں خوشخبری کی نوید عطا فرماتا ہے۔

۴) دوسرا راستہ سرکشی اور بغاوت کا راستہ ہے۔اس میں دوسروں کے حقوق تلف کیے جاتے ہیں، لوگوں کے جان و مال پر حملے ہوتے ہیں، انہیں ایذا اور تکلیفیں دی جاتی ہیں اور یہ معاملہ افراد ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ قوموں اور ملکوں میں پھیل جاتا ہے، پھر ہر زبردست قوم زیردست قوم کو دباتی ہے اور اس پر نت نئے ظلم وستم ڈھاتی ہے، ہر طاقتور کمزور کو دباتا ہے اور اس کے حقوق تلف کرتا ہے اور شیطان ان کے ساتھ مل کر رقص کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ڈھیل دی جاتی ہے لیکن جب یہ لوگ اس کی گرفت میں آجاتے ہیں تو ان کا انجام ہمیشہ کے لیے عبرت کا سامان بن جاتا ہے۔

۵) یہ آیات دورِ حاضر کے مسلمانوں کے لیے عبرت وموعظت کا پیغام رکھتی ہیں ان پر نکبت وادبار کی گھٹا چھارہی ہے اور ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کردیا گیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے احکام الٰہی سے منہ موڑا ہے اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روگردانی کی ہے۔

....

﴿اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی(۱۲) وَاِنَّ لَنَا لَـلْاٰخِرَۃَ وَ الْاُوْلٰی(۱۳)
فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰی(۱۴) لَا یَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَی(۱۵)
الَّذِیْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰی(۱۶) وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی(۱۷) الَّذِیْ
یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی(۱۸) وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ
تُجْزٰٓی(۱۹) اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی(۲۰) وَلَسَوْفَ
یَرْضٰی(۲۱)﴾

بلاشبہ راستہ دکھانا ہمارے ذمہ ہے اور درحقیقت آخرت اور دنیا، دونوں کے ہم ہی مالک ہیں، پس میں نے تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا دیا ہے، جس میں صرف وہی بد بخت داخل ہوگا جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا، اور وہ پرہیز گار دور رکھا جائے گا جو پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال صرف کرتا ہے اور اس پر کسی کے احسان کا بار نہیں جس کا اسے بدلہ اتارنا ہو، وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے اور وہ (رب) ضرور خوش ہوگا۔

﴿اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی﴾ بلاشبہ راستہ دکھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اِنَّ بے شک، بلاشبہ، کلام میں زور اور تاکید پیدا کرتا ہے، عَلَیْنَا (عَلٰی.نَا) اوپر۔ ہمارے یعنی ہمارے ذمہ ”نا“ ضمیر جمع متکلم، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے آئی ہے، عربی زبان کا قاعدہ ہے واحد کے لیے جمع کی ضمیر بطور عزت وتکریم لائی جاتی ہے، لَلْهُدٰی (لَ.لْهُدٰی) ضرور بضرور۔ ہدایت (دینا ہے) ”لام“ زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے۔ یعنی ہدایت کا اہتمام، انتظام اور عنایت وعطا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے کسی کے اپنے بس میں نہیں کہ وہ ہدایت کو از خود حاصل کرلے جب تک اللہ کی توفیق شامل نہ ہو۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”یعنی انسان کا خالق ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حکمت، اپنے عدل اور اپنی رحمت

کی بنا پر اس بات کا ذمہ لیا ہے کہ اس کو دنیا میں بے خبر نہ چھوڑے بلکہ اسے یہ بتا دے کہ راہ راست کونسی ہے اور غلط راہیں کونسی، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، حلال کیا ہے اور حرام کیا کونسی روش اختیار کر کے وہ فرمانبردار بندہ بنے گا اور کونسا رویہ اختیار کر کے بندۂ نافرمان بن جائے گا، اسی بات کو سورۂ نحل میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ (النحل:۹) اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔" (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَاِنَّ لَنَا لَـلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى﴾

اور در حقیقت آخرت اور دنیا، دونوں کے ہم ہی مالک ہیں۔

وَ اور عاطفہ، سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے ہے، اِنَّ بلاشبہ لَنَا ہمارے لیے ہے (ہم مالک ہیں) لَـلْاٰخِرَةَ (لَ. اٰخِرَةَ) ضرور بضرور۔ آخرت (کے) وَالْاُوْلٰى اور ابتدا کے (یعنی دنیا کے)۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"اس ارشاد کے کئی مفہوم ہیں اور وہ سب صحیح ہیں ایک یہ کہ دنیا سے آخرت تک تم کہیں بھی ہماری گرفت سے باہر نہیں ہو، کیونکہ دونوں جہانوں کے ہم ہی مالک ہیں، دوسرے یہ کہ ہماری ملکیت دنیا اور آخرت دونوں پر بہر حال قائم ہے، خواہ تم ہماری بتائی ہوئی راہ پر چلو یا نہ چلو، گمراہی اختیار کرو گے تو ہمارا کچھ نہ بگاڑو گے، اپنا ہی نقصان کر لو گے اور راہ راست اختیار کرو گے تو ہمیں کوئی نفع نہ پہنچاؤ گے، خود ہی اس کا نفع اٹھاؤ گے، تمہاری فرمانبرداری سے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا تیسرے یہ کہ دونوں جہانوں کے مالک ہم ہی ہیں، دنیا چاہو گے تو وہ بھی ہم ہی سے تمہیں ملے گی اور آخرت کی بھلائی چاہو گے تو اس کا دینا بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے، یہی بات ہے جو سورۃ ال عمران آیت 145 میں فرمائی گئی ہے:

وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا

"جو شخص ثوابِ دنیا کے ارادہ سے کام کرے گا، اس کو ہم دنیا ہی میں دیں گے اور جو ثوابِ آخرت کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم آخرت میں سے دیں گے۔"

اور اسی کو "سورۃ شوریٰ" آیت 20 میں اس طرح بیان فرمایا گیا:

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ حَرۡثَ الۡاٰخِرَةِ نَزِدۡ لَهٗ فِىۡ حَرۡثِهٖ‌ وَ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ حَرۡثَ الدُّنۡيَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا وَ مَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ نَّصِيۡبٍ......

''جوکوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھا دیتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى﴾ پس میں نے تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرادیا ہے۔

فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ (ف. اَنۡذَرۡتُ. كُمۡ) پس۔ ہم نے ڈرایا ہے۔ تمھیں اَنۡذَرۡتُ میں نے ڈرایا فعل ماضی واحد متکلم کُمۡ ضمیر جمع مذکر حاضر (اَنذَرَ، یُنۡذِرُ، اِنۡذارًا) کسی کو کوئی بات بتا کر چوکنا کرنا اور ڈرانا، آگاہ کرنا، دھمکی دینا انجام سے باخبر کرنا، نوٹس دینا، (القاموس الوحید) نَارًا تَلَظّٰى آگ سے جو شعلے مارتی ہے، بھڑکتی ہے، تَلَظّٰى يَتَلَظّٰى، آگ کا بھڑک اٹھنا۔

﴿لَا يَصۡلٰىهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَى، الَّذِىۡ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى﴾

جس میں صرف وہی بد بخت داخل ہوگا جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔

لَا نہ، نافیہ، يَصۡلٰىهَاۤ (يَصۡلٰى. هَاۤ) (داخل ہوگا۔ اس میں) یعنی آگ میں، صَلِیَ النّار و بِهَا، يَصۡلٰى صَلًى وَ صِلِیاً، آگ میں جلنا (القاموس الوحید) اِلَّا مگر، الۡاَشۡقَى، بہت ہی بدنصیب (بدبخت) شَقِیٌّ سے اسم تفضیل الَّذِىۡ جس نے، اسم موصول، كَذَّبَ جھٹلایا، حق بات سے انکار کیا، کِذب بیانی اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، وَ تَوَلّٰى اور منہ پھیرا ماضی واحد مذکر غائب (تَوَلّٰى، يَتَوَلّٰى) منہ پھیرنا اس کا مادہ وَلۡیٌ ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اس بھڑکتی ہوئی جہنم میں وہی کافر بدبخت داخل ہوگا جس نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا اور ایمان سے تہی دامن رہا۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَ سَیُجَنَّبُھَا الۡاَتۡقَی، الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی﴾

اور وہ پرہیزگار دور رکھا جائے گا۔ جو پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال صرف کرتا ہے۔

وَ سَیُجَنَّبُھَا (وَ. سَ. یُجَنَّبُ. ھَا) اور۔عنقریب۔ بچا لیا جائے گا۔ اس سے (آگ سے) وَ عاطفہ، سَ حرف استقبال، فعل مضارع پر داخل ہو تو مستقبل کے لیے خاص کر دیتا ہے اور کسی واقعہ کے قریب ہونے پر دلالت کرتا ہے (جَنَّبَ، یُجَنِّبُ، فَلَانًا الشَّیَٔ) کسی کو کسی چیز سے دور رکھنا (القاموس الوحید) "ھَا" کی ضمیر آتش جہنم کی طرف جاتی ہے، الۡاَتۡقَی جو بہت زیادہ پرہیزگار ہے، تَقِیٌّ سے اسم تفضیل کا صیغہ اَتۡقٰی ہے۔ الَّذِیۡ جو، اسم موصول، یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ دیتا ہے، اپنا مال (اٰتٰی یُؤۡتِیۡ اِیۡتَاءً) دینا، عطا کرنا، یَتَزَکّٰی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے (تَزَکّٰی، یَتَزَکّٰی) پاکیزگی حاصل کرنا، تزکیہ نفس، نفس کی پاکیزگی اردو میں مستعمل ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف ان آیات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"وَسَیُجَنَّبُھَا الۡاَتۡقَی" یعنی جہنم سے دور رہے گا اور جنت میں داخل ہوگا، وہ شخص جو اپنا مال اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرتا ہے تاکہ اس کا نفس بھی اور اس کا مال بھی پاک ہو جائے۔" (تفسیر احسن البیان)

﴿وَ مَا لِاَحَدٍ عِنۡدَہٗ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ تُجۡزٰۤی، اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِ الۡاَعۡلٰی﴾

اور اس پر کسی کے احسان کا بار نہیں جس کا اسے بدلہ اتارنا ہو وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے۔

وَ اور، عاطفہ، مَا نہیں نافیہ، لِاَحَدٍ کسی کا (بھی)، عِنۡدَہٗ (عِنۡدَ. ہٗ) پاس۔ اس کے (اس پرہیزگار کے)، مِنۡ نِّعۡمَۃٍ احسان (کا بار)، تُجۡزٰۤی (کہ) بدلہ اتارے (جَزٰی، یَجۡزِی، جَزَاءً) بدلہ اتارنا جزا دینا اردو میں مستعمل ہے، جزاک اللہ، اللہ تمہیں اس کی جزا دے، اِلَّا مگر، ابۡتِغَآءَ وہ چاہتا ہے، طلب کرتا ہے فعل ماضی واحد مذکر غائب (اِبۡتَغٰی، یَبۡتَغِیۡ) چاہنا، طلب کرنا، وَجۡہِ رضا مندی، رَبِّہٖ (رَبِّ. ہٖ) رب۔ اپنے (کی)، الۡاَعۡلٰی جو برتر ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

’’یعنی جو بدلہ اتارنے کے لیے خرچ نہ کرتا ہو، بلکہ اخلاص سے اللہ کی رضا اور جنت میں اس کے دیدار کے لیے خرچ کرتا ہے۔‘‘(احسن البیان)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

’’اس کی بہترین مثال سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کا یہ فعل ہے کہ مکہ معظّمہ میں جن بے کس غلاموں اور لونڈیوں نے اسلام قبول کیا تھا اور اس قصور میں جن کے مالک ان پر بے تحاشا ظلم توڑ رہے تھے ان کو خرید خرید کر وہ آزاد کر دیتے تھے تا کہ وہ ان کے ظلم سے بچ جائیں، ابن جریر اور ابن عسا کرنے عامر بن عبداللہ بن زبیر کی یہ روایت نقل کی ہے کہ سیدنا ابوبکرؓ کو اس طرح ان غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر روپیہ خرچ کرتے دیکھ کر ان کے والد نے ان سے کہا کہ بیٹا! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کر رہے ہو، اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہی روپیہ خرچ کرتے تو وہ تمہارے لیے قوت بازو بنتے، اس پر ابوبکرؓ نے ان سے کہا ’’ابا جان! میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے۔‘‘(تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿وَلَسَوۡفَ يَرۡضٰى﴾ اور وہ (رب کریم) ضرور خوش ہوگا۔

وَ اور، عاطفہ، لَسَوۡفَ (لَ. سَوۡفَ) ضرور بضرور۔ قریب ہے (کہ)، يَرۡضٰى (رب کریم) راضی ہوگا، (رَضِيَ، يَرۡضٰى) راضی ہونا، اسی مفہوم کے ساتھ یہ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو نہ صرف شکل وصورت میں اشرف واعلیٰ بنایا بلکہ عقل وفکر میں بھی اسے تمام مخلوقات پر ممتاز فرمایا، پھر انسانوں میں سے اچھے لوگوں کو منتخب فرمایا جن نفوس قدسیہ کی پاکیزہ زندگیاں دوسرے انسانوں کے لیے مشعل راہ بنیں، یہ ابرار وصالحین انبیا ورسل کہلائے ان پر کتابیں اور صحیفے نازل کیے کہ ان میں لکھے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزاری جائے اور انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں اور آیات بکھیر دیں تا کہ فہم وبصیرت سے کام لے کر یہ انسان رب

کائنات کو پہچان لے، خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نسل انسانیت کے لیے رہبر ورہنما بنا کر دین اسلام کو مکمل و منظم ضابطۂ حیات قرار دیا گویا کہ انسان کی ہدایت میں کوئی کمی اور کسر نہ چھوڑی گئی، روز قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ اسے کچھ خبر نہ تھی۔

۲) دنیا اور آخرت میں حقیقی بادشاہت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اگر وہ اس دنیا میں کسی کو حکمرانی کے اختیارات عطا کرتا ہے تو وہ اس کی آزمائش ہے، آیا کہ وہ رب کائنات کے احکام کے مطابق حکمرانی کرتا ہے یا اپنی خواہشات کے مطابق حکومت پر قابض رہتا ہے، اس صفحہ ہستی پر فرعون ونمرود ایسے کتنے ظالم اور سرکش حکمرانوں کو اس نے نیست ونابود کر دیا اور ان کا انجام لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بنا۔

۳) انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں......ایک گروہ ان سعادتمندوں کا جن کی زندگیاں صاف ستھری ہیں، وہ زندگی کے شب وروز رب کی بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی میں بسر کرتے ہیں، تقوی وطہارت ان کا زادِ راہ ہے، اللہ کی رضا کے لیے یتامیٰ اور بیوگان، غربا ومساکین کی خدمت ان کا شعار ہے۔

دوسرا گروہ ان بدبختوں کا ہے جن کی زندگیاں شیاطین کی اطاعت اور خواہشات کی پیروی میں بسر ہوتی ہیں، ہر جائز وناجائز ذرائع سے دھن دولت اکٹھی کرنا اور پھر اسے فضول خرچیوں میں لٹانا، نمود ونمائش کے لیے خرچ کرنا اور زندگی کو لہو ولعب اور کھیل تماشے میں گزارنا ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔

۴) ظاہر ہے کہ ان دونوں گروہوں کا انجام بھی مختلف ہوگا، نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کی ابدی جنت سے نوازا جائے گا جبکہ بدبخت اور گنہگار سزا کے مستحق ہوں گے اور انہیں آتشِ جہنم کا مزہ چکھنا پڑے گا۔

..................o..................

سُوۡرَۃُ الضُّحٰی

اس سورۃ مبارکہ کے مضامین پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مکی دور کے شروع میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے انہیں انتہائی مصائب و مشکلات کا سامنا تھا، قریش مکہ نے دعوتِ حق کو روکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اہل ایمان پر ظلم وستم کی انتہا کر دی۔ بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قدر دل گرفتہ ہو جاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ظلم وجور کی داستانیں سناتے، آپ انہیں صبر واستقامت کی تلقین کرتے، اس پر رب کریم نے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سورۃ مبارکہ نازل فرمائی اور اس میں آپ کو ایک طرف یہ تسلی دی کہ جس طرح رات میں پھیلی ہوئی تاریکی آفتاب کے طلوع ہوتے ہی چھٹ جاتی ہے، اسی طرح یہ ناساز گار حالات جس میں آپ اور آپ کے اصحابؓ وقتی طور پر گھرے ہوئے ہیں، بالآخر چھٹ کر رہیں گے، پریشانیوں اور مخالفتوں کا یہ طوفان ختم ہو جائے گا اور حق وصداقت کا آفتاب پوری تابانی سے چمک کر رہے گا جس کا مشاہدہ اہل دنیا نے فتح مکہ پر کر لیا۔ دوسری طرف آپ کو اور آپ کے اصحابؓ کو ابدی راحت اور دائمی کامیابی کی بشارت بھی سنائی گئی کہ یہ دنیا عارضی اور فانی ہے، اس میں اگر تھوڑی بہت پریشانی ہے تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، آخرت میں آپ کے لیے لازوال اجر ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ عرصہ کے لیے وحی کا سلسلہ منقطع ہوا تو مخالفین نے یہ اعتراض شروع کر دیا کہ آپ کا رب آپ سے ناراض ہو گیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی اور تشفی دی کہ نہ تو آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا ہے بلکہ اپنی حکمت ومصلحت سے جب وہ چاہتا ہے آپ پر جبرئیل امین کے ذریعہ وحی نازل فرماتا ہے۔

سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات کا ذکر فرمایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں یتیمی کی حالت میں آنکھیں کھولیں، تو رب رحیم نے آپ کی سرپرستی فرمائی آپ لوگوں کی زبوں حالی پر پریشان تھے اور نورِ ہدایت کے لیے مضطرب تھے تو ہادی مطلق نے آپ کے لیے روشنی کا سامان بہم پہنچایا اور قرآن حکیم ایسی عظیم کتاب سے آپ کو نوازا، لہٰذا آپ اور آپ کے اصحابؓ اس دعوتِ حق کو جاری وساری رکھیں اور رب تعالیٰ کے نام کو اونچا اور سربلند رکھیں، اس کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کو اپنی زندگیوں کا شعار بنائیں...... غربا ومساکین کی خدمت، یتامیٰ اور بیوگان کی سرپرستی، بے سہارا اور کمزور لوگوں کی اعانت، یہی زندگی کے وہ ارفع واعلیٰ مقاصد ہیں جس کے لیے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

سُورَةُ الضُّحیٰ

آیات:۱۱ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالضُّحٰی (۱) وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی (۲) مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی (۳) وَ لَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی (۴) وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی (۵)﴾

گواہ ہے آفتاب کی روشنی اور گواہ ہے رات جب وہ ہر شے پر چھا جاتی ہے (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا اور آپ کے لیے انجام (آخرت) ابتدا (دنیا) سے بہتر ہے اور عنقریب آپ کو آپ کا رب اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

﴿وَالضُّحٰی، وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی﴾

گواہ ہے آفتاب کی روشنی اور گواہ ہے رات جب وہ ہر شے پر چھا جاتی ہے۔

وَ، قسمیہ ہے اور قسم بمعنی گواہی اور شہادت کے ہوتی ہے الضُّحٰی کے اصل معنی (طلوع آفتاب کے بعد) دھوپ پھیل جانے اور دن چڑھ آنے کے ہیں۔ (مفردات القرآن) وَ قسمیہ ہے، الَّیۡلِ رات کی، اِذَا جب، سَجٰی (وہ) چھا جائے (سَجَا، یَسۡجُوۡ، سَجۡوًا وَ سُجُوًّا) ٹھہرنا، پرسکون ہونا جیسے کہا جاتا ہے: سَجا الۡبَحۡرُ سمندر پرسکون ہے، سَجَا الَّیۡلُ رات پرسکون ہے، (القاموس الوحید)

مولانا محمد عبدالحی لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کی قدرت کے یہ نمونے ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں کہ ایک وقت رات ہوتی ہے، چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوتا ہے، راستہ چلنے والوں کے لیے راستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے اور

بہت سے کام کرنے والے اپنا اپنا کام بند کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے بعد سورج نکلتا ہے سارے اندھیرے غائب ہو جاتے ہیں، ہر چیز روشن ہو جاتی ہے، راستہ چلنے والے راہ پاتے ہیں، کام کرنے والے کام کرنے لگتے ہیں، یہ نظارہ جو ہر روز ہمارے سامنے آتا ہے، اس سے ہم ایک طرف تو اس بات کی طرف اشارہ پاتے ہیں کہ یہ پورا کارخانہ جس کی تدبیر کے تحت چل رہا ہے، وہ بڑی قدرت والا ہے، دوسرا اشارہ اس بات کی طرف بھی ملتا ہے کہ زمانے کا مزاج ہی یہ ہے کہ یہ ایک حال پر قائم نہیں ہے، یہاں کبھی اندھیروں کا راج ہوتا ہے اور کبھی اجالے کا، کبھی ایک طرح کے حالات سامنے آتے ہیں اور کبھی دوسری طرح کے، تو جب صورت حال یہ ہے تو پھر انسان اپنے حالات کے بارے میں یہ کیوں سمجھ لے کہ وہ کبھی نہ بدلیں گے؟ وہ کیوں اس بات کی امید نہ رکھے کہ اگر آج حالات کچھ سخت ہیں تو کل ضرور نرم ہو جائیں گے، آج اگر مشکلات کا سامنا ہے تو کل آسانیاں بھی آئیں گی۔

یہی بات ہے جس کی طرف ابتدائی دو آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو دوسری جگہ اس طرح فرمایا: اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً ''بلاشبہ ہر تنگی کے بعد آسانی ہے۔'' (آسان تفسیر)

﴿مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی﴾

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا۔

مَا نہ، مائے نافیہ، وَدَّعَکَ (وَدَّعَ. کَ) چھوڑا۔ آپ کو (وَدَّعَ، یُوَدِّعُ) چھوڑنا، قطع تعلق کرنا، رَبُّکَ (رَبُّ. کَ) رب۔ آپ کا، وَمَا اور نہ، وَ عاطفہ، مَا نافیہ، قَلٰی وہ ناراض ہوا، خفا ہوا۔ فعل ماضی واحد مذکر غائب (قَلٰی، یَقْلٰی، قِلًی) کسی کو ناپسند کرتے ہوئے چھوڑ دینا۔ (قاموس الوحید)

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اے محمد ﷺ! آپ کے رب نے جب سے آپ کو رسالت کے لیے چن لیا ہے اس نے آپ کو چھوڑا نہیں ہے اور نہ ہی وہ آپ سے ناراض ہوا جب سے اس نے آپ کو اپنی محبت سے نوازا ہے اور یہ بات مشرکین کی تردید میں ہے جب انہوں نے کہا کہ ان کے رب نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور یہ قسم کا جواب ہے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

تعجب ہے ان مشرکین پر جو ایک طرف تو یہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ ان کا اپنا کلام ہے اور یہ بات جھوٹ ہے کہ ان پر وحی اللہ کی طرف سے آتی ہے تو دوسری طرف جب اس وحی کے آنے میں کچھ دیر ہوئی تو محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھانے کے لیے یہ طعنے دینے لگے کہ ان کے رب نے انہیں چھوڑ دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ مخالفت انسان کو حق بات کہنے اور پہچاننے میں اندھا کر دیتی ہے۔

﴿وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى﴾

اور آپ کے لیے انجام (آخرت) ابتدا (دنیا) سے بہتر ہے۔

وَ اور، لَلْاٰخِرَةُ (لَ. اَلْاٰخِرَةُ) ضرور بضرور۔ آخرت۔ لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے، خَيْرٌ بہتر ہے، یہ لفظ اردو میں بھی یہی معنی دیتا ہے، لَّكَ (لَ. كَ) لیے۔ آپ کے، مِنَ سے، الْاُوْلٰى ابتدا (دنیا)۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

"اے محمد ﷺ! دارِ آخرت آپ کے لیے دنیا کی اس زندگی سے کہیں بہتر ہے اس لیے کہ آخرت ہمیشہ رہنے والی ہے جبکہ دنیا فانی ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشَ الْآخِرَةِ "اے اللہ! (اصل) زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے۔" (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾

اور عنقریب آپ کو آپ کا رب اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

وَ اور، لَسَوْفَ (لَ. سَوْفَ) ضرور بضرور۔ عنقریب، لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے، سَوْفَ، فعل مضارع کے شروع میں آتا ہے تو مستقبل قریب کے لیے خاص کر دیتا ہے، کبھی یہ وعید کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے: كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ "تم

کو پتہ چل جائے گا، جلدی تم کو پتہ لگ جائے گا۔" اور کبھی یہ وعدہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى" (القاموس الوحید)

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

"ہر آنے والا دن آپ کے لیے گزشتہ دن سے بہتر ہو گا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات اللہ کی نگاہ میں بلند ہوتے رہے آپ کے دشمن مغلوب ہوتے گئے اور آپ کا دین غالب ہوتا گیا اور روز بروز آپ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات بڑھتے ہی گئے اور آپ کا مقام اونچے سے اونچا ہوتا گیا، یہاں تک کہ آپ اپنے رب کے نزدیک اس مقام پر فائز ہو گئے جو اولین وآخرین میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا اور آخرت میں جو مقام ملے گا اور جن نعمتوں سے آپ نوازے جائیں گے، ان کی تعبیر انسانی الفاظ میں ممکن نہیں، اسی لیے اللہ نے کہا "وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى" اور عنقریب آپ کا رب آپ پر اپنے انعامات کی بارش کرے گا تو آپ راضی ہو جائیں گے۔ (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ان آیات مبارکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے لیے ہی نہیں بلکہ قیامت تک تمام داعیان حق کے لیے شفقت ومحبت کا پیغام اور صبر واستقامت کی راہ پر چلنے والوں کے لیے روشن ہدایات ہیں، انہیں مصائب ومشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے اپنے مشن کو اپنے رب کی رضا کے لیے جاری وساری رکھنا چاہیے، یہ مصائب اور دکھ فتح ونصرت کا پیغام دیتے ہیں اور اس دنیا کی عارضی تکالیف ابدی کامیابی کی نوید بنتی ہیں۔

۲) دنیا کی عارضی مشکلات تو بہر حال کٹ ہی جاتی ہیں مگر اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں لازوال اور بے مثال ملتا ہے، دنیا کی ساری کلفتیں اور مصیبتیں جنت میں قدم رکھتے ہی ابدی نعمتوں اور آسانیوں میں بدل جائیں گی اور یہاں کے سارے دکھ اور غم وہاں پہنچتے ہی ابدی راحت وآرام میں تبدیل ہو جائیں گے۔ آمین!

....

﴿اَلَم یَجِدُکَ یَتِیمًا فَاٰوٰی(٦) وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی(٧) وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی(٨) فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡهَرۡ(٩) وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ(١٠) وَ اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ(١١)﴾

(اے محمدؐ!) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس (رب العالمین) نے آپ کو یتیم پایا تو ٹھکانا بخشا اور آپ کو پریشان حال پایا تو سیدھا راستہ بتلا دیا اور نادار پایا تو غنی کر دیا، لٰہذا کسی یتیم پر سختی نہ کیجیے، اور نہ کسی سائل کو جھڑکیے، اور اپنے رب کے احسانات کو بیان کرتے رہیے۔

﴿اَلَم یَجِدُکَ یَتِیمًا فَاٰوٰی﴾

(اے محمدؐ!) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس (رب العالمین) نے آپ کو یتیم پایا تو ٹھکانا بخشا۔

اَ کیا، کلمہ استفہام، لَم نہیں، یہ حرف جزم ہے، فعل مضارع کے شروع میں آتا ہے تو نفی کا معنی دیتا ہے اور اسے ماضی کے معنی میں بدل دیتا ہے اور آخری لفظ کو ساکن کر دیتا ہے، جیسا کہ یذھَبُ، (وہ جاتا ہے یا جائے) گا سے لَمۡ یَذۡھَبۡ وہ نہیں گیا، اَلَمۡ یَجِدۡکَ کیا نہیں پایا آپ کو (وَجَدَ، یَجِدُ) پانا، اَلوِجُدان، شعور، جذبہ، ضمیر، ادراک اردو میں بھی جانا پہچانا لفظ ہے۔ ”ک“ ضمیر واحد مذکر حاضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، یَتِیۡمًا یتیم، معروف لفظ ہے، نابالغ بچے کا شفقت پدری سے محروم ہو جانا، انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں یُتۡم کا اعتبار ماں کی طرف سے ہوتا ہے اور جانور کے چھوٹے بچے کے بن ماں کے رہ جانے کو یتیم کہا جاتا ہے۔ (مفردات القرآن)، فَاٰوٰی تو اس نے ٹھکانا بخشا (ف. اٰوٰی) پس۔ اس نے ٹھکانا بخشا، ”ف“ عاطفہ سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے ہے (اٰوٰی،

یُاْوِی، ایوٰاءً) ٹھکانا دینا، پناہ دینا ''مَأْوٰی'' مرجع اور جائے پناہ کو کہتے ہیں۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یعنی آپ کو چھوڑ دینے اور آپ سے ناراض ہو جانے کا کیا سوال، ہم تو اس وقت سے آپ پر مہربان ہیں جب آپ یتیم پیدا ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بطن مادر ہی میں چھ مہینے کے تھے جب آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا، اس لیے آپ دنیا میں یتیم ہی کی حیثیت سے تشریف لائے مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دن بھی آپ کو بے سہارا نہ چھوڑا، چھ سال کی عمر تک والدہ ماجدہ آپ کی پرورش کرتی رہیں، ان کی شفقت سے محروم ہوئے تو آٹھ سال کی عمر تک آپ کے جدّ امجد نے آپ کو اس طرح پالا کہ ان کو نہ صرف آپ سے غیر معمولی محبت تھی بلکہ ان کو آپ پر فخر تھا اور وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا ایک دن دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا، ان کا بھی انتقال ہو گیا تو آپ کے حقیقی چچا ابو طالب نے آپ کی کفالت اپنے ذمے لی، اور آپ کے ساتھ ایسی محبت کا برتاؤ کیا کہ کوئی باپ بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ نبوت کے بعد جب ساری قوم آپ ﷺ کی دشمن ہو گئی تھی اس وقت دس سال تک وہی آپ کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔'' (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی﴾

اور آپ کو پریشان حال پایا تو سیدھا راستہ بتلا دیا۔

وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، وَجَدَکَ (وَجَدَ. کَ) اس نے پایا۔ آپ کو، فعل ماضی واحد مذکر غائب۔ ''کَ'' ضمیر واحد مذکر حاضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، ضَآلًّا گم گشتہ راہ (پریشان حال)، فَهَدٰی (فَ. هَدٰی) تو۔ اس نے ہدایت عطا فرمائی اسلام کی سیدھی اور سچی راہ سے نوازا، قرآن حکیم ایسی کتاب عطا فرمائی اور نسل انسانیت کے لیے آپ کو ہادی اور رہنما بنایا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اصل میں لفظ ضَآلًّا استعمال ہوا ہے، عربی زبان میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس

کے ایک معنی گمراہی کے ہیں، دوسرے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص راستہ نہ جانتا ہو اور ایک جگہ حیران (پریشان) کھڑا ہو کہ مختلف راستے جو سامنے ہیں ان میں سے کدھر جاؤں، ایک اور معنی کھوئے ہوئے کے ہیں چنانچہ عربی محاورے میں کہتے ہیں ''ضَلَّ الْمَآءُ فِی اللَّبَنِ'' پانی دودھ میں گم ہو گیا، اس درخت کو بھی عربی میں ''ضَالَّۃٌ'' کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو، ضائع ہونے کے لیے بھی ''ضلال'' کا لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً کوئی چیز ناموافق اور ناسازگار حالات میں ضائع ہو رہی ہو، غفلت کے لیے بھی ''ضلال'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں اس کی مثال موجود ہے کہ: لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی (طٰہٰ:۵۲) میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے، ان مختلف معنوں میں سے پہلے معنی یہاں چسپاں نہیں ہوتے کیونکہ بچپن سے قبل نبوت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات تاریخ میں موجود ہیں ان میں کہیں اس بات کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ آپ کبھی بت پرستی، شرک یا دہریت میں مبتلا ہوئے ہوں یا جاہلیت کے جو اعمال، رسوم اور طور طریقے آپ کی قوم میں پائے جاتے تھے ان میں سے کسی میں آپ ملوث ہوئے ہوں، اس لیے لامحالہ ''وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا'' کے معنی یہ تو نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقیدے یا عمل کے لحاظ سے گمراہ پایا تھا، البتہ باقی معنی کسی نہ کسی طور پر یہاں مراد ہو سکتے ہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایک اعتبار سے سب مراد ہوں، نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کے قائل تو ضرور تھے اور آپ کی زندگی گناہوں سے پاک اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھی لیکن آپ کو دین حق اور اس کے اصول اور احکام کا علم نہ تھا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَ لَا الْاِیْمَانُ (الشوریٰ:۵۲) ''آپ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ ایمان کی آپ کو خبر تھی۔'' یہ معنی بھی اس آیت کے ہو سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جاہلی معاشرے میں گم ہو کر رہ گئے تھے اور ایک ہادی و رہبر ہونے کی حیثیت سے آپ کی شخصیت نبوت سے پہلے نمایاں نہیں ہو رہی تھی، یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کے صحراء میں آپ ایک اکیلے درخت کی حیثیت سے کھڑے تھے جس میں پھل لانے اور ایک پورا باغ کا باغ پیدا کر دینے کی صلاحیت تھی مگر نبوت سے پہلے یہ صلاحیت کام نہیں آ رہی تھی، یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی قوتیں آپ کو عطا کی تھیں وہ جاہلیت کے ناسازگار ماحول میں ضائع ہو رہی

تھیں، ''ضلال'' کو غفلت کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے یعنی آپ ان حقائق اور علوم سے غافل تھے جن سے نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آگاہ فرمایا، یہ بات خود قرآن میں بھی ایک جگہ ارشاد ہوئی ہے: وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (یوسف:۳) اور اگر چہ آپ اس سے پہلے ان باتوں سے غافل تھے۔'' (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی﴾ اور نادار پایا تو غنی کر دیا۔

وَ اور، عاطفہ، وَجَدَکَ (وَجَدَ. کَ) پایا۔ آپ کو، فعل ماضی واحد مذکر غائب، ضمیر واحد مذکر حاضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، (وَجَدَ، یَجِدُ) پانا، عَآئِلًا نادار، مفلس (عَالَ، یَعِیْلُ، عَیْلًا) مفلس ہونا، نادار ہونا اس سے اسم فاعل عَآئِلًا مفلس، نادار، فَاَغْنٰی (فَ. اَغْنٰی) پس غنی کر دیا، اس نے (رب العالمین نے) اَغْنَی اللّٰهُ فُلَانًا اللہ تعالیٰ نے فلاں کو مالدار کر دیا، اَلْغِنٰی، مالداری، تمول، یہ لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ ''اَلْغَنِیُّ'' مالدار، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے، یعنی وہ کسی شے میں کسی کا محتاج نہیں ہے (کائنات میں) ہر ایک اس کا محتاج ہے۔ (القاموس الوحید)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اَغْنٰی'' تونگر (مالدار) کا مطلب اپنے سوا آپ کو ہر ایک سے بے نیاز کر دیا، پس آپ فقر میں صابر اور غنیٰ میں شاکر رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی ہے: ''تونگری، ساز و سامان کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل تونگری تو دل کی تونگری ہے۔'' اور اسی کی رحمت سے آپ غنی ہو گئے۔ ویسے بھی آپ نے اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ سفر تجارت میں تجربہ حاصل کیا اور شادی سے پہلے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامانِ تجارت کو امین تاجر کی حیثیت سے خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا اور اس صالحہ خاتون سے شادی کے بعد بھی اس تجارت کی خود ہی نگرانی فرمائی جو اللہ کی رحمت سے پھلی پھولی۔'' (احسن التفاسیر)

﴿فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ لہٰذا آپ کسی یتیم پر سختی نہ کیجیے۔

فَاَمَّا (فَ. اَمَّا) لہٰذا۔ جو، اَلْیَتِیْمَ یتیم ہو، فَلَا تَقْهَرْ تو اس پر غصہ نہ کیجیے، فعل نہی واحد مذکر حاضر

(قَهَرَ یَقْهَرُ، قَهْرًا) کسی پر غالب ہونا، مغلوب کرنا، سختی اور غصہ کرنا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''یعنی کسی یتیم کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیے اور نہ اس کے مال کو حاصل کیجیے، مجاہد کا قول ہے کہ یتیم کو نفرت اور حقارت سے نہ دیکھیے۔ سفیان کہتے ہیں ''یتیم کے مال کو ضائع کر کے اس پر ظلم نہ کیجیے۔'' اور اس سے مراد یہ ہے کہ یتیم کے ساتھ ایک مشفق اور مہربان والد کا سا برتاؤ کیجیے، آپ بھی یتیم تھے، تو اللہ تعالیٰ آپ کا آسرا بنا۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ اور نہ کسی سائل کو جھڑکیے۔

وَ اور، حرف عاطفہ، اَمَّا جو کوئی، لیکن، رہا یہ کہ...... یہ حرف شرط و تفصیل کہلاتا ہے، السَّآئِلَ (سَأل. یَسْئَلُ. سُؤَالٌ) پوچھنا، سوال کرنا، اس سے اسم فاعل سَآئِلٌ، پوچھنے والا (کوئی مسئلہ، سوال پوچھنے والا) اور مانگنے والا، حاجتمند، فقیر، گداگر۔ دونوں مفہوم اس لفظ میں ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ'' یہ اس انعام کا حق بیان ہوا ہے، جو اوپر ''وَ وَجَدَکَ ضَآ لًّا فَهَدٰی'' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ لفظ سائل، یہاں محدود معنی میں نہیں بلکہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے خواہ سائل اپنے پیٹ اور تن کی کسی ضرورت کے تحت سوال کرے یا اپنی کسی ذہنی و عقلی الجھن سے متعلق سوال کرے یا اپنے دین سے متعلق سوال کرے، غرض جس طرح کی بھی مدد و رہنمائی کا طالب ہو حتی الامکان اس کی مدد و رہنمائی کی جائے اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو خوبصورتی کے ساتھ اس کے سامنے معذرت پیش کر دی جائے، اُس کو جھڑکا اور ڈانٹا نہ جائے، مطلب یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھنا کہ ایک دور تم پر بھی ایسا گزرا ہے جب تم سراپا سوال تھے اور ان سوالوں نے تمہاری زندگی ضیق [تنگی] میں ڈال رکھی تھی بالآخر تمہارے رب نے تمہاری ہر خلش دور فرمائی اور تمہارے ہر سوال کا جواب دیا، اس کا حق یہ ہے کہ تم بھی سائلوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ ان لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جن کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو دے رکھا ہے تو مسکینوں اور سائلوں سے ترش روئی سے پیش آتے ہیں اور ابھی کسی گردش میں

اللہ اُن کو پکڑ لے تو کہیں گے کہ اللہ نے مجھے ذلیل کر دیا، اس وقت ان کو یہ بات یاد نہیں آتی کہ انہوں نے اللہ کے بندوں کو کس طرح ذلیل کیا ہے۔‘‘(تدبر قرآن، ج:۸)

﴿وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ﴾

اور اپنے رب کے احسانات کو بیان کرتے رہیے۔

وَ اور، عاطفہ، اَمَّا جو، بِنِعْمَةِ نعمت (ہے) رَبِّکَ (رَبِّ. کَ) رب، آپ کا (یعنی اس کی طرف سے)، بِنِعْمَةِ رَبِّکَ مضاف، مضاف الیہ ہیں ب نے نعمت کو زیر دی۔ رَبِّکَ بھی مضاف، مضاف الیہ ہے۔ فَحَدِّثْ تو اسے بیان کیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر، فَ پس، (تو)، حَدَّثَ، یُحَدِّثُ بیان کرنا، ’’تحدیثِ نعمت‘‘ نعمت کے ملنے پر اس کا اعتراف کرنا اردو میں مستعمل ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

’’یہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اوپر ’’وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی‘‘ کے الفاظ میں بیان ہوا ہے ہم اس کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے وہ غِنیٰ مراد نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال سے حاصل ہوا بلکہ اصلاً اس سے دین کی وہ حکمت اور شریعت کی وہ دولت مراد ہے جس کی شان قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے کہ: وَ مَن یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (البقرہ:۲۶۹) ’’اور جس کو حکمت عطا ہوئی اس کو خیر کثیر کا خزانہ بخشا گیا۔‘‘ یہاں لفظ ’’فَحَدِّثْ‘‘ خاص طور پر نگاہ میں رکھیے، یہ مال کی نعمت کے لیے نہیں بلکہ حکمت کی نعمت ہی کے لیے موزوں ہے، فرمایا کہ جس حکمت کے خزانے سے تمہارے رب نے تم کو بہرہ ور کیا ہے، اس کی تحدیث کرو، یعنی جس طرح تمہارے رب نے تمہیں مفت بخشا ہے، تم بھی اس کو مفت بانٹو، ہر آنے جانے والے کے سامنے اس کا چرچا کرو اور ہر بزم و انجمن کو اس کے ذکر سے معمور کر دو۔‘‘(تدبر قرآن، ج:۸)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) رب کریم کے ان گنت انعامات میں سے اسلام ایسے پاکیزہ دین کی عطا، خاتم النبیین جناب محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، ان پر قرآن حکیم کا نزول اور ان کی حیات طیبہ ہے۔

۲) انبیاء علیہم السلام کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وطہارت کا سروسامان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیمی کی حالت میں اس دنیا میں آنکھیں کھولیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی نگہداشت اور تربیت کا عمدہ سامان فرمایا جیسا کہ حدیث مبارکہ میں بھی آتا ہے: اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَأدِیْبِی ''میرے رب نے میری تربیت فرمائی اور بہترین تعلیم وتربیت سے آراستہ فرمایا'' نور بصیرت سے مالا مال ہونا اتنا بڑا خزانہ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کے سارے خزانے ہیچ ہیں۔

۳) اتنی بڑی نعمت ملنے کے بعد اس کے شکرانے کا طریق کار یہ ہے کہ بیوگان اور یتامیٰ کے ساتھ نرمی کے ساتھ محبت کا رویہ اختیار کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ رب کریم کی عظمت اور بڑائی کا اعلان کیا جائے جس کے احسانات ان گنت اور جس کے انعامات بے پایاں ہیں۔

۴) امت مسلمہ اس قدر انعامات پانے کے بعد انہیں فراموش کر چکی ہے، اس کی ذلت وخواری کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے اور خالق کائنات کا یہ قانون اٹل ہے کہ جو بھی حق وصداقت سے منہ موڑے گا، ذلت وخواری اس کا مقدر ٹھہرے گی۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا.

سُورَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ

یہ بھی مکی سورتوں میں سے ہے، اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت کی پھوار پڑ رہی ہے۔اس سورۃ مبارکہ کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دعوت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کی راہ میں جو دشوار گزار گھاٹیاں تھیں اور آپ کے اردگرد سازشوں کا جو جال پھیلا ہوا تھا، اس سے آپ کی روح قلق و اضطراب میں مبتلا تھی، اس بارگراں کے افکار وہجوم سے آپ کا سینہ مبارک سخت بوجھل تھا اور یہ بوجھ آپ کی کمر توڑے دے رہا تھا اور آپ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے مدد، اس سے زادِراہ اور اس کی جانب سے ہمت وحوصلہ کی ضرورت شدت سے محسوس فرما رہے تھے، اِن حالات میں یہ سورۃ مبارکہ آپ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کا حوصلہ بڑھانے میں اکسیر ثابت ہوئی۔

سورۃ کے آغاز میں رب کائنات نے اپنی رحمت کا ذکر فرمایا کہ اس نے اپنی رحمت سے آپ کے انقباض نفس کو دور فرما کر اسے کشادگی اور فراخی سے ہمکنار کیا ہے، آپ کو قرآن حکیم ایسی عظیم نعمت عطا فرمائی اور دین اسلام آپ کا طریق زندگی مقرر فرمایا۔ یہ عارضی مصائب و مشکلات بالآخر چھٹ کر رہیں گے۔ یہ اس کا قانون اور ضابطہ ہے کہ ہر سختی کے بعد آسانی اور ہر تنگی کے بعد راحت نصیب فرماتا ہے تو جب بھی آپ اور آپ کے صحابہؓ دعوت وتبلیغ سے فراغت حاصل کریں تو عبادت وریاضت میں جم جائیں، اس سے دلوں کو سکون وسرور ملے گا، اپنے مشن کو جاری وساری رکھنے کا حوصلہ بڑھے گا اور یہی بات تا قیامت آپ کی امت میں سے ہر داعی الی الخیر کے لیے زادراہ ہوگی۔

رہی آپ کی عزت وعظمت تو وہ وقت کے دھارے کے ساتھ بڑھتی چلی جائے گی، جہاں دنیا کی ہر مسجد کے مینار سے اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کی توحید اور اس کی کبریائی کی صدا بلند ہوگی وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان بھی ہوگا۔

آیات:۸ سُورَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ(۱) وَ وَضَعْنَا عَنْکَ
وِزْرَکَ(۲) الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ(۳) وَرَفَعْنَا لَکَ
ذِکْرَکَ(۴) فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا(۵) اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ
یُسْرًا(۶) فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ(۷) وَ اِلٰی رَبِّکَ
فَارْغَبْ(۸)﴾

(اے نبیؐ) کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ کر دیا، اور ہم نے آپ کے دل سے آپ کا بوجھ اتار دیا جو آپ کی کمر توڑے دے رہا تھا اور آپ کے لیے ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا، پس یاد رکھیں بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی اور ہر تنگی کے بعد فراخی ہے اور جب آپ فرصت پائیں تو ہمہ تن مشغول ہو جائیے اور اپنے رب سے لو لگائیں۔

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ﴾

(اے نبیؐ) کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ نہیں کر دیا۔

اَ کیا، حرف استفہام، لَمْ نہیں، حرف نفی و جزم، یہ بعد والے حرف کو جزم دیتا ہے جیسا کہ نَشْرَحْ کی ''ح'' پر جزم ہے (شَرَحَ، یَشْرَحُ، شَرْحًا) کھولنا، بیان کرنا، شَرَحَ صَدْرَہ لِشَیءٍ کسی شے کو محبوب و مرغوب بنانا، کشادہ کرنا، (القاموس الوحید)۔ لَکَ (لَ.کَ) لیے، آپ (کے) صَدْرَکَ (صَدْرَ.کَ) سینہ آپ کا۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

”کیا ہم نے اس دعوت کے لیے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟ کیا ہم نے آپ کے لیے دین کا کام آسان نہیں کیا؟ کیا اس کام کو آپ کے لیے محبوب نہیں بنایا؟ کیا ہم نے اس کی راہ آپ کے لیے متعین و مقرر نہیں فرمائی اور کیا اس راہ کو آپ پر واضح اور روشن نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپ اِس کا مبارک انجام بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں...... ذرا اپنے سینہ کو ٹٹول کر دیکھیے! کیا آپ اس میں روح، اِنشراح اور نور نہیں پاتے؟ کیا آپ اپنے احساسات میں اللہ تعالیٰ کی جود و عطا کا ذائقہ محسوس نہیں کرتے؟ کیا آپ ہر مشقت کے ازالہ کے لیے ساز و سامان، ہر تکلیف کے ساتھ راحت، ہر دشواری کے ساتھ فراخی اور ہر محرومی کے ساتھ خوشنودی و رضا کی نعمت نہیں پاتے۔“(فی ظلال القرآن)

﴿وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ اور ہم نے آپ کے دل سے آپ کا بوجھ اتار دیا۔

وَ وَضَعْنَا اور اتار دیا، ہم نے، وَ اور عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے وَضَعْنَا اتار دیا ہم نے، فعل ماضی جمع متکلم، رب العزت کے لیے بطور عزت جمع کا صیغہ آیا ہے، واحد کے لیے جمع کا صیغہ عزت کے لیے آتا ہے، (وَضَعَ، يَضَعُ، وَضْعًا)، عربی زبان میں وسیع معنوں میں آتا ہے، وَضَعَ کے بعد عَنْ آ جائے تو اس کے معنی اتارنا، ہلکا کرنا، دور کر دینا، ہٹا دینا کے ہوتے ہیں۔ عَنْكَ (عَنْ. كَ) آپ سے، ’كَ‘ ضمیر واحد مذکر مخاطب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، وِزْرَكَ (وِزْرَ. كَ) بوجھ۔ آپ کا۔

حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

”یہ بوجھ کون سا تھا؟ اردگرد کے ماحول میں جہالت، کفر، شرک، گمراہی دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کڑھتے تھے، مگر آپ کو علم نہیں تھا کہ اس کا علاج کیا ہو؟ یہی وہ بوجھ تھا جسے اللہ نے نبوت کے ذریعہ ہٹا دیا۔“(تیسیر القرآن)

﴿الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ﴾ جو آپ کی کمر توڑے دے رہا تھا۔

الَّذِیْ جس نے، اسم موصول، اَنْقَضَ توڑ رکھی تھی، فعل ماضی واحد مذکر غائب (اَنْقَضَ، يُنْقِضُ،

اِنْقَاضًا) توڑنا، دبانا، ظَهْرَكَ (ظَهْرَ. كَ) کمر۔آپ کی "ک" ضمیر واحد مخاطب، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

"یعنی ہم نے آپ کے بوجھ کو، جو آپ کی کمر کے لیے بارگراں بنا ہوا تھا، یہاں تک کہ وہ مارے بوجھ کے ٹوٹی جارہی تھی، آپ کے اوپر سے اتار دیا، اس طرح کہ آپ کا سینہ (اسلام کے لیے) کھول دیا، آپ کو اس دعوت کی توفیق دی، آپ کے لیے دعوتِ حق کو آسان بنا دیا، نیز وحی نازل کی جو حقیقت کو واضح کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ دعوتِ دین کو کس طرح دلوں میں سہولت ونرمی کے ساتھ اتارا جائے، اس طرح آپ کے بوجھ کو ہلکا کر دیا بلکہ اسے اتار دیا، کیا آپ اس بارگراں کے سلسلے میں جو آپ کی کمر توڑے دے رہا تھا، اس حقیقت کو محسوس نہیں کرتے؟ کیا آپ شرح صدر کے بعد اپنے بوجھ کو ہلکا نہیں پاتے۔" (فی ظلال القرآن)

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾

اور آپ کے لیے ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا۔

وَ اور عاطفہ، رَفَعْنَا ہم نے بلند کیا، فعل ماضی جمع متکلم، جمع کا صیغہ رب العزت کے لیے بطور عزت استعمال ہوا ہے (رَفَعَ، يَرْفَعُ، رَفْعًا) شہرت دینا، ذکر خیر کرنا، رتبہ بڑھانا، فوقیت دینا، حیثیت دینا۔ (القاموس الوحید) لَكَ (لَ. كَ) لیے۔آپ کے 'ک' ضمیر واحد مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے۔ ذِكْرَكَ (ذِكْرَ. كَ) ذکر۔آپ کا۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

"ہم نے آپ کے لیے آپ کا آوازہ بلند کیا، ہم نے آپ کا "رفعِ ذکر" ملاءِ اعلیٰ میں کیا، ہم نے آپ کا رفع ذکر زمین میں کیا، ہم نے پوری کائنات میں آپ کا آوازہ بلند کیا۔ہم نے اپنے نام کے ساتھ آپ کا نام لکھ دیا کہ جب بھی کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کسی کی زبان سے نکلے تو اللہ کے نام کے ساتھ آپ کا نام بھی آئے، اس سے زیادہ رفع ذکر اور کیا ہوسکتا ہے......اس سے بلند تر کوئی

مقام نہیں، یہ مقام اس عالم میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا، اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا﴾

پس بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی اور ہر تنگی کے بعد فراخی ہے۔

فَاِنَّ (ف. اِنَّ) پس۔ بلاشبہ، مَعَ الْعُسْرِ ساتھ، مشکل کے، یُسْرًا آسانی ہے، اِنَّ یقیناً، مَعَ الْعُسْرِ ساتھ ہر تنگی کے، یُسْرًا فراخی ہے۔ یعنی آپ صبر و استقلال سے دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھیں اور یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی اور ہر تنگی کے بعد فراخی ہوتی ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے خوشخبری ہے کہ تم اسلام کی راہ میں جو تکلیفیں برداشت کر رہے ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے بعد اللہ ہی تمہیں فراغت و آسانی سے نوازے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا جسے ساری دنیا جانتی ہے۔'' (احسن البیان)

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ، وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾

اور آپ فرصت پائیں تو ہمہ تن مشغول ہو جایئے اور اپنے رب سے لو لگایئے۔

فَاِذَا (ف. اِذَا) پس۔ جب، فَرَغْتَ آپ فارغ ہو جائیں یعنی تبلیغ و جہاد کی مصروفیات سے فراغت پائیں، فعل ماضی واحد مذکر حاضر (فَرَغَ، یَفْرُغُ، فَرَاغًا) خالی ہونا، فارغ ہونا، اردو میں بھی انہی معنوں میں آتا ہے، فَانْصَبْ (ف. انْصَبْ) پس۔ محنت کیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (نَصَبَ، یَنْصَبُ، نَصَبًا) محنت سے کام کرنا، جانفشانی سے کام کرنا، وَاِلٰی اور طرف، رَبِّکَ (رَبِّ. کَ) رب۔ اپنے کے، فَارْغَبْ (ف. ارْغَبْ) پس۔ راغب ہو جایئے، فعل امر واحد مذکر حاضر (رَغِبَ، یَرْغَبُ، رَغْبًا وَ رَغْبَۃً) خواہش مند ہونا، راغب ہونا، رغبت، چاہت اردو میں بھی جانا پہچانا لفظ ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اے محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) جب آپ مخلوق کو دعوتِ حق دینے سے فارغ ہو جائیں تو خالق

کائنات کی بندگی میں مصروف ہو جائیں اور جب آپ دنیا کے کام کاج سے فرصت پالیں تو آخرت کی طلب اور چاہت میں لگ جائیں۔'' (صفوۃ التفاسیر)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) نبوت ملنے سے پہلے خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل عرب کی بالخصوص اور دنیا کی بالعموم حالتِ زار دیکھ کر کڑھتے تھے یہ بارگراں گویا آپ کی کمر کو توڑ رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شدید آرزو اور تمنا تھی کہ یہ لوگ راہ راست پر آجائیں، ان کی عادات واخلاق سنور جائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے نوازا، خاتم النبیین کے مرتبہ پر سرفراز فرما کر نسل انسانیت کے لیے رحمت بنایا تو یہ ابدی ہدایت اور پاکیزہ روشنی آپ کے لیے انشراح صدر کا باعث ہوئی اور جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہا، وہ بھی انشراح صدر کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔

۲) آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے اصحاب ؓ کو حکم ہوتا ہے کہ مصائب ومشکلات سے نہ گھبرائیں دعوت حق پیش کرنے میں ان کا پیش آنا لازمی حصہ ہے، اِبتلا وآزمائش کے بعد ہی آسانیاں ملتی ہیں اور انہیں عنقریب فتح وکامرانی کا مژدۂ جانفزا سنایا جائے گا، چنانچہ فتح مکہ مسلمانوں کے عروج اور سر بلندی کا نشان تھا، اس کے بعد چاردانگِ عالم میں انہوں نے حق کا پرچم لہرایا۔

۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت بھی دی گئی کہ آپ کا آوازہ وشہرت اور عُلو مرتبت چاردانگ عالم میں پھیل جائے گی۔ جو کیفیت اس وقت بظاہر گمنامی کی ہے اس سے نکل کر آپ ﷺ کا نامِ نامی پوری دنیا میں ایک بلند مقام حاصل کر لے گا اور دنیا آپ ﷺ کی عظمت ورفعت کی قائل ہو کر رہے گی۔

۴) اس خوشخبری اور تسلی پر مبنی حکم الٰہی میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اپنی طرف راغب رکھنے کے لیے بھی حکم فرمایا کہ یہ جہاد وقتال اور امورِ سلطنت بظاہر دنیاوی مشغولیتیں ہیں لیکن حقیقتاً یہ نفاذ اسلام اور غلبۂ اسلام کی جدوجہد ہے اور یہ خود عبادت ہے تاہم مشغولیت کے ان لمحات سے کچھ لمحات اللہ کے لیے مختص کر لیجیے جن کے اندر صرف اور صرف اسی سے لو لگائی جائے اور اسی سے راز ونیاز ہو۔

...............o...............

سُوۡرَۃُ التِّیۡن

یہ مکی سورتوں میں سے ہے اور اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جزا اور سزا کا قانون اٹل اور لازمی ہے، سورۃ کے آغاز میں چار مقامات کا ذکر بطور شہادت کے پیش کیا گیا ہے۔ ’’وَالتِّیۡنِ‘‘ (انجیر) سے اشارہ، ارض مقدس ہے جس میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ جل جلالہٗ کی توحید اور کبریائی کا اعلان کیا تھا۔ انہیں اللہ کی طرف سے کتاب ہدایت انجیل عطا کی گئی تھی۔ ’’ارض زیتون‘‘ سے مراد ملک شام ہے کہ اس سرزمین مقدس میں جلیل القدر انبیاء کرام لوگوں کو دعوت حق دینے کے لیے تشریف لاتے رہے اور ’’طور سینا‘‘ سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رب سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ انہیں اللہ کی طرف سے کتاب ’’توراۃ‘‘ عطا کی گئی اور انہیں اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے ساتھ ’’فرعون‘‘ کے دربار میں دعوتِ توحید کے لیے بھیجا گیا اور ’’الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ‘‘ میں اشارہ مکہ مکرمہ کی طرف ہے جہاں خاتم النبیین، سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن مجید ایسی عظیم کتاب سے نوازا اور عالم انسانیت کا رہبر و رہنما بنایا اور انہوں نے اُسی دعوت حق کو اہل عرب اور دنیا کے سامنے پیش کیا جس کا اعلان سابقہ انبیاء کرام اپنی اپنی قوم میں کرتے رہے تھے، یہ کوئی انوکھا مذہب نہیں ہے بلکہ وہی دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہمیشہ ہمیشہ سے پسندیدہ دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ’’اسلام‘‘ کا نام دے رکھا ہے۔ قرآن مجید میں تمام انبیاء کی بنیادی دعوت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

’’(اے رسولؐ) ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے، اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ پس تم لوگ میری بندگی کرو۔‘‘ (الانبیاء: ۲۵) تو جو لوگ دعوتِ حق کو مان لیتے ہیں اور نیکی کی راہ پر چل پڑتے ہیں اُن کی دنیا اور آخرت سنور جاتی ہے اور جو لوگ خواہشات نفس کے غلام بن جاتے ہیں وہ قعر مذلت میں جا گرتے ہیں۔

سُورَةُ التِّين

آیات:۸ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ(۱) وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ(۲) وَهٰذَا الۡبَلَدِ
الۡاَمِيۡنِ(۳) لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ(۴)
ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ(۵) اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ(۶) فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعۡدُ
بِالدِّيۡنِ(۷) اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ(۸)

قسم ہے انجیر اور زیتون اور طورِ سینا اور اس امن والے شہر کی، ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا پھر ہم نے اسے پست ترین حالت میں ڈال دیا، مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے بے انتہا اجر ہے، تو (اے انسان!) کونسی چیز تجھ سے جزا کی تکذیب کرا رہی ہے؟ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے؟

﴿وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ، وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ، وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ﴾
قسم ہے انجیر اور زیتون اور طورِ سینا اور اس امن والے شہر کی۔

وَ قسم ہے، وَ قسمیہ اور قسم بمعنی شہادت اور گواہی کے ہوتی ہے۔ اس کائنات میں رب کائنات کی کبریائی وعظمت کی ہر چیز گواہی دے رہی ہے۔ "وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ" (الاسراء:۴۴) "کوئی چیز نہیں مگر اس کی تسبیح سے رطب اللسان ہے۔"

'التِّینِ' انجیر مشہور پھل ہے یعنی جہاں بہت زیادہ انجیر ہوتی ہے یا انجیر والا شہر (ناصرہ) جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا مولد و مسکن ہے، وَالزَّیْتُوْنِ، اور قسم ہے زیتون کی، جہاں زتیون کی کثرت ہوتی ہے یا زیتون والا شہر یعنی ملک شام جہاں جلیل القدر انبیاء تشریف لاتے رہے، وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ، اور قسم ہے طور سین پہاڑ کی، وہ پہاڑ مراد ہے جہاں جلیل القدر پیغمبر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا، وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ اور قسم ہے اس امن والے شہر کی جہاں خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ یعنی مکہ مکرمہ۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''اس وقت جبکہ دنیا میں انسانیت کی توہین ہو رہی تھی اور انسانیت کے لیے خود انسانوں کے دلوں میں کوئی جذبۂ عزت و احترام نہ تھا، اس وقت جب پتھر پجتے تھے، درخت محترم تھے، دریا مقدس تھے، قبریں اور مزار قابل عزت و شرف تھے، انسان کی حیثیت محض حقیر پجاری کی تھی۔ اس وقت جبکہ کلیسا سے انسان کو ہمیشہ کی گنہگاری کا سرٹیفکیٹ مل چکا تھا اور ہندو نقطہ نگاہ سے اس کی تناسخ کے آہنی چکر سے رہائی ناممکن تھی اور یہ موجودہ زندگی سابقہ کئی ہزار گناہوں کا نتیجہ قرار دی جا رہی تھی۔...... اسلام اٹھا اور اس نے انسانی شرف و فضیلت کے عالم بوسیدہ کو پھر سے جلا دی اور علی الاعلان کہا کہ انسان کو بہترین انداز میں پیدا کیا گیا ہے، یہ اس لیے نہیں منصۂ شہود پر آیا ہے کہ شجر و حجر کے سامنے سر جھکائے بلکہ اس لیے آیا ہے کہ ساری کائنات اس کے سامنے جھکے اور اس کی بزرگی اور برتری کا اقرار کرے۔ یہ انسان فطرت کے اعتبار سے گنہگار نہیں ہے اور اپنی ساخت (شکل و صورت) کے اعتبار سے اشرف المخلوقات ہے۔ پہلی دفعہ دنیا میں آیا ہے کہ بر و بحر میں اپنی قابلیت کا علم گاڑ دے، ثبوت یہ ہے کہ انسانی عظمت و بزرگی کی تاریخ پر غور کرو، ارض تین (فلسطین) کو دیکھو جس میں مسیح علیہ السلام نے اپنی رفعت کا اعلان کیا، ارض زیتون یعنی ملک شام کو ملاحظہ کرو کہ بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء کا مہبط و مسقط (مرکز) ہے، طور پر جلوہ فرمائی کے واقعات پر غور کرو کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی جلالت و بزرگی پر شاہد ہے اور پھر فخر موجودات، سید الکونین اور صاحب بلد امین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان دیکھو، تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ انسانیت کا رتبہ کتنا بلند ہے یہ وہ تعلیم ہے جو انسانیت کے افق کو تابناک اور روشن بنا دیتی ہے اور جس کی وجہ سے انسان اس قابل

ہو جاتا ہے کہ اس دنیا کی تگ و دو میں حوصلہ مندانہ حصہ لے۔‘‘(تفسیر سراج البیان، ج:۵)

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾

’’ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا ہے۔‘‘

لَقَدْ (یقیناً) لام تاکید کے لیے، قَدْ حرف تاکید یعنی ’لَقَدْ‘ میں انتہائی زور اور تاکید ہے، ضرور بضرور بلا شک و شبہ، خَلَقْنَا ہم نے پیدا کیا، فعل ماضی جمع متکلم، اللہ وحدہ لاشریک کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت و تکریم کے لیے آیا ہے (خَلَقَ، یَخْلُقُ، خَلْقًا)، الْاِنْسَانَ بنی نوع انسان، اس سے مراد تمام انسان ہیں، فِیْٓ درمیان (میں) حروف جارہ میں سے ہے جو بعد والے حرف کو زیر دیتے ہیں، اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ اچھی حالت میں، بہترین شکل و صورت میں اَحْسَنِ، عمدہ اچھی، تَقْوِیْمٍ، ساخت (شکل و صورت)۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

’’اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو بہترین شکل و صورت، عمدہ صفات و عادات، مناسب قد و قامت، علم و فہم سے آراستہ، عقل و شعور سے پیراستہ اور نطق و کلام سے بہرہ ور فرمایا ہے۔‘‘(صفوۃ التفاسیر)

﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ﴾ پھر ہم نے اسے پست ترین حالت میں ڈال دیا۔

ثُمَّ پھر، رَدَدْنٰهُ (رَدَدْنَا. ہٗ) ہم نے ڈال دیا (الٹ دیا) اسے رَدَدْنَا، ہم نے ڈال (الٹ) دیا۔ رب کریم کے لیے جمع متکلم کا صیغہ بطور عزت کے آیا ہے، (رَدَّ، یَرُدُّ، رَدًّا) الٹانا۔ لوٹانا، پھیر دینا ’’ہٗ‘‘ کی ضمیر بنی نوع انسان کی طرف جاتی ہے۔ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ انتہائی پستی کی حالت میں۔ اَسْفَلُ، (اَفْعَلُ کے وزن پر اسم تفضیل) ذلیل ترین۔ اسی سے سَافِلٌ (اسم فاعل) ذلیل، پست، اس کی جمع سَافِلُوْنَ نصبی اور اضافی حالت میں سَافِلِیْنَ، اردو کا لفظ سفلہ (کمینہ) اور سفلہ پن (کمینگی) اسی سے ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

’’جب انسان نے اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچانا اور حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کا اہتمام نہ کیا اور ہماری فرمانبرداری کو اس نے فراموش کر دیا تو ہم اسے پست ترین حالت میں لوٹا دیں گے اور وہ جہنم ہے۔‘‘(صفوۃ التفاسیر)

﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ﴾

مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ان کے لیے بے انتہاء اجر ہے۔

اِلَّا مگر، الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡ جو ایمان لائے، الَّذِیۡنَ جو اسم موصول (اٰمَنَ، یُؤمِنُ، اِیۡمانًا) ایمان لانا، وَعَمِلُوا اور انہوں نے عمل نیک کیے ماضی جمع مذکر غائب (عَمِلَ، یَعۡمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا، الصّٰلِحٰتِ اچھے (نیک)، اس کا مفرد الصّٰلِحَةُ ہے فَلَهُمۡ (ف. لَهُمۡ) پس۔ ان کے لیے (ہے) هُمۡ ضمیر جمع مذکر غائب ان کے لیے ہے (جو نیک عمل کرتے ہیں) اَجۡرٌ اجر، ثواب، غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ بے انتہا، لازوال، نہ منقطع ہونے والا، غَیۡرُ نہ، مَمۡنُوۡنٍ منقطع۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''ان کے لیے اجر و ثواب دائمی اور ابدی ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا اور وہ اہل تقویٰ کے لیے جنت کا گھر ہے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ، اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ﴾

تو (اے انسان) کونسی چیز تجھ سے جزا کی تکذیب کرا رہی ہے کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے؟

فَمَا (ف. مَا) پس، کونسی (بات) ''مَا'' استفہامیہ ہے، مَا یعنی جزا کو جھٹلانے کا کون سا سبب ہے؟ (تفسیر مدارک)، یُکَذِّبُکَ (یُکَذِّبُ. کَ) تکذیب کراتی ہے، فعل مضارع واحد مذکر حاضر 'کَ' کی ضمیر واحد مذکر حاضر جھٹلانے والے اور کفر کرنے والے انسان کی طرف جاتی ہے، بِالدِّیۡنِ (بِ. الدِّیۡنِ) قیامت (جزا) کے بارے میں.

مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یعنی اللہ کی قدرت کے اتنے شواہد دیکھ کر بھی اے ناشکر گزار اور کافر انسان، تو آخر کس دلیل سے یوم جزا کا منکر ہو رہا ہے؟ (تفسیر ماجدی)

اَلَیۡسَ اللّٰهُ کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ، بِاَحۡکَمِ بہت بڑا حاکم، الۡحٰکِمِیۡنَ حکومت کرنے والوں

میں (سے)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"(اے ناشکرے انسان!) ایسی موٹی بات بھی تیری سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ تو ہر تصرف پر قادر ہے اور وہی سب حاکموں کے اوپر حاکم ہے، تو وہ آخری عدالت برپا کیے اور ہر ہر جزئی کا آخری صحیح وصادق فیصلہ کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ یوم الحساب کا وقوع تو حق تعالیٰ کے حاکم اعلیٰ ہونے کا عین قدرتی نتیجہ ہی ہونا چاہیے۔ (تفسیر ماجدی)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انبیاء علیہم السلام کی دعوت وتبلیغ کا مرکزی نقطہ رب کائنات کی بندگی اور اس کے احکام کی مکمل پیروی رہا ہے۔ ان نفوس قدسیہ کا زیادہ تر تعلق عرب ممالک خصوصاً مکہ مکرمہ، مصر کے جزیرہ نمائے سینا، شام اور فلسطین سے رہا ہے۔ یہ پاکباز نفوس دوسرے انسانوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی دعوت دیتے رہے تو ان کی اپنی زندگیاں بھی حق وصداقت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی تھیں، انہیں بطور ثبوت پیش کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف ہماری توجہ دلائی جارہی ہے کہ وہ سارے بزرگ "احسن تقویم" بن کر انسانی شرف وعظمت کے آئینہ دار رہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا ہے اور اسے عقل وشعور کی عمدہ صلاحیتوں سے نوازا ہے تاکہ وہ نیابت الٰہی کا فریضہ ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو اس کی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال کرے تو وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا حقدار ہو جاتا ہے، اس کے برعکس اگر وہ شیطانی مقاصد اور اپنی بے لگام نفسانی خواہشات کا شکار ہو جائے تو پھر وہ ذلیل ترین مخلوق کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے اور برے، خیر اور شر دونوں راستوں کی واضح طور پر نشاندہی کر دی ہے اور اس کا قانونِ جزاوسزا یہ ہے کہ نیک اعمال پر لازوال اجروثواب عطا فرماتا ہے جو آخرت میں جنت کی صورت میں ظاہر ہوگا اور نافرمانیوں اور سرکشیوں پر اس کی گرفت ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ آخرت میں دوزخ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سُورَۃُ الْعَلَق

انسان کا خالق وہ رب عظیم ہے جس نے اس تمام کائنات کو بنایا اور سجایا۔ خالق کائنات نے پانی کے ایک قطرے اور پھر اس قطرے کو جمے ہوئے خون میں تبدیل کر کے اسے جیتا جاگتا خوب صورت انسان بنا ڈالا اور پھر اسے علم وادب اور عقل وفکر سے آراستہ کیا اور قلم کے ذریعے سے ایسی صلاحیتیں عطا فرمائیں کہ وہ دوسروں تک اس کی روشنی بکھیرتا چلا جائے اور وہ اس علم کے ذریعے سے ایک طرف اپنے خالق و مالک کو پہچانے تو دوسری طرف اس کی خلافت و نیابت کا حق ادا کرے۔ اگر وہ اس کا حق ادا کرے تو اس کے لیے ابدی فلاح و کامرانی ہے اور اگر نہ کرے تو ہمیشہ کی ناکامی اور نامرادی ہے اسے بہر حال اپنے خالق و مالک کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا اور وہی شخص کامیاب ہے جو اپنی جبین نیاز کو اس کے در پر جھکاتا رہے۔

اس ابدی وسرمدی پیغام کو نوع انساں تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو منتخب کیا ان میں سے آخری شخصیت جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حضرت محمد ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے جو پہلی وحی فرمائی وہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات ہیں۔ ان آیات اور ان کے بعد کی آیات کا بنیادی موضوع اور مرکزی مضمون دو ہستیوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ایک ہستی خالق اور دوسری مخلوق ہے۔ خالق کو چونکہ اپنی مخلوق سے کچھ کہنا تھا اس لیے اس نے مخلوق پر اپنا احسان یاد دلایا اور ساتھ ہی اپنی فوقیت و برتری بھی بیان فرمائی۔ چونکہ انسان کو ہدایت و گمراہی میں سے کسی کو بھی قبول کرنے کی آزادی ہے لہٰذا وہ گمراہی کو اختیار کرنے کی صورت میں تکبر و غرور کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور اپنی مخلوقانہ حیثیت کو بھول کر زندگی کو کسی ایسی ڈگر پر چلا سکتا ہے جو سراسر خدا کے مقابلے میں خدا بننے کا اظہار ہو لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسے انسان کو ایسی زندگی کے تباہ کن نتائج سے خبردار بھی کیا ہے اور اپنا قہر و جبروت بھی یاد دلایا ہے۔

ام المؤمنین بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی، جو خواب آپ دیکھتے وہ صبح کی طرح ظاہر ہوتا۔ پھر آپ نے گوشہ نشینی اور خلوت اختیار کی، ام المؤمنین بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا سے توشہ لے کر غار حرا میں چلے جاتے ایک مرتبہ اچانک فرشتہ آپ کے پاس آیا اور کہا ''اِقْرَأْ'' یعنی پڑھیے، آپ ﷺ فرماتے ہیں میں نے کہا ''میں تو پڑھا ہوا نہیں'' فرشتے نے مجھے پکڑا اور بھینچا یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھ، میں نے کہا میں پڑھنا نہیں جانتا، فرشتے نے مجھے دوبارہ بھینچا جس سے مجھے تکلیف ہوئی، پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھیے میں نے پھر یہی کہا کہ میں پڑھنے والا نہیں، اس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑ کر دبایا اور پھر چھوڑ دیا اور اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ سے مَالَمْ یَعْلَمْ تک پڑھا۔

سُوۡرَةُ الۡعَلَق

آیات:۱۹ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ(۱) خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ(۲) اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ(۳) الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ(۴) عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ(۵)

(اے نبیؐ) اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھیے آپ کا رب تو بڑا ہی کریم ہے جس نے علم بخشا قلم سے، اس نے انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ﴾ (اے نبی ﷺ) اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے۔

اِقۡرَاۡ پڑھیے (قرأ، یقرءُ، قِراۃً) پڑھنا، اس سے فعل امر واحد مذکر حاضر، بِاسۡمِ رَبِّکَ ساتھ نام رب اپنے کے، کَ کی ضمیر واحد مذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، الَّذِیۡ جس نے، خَلَقَ پیدا کیا (خَلَقَ، یَخۡلُقُ، خَلۡقًا) پیدا کرنا، خالِقٌ پیدا کرنے والا، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"فرشتے نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ پڑھو تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیے تھے اور انہیں پڑھنے کے لیے کہا تھا کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا جاؤں آپ اسی طرح پڑھتے جائیں تو آپ ﷺ کو یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ نیز مطلقاً "خَلَقَ" پیدا کیا فرمایا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ کس کو پیدا کیا، اس سے خود بخود یہ

مفہوم نکلتا ہے کہ اس رب کا نام لے کر پڑھیے جو خالق ہے جس نے ساری کائنات کو اور کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔

خَلَقَ پیدا کیا فعل ماضی واحد مذکر غائب (یعنی رب العزت نے)، الْاِنْسَانَ انسان کو، مِنْ عَلَقٍ جمے ہوئے خون سے، مِنْ سے، عَلَقٍ جما ہوا خون۔ اس کا مفرد عَلَقَةٌ ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''عَلَقٌ خون کی پھٹکی یا تھکّے کو کہتے ہیں، انسان کی خلقت کی ابتدائی مراحل کی یاددہانی قرآن میں جگہ جگہ فرمائی گئی ہے مثلاً سورۂ حج، سورۃ مؤمنون، سورۃ سجدہ، سورۃ قیامہ اور سورۃ دہر وغیرہ میں اور ہر جگہ الفاظ کی وضاحت کردی گئی ہے اور اس خاص پہلو کی طرف بھی ہم نے توجہ دلا دی ہے جو اس یاددہانی سے پیش نظر ہے، اس سے مقصود بالعموم تین حقیقتوں کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔

o...... ایک یہ کہ جس خالق کی قدرت وحکمت کا یہ حال ہے کہ وہ خون کی ایک حقیر پھٹکی کو عاقل ومدرک اور سمیع وبصیر انسان بنا کر کھڑا کر دیتی ہے، کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کر دینا مشکل ہوجائے گا۔

o...... دوسری یہ کہ انسان کی تخلیق میں خالق کی جو قدرتیں اور حکمتیں نمایاں ہیں وہ دلیل ہیں کہ یہ عبث اور بے غایت نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے ایک روزِ حساب لازماً آنا ہے اور یہ اپنے اعمال کی جزا یا سزا ضرور پائے گا۔

o...... تیسری یہ کہ جس انسان کی پیدائش اتنے حقیر اور ذلیل عنصر سے ہوئی ہے، اس کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی پاکی و پاک دامنی یا اپنے حسب ونسب کی حکایت زیادہ بڑھائے اور غرور واستکبار کا مظاہرہ کرے۔

قرآن کے بعض مقامات میں بیک وقت ان تمام حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن بعض جگہ ان میں ایک یا دو مدِّ نظر ہوتے ہیں۔ یہاں موقع کلام اشارہ کر رہا ہے کہ ان میں سے اوپر کی دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، مقصود یہ بتانا ہے کہ خالق کائنات کا کلام خاص اُس کے نام سے لوگوں کو پہنچاؤ اور

ان کو یاددہانی کراؤ کہ جس خالق نے انسان کو خون کی پھٹکی سے وجود بخشا ہے، وہ قادر ہے کہ اس کو دوبارہ پیدا کرکے اس کے اعمال کا محاسبہ کرے۔" (تدبر قرآن، ج:٨)

﴿اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ، الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ﴾

پڑھیے، آپ کا رب تو بڑا ہی کریم ہے، جس نے علم بخشا قلم سے۔

اِقۡرَاۡ پڑھیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (قَرَءَ، یَقۡرَءُ، قِرَأةً) پڑھنا، وَ رَبُّکَ اور آپ کا رب، 'ک' ضمیر واحد مذکر حاضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، الۡاَکۡرَمُ کرم کرنے والا (کریم) ہے، کرُمٌ اسم تفضیل کا صیغہ اَکۡرَم الَّذِیۡ جس نے، اسم موصول، عَلَّمَ علم بخشا، سکھایا (عَلَّمَ، یُعَلِّمُ، تعۡلِیمٌ) علم بخشا، سکھانا، بِالۡقَلَمِ (بِ. الۡقَلَمِ) ساتھ قلم کے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"یہ اِقۡرَاۡ سابق اِقۡرَاۡ سے بدل کے طور پر آیا ہے اور یہ اسی حکم کی تاکید ہے جو اوپر دیا گیا ہے البتہ اس میں اظہارِ احسان کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ قریش اللہ تعالیٰ کے اس فضل عظیم کی قدر کریں کہ اس نے ان کی ہدایت کے لیے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا، یہ امر واضح رہے کہ اس سے پہلے بنی اسماعیل کے پاس سیدنا ابراہیمؑ وسیدنا اسماعیلؑ کی تعلیمات سے متعلق اگر کچھ روایات تھیں تو وہ زبانی روایات کی شکل میں تھیں، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو احکام عشرہ تو ضرور لکھ دیے گئے لیکن موجودہ تورات کی حیثیت بس قلمبند کی ہوئی روایات کی ہے، اس کے اندر یہ امتیاز ناممکن ہے کہ کون سی بات اللہ تعالیٰ کے لفظوں میں ہے اور کون سی بات مجہول راویوں کے الفاظ میں لیکن قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام فرمایا کہ اس کا ہر لفظ اول تو براہ راست نطق الٰہی ہے، پھر اس کو زبانی روایات پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کو عین اللہ تعالیٰ کے لفظوں میں تحریری طور پر محفوظ کر دیا گیا اور یہ کام اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات کے تحت کرایا تاکہ کسی حرف میں سرمو کوئی تغیر نہ ہونے پائے۔

اس اہتمامِ خاص کی طرف یہاں "عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ" کے الفاظ میں اشارہ فرمایا اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ عربوں پر ایک عظیم احسان ہوا، اول تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وحی کو محفوظ کرنے کا یہ اہتمام اس سے

پہلے کسی قوم کے لیے بھی نہیں کیا گیا، ثانیاً اہل عرب امی ہونے کے باعث قلم کے استعمال سے اچھی طرح واقف نہ تھے، لیکن قرآن کی بدولت انہوں نے اس کے ذریعہ وہ عظیم آسمانی خزانہ محفوظ کیا جو صرف انہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے سرمایۂ زندگی ہے۔" (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ اس نے انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

عَلَّمَ سکھایا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (عَلَّمَ، يُعَلِّمُ، تَعْلِيمٌ) سکھانا، الْاِنْسَانَ انسان کو، یہاں انسان سے مراد بنی نوع انسان ہے، مَا جو، اسم موصول، لَمْ يَعْلَمْ وہ نہیں جانتا تھا، لَمْ حرف نفی و جزم۔ مضارع کے شروع میں آئے تو نہ صرف اس کے آخری حرف پر جزم دیتا ہے اور اسے ماضی منفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

"نوعِ بشر کو ماضی و حال میں جو کچھ معلوم ہوا ہے یا آئندہ جو کچھ بھی معلوم ہو سکے گا، یہ سب اگر فیضانِ الٰہی کا پرتو نہیں تو اور کیا ہے؟ انسان کو اپنے جن جن علوم وفنون، معارف وصنائع پر ناز ہے، یہ سب اگر حق تعالیٰ ہی کے سکھائے ہوئے، بتائے ہوئے، سمجھائے ہوئے نہیں تو اور کیا ہیں، قرآن مجید نے یہاں ایسی ہی گہری حقیقت کو یاد دلایا ہے۔" (تفسیر ماجدی)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا 'اِقْرَأْ' سے ہوئی جس میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ پڑھنا لکھنا مسلمان کی زندگی کا جزو لاینفک ہے اور حصول علم کی ابتدا رب کریم کے پاکیزہ نام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے۔

۲) جس خالق و مالک نے انسان کو بہترین شکل وصورت سے نوازا ہے، اسی نے اس کو دولتِ علم سے مالا مال کر کے اسے دوسری مخلوقات پر فضیلت و برتری عطا کی ہے۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن حکیم ایسی عظیم کتاب نازل فرمائی کہ جس سے لوگوں میں بہترین اخلاق پیدا ہوں

اوران کی دنیا اور آخرت سنور جائے تو دوسری طرف انہیں علم ودانش کے ساتھ حقائق واشیاء کا علم
عطا کیا کہ جس سے انہوں نے بہتر زندگی گزارنے کے وسائل مہیا کر لیے ہیں۔

۳) وہ رب بڑا ہی کریم ہے کہ جس نے انسان کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ قلم سے لکھنے کی قوت بھی عطا کی کہ ایک طرف زبان وبیان سے وہ حق وصداقت کا اعلان کرے تو دوسری طرف وہ قرطاس وقلم کے ذریعہ سچائی وراست بازی کی اشاعت کا حق ادا کرے۔

۴) ان تمام صفات اور خوبیوں کے باوجود اسے فخر وغرور کو نہیں بلکہ عجز وخاکساری کو اپنی زندگی کا محور ومقصد بنانا چاہیے، وہ اپنی پیدائش پر غور کرے کہ وہ حقیر پانی اور خون کی پھٹکی سے ہوئی اور رب قدیر نے اسے بہترین شکل کے ساتھ جیتا جاگتا انسان بنا دیا، اگر وہ ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کرے تو بے اختیار اس کا سر اپنے مولا ومالک کے حضور جھک جائے اور اس کے لیے اس کی بندگی کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

....

كَلَّآ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَيَطۡغٰٓى (٦) اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰى (٧) اِنَّ اِلٰى
رَبِّكَ الرُّجۡعٰى (٨) اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يَنۡهٰى (٩) عَبۡدًا اِذَا
صَلّٰى (١٠) اَرَءَيۡتَ اِنۡ كَانَ عَلَى الۡهُدٰٓى (١١) اَوۡ اَمَرَ
بِالتَّقۡوٰى (١٢) اَرَءَيۡتَ اِنۡ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى (١٣) اَلَمۡ يَعۡلَمۡ بِاَنَّ
اللّٰهَ يَرٰى (١٤) كَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ ۙ لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ (١٥)
نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (١٦) فَلۡيَدۡعُ نَادِيَهٗ (١٧) سَنَدۡعُ
الزَّبَانِيَةَ (١٨) كَلَّا ؕ لَا تُطِعۡهُ وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ (١٩) السجدة

ہاں ہاں بے شک انسان حد سے نکل جاتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے پروا سمجھتا

ہے (یاد رکھو اے انسان!) یقیناً اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔ کیا اس شخص کا حال آپ نے دیکھا جو بندۂ (مؤمن) کو روکتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ کیا (اے مخاطب) تو دیکھتا ہے کہ اگر وہ بندۂ (مؤمن) راہِ راست پر ہو یا وہ پرہیز گاری کا حکم دیتا ہو (تو پھر بھی تم اس کو اس کام سے روکو گے؟) آپ نے دیکھ لیا؟ اگر اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی (تو کیا وہ سزا سے بچ سکے گا؟) کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ اُسے دیکھ رہا ہے، ہاں اگر باز نہ آئے گا تو (یقیناً) ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے (یعنی) وہ پیشانی جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے، پھر وہ بلا لے اپنے حامیوں کی ٹولی کو، ہم بھی دوزخ کے پیادوں کو بلا لیں گے۔ خبردار (اس ظالم و کافر) کا کہنا ہرگز نہ مانیے اور نماز سے (رب کا) قرب حاصل کرتے رہیے۔

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى﴾ ہاں ہاں! بے شک انسان حد سے نکل جاتا ہے۔

كَلَّآ ہاں ہاں! حرفِ زجر و تنبیہ، اِنَّ الْاِنْسَانَ بلاشبہ انسان، لَيَطْغٰٓى (لَ. يَطْغٰى) یقیناً۔ حد سے نکل جاتا ہے، لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے (طَغٰى، يَطْغٰى، طُغْيَانًا) سرکشی اختیار کرنا، حد سے نکل جانا، جب پانی دریا کے کناروں سے امڈ آتا ہے تو اسے طغیانی کہتے ہیں۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت سرکشی اختیار کرتی ہے، خواہشات نفس کی پجاری بن جاتی ہے اور اپنے رب عزوجل سے بغاوت کی راہ پر چل پڑتی ہے۔'' (صفوة التفاسیر)

﴿اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى﴾ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے پروا سمجھتا ہے۔

اَنْ رَّاٰهُ یہ کہ وہ دیکھتا ہے (سمجھتا ہے) (رَاٰى، يَرٰى، رَاْيًا، رُؤْيَةً) آنکھ سے دیکھنا، ادراک کرنا، رائے رکھنا، اعتقاد و گمان رکھنا، سمجھنا۔ (القاموس الوحید)، ہٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب سرکش انسان کی طرف جاتی ہے (جو) اِسْتَغْنٰى (اپنے آپ کو) بے پروا سمجھتا ہے (اِسْتَغْنٰى، يَسْتَغْنِىْ، اِسْتِغْنَاء)

مستغنی ہونا، بے پرواہونا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

”یہاں یہ بتایا کہ انسان کے حدِ عبودیت سے نکل جانے اور سرکشی اور طغیانی کی اکثر وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو اپنے خالق کی طرف سے بے نیاز سمجھنے لگتا ہے۔“ (تفسیر ماجدی)

﴿اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی﴾ (یادرکھ اے انسان) یقیناً اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔

اِنَّ بلاشبہ، یقیناً، اِلٰی رَبِّکَ طرف اپنے رب کے، الرُّجۡعٰی لوٹنا ہے (رَجَعَ، یَرۡجِعُ، رُجُوۡعًا وَ رَجَاعًا) لوٹنا، پلٹنا، اردو میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

”قلب میں انابت و شکستگی پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر کوئی طریقہ نہیں کہ استحضار اپنے اسی انجام و عاقبت کا ہوتا رہے۔“ (تفسیر ماجدی)

﴿اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡهٰی، عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی﴾

کیا اس شخص کا حال آپ نے دیکھا جو بندہ (مؤمن) کو روکتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے۔

اَرَءَیۡتَ کیا آپ نے دیکھا، اَ، استفہام کے لیے، الَّذِیۡ اسم موصول، اس (شخص کو)، یَنۡهٰی (جو) روکتا ہے مضارع واحد مذکر غائب (نَهٰی، یَنۡهٰی، نَهۡیًا) روکنا، منع کرنا، منہیات وہ باتیں جن سے رک جانا چاہیے، اردو میں مستعمل ہے، عَبۡدًا بندہ (مؤمن) کو، اِذَا جب صَلّٰی وہ نماز پڑھتا ہے، فعل ماضی واحد مذکر غائب (صَلّٰی، یُصَلِّیۡ، صَلَاۃً) نماز پڑھنا، لفظ صلوٰۃ (نماز) اردو زبان میں بھی معروف ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

”عبدًا“ بندہ خاص سے اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہونا بالکل ظاہر ہے اور روکنے والے سے مراد ابوجہل سے لی گئی ہے۔ (تفسیر ماجدی)

﴿اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى، اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى﴾

کیا (اے مخاطب) تو دیکھتا ہے کہ اگر وہ بندہ (مؤمن) راہ راست پر ہو یا پرہیزگاری کا حکم دیتا ہو (تو پھر بھی تم اس کو اس کام سے روکو گئے؟)۔

اَ (کیا) حرف استفہام رَءَیْتَ ماضی واحد مذکر حاضر، اِنْ كَانَ اگر وہ (بندۂ مؤمن)، عَلَى الْهُدٰٓى، اوپر ہدایت کے، اَوْ یا، اَمَرَ حکم دیتا ہو بِالتَّقْوٰى (بِ. التَّقْوٰى) پرہیزگاری کا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر انصاف پسند شخص مخاطب ہے۔ اس سے پوچھا جارہا ہے کہ تم نے دیکھی اس شخص کی حرکت جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے ایک بندے کو روکتا ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر وہ بندہ راہ راست پر ہو یا لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور برے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتا ہو اور یہ منع کرنے والا حق کو جھٹلاتا اور اس سے منہ موڑتا ہو، تو اس کی یہ حرکت کیسی ہے؟ کیا یہ شخص یہ روش اختیار کرسکتا تھا اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو بھی دیکھ رہا ہے جو نیکی کا کام کرتا ہے اور اس کو بھی دیکھ رہا ہے جو حق کو جھٹلانے اور اس سے روگردانی میں لگا ہوا ہے، ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومی کو اللہ تعالیٰ کا دیکھنا خود اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ ظالم کو سزا دے گا اور مظلوم کی دادرسی کرے گا۔'' (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى، اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى﴾

آپ نے دیکھ لیا؟ اگر اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی (تو کیا وہ سزا سے بچ سکے گا؟) کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

اَرَءَيْتَ کیا آپ نے دیکھا، اِنْ كَذَّبَ کہ اس نے جھٹلایا فعل ماضی واحد مذکر غائب (كَذَّبَ، يُكَذِّبُ تَكْذِيْبًا) جھٹلانا، وَ تَوَلّٰى، اور منہ پھیرا (روگردانی کی) ماضی واحد مذکر غائب (تَوَلّٰى، يَتَوَلّٰى) منہ پھیرنا، اَلَمْ کیا نہیں، لَمْ حرف نفی اور مضارع پر جزم دیتا ہے، يَعْلَمْ (وہ جانتا ہے) فعل مضارع واحد مذکر غائب (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، پہچاننا، بِاَنَّ اللّٰهَ کہ بے شک اللہ

تعالیٰ، یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں: ”یعنی اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق کو جھٹلا کر ایمان کو خیر باد کہا۔“ (زبدة التفسیر من فتح القدیر)

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

”کیا اس ظالم، بدحال کو خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام کرتوتوں سے آگاہ ہے اور وہ اسے اس کی سزا دے گا۔ افسوس کہ اس نے کیسی جہالت اور نادانی سے کام لیا! پھر اسے مزید زجر و توبیخ سنائی جا رہی ہے۔“ (صفوة التفاسیر)

﴿كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ، نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ﴾

هاں هاں! اگر وہ باز نہ آئے گا تو (یقیناً) ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے (یعنی وہ) پیشانی جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے۔

كَلَّا ہاں ہاں! حرف زجر و توبیخ، كَلَّا ہمیشہ تردید ہی کے معنی میں نہیں، بلکہ کبھی زور و تاکید کے موقع پر ”یقیناً“ کے معنی میں بھی آتا ہے، لَئِنْ اگر، لَّمْ يَنْتَهِ وہ باز نہ آیا، لَمْ ”نہ“ مضارع کے شروع میں آئے تو اسے ماضی کے معنی میں بدل دیتا ہے اور اس کے آخری حرف پر جزم دیتا ہے، جزم آنے کی وجہ سے اگر ”ی“ ہو تو وہ گر جاتی ہے، (اِنتَهَى، يَنْتَهِي، اِنْتِهَاءً) باز آنا، رُکنا، لَنَسْفَعًا تو ہم (لَ. نَسْفَعًا) بضرور گھسیٹیں گے، ’لام‘ تاکیدی معنی دیتا ہے (سَفَعَ، يَسْفَعُ، سَفْعًا) جسم کے کسی عضو کو پکڑ کر زور سے کھینچنا، سَفَعَ نَاصِيَتَهُ اس کی پیشانی کو پکڑ کر زور سے کھینچا (القاموس الوحید) لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ہم ضرور بضرور اسے پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے، نَاصِيَةٍ (ایسی) پیشانی، كَاذِبَةٍ (جو) جھوٹی ہے، كِذْبٌ، جھوٹ، اس سے اسم صفت كَاذِبَةٍ جھوٹی، خَاطِئَةٍ خطا کار (ہے) (خَطِئَ، يَخْطَأُ، خَطْئًا) غلطی کرنا، جرم کرنا، اس سے اسم صفت خاطِئَةٍ، خطا کار، یہ پیشانی کی دوسری صفت ہے۔

”نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ“ اس سے مراد خطا کار پیشانی والا، جھوٹا شخص ہے جو جان بوجھ کر بندۂ مؤمن کے درپے آزار تھا۔“ (صفوة التفاسیر)

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں: ''ایسے خطا کار مجرم کو ہم پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے اور جہنم میں جھونک دیں گے۔'' (العیاذ باللہ)

﴿ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ، سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴾

وہ (سرکش) بلالے اپنے حامیوں کی ٹولی کو، ہم بھی دوزخ کے پیادوں کو بلالیں گے۔

فَلْيَدْعُ (فَ. لْ. يَدْعُ) پس، چاہیے، کہ وہ بلالے (دَعَا، يَدْعُوْ، دَعْوًا وَ دَعْوَةً) بلانا، پکارنا، آواز دینا، مدد چاہنا، مدد کے لیے بلانا۔ (قاموس الوحید) نَادِيَهٗ، اپنی مجلس (کو) ''وَالنّادی'' اَلْمَكَانُ الَّذِیْ يَجْتَمِعُ فِيْهِ الْقَوْمُ وَلَا يُسَمّٰى نَادِياً حَتّٰى يَكُوْنَ فِيْهِ اَهْلُهٗ (المراغی) ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں قبیلہ اور قوم کے لوگ جمع ہوں اور ضروری ہے کہ اس میں اہل وعیال اور دوست واحباب بھی ہوں۔ سَنَدْعُ (سَ. نَدْعُ) قریب ہے، ہم بلالیں گے، ''س'' قریب کا معنی دیتا ہے، الزَّبَانِيَةَ اس کا مفرد زِبْنِية ہے، وہ مخصوص فرشتے جو دوزخیوں کو آگ میں دھکیلیں گے۔ (القاموس الوحید)

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں:

''کہ وہ قبیلے اور قوم کے لوگوں اور اپنے اعوان وانصار سب کو اپنی مدد کے لیے بلالے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابوجہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ مجھے عذاب آخرت سے ڈراتے ہیں جبکہ میرے ساتھ لوگوں کے انبوہ اور جتھے ہیں تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ (زبدۃ التفسیر من فتح القدیر)

﴿ كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾

خبردار! (اس ظالم وکافر) کا کہنا ہرگز نہ مانیے اور نماز سے (رب کا) قرب حاصل کرتے رہیے۔

كَلَّا خبردار! (حرف زجر وتنبیہ)، لَا مت، تُطِعْهُ (تُطِعْ. هُ) کہنا مانیے، اس کا (اَطَاعَ، يُطِيْعُ، اِطَاعَةً) اطاعت کرنا، کہنا ماننا، تُطِعْ اصل میں تُطِيْعُ تھا، لائے ناہیہ کی وجہ سے 'ی' حرف علت گر گیا، هٗ ضمیر واحد مذکر غائب اس کافر وظالم کی طرف جاتی ہے جو نماز پڑھنے سے روکتا ہے، وَاسْجُدْ اور سجدہ کیجیے (نماز پڑھیے) فعل امر واحد مذکر حاضر (سَجَدَ، يَسْجُدُ، سُجُوْدًا) زمین پر پیشانی رکھنا، سجدہ کرنا، شریعت میں صرف اللہ تعالیٰ کے حضور سر جھکانا اور اس طرح نماز پڑھنا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ادا فرمائی ہے، وَاقْتَرِبْ اور قرب حاصل کرتے رہیے۔ فعل امر واحد مذکر حاضر (اِقْتَرَبَ، یَقْتَرِبُ) قرب حاصل کرنا، رضا مندی حاصل کرنا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''فرمایا کہ اگر کوئی سر پھرا آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ کرنے سے روکتا ہے تو اس کی اس حرکت کو خاطر میں نہ لائیے بلکہ سجدہ کیجیے اور اپنے رب سے قریب تر ہو جائیے، یہ امر یہاں واضح رہے کہ قرآن نے جگہ جگہ نماز ہی کو صبر و عزیمت اور فتح باب نصرت کی کلید بتایا ہے اور سجدہ نماز کا سب سے اعلیٰ رکن ہے، یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کس کی مجال ہے کہ آپ کو اس چیز سے روک دے جو آپ ﷺ کی زندگی کی غایت اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کا واحد وسیلہ ہے، اگر کوئی ایسی جسارت کرتا ہے تو آپ ﷺ اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کیجیے، جس کا واحد طریقہ اس کے آگے سر بسجود ہونا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسانوں کی اکثریت مال و دولت اور جاہ وحشمت پانے کے بعد اللہ تعالیٰ کو بھول جاتی ہے درآنحالیکہ یہ تمام اشیا اسی کی عطا اور دین ہیں۔

۲) ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ؓ کو دعوت حق کی تبلیغ و اشاعت اور نماز پڑھنے سے روکنے کی کوشش کی، انہوں نے اس کا نقصان دنیا میں بھی اٹھایا اور آخرت میں بھی وہ ناکام اور نامراد رہوں گے۔

۳) جب ہر طرف مصائب وتکالیف کا ہجوم ہو تو ہمارے لیے لازم ہے کہ اپنی پیشانیوں کو رب کریم کے حضور جھکا دیں اور اسی سے مدد اور قوت حاصل کریں۔

۴) آج امت مسلمہ پر ادبار و ذلت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے، اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ ہدایت الٰہی پر کاربند ہو کر، رب قدیر سے امن اور عافیت کی طلبگار بنے۔

.................o.................

سُورَۃُ الْقَدْر

قرآن مجید نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو احسانِ عظیم فرمایا اور تعلیم بالقلم کا اہتمام کر کے اس کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت کا جو دائمی سروسامان کیا، اس کا ذکر گزشتہ سورۃ ''العلق'' میں ہو چکا ہے اور اس سورۂ مبارکہ کا موضوع ہی نزولِ قرآن ہے، کہ رہتی دنیا تک کے انسانوں کو اس عظیم کتاب کی قدر و قیمت اور ضرورت و اہمیت سے آگاہ کیا جائے اور ترتیب میں اسے سورہ علق کے بعد رکھنے سے خود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس کتابِ ہدایت کے نزول کا آغاز سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوا تھا اسی کے متعلق اس سورۃ میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ کیسی بابرکت اور تقدیر ساز رات میں اس کا نزول شروع ہوا؟

یہ شب قدر ہے اور قدر و منزلت کے لحاظ سے ہزار مہینے سے زیادہ وقعت رکھتی ہے، اس میں جبرئیل فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ نیچے اترتے ہیں، اس وقت خیر و برکت اور امن و سلامتی کا منظر چھا جاتا ہے جو طلوع فجر تک جاری و ساری رہتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔''

(بخاری، مسلم بحوالہ تیسیر القرآن)

سُوْرَةُ الْقَدْرِ

آیات:۵ رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۱) وَمَآ اَدْرٰکَ مَا لَیْلَةُ
الْقَدْرِ (۲) لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۵ لا خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (۳) تَنَزَّلُ
الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ج مِنْ کُلِّ اَمْرٍ (۴)
سَلٰمٌ قف هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۵)

(رب کریم کا ارشاد ہے) بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے، اور آپ کو کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے، فرشتے اور روح الامین اس میں اپنے رب کے اِذن سے ہر حکم کو لے کر اترتے ہیں، سرتا سر امن اور سلامتی (کی رات) ہے، یہ فجر کے طلوع ہونے تک رہتی ہے۔

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا۔

اِنَّا، بے شک ہم نے، "نا" ضمیر جمع متکلم، رب العزت کی طرف جاتی ہے، جمع کا صیغہ اللہ تعالیٰ کے لیے بطور عزت کے آیا ہے، اَنْزَلْنٰهُ (اَنْزَلْنَا.هُ) نازل کیا ہم نے۔ اس (قرآن) کو "هُ" کی ضمیر قرآن کی طرف جاتی ہے، (اَنْزَلَ، یُنْزِلُ، اِنْزَالًا) اتارنا، اور التَّنْزِیْل کے معنی تھوڑا تھوڑا اتارنا، قرآن حکیم جو اللہ کی جانب سے خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی تھوڑا تھوڑا نازل کیا گیا۔ (القاموس الوحید)

جیسا کہ رب کریم کا ارشاد ہے: وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ

تَنۡزِيۡلًا (بنی اسرائیل:۱۰۶) ''اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا تا کہ تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کو سناؤ اور اسے ہم نے بتدریج اتارا۔''

فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ شب قدر میں، فِیۡ حروف جارہ میں سے ہے جو اپنے بعد والے اسم کو زیر دیتے ہیں، لیل، رات، القدر، قدر و قیمت والی۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اصل الفاظ ہیں ''اَنۡزَلۡنٰهُ '' ہم نے اس کو نازل کیا ہے، لیکن بغیر اس کے کہ پہلے قرآن کا کوئی ذکر ہو، اشارہ قرآن ہی کی طرف ہے اس لیے کہ ''نازل کرنا'' خود بخود اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد قرآن ہے اور قرآن مجید میں اس امر کی بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ اگر سیاق کلام یا اندازِ بیان سے ضمیر کا مرجع خود ظاہر ہو رہا ہو تو ضمیر ایسی حالت میں بھی استعمال کر لی جاتی ہے جبکہ اس کے مرجع کا ذکر پہلے یا بعد میں نہ کیا گیا ہو، یہاں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے: شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ (البقرہ:۱۸۵) ''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ وہ رات جس میں پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ غار حرا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر آیا تھا، وہ ماہ رمضان کی ایک رات تھی، اس رات کو یہاں شب قدر کہا گیا ہے اور سورۃ دُخان میں اسی کو مبارک رات فرمایا گیا ہے۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ''ہم نے اس کو برکت والی رات میں نازل کیا۔'' (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ﴾ اور آپ کو کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے، مَاۤ کیا، استفہامیہ، اَدۡرٰىكَ آپ جانیں (اَدۡرٰی، یُدۡرِی) جاننا ''ک'' ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اے محمد (ﷺ) آپ کیا جانیں کہ شب قدر کی عظمت کیا ہے؟'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۬ۙ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ﴾ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ، شب قدر، خَيۡرٌ، بہتر ہے، مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ہزار مہینوں سے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”یہ اس رات کی برکت بیان ہوئی ہے کہ یہ ایک رات ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے، یہ بہتری ظاہر ہے کہ حصول مقصد کے اعتبار سے ہے۔ جس طرح اس مادی دنیا میں فصلوں، موسموں اور اوقات کا اعتبار ہے، اسی طرح روحانی عالم میں بھی ان کا اعتبار ہے، جس طرح خاص خاص چیزوں کے بونے کے لیے خاص خاص موسم اور مہینے ہیں، ان میں آپ بوتے ہیں تو وہ پروان چڑھتی اور ثمرآور ہوتی ہیں، اور اگر ان موسموں اور مہینوں کو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں تو دوسرے مہینوں کی طویل سے طویل مدت بھی ان کا بدل نہیں ہوسکتی اسی طرح روحانی عالم میں بھی خاص خاص کاموں کے لیے خاص موسم اور خاص اوقات مقرر ہیں، اگر ان اوقات و ایام میں وہ کام کیے جاتے ہیں تو وہ مطلوبہ نتائج پیدا کرتے ہیں اور اگر وہ ایام و اوقات نظر انداز ہو جاتے ہیں تو دوسرے ایام و اوقات کی زیادہ سے زیادہ مقدار بھی ان کی صحیح قائم مقامی نہیں کرسکتی، اِس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ جمعہ کے لیے ایک خاص دن ہے، روزوں کے لیے ایک خاص مہینہ ہے، حج کے لیے ایک خاص مہینہ اور خاص ایام ہیں، وقوفِ عرفہ کے لیے معینہ دن ہے۔ ان تمام ایام و اوقات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی عبادتیں مقرر کر رکھی ہیں جن کے اجر و ثواب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، لیکن ان کی ساری برکتیں اپنی اصل صورت میں تبھی ظاہر ہوتی ہیں جب یہ ٹھیک ٹھیک ان ایام و اوقات کی پابندی کے ساتھ عمل میں لائی جائیں، اگر ایسا نہ ہو تو وہ برکت حاصل نہیں ہو پاتی جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہے۔

یہی حال لیلۃ القدر کا ہے، یہ بڑی رحمتوں اور برکتوں کی رات ہے۔ بندہ اگر اس کی جستجو میں کامیاب ہو جائے تو اس ایک ہی رات میں اللہ تعالیٰ کے قرب کی وہ اتنی منزلیں طے کر سکتا ہے جتنی ہزار راتوں میں نہیں کرسکتا۔ ہزار راتوں کی تعبیر بیانِ کثرت کے لیے بھی ہوسکتی ہے اور بیان نسبت کے لیے بھی لیکن مدعا کے اعتبار سے دونوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، مقصود یہی بتانا ہے کہ اس رات کے پردوں

میں روح ودل کی زندگی کے بڑے خزانے چھپے ہوئے ہیں، خوش قسمت ہیں وہ جو اس کی جستجو میں سرگرم رہ سکیں اور اس کو پانے میں کامیاب ہو جائیں۔

اس رات سے متعلق یہ بات تو مسلّم ہے کہ اس میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا، اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ یہ رمضان کی کوئی رات ہے دوسرے مقام پر یہ تصریح ہے کہ قرآن رمضان کے مہینے میں نازل ہوا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ، (البقرہ:۱۸۵) (رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا) رہا یہ سوال کہ یہ رمضان کی کون سی تاریخ ہے تو روایات کے اختلاف کے سبب اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے، بس زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ میں اس کے ہونے کا گمان غالب ہے۔ (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ، سَلٰمٌ ۛ، هِیَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾

فرشتے اور روح الامین، اس میں اپنے رب کے اِذن سے ہر حکم کو لے کر اترتے ہیں، سر تا سر امن اور سلامتی (کی رات) ہے یہ فجر کے طلوع ہونے تک ہے۔

تَنَزَّلُ اترتے ہیں فعل مضارع واحد مؤنث غائب، اصل میں تَتَنَزَّلُ تھا، ثقالت کی وجہ سے ایک 'تَ' حذف ہوگئی، الْمَلٰٓئِكَةُ فرشتے، اس کا مفرد اَلْمَلَکُ ہے، الْمَلٰٓئِكَةُ کے لیے تَنَزَّلُ مضارع واحد مؤنث کا صیغہ بحیثیت جماعت ملائکہ آیا ہے، وَالرُّوْحُ اور روح۔ اس سے مراد جبرئیل امین ہیں، فِیْهَا (فِیْ.هَا) اس رات میں، 'ها' واحد مؤنث کی ضمیر لَیْل (رات) کی طرف جاتی ہے، بِاِذْنِ (بِ. اِذْنِ) ساتھ۔ اجازت (کے) رَبِّهِمْ (رَبِّ.هِمْ) رب۔ اپنے کے، مِنْ سے، كُلِّ اَمْرٍ ہر حکم (کے ساتھ) سَلٰمٌ سلامتی ہے، هِیَ (اس رات میں) هِیَ، اسم اشارہ واحد مؤنث، رات کے لیے آیا ہے، حَتّٰى یہاں تک کہ، مَطْلَعِ الْفَجْرِ فجر طلوع ہو (طَلَعَ، يَطْلَعُ) طلوع ہونا، نکلنا، مَطْلَعٌ (اسم فعل) طلوع کا وقت۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

’’اس میں ملائکہ اور جبرئیل امین ان تمام معاملات میں جو زمین میں نافذ ہونے والے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی منظوری لے کر اترتے ہیں، یہی بات سورۃ دُخان میں ارشاد ہے: ’’فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ، اَمْرًا مِنْ عِنْدِنَا‘‘ یعنی اسی رات تمام حکیمانہ امور کی تقسیم ہوتی ہے، خاص ہمارے حکم سے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت جو امور طے کر رکھے ہوں وہ اس رات میں تقسیم ہوتے ہیں اور متعلق فرشتے اللہ تعالیٰ کے اذن سے ان کی تنفیذ کے لیے زمین پر اترتے ہیں، لفظ ’’الرُّوح‘‘ اس آیت میں قرینۂ دلیل ہے کہ جبرئیل امین کے لیے آیا ہے، چونکہ ملائکہ کے زمرے میں ان کا درجہ بہت اونچا ہے، اس لیے ان کا ذکر خاص طور پر ہوا: ’’سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ‘‘ یہ اس رات کے اس پہلو کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر ’’خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ‘‘ کے الفاظ سے ہوا ہے، فرمایا کہ یہ رات کلیۃً امان ہی امان ہے اور اس کی یہ برکت طلوع فجر تک محیط ہے۔

سَلٰمٌ میرے نزدیک مبتدا محذوف کی خبر ہے، پورا جملہ ’’هِيَ سَلٰمٌ ‘‘ ہے پوری توجہ خبر پر مرکوز کر دینے کے لیے مبتدا کو حذف کر دیا ہے، جس طرح ’’زَيْدٌ عَدْلٌ‘‘ میں لفظ عدل میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے، اسی طرح سَلٰمٌ میں بھی مبالغہ کا مفہوم ہے۔

لفظ ’’سَلٰمٌ‘‘ میں یوں تو ہر قسم کی آفات سے محفوظ ہونے کی ضمانت ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک رات میں شیاطین کی ہر قسم کی دوا دوش پر پابندی لگا دی جاتی ہے، جس طرح وحی کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ ملاء اعلیٰ کے حدود میں ان کی مداخلت کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں، اِس کی تفصیل قرآن میں موجود ہے، اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر میں شیاطین آسمانی کرفیو کے تحت ہوتے ہیں اور ان پر یہ کرفیو طلوع فجر تک نافذ رہتا ہے جس کے سبب نہ وہ اس اہم رات کے اسرار معلوم کرنے کے لیے کوئی نقل و حرکت کر سکتے ہیں اور نہ ہی شب مبارک کی برکتوں میں کوئی خلل پیدا کر سکتے ہیں۔‘‘ (تدبر قرآن، ج:۸)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اس سورۃ مبارکہ میں نسل انسانی کے لیے بالعموم اور امت مسلمہ کے لیے بالخصوص رب العالمین کی طرف سے کئی بشارتیں ہیں۔

۲) سب سے پہلے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ہم نے قرآن نازل کیا ہے یعنی یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف نہیں ہے۔

۳) یہ قرآن حکیم نسل انسانی کے لیے ہدایت اور رہنمائی ہے اور اس کی پاکیزہ تعلیمات پر عمل کرنے میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔

۴) جس رات میں یہ قرآن نازل ہوا، اس رات کو ہمیشہ کے لیے ''شب قدر'' بنا دیا گیا ہے، اور اس میں عبادت وریاضت کو ہزاروں مہینوں کی بندگی سے افضل قرار دیا گیا ہے اور تمام ساعتوں کو سکون اور سلامتی کے لمحات بنا دیا گیا ہے۔

۵) 'رمضان المبارک' جس مہینہ میں قرآن نازل ہوا اسے مومنوں کے لیے تزکیہ اور تربیت کا مہینہ بنا دیا گیا ''لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.''

٦) اے نسلِ انسانی! تم ظلم وستم کی راہ چھوڑ دو، قرآن تمھیں امن اور سلامتی کی طرف بلاتا ہے، اے مسلمانو! تمہاری زندگیاں بھی قرآنی تعلیمات سے خالی ہو چکی ہیں، تم بھی بھٹک رہے ہو، ہدایت اور امن وسلامتی چاہتے ہو تو قرآن سے رجوع کرنا ضروری ہے۔

..................o..................

سُوۡرَةُ الۡبَیِّنَة

یہ سورہ مدنی سورتوں میں سے ہے، قرآن مجید کی ترتیب میں اس کو "سورۃ العلق" اور "سورۃ القدر" کے بعد رکھنا بہت معنی خیز ہے، سورۃ العلق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کا ذکر ہے، سورۃ القدر میں اس کے نزول کا تذکرہ ہے اور اس سورۃ مبارکہ میں بتایا جا رہا ہے کہ اس کتاب عظیم کے ساتھ خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنا کیوں ضروری تھا؟

سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنے کی ضرورت بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے لوگ، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، جس کفر اور ضلالت کی حالت میں مبتلا تھے، اس سے ان کا نکلنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایسا رسول بھیجا جائے جس کا وجود اپنی رسالت پر روشن دلیل ہو اور وہ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بلا کم و کاست اس کی اصلی اور صحیح صورت میں پیش کرے، جو کفر و باطل کی ان تمام آمیزشوں سے پاک ہو جن سے سابقہ آسمانی کتب کو آلودہ کر دیا گیا ہے اور اس کی تعلیمات ٹھیک اور درست ہوں اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سینوں اور سفینوں میں محفوظ کر دیا جائے۔

اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اس بات پر متفق تھے کہ سرزمین عرب میں ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے، وہ اس کی علامات بھی جانتے تھے اور اس کے بارے میں ان کے ہاں کوئی اختلاف نہ تھا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد کچھ ایمان لے آئے مگر اکثر نے حسد اور عداوت کا راستہ اختیار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسماعیل میں کیوں مبعوث ہوئے ہیں؟

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انبیاء بھی آئے اور جو کتابیں بھی بھیجی گئی تھیں، انہوں نے اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا تھا کہ سب طریقوں کو چھوڑ کر خالص اللہ کی بندگی کا طریقہ اختیار کیا جائے، نظام زکوٰۃ اور صلوٰۃ کی پابندی کی جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی بات کی طرف بلا رہے ہیں، لہٰذا جو لوگ اس دعوتِ حق کی پیروی کریں گے ان کے لیے ابدی راحت اور آرام کے باغات ہیں اور جو انکار کریں گے ان کی سزا ہمیشہ کی جہنم ہے۔

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ

آیات:۸ رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ(۱) رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً(۲) فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ(۳) وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ(۴) وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ(۵)﴾

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے انکار کی روش اختیار کی وہ اپنے کفر سے اس وقت تک باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے سامنے روشن دلیل نہ آجاتی (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول آتا جو پاک صحیفے (قرآن) پڑھ کر سناتا جن میں بالکل راست اور درست باتیں لکھی ہوتیں۔اور اہل کتاب ٹولیوں میں نہیں بٹے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن دلیل آگئی۔اور انہیں صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ یکسو ہو کر اور مخلص بن کر صرف اللہ کی عبادت کریں،نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی نہایت درست دین ہے۔

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ، رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً﴾

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے انکار کی روش اختیار کی وہ اپنے کفر سے اس وقت تک باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس روشن دلیل نہ آجاتی (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول آتا جو پاک صحیفے (قرآن) پڑھ کر سناتا۔

لَمْ يَكُنِ نہ تھے، لَمْ حرف نفی و جزم فعل مضارع کے شروع میں آجائے تو اس کے آخری حرف پر جزم دیتا ہے جیسا کہ يَكُنْ کی نون پر ہے (كَانَ، يَكُونُ، كَوْنًا) ہونا، كَفَرُوْا (جو) کافر ہوئے، جنہوں نے انکار کیا، فعل ماضی جمع مذکر غائب (كَفَرَ، يَكْفُرُ، كُفرًا) انکار کرنا، کفر کرنا، مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اہل کتاب میں سے (یہود و نصاریٰ) وَالْمُشْرِكِيْنَ اور مشرکوں میں سے، اس کا مفرد مُشرِكٌ ہے، مُنْفَكِّيْنَ باز رہنے والے (کفر سے) اسم فاعل، اس کا مفرد، مُنْفَكٌّ ہے، حَتّٰى یہاں تک کہ، حرف غایت، تَاْتِيَهُمُ (تَاْتِيْ. هُمْ) آئی۔ان کے پاس (اَتى، يَأتِيْ) آنا، تَاْتِيْ مضارع واحد مؤنث غائب، "هُمْ" ضمیر جمع مذکر غائب، اہل کتاب اور مشرکین کی طرف جاتی ہے الْبَيِّنَةُ، روشن دلیل (وہ روشن دلیل کیا ہے؟) رَسُوْلٌ (یہ) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، مِّنَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی طرف سے، يَتْلُوْا پڑھے (تَلَا، يَتْلُوْا، تِلَاوَةً) پڑھنا، تلاوت کرنا، صُحُفًا مُّطَهَّرَةً صحیفے، پاک (پاکیزہ اوراق) صُحُفًا کا مفرد صَحِيْفَةٌ، ورق، کتاب، لکھی ہوئی بات، مُّطَهَّرَةً پاکیزہ، صُحُفًا کی صفت ہے۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

"اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہود و نصاریٰ اور بتوں کے پجاری کفر و ضلالت کی وادیوں میں بھٹکتے رہے اور مرور زمانہ کے ساتھ ان کا کفر بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ اللہ کی طرف سے دلیلِ واضح اور برہان قاطع آگیا یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت نبی و رسول مبعوث ہوئے اور ان پر اللہ کی کتاب نازل ہوئی، تب انہوں نے حق کو پہچانا، اور ان میں سے کچھ لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور کچھ کفر پر ہی باقی رہے، یہاں تک کہ ان کی موت آگئی، آیت (۲) میں رسول سے مراد نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم اور ''صُحُفًا مُّطَهَّرَةً'' سے مراد قرآن کریم ہے۔'' (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

﴿فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ جن میں راست اور درست باتیں لکھی ہوتیں۔

فِيهَا (فِیْ. هَا) (اُن) میں۔اُن، ''ھا'' کی ضمیر صحیفوں کی طرف جاتی ہے، كُتُبٌ نوشتے، احکام (لکھی ہوئی باتیں)، قَيِّمَةٌ راست، درست۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''یعنی ان صحیفوں یا کتاب میں ایسے احکام ہوں جن میں کوئی کجی نہ ہو، حق باطل سے واضح طور پر پہچانا جاسکے۔ الصّاوی کہتے ہیں ''صحف'' ایسے اوراق ہیں جن پر قرآن لکھا جاتا ہے اور ''كُتُبٌ'' سے مراد لکھے ہوئے احکام ہیں اور ''فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ'' کے مفہوم میں یہ بات بھی آتی ہے کہ قرآن حکیم گزشتہ تمام آسمانی کتب کا نچوڑ ہے۔'' (صفوة التفاسیر)

﴿وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾

اور اہل کتاب ٹولیوں میں نہیں بٹے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن دلیل آ گئی۔

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، مَا نہیں، تَفَرَّقَ تفرقہ میں پڑے (بٹ گئے) تَفَرَّقَ، يَتَفَرَّقُ تفریق پیدا کرنا، بٹ جانا، آپس میں اختلاف ہونا، ایک دوسرے سے جدا ہونا، الَّذِينَ اسم موصول، وہ لوگ، أُوتُوا الْكِتٰبَ (جن کو) دی گئی کتاب (اس سے پہلے) اِلَّا مگر، حرف استثناء، مِنْ بَعْدِ اس کے بعد مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ جو آئی ان کے پاس روشن دلیل۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''اس آیہ کریمہ میں ان اہل کتاب کی زجر و توبیخ کی گئی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔ اللہ نے کہا کہ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ انہوں نے حق کو نہیں پہچانا، بلکہ حق واضح ہو جانے کے بعد انہوں نے کفر کو ترجیح دی۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ تمام یہود و نصاریٰ بعثت نبوی سے پہلے خاتم النبیین ﷺ کی آمد کا انتظار کرتے

رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ مبعوث ہو گئے، اِس کے بعد آپ ﷺ پر ایمان لانے میں اختلاف کر بیٹھے، بعض لوگ ایمان لے آئے اور بعض نے انکار کر دیا۔ سورۃ آل عمران آیت (۱۹) میں اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو یوں بیان فرمایا: وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ. ''اور اہل کتاب نے اپنے پاس علم آ جانے کے بعد، محض سرکشی اور حسد کی بنا پر اختلاف کیا۔'' (تیسیر الرحمٰن، لبیان القرآن)

﴿وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾

اور انہیں صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ یکسو ہو کر اور مخلص بن کر صرف اللہ کی عبادت کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی نہایت درست دین ہے۔

وَ عاطفہ، مَآ نافیہ، اُمِرُوْٓا حکم دیا گیا تھا ان کو (اہل کتاب کو) فعل ماضی مجہول جمع مذکر غائب (اَمَرَ، يَأْمُرُ، اَمْرًا) حکم دینا، اِلَّا مگر (اس کا) حرف استثناء، لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ کہ وہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی، (عَبَدَ، يَعْبُدُ، عَبْدًا) عبادت کرنا، عاجزی اختیار کرنا، پوری زندگی اطاعت الٰہی میں گزارنا، احکام الٰہی کا پابند رہنا، مُخْلِصِيْنَ مخلص بن کر، اس کا مفرد مُخْلِصٌ ہے اور اخلاص مصدر ہے، اس کا معنی ہے خالص اللہ ہی کا بندہ بن کر رہنا اور اس کے احکام کی پیروی کرنا، لَهُ (لَ. هُ) لیے، اس کے، هٗ کی ضمیر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف جاتی ہے، الدِّيْنَ دین، یعنی اللہ کی رضا کے لیے، دین اسلام پر قائم و دائم رہیں گے، حُنَفَآءَ اس کا مفرد حنیف ہے، برائی کو چھوڑ کر اچھائی کی طرف آنے والا، غلط راہ سے ہٹ کر سیدھی راہ پر آنے والا، عبادت گزار، مسلمان، وَ يُقِيْمُوا اور قائم کریں (اَقَام، يُقِيْمُ، اِقَامَةً)۔ قائم کرنا، اجتماعی طور پر، با جماعت، وقت کی پابندی کے ساتھ خشوع وخضوع کے ساتھ، یہ تمام باتیں قائم کرنے میں آتی ہیں، الصَّلٰوةَ نماز، وَيُؤْتُوا اور دیتے رہیں، الزَّكٰوةَ زکوٰۃ، وَ ذٰلِكَ اور یہی (ہے) دِيْنُ الْقَيِّمَةِ مضبوط دین۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"یعنی جس دین کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، اس دین کی تعلیم اہل کتاب کو ان کے ہاں آنے والے انبیاء اور ان کے ہاں نازل ہونے والی کتابوں نے دی تھی، اور ان عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ میں سے کسی چیز کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا جنہیں انہوں نے بعد میں اختیار کر کے مختلف مذاہب بنا ڈالے۔ صحیح اور درست دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ خالص اللہ کی بندگی کی جائے، اس کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی کی آمیزش نہ کی جائے، ہر طرف سے رخ پھیر کر انسان صرف ایک اللہ کا پرستار اور تابع فرمان بن جائے، نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔" (تفہیم القرآن، ج:٦)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسانوں کے راہ راست سے پھسل جانے کی وجہ یا تو خواہشاتِ نفس کی پیروی یا پھر شیاطین کے بہکاوے میں آجانا رہا ہے، یہ ٹولہ انسانوں اور جنوں میں سے ہوتا ہے جن کی ہر وقت اور ہر لمحہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ نیک راہ چلنے والوں کو نت نئے طریقوں سے بھٹکایا جائے۔ دنیا میں فتنہ وفساد پھیلانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

۲) ضد اور ہٹ دھرمی، فساد اور سرکشی بھی خواہشاتِ نفسانی کا ہی حصہ ہیں جن سے انسان راہ راست سے دور جا پڑتا ہے۔ اہل کتاب کا حق کو قبول نہ کرنے کا سبب یہی چیز تھی۔

۳) دین حنیف (اسلام) فطرت کی آواز ہے، وہ انسانوں کو توڑتا نہیں جوڑتا ہے، وہ تفریق نہیں اتحاد کی راہ بتاتا ہے۔

۴) دین کی بنیادیں ہمیشہ ایک رہی ہیں...... اللہ تعالیٰ کی اخلاص کے ساتھ بندگی، نماز کو قائم کرنے اور زکوٰۃ دیتے رہنے میں معاشرتی اور معاشی مسائل کا شافی وکافی حل موجود ہے، نماز معاشرے میں سدھار پیدا کرتی ہے، ایمان کے ساتھ اخلاقی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور نظام زکوٰۃ سے معاشی الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں اور یہی باتیں فلاحی ریاست کی بنیاد بنتی ہیں۔

....

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ
جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاؕ اُولٰٓئِکَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّةِ(٦) اِنَّ
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِۙ اُولٰٓئِکَ هُمۡ خَیۡرُ
الۡبَرِیَّةِ(٧) جَزَآؤُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ
تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًاؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ
رَضُوۡا عَنۡهُؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّهٗ(٨)﴾

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے (توحید ورسالت کا) انکار کیا وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ لوگ بدترین خلائق ہیں، جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے، وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں، ان کا صلہ ان کے رب کے یہاں ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی رہے گا، وہ اللہ سے راضی رہیں گے، یہ ہے اس کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتا رہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاؕ اُولٰٓئِکَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّةِ﴾

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے (توحید ورسالت کا) انکار کیا، وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔

اِنَّ یقیناً، جملے کے شروع میں آئے تو بیان میں زور پیدا کرتا ہے، کَفَرُوۡا (جنہوں نے) کفر کیا، انکار کیا، جمع مذکر غائب (کَفَرَ، یَکۡفُرُ، کُفۡرًا) کفر کرنا، انکار کرنا، مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے، وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ اور مشرکوں (میں سے) اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں دوسروں کو

شریک کرنے والے، فِیۡ نَارِ درمیان آگ کے ہیں، جَهَنَّمَ جہنم (دوزخ) کی، خٰلِدِیۡنَ ہمیشہ رہیں گے، خَالِدٌ، اسم فاعل سے خالِدُون اور حالت نصبی میں خَالِدِیْن، ہمیشہ رہنے والے، فِیۡهَا (فِیۡ.هَا) میں۔اس، یعنی اس میں، ''ھا'' کی ضمیر جہنم کی طرف جاتی ہے، اُولٰٓئِکَ اسم اشارہ جمع مذکر وہ لوگ، هُمْ وہی، اسم ضمیر جمع مذکر غائب، اُولٰٓئِکَ کے بعد هُمْ لانے سے جملے میں مزید زور پیدا ہوا یعنی کچھ شک نہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں، شَرُّ الۡبَرِیَّةِ بدترین مخلوق ہیں۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یہ ایک قطعی حکم ہے جس میں بحث وجدال کی کوئی گنجائش نہیں، اگر ان کفار کے کچھ اعمال، آداب اور زندگی کے طور وطریق بظاہر صالح ہوں، تب بھی ان کی کوئی قیمت نہیں ہے اگر وہ آخری رسالت اور آخری رسول پر ایمان کا نتیجہ وثمرہ نہیں ہیں، نیکی کے کسی بڑے سے بڑے مظہر کی وجہ سے، جس کا اس صحیح اور محکم نظامِ الٰہی سے تعلق نہ ہو (بے قیمت ہو جاتا ہے) اور اس حکم میں شک نہیں کیا جاسکتا۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ هُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّةِ﴾

اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔

اِنَّ بلاشبہ، یقیناً، الَّذِیۡنَ جو لوگ، اسم موصول، اٰمَنُوۡا وہ ایمان لائے، فعل ماضی جمع مذکر غائب (اٰمَنَ، یُؤمِنُ، اِیۡمَانًا) ایمان لانا، وَ عَمِلُوا اور انہوں نے عمل کیے، فعل ماضی جمع مذکر غائب (عَمِلَ، یَعۡمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا، الصّٰلِحٰتِ نیک، اچھے، اس کا مفرد الصَّالِحَةُ ہے، اُولٰٓئِکَ یہی لوگ، اسم اشارہ، هُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّةِ وہ بہترین مخلوق ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ اللہ کے ان بندوں کا بیان ہے جو کبر وغرور کی آلائش سے پاک رہے اس وجہ سے ان کے اندر حق کا احترام باقی رہا، انہوں نے جب رسول ﷺ کی دعوت سنی تو اس طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کیا، جس طرح کا مطالبہ مغروروں نے کیا بلکہ وہ اللہ کی کتاب پر ایمان لائے اور عمل صالح کی راہ پر چل پڑے، فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو بہترین خلائق ہیں، اس لیے کہ انسان کی قدر و قیمت مال واسباب اور خاندان ونسب سے

نہیں بلکہ اس کے عقلی واخلاقی اوصاف سے ہے، جن کے اندر یہ اوصاف موجود ہیں، اللہ کے نزدیک وہی اشراف وسادات ہیں اگر چہ وہ روم یا حبش کے غلام ہوں اور جو اِن اوصاف سے محروم ہیں وہ اللہ کے نزدیک ارذل خلائق ہیں، اگر چہ وہ قریشی وہاشمی، سادات ہوں۔ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے قریش کے لیڈروں کی وہ پھبتیاں ذہن میں تازہ کر لیجیے جو وہ ان غریب مسلمانوں پر چست کرتے تھے جو شروع شروع میں اسلام لائے تھے، ان کی طرف سے اس توہین وتذلیل کے بعد ربّ السّمٰوٰتِ والارض کی طرف سے ان کی اس سرفرازی سے کون اندازہ کرسکتا ہے کہ ان کے سَر کتنے اونچے ہوں گے!

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور جیسا کہ ''سورۂ تین'' میں ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو بہترین ساخت اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے، اگر یہ اپنی قدر پہچان لے تو یہ "خیر البریة" ہے، اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں کوئی اس کے برابر کا نہیں اور اگر یہ اپنی حقیقی قدر و قیمت سے بے خبر رہ کر زندگی گزارے تو یہ "شرُّ البَرِیّة" اور ''ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ'' کا بالکل صحیح مصداق ہے، پھر یہ اتنی پستی میں گرتا ہے جو صرف اسی کے لیے خاص ہے، اللہ کی کوئی اور مخلوق اس پستی تک نہیں گرتی جس طرح انسان کے عروج کی کوئی حد نہیں ہے اس طرح اس کے زوال کی بھی کوئی حد نہایت نہیں ہے، بڑی ہی اعلیٰ بات کہی ہے ان حکماء نے جنہوں نے کہا ہے کہ: ''اے انسان، تو اپنے آپ کو پہچان!'' (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًاؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُؕ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ﴾

ان کا صلہ ان کے رب کے یہاں ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی رہے گا، وہ اللہ سے راضی رہیں گے، یہ ہے اس کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتا رہے۔

جَزَآؤُھُمْ (جَزَآؤُ.ھُمْ) صلہ۔ ان کا، جزا، صلہ، بدلہ، انعام، اردو زبان میں جانا پہچانا لفظ ہے، ھُمْ کی ضمیر جمع مذکر غائب ان اہل ایمان کی طرف جاتی ہے جنہوں نے اپنی زندگیوں کو اعمال صالحہ سے

آراستہ کیا، عِنْدَ رَبِّهِمْ ان کے رب کے پاس، عِنْدَ، پاس، ظرف مکان هِمْ کی ضمیر اہل ایمان کی طرف جاتی ہے، جَنّٰتُ باغات، اس کا مفرد جَنَّةٌ ہے، عَدْنٍ ہمیشہ کے، تَجْرِیْ (کہ) بہتی ہیں، فعل مضارع واحد مؤنث غائب (جَرَیَ، یَجْرِی، جَرْیَانًا) بہنا، (دریا، نہر کا)، مِنْ تَحْتِهَا ان کے نیچے (سے) ''ھا'' کی ضمیر واحد مؤنث غائب جنّت (باغات) کی طرف جاتی ہے، الْاَنْهٰرُ نہریں، اس کا مفرد نَهْرٌ ہے، خٰلِدِیْنَ ہمیشہ رہیں گے، اسم فاعل ہے، خَالِدٌ کی جمع خَالِدُوْنَ ہے اور حالتِ نصبی خَالِدِیْن آیا ہے، فِیْهَآ (فِیْ.هَآ) میں۔ان، (باغات) یعنی ان باغات میں، ''ھا'' ضمیر واحد مونث غائب جنت کے باغات کی طرف جاتی ہے، اَبَدًا ہمیشہ ہمیشہ (کے لیے)، رَضِیَ راضی ہوا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (رَضِیَ، یَرْضٰی، رِضًا) راضی ہونا، خوش ہونا، رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ راضی ہوا، اللہ تعالیٰ ان سے، هُمْ کی ضمیر اہل ایمان کی طرف جاتی ہے، وَ رَضُوْا اور وہ بھی راضی ہوئے فعل ماضی جمع مذکر غائب یعنی اہل ایمان، عَنْهُ (عَنْ.هُ) اس۔سے ''هُ'' کی ضمیر واحد مذکر، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف جاتی ہے، ذٰلِکَ یہ (بات ہے) لِمَنْ (لِ.مَنْ) لیے، اس کے (جو)، خَشِیَ ڈرتا (ہے)، رَبَّهٗ (رَبَّ.هٗ) رب۔اپنے (سے) 'ہ' کی ضمیر واحد مذکر غائب متقی شخص کی طرف جاتی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

یہ اللہ کے ان بندوں کا صلہ بیان ہو رہا ہے، فرمایا کہ اس دنیا میں ان کے لیے جو آزمائشیں مقدر ہیں، ان سے تو انہیں بہرحال گزرنا ہے لیکن اپنے رب کے پاس ان کے لیے اقامت کے ایسے باغ ہیں جن میں نہریں جاری ہوں گی اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہوں گے عدن کے معنی توطن اور اقامت کے ہیں، یہ متقین کے گھر کی تعریف ہے کہ وہ اقامت اور توطّن کے باغ ہوں گے، اللہ کے متقی بندے ان میں محض وقتی سیر وتفریح کے لیے نہیں بلکہ ان میں ہمیشہ رہنے بسنے کے لیے داخل ہوں گے۔

پھر اس جنت میں اللہ بھی ان سے راضی اور وہ بھی اس سے راضی، اللہ ان سے اس وجہ سے راضی کہ انہوں نے بندگی کا حق اس طرح ادا کیا جس طرح ان کو ادا کرنا چاہیے تھا اور جو ان کے رب کے معیار پر پورا اترا اور وہ اللہ سے اس وجہ سے راضی کہ ان کے رب نے نہ صرف وہ وعدے پورے کیے جو اُن سے کیے تھے بلکہ اُن کو وہ کچھ بخشا جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

''ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ'' فرمایا کہ یہ مقام ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنے رب سے، غیب میں رہتے ڈرے۔ مطلب یہ ہے کہ جو احمق سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں، وہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے، ان کا علاج کوئی نہیں کرسکتا اس دنیا میں انسان کا اصل امتحان یہی ہے کہ وہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر ان حقائق پر ایمان لائے جن کی خبر اللہ کے رسولوں نے دی ہے، وہ کان اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہ گزارے اور نہ اس بات کا منتظر رہے کہ سب کچھ سامنے دکھا دیا جائے تو وہ تب مانے گا۔ جس نے یہ امتحان پاس کرلیا، وہی اس بات کا مستحق ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل عظیم سے نوازے، جو اس میں ناکام رہا وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے اور اس لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل کا کوئی حصہ عطا کرے۔'' (تدبر قرآن۔ ج:۸)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) اللہ تعالیٰ کا دین اپنی سیدھی اور سچی تعلیمات کے ساتھ روز روشن کی طرح لوگوں کے سامنے موجود ہوتا ہے، اہل بصیرت کے لیے اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، یہ کوئی پیچیدہ اور سمجھ میں نہ آنے والا فلسفہ نہیں ہے، یہ تو زندگی گزارنے کے نکھرے ہوئے اصول و ضوابط ہیں جو عقل و فکر کو اپیل کرتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونا آسان اور سہل ہے۔

۲) اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اور اس کی ہر چیز کو بنایا ہے، وہی ہر شے کا مالک ہے اسی نے انسان کو اشرف و اعلیٰ بنایا ہے اور اسے عقل و دانش کی نعمت سے نوازا ہے جس سے وہ کھرے اور کھوٹے، اچھائی اور برائی میں تمیز کرسکتا ہے، اس کے علاوہ اس کا اپنے بندوں پر کتنا بڑا احسان ہے کہ ان میں بعض نیک اور صالح لوگوں کو منتخب فرمایا، اور انہیں وحی کے ذریعہ کتاب و حکمت کی تعلیم سے آراستہ فرمایا، یہ انبیاء علیہم السلام کہلائے ان ابرار و صالحین کی زندگیاں دوسروں کے لیے بہترین نمونہ بنیں۔ سب سے آخری نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جنہیں قرآن ایسی عظیم کتاب سے نوازا گیا، اس روشن کتاب اور اسوہ حسنہ کو نسل انسانیت کے

لیے قیامت تک ہدایت کا سروسامان بنا دیا گیا۔اب ہر چیز واضح اور روشن ہوگئی، کسی شخص کے لیے حیل وحجت کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

۳) اس کے باوجود جو کفر اور شرک کا راستہ اختیار کریں گے ان کی سزا ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی آگ اور ایندھن کا وہ گھر ہے جسے جہنم کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے خالق و مالک سے بغاوت کی ہے اور رب چاہی زندگی کی بجائے من چاہی زندگی گزاری ہے، یہ بدترین مخلوق ہیں۔

۴) اور جو لوگ سوجھ بوجھ سے کام لے کر سیدھے اور سچے راستے کو اپنا لیں، احکام الٰہی پر عمل پیرا ہو جائیں اور اسوہ رسول ﷺ کی پیروی کو اپنی سعادتمندی خیال کریں، انہیں دنیا میں بھی آسودگی اور سلامتی ملتی ہے اور آخرت میں تو نہ ختم ہونے والی راحت وآرام کی حیات جاوداں کا مژدۂ جانفزا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ایسی ہی زندگی کا مستحق بنا دے اور دنیا میں بھی نیک اعمال کی توفیق عطا فرمائے اور آخرت کی لازوال زندگی سے بھی نوازے۔آمین

..................o..................

سُورَةُ الزِّلۡزَال

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بنائی اور سجائی ہے اور انسان کو اس دنیا میں اشرف المخلوقات بنا کر امتحان کے لیے بھیجا ہے اور ایک خاص مدت کے بعد یہ دنیا رب کائنات ہی کے حکم سے زیر وزبر کر دی جائے گی اور ایک دوسرا عالم وجود میں آئے گا اور اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے روئے زمین پر پیدا ہونے والے تمام انسان زندہ ہو جائیں گے تا کہ دنیا کی چندروزہ حیات مستعار کے نتائج انہیں سنا دیے جائیں۔

قیامت کا سماں بڑا خوفناک ہوگا کہ زلزلوں کی شدت سے زمین تھرتھرا اٹھے گی اور اپنے سارے بوجھ نکال باہر کرے گی۔ اس دن زمین کے گوشے گوشے سے انسان الگ الگ اپنے مرقدوں سے نکل نکل آئیں گے۔ اور میدان محشر میں حساب کتاب کے لیے جمع ہو جائیں گے۔ زندگی کے اعمال نامے ان کے ہاتھوں میں تھما دیے جائیں گے۔

اس دن انسان کی کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہے گی، ہر بدی خواہ اس نے کتنے ہی پردوں کے اندر چھپ کر کی ہو، اس کے سامنے رکھ دی جائے گی، اسے انکار کی قطعی کوئی گنجائش نہ ہوگی، اگر انسان نے انکار کیا بھی تو رب قدیر کے حکم سے زمین کو قوت گویائی مل جائے گی جو انسانوں کی ہر قسم کی نقل وحرکت کو ٹھیک ٹھیک بیان کر دے گی۔

سُوْرَةُ الزِّلْزَال

آیات:۸ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا(۱) وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا(۲) وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا(۳) يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا(۴) بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا(۵) يَوۡمَئِذٍ يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۙ لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ(۶) فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ(۷) وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ(۸)﴾

جب زمین اپنی شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال باہر کرے گی اور انسان کہے گا یہ اسے کیا ہوا؟ زمین اس روز اپنے حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہوگا، اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے کہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

﴿اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا﴾

جب زمین اپنی شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی۔

اِذَا جب، ظرف زمان، یہ لفظ وقت کو ظاہر کرتا ہے، یعنی لوگو! اس وقت کو یاد رکھو، زُلۡزِلَتِ ہلائی جائے گی، ماضی مجہول واحد مؤنث غائب (زَلۡزَلَ، يُزَلۡزِلُ، زِلۡزَالًا) ہلا ڈالنا، جھٹکے دینا، الزِّلۡزَالُ، بھونچال، زلزلہ، اردو میں جانا پہچانا لفظ ہے، الۡاَرۡضُ زمین، ارض وسما (زمین آسمان) اردو میں استعمال

ہوتا ہے۔ زِلْزَالَهَا (زِلْزَالَ. هَا) بھونچال۔ اپنے سے، یہاں پر 'ها' کی ضمیر زمین کی طرف جاتی ہے۔
مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کی بہت سی سورتوں اور آیتوں میں قیامت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ کسی درجہ کا کچھ منظر سامنے آ جاتا ہے، اس ''سورۃ الزلزال'' میں بھی قیامت کا ذکر اسی طرح فرمایا گیا ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے: ''اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا'' مطلب یہ ہے کہ ذرا سوچو اس وقت کیا حال ہوگا جب ساری زمین مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک اور نیچے سے اوپر تک ایک غیر معمولی قسم کے زلزلہ اور بھونچال سے ہلا ڈالی جائے گی، یعنی ایک ایسا بھونچال آئے گا جو ساری زمین کو زیر و زبر کر دے گا۔ زلزلے مقامی بھی ہوتے ہیں اور علاقائی بھی، لیکن قیامت کا زلزلہ اور بھونچال پورے کرۂ ارض کا زلزلہ ہو گا اور ہماری پوری دنیا کو تہ و بالا کر دے گا، قرآن مجید ہی میں دوسری جگہ (سورہ حج کے شروع میں) فرمایا گیا ہے۔ ''اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ'' یعنی قیامت کا زلزلہ بہت ہی عظیم چیز ہے، آگے فرمایا گیا ہے کہ جب وہ برپا ہوگا تو ہیبت ناکی کا یہ عالم ہوگا کہ بچوں کو دودھ پلاتی مائیں اپنے پیارے چہیتے بچوں کو بھول جائیں گی اور حمل والیوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے اور لوگ ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے۔ اس سورہ مبارکہ میں لفظ ''زِلْزَالَهَا'' اس زلزلہ کی شدت اور غیر معمولی پن کو ظاہر کر رہا ہے۔
یہ زلزلہ قیامت اس وجہ سے بھی انتہائی ہوش ربا ہوگا کہ بالکل اچانک آئے گا۔ پہلے کسی کو اطلاع نہ ہوگی، کوئی اندازہ نہ ہوگا، سورہ اعراف میں فرمایا گیا ہے: لَا تَاْتِیْکَ اِلَّا بَغْتَةً ''قیامت جب آئے گی، تو بالکل اچانک آئے گی''۔ (درس قرآن)

﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا﴾

اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال باہر کرے گی۔

وَ اور، عاطفہ، سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، اَخْرَجَتِ نکالے گی، ماضی واحد مؤنث غائب، زمین عربی زبان میں مؤنث ہے اس لیے اس کے لیے یہ صیغہ آیا ہے، الْاَرْضُ زمین، اَثْقَالَهَا (اَثْقَالَ. هَا) بوجھ۔ اپنے، 'ها' ضمیر واحد مؤنث غائب زمین کے لیے آیا ہے، اَثْقَالَ کا مفرد ثِقْلٌ ہے،

ثقیل، وزنی، بوجھل، ثقیل غذا نہ کھاؤ، ایسی غذا جو دیر سے ہضم ہو۔ اردو میں جانا پہچانا لفظ ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ وہی مضمون ہے جو''سورۃ انشقاق'' آیت نمبر 4 میں اس طرح بیان ہوا ہے،''وَ اَلْقَتْ فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ ''اور جو کچھ اس کے اندر ہے، اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی، اس کے کئی مطالب ہیں، ایک یہ کہ مرے ہوئے انسان زمین کے اندر جہاں جس شکل اور جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے، ان سب کو وہ نکال کر باہر ڈال دے گی اور بعد کا فقرہ (وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا) اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت ان کے جسم کے تمام بکھرے ہوئے اجزا جمع ہو کر از سر نو اسی شکل وصورت میں زندہ ہو جائیں گے جس میں وہ پہلی زندگی کی حالت میں تھے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ کیسے کہیں گے کہ زمین کو یہ کیا ہو رہا ہے؟ دوسرا مطلب یہ ہے کہ صرف مرے ہوئے انسانوں ہی کو وہ باہر نکال پھینکنے پر اکتفا نہ کرے گی، بلکہ ان کی پہلی زندگی کے افعال واقوال اور حرکات وسکنات کی شہادتوں کا جو انبار اس کی تہوں میں دبا پڑا ہے، اس سب کو بھی وہ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اس پر بعد کا یہ فقرہ (یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا) دلالت کرتا ہے کہ زمین اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی۔ تیسرا مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سونا، چاندی، جواہر اور ہر قسم کی دولت جو زمین کے پیٹ میں ہے، اس کے بھی ڈھیر کے ڈھیر وہ باہر نکال کر رکھ دے گی اور انسان دیکھے گا کہ یہی وہ چیزیں ہیں جن پر وہ دنیا میں مرا جاتا تھا، جن کی خاطر اس نے قتل کیے، حقداروں کے حقوق مارے، چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے، خشکی اور تری میں قزاقیاں کیں، جنگ کے معرکے برپا کیے اور پوری پوری قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ آج وہ سب کچھ سامنے موجود ہے اور اس کے کسی کام کا نہیں بلکہ الٹا اس کے لیے عذاب کا سامان بنا ہوا ہے۔''

(تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا﴾ اور انسان کہے گا، یہ اسے کیا ہوا؟

وَ اور، عاطفہ، قَالَ کہے گا (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، الْاِنْسَانُ انسان یعنی بنی نوع انسان، مَا لَهَا (مَا. لَهَا) کیا ہوا۔ اسے، ''لَهَا'' کی ضمیر واحد مؤنث غائب بھی زمین کی طرف جاتی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس ہولناک صورت حال کا انسان پر جو اثر پڑے گا، یہ اس کی تعبیر ہے کہ وہ بدحواس ہو کر پکار اٹھے گا کہ ارے، یہ اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ کسی طرح ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے اور اپنے اندر کی ہر چیز باہر نکالے دے رہی ہے؟ اسی طرح کی گھبراہٹ مجرموں پر اس وقت بھی طاری ہو گی جب ان کے اعمال کا رجسٹر کھلے گا، اس وقت بھی وہ کہیں گے، مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا، عجیب ہے یہ کتاب! کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں ہے جو اس کی گرفت سے باہر رہ گیا ہو۔ (تدبر قرآن، جلد:۸)

﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ﴾

اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے کہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔

يَوْمَئِذٍ اس دن ظرف زمان، يَّصْدُرُ النَّاسُ آئیں گے لوگ (صَدَرَ، يَصْدُرُ، صَدْرًا) نکلنا، اَشْتَاتًا الگ الگ، تنہا تنہا، لِّيُرَوْا (لِ.يُرَوْا) فعل مضارع مجہول جمع مذکر غائب، تا کہ دکھائے جائیں (اَرٰى، يُرِىْ، رُؤْيَةً) دکھانا، اَعْمَالَهُمْ (اَعْمَالَ.هُمْ) اعمال ان کے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس دن لوگ قبروں سے اس طرح نکلیں گے کہ کسی کے ساتھ نہ اس کے اہل خاندان ہوں گے نہ اعزّہ واقرباء، نہ اس کا جتھا ہو گا، نہ خدم وحشم، نہ املاک وجائیدادنہ اعوان وانصار، نہ سفارشی اور نہ شفاعت کرنے والے، بلکہ ہر ایک اپنے رب کے حضور تنہا حاضر ہو گا، یہ مضمون قرآن کے دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت سے بیان ہوا ہے، مثلاً سورہ مریم میں فرمایا: وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا (۹۵) سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے اور سورہ انعام میں فرمایا: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۹۴) ''لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ، وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾

جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی، وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

فَمَنۡ (فَ. مَنۡ) پس۔ جس نے، يَّعۡمَلۡ عمل کیا ہوگا، فعل مضارع واحد مذکر غائب (عَمِلَ، يَعۡمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا، مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ ذرہ کے برابر بھی، خَيۡرًا اچھا (عمل) يَّرَهٗ (يَّرَ. هٗ) وہ دیکھ لے گا، اسے "هٗ" کی ضمیر واحد مذکر غائب، عمل کی طرف جاتی ہے، وَمَنۡ اور جس نے، يَّعۡمَلۡ عمل کیا ہوگا، مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ ذرہ برابر بھی، شَرًّا برائی کا، يَّرَهٗ (يَّرَ. هٗ) تو وہ اسے پالے گا، "هٗ" کی ضمیر واحد مذکر غائب عمل کی طرف جاتی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ہر مؤمن و کافر کی ہر چھوٹی بڑی نیکی یا بدی اس کے سامنے آئے گی تو ضرور لیکن اس قاعدے کے مطابق آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے دوسرے مقامات میں بیان فرمایا ہے یعنی ایک مؤمن یہ دیکھے گا کہ اس سے نیکیوں کے ساتھ ساتھ فلاں فلاں غلطیاں بھی صادر ہوئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی فلاں فلاں نیکیوں کو ان کا کفارہ بنا دیا ہے، اسی طرح ایک کافر یہ دیکھے گا کہ اس نے بدیوں کے ساتھ کچھ نیک کام بھی کیے ہیں لیکن اس کے وہ نیک کام اس کے فلاں برے اعمال وعقائد کے سبب ضائع ہو گئے، اس وجہ سے وہ ان کے صلہ سے محروم رہا۔

اس قاعدے پر پرکھے جانے کے بعد نجات پانے والوں اور ہلاک ہونے والوں کے لیے جو ضابطہ مقرر ہوا ہے وہ سورہ القارعہ میں یوں بیان ہوا ہے:

فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ، فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۶ تا ۹)

"پس جس کے پلڑے بھاری ہوں گے، وہ تو دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا دوزخ کا کھڈ ہوگا۔" (تدبر قرآن، ج: ۸)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) ہماری موت کے بعد بھی زندگی کا سفر جاری وساری رہے گا جو یا تو ابدی اور دائمی راحت میں تبدیل ہو جائے گا یا پھر ہمیشہ اور نہ ختم ہونے والے عذاب اور تکلیف میں بدل جائے گا۔ کامیابی اور ناکامی کا انحصار دنیاوی زندگی پر ہے۔ اس چندروزہ زندگی کو صبر واستقامت سے احکام الٰہی کے مطابق گزارنے پر آخرت میں کامیابی ملے گی اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی جنت ٹھکانا ہے اور خواہشات نفس کا پجاری بن کر اس فانی زندگی کو برباد کرنے والے ہمیشہ کے عذاب میں پھنس کر رہ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی دوزخ ان کا ٹھکانا ہو گی۔ (اللھم اجرنا من النار)

۲) ہماری دنیاوی زندگی کا ہر ہر لمحہ ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ جو کچھ ہم اس دنیا میں کہہ رہے ہیں یا کر رہے ہیں اس کے ہر وقت کا حساب رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے "کراماً کاتبین" یعنی بزرگ فرشتوں کی جماعت مقرر ہے جو ہماری ہر بات اور ہر عمل من وعن لکھ لیتے ہیں اور ہم روز جزا و سزا اپنے ہر قول و فعل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے، انکار کی قطعی کوئی گنجائش نہ ہو گی، اس روز ہماری زندگی کی فلم ہمارے سامنے آ جائے گی۔

..................o..................

سُوۡرَۃُ الۡعٰدِیٰت

زمانۂ جاہلیت میں جنگ اور لوٹ مار عام تھی، طاقتور قبائل کمزور قبائل کو ظلم وستم کا نشانہ بناتے اور زبردست زیردستوں کو لوٹتے مارتے تھے۔ان حملوں میں جنگی گھوڑے استعمال ہوتے تھے جو اپنے مالک کے معمولی اشاروں پر بے دریغ جنگ کے شعلوں میں ہانپتے ہوئے کود پڑتے تھے، اگرچہ اپنے سواروں کے اشاروں پر زخم پر زخم کھاتے اور گرتے مرتے مگر جنگ کے شعلوں سے منہ نہیں موڑتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں ان گھوڑوں کی اپنے مالکوں کے ساتھ اس وفاداری کو بطور شہادت پیش کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ انسان اپنے حقیقی مالک کا بڑا ہی ناشکرا ہے اور اس کی ان گنت نعمتوں کو فراموش کرتا رہتا ہے، گزشتہ سورۃ ''الزلزال'' میں اس بات کی نشاندہی کر دی گئی تھی کہ انسان کی ذرہ بھر نیکی اور بدی لکھ لی جاتی ہے جس کی جزا یا سزا روز قیامت اسے مل کر رہے گی۔اس سورۃ مبارکہ میں رب کریم کی نعمتوں کی حق ناشناسی اور مال و دولت کی ہوس کا تذکرہ ہے اور اگر غور کیا جائے تو یہ دونوں بیماریاں تمام گناہوں اور معصیتوں کی جڑ اور بنیاد بنتی ہیں، دنیا میں شرک وکفر اور ہر قسم کے ظلم وستم کی اصل یہی دو باتیں ہیں، معرفت حق سے دوری پر انسان ہر قسم کے کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور زر و زمین کے جھگڑوں میں ہر قسم کے ظلم پر اتر آتا ہے۔

پس اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی صلے اور اجر کی تمنا ہے تو انسان پر لازم ہے کہ اس کا شکر گزار بندہ بن کر رہے، اور مال و دولت کا حریص بننے کے بجائے نیک اعمال کا شائق اور حریص بنے۔

آیات: ۱۱ سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰت رکوع: ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا(۱) فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا(۲) فَالْمُغِیْرٰتِ
صُبْحًا(۳) فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا(۴) فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا(۵) اِنَّ
الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْدٌ(۶) وَ اِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیْدٌ(۷)
وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ(۸) اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی
الْقُبُوْرِ(۹) وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ(۱۰) اِنَّ رَبَّہُمْ بِہِمْ
یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ(۱۱)﴾

ان گھوڑوں کی قسم جو دوڑتے ہانپ اٹھتے ہیں پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں، جو صبح سویرے (دشمن پر) حملہ کرتے ہیں اور گرد وغبار کے طوفان اٹھاتے ہیں اور اسی حال میں (دشمن کے) ہجوم کے اندر جا گھستے ہیں۔ یقیناً انسان اپنے رب کا بڑا ناقدر شناس اور ناشکرا ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے، کیا وہ وقت اس کے علم میں نہیں ہے جب قبروں کے اندر جو (مدفون) ہیں انہیں باہر نکال لیا جائے گا اور جو کچھ دلوں میں ہے آشکارا ہو جائے گا، بے شک ان کا رب ان کے حال سے اس روز پورا پورا آگاہ ہوگا۔

﴿وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا﴾ ان گھوڑوں کی قسم جو دوڑتے دوڑتے ہانپ اٹھتے ہیں۔

وَالْعٰدِیٰتِ وَ قسمیہ اور قسم بطور شہادت کے لائی جاتی ہے، اَلْعٰدِیٰتِ سے مراد اللہ کی راہ میں جہاد

کرنے والوں کے تیز رفتار گھوڑے ہیں اس کا مفرد "**العادیة**" ہے (القاموس الوحید) **ضَبۡحًا**، دوڑتے وقت گھوڑوں کے اندر سانس کی آواز، ان کے ہانپنے کا یہ انداز اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے ان کو انسان کی محکومی میں دیا ہے اس کو وہ نہایت وفاداری و جانثاری سے پورا کرنے والے اور انسان کی مقصد برآری میں اپنی طاقت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر رکھ دینے والے ہیں۔(تدبر قرآن)

﴿**فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا**﴾ پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں۔

فَالۡمُوۡرِیٰتِ، فَ عاطفہ، ترتیب کے لیے ہے، **مُوۡرِیٰتِ**، **اِیۡرَاءٌ** سے ہے جس کے معنی چقماق یا کسی چیز سے آگ نکالنے کے ہیں، **قَدۡحًا**، چنگاریاں جھاڑنا، **قَدۡحٌ** کے معنی ضرب لگانے، ٹھوکر لگانے اور ایک چیز کو دوسری سے ٹکرانے کے ہیں، یہ انسان کی مقصد برآری میں گھوڑوں کی سرگرمی اور آتش زیرپائی کی تعبیر ہے کہ وہ اس طرح دوڑتے ہیں کہ ان کے سموں کی ٹھوکر سے چنگاریاں جھڑتی ہیں، گھوڑوں کے چونکہ آہنی نعل ہوتے ہیں، اس وجہ سے جب وہ دشمن پر دھاوا بولنے کے لیے پتھریلی زمینوں پر دوڑتے ہیں تو ان کی سموں کی ضرب سے چقماق کی طرح چنگاریاں نکلتی ہیں، گویا وہ اپنے مالکوں کی رضا جوئی میں آگ کے انگاروں پر دوڑ رہے ہیں۔" (تدبر قرآن)

﴿**فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا**﴾ جو صبح سویرے (دشمن پر) حملہ کرتے ہیں۔

یعنی وہ گھوڑے جو بوقت صبح دشمنوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔" (صفوۃ التفاسیر)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"عرب میں حریفوں پر غارت گری کا سب سے موزوں وقت صبح کا ہی سمجھا جاتا تھا، اس وجہ سے یہاں "**صُبۡحًا**" کی قید لگی ہوئی ہے، ان کے ہاں غارت گری کے الارم کے طور پر "**وَاصَبَاحَا**" کا جو نعرہ تھا، اس میں بھی صبح کا حوالہ اسی پہلو سے ہے، یہاں تک کہ لفظ "**صَبِّحۡ**" عربی میں جملے اور غارت گری کے لیے ایک معروف لفظ بن گیا۔(تدبر قرآن)

﴿فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا﴾ اور گرد و غبار کے طوفان اٹھاتے ہیں۔

اِثَارَۃٌ کے معنی اٹھانے اور ابھارنے کے اور نَقْعٌ کے معنی گرد و غبار کے ہیں۔ (تدبر القرآن)

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''یہ گھوڑے اس طرح دوڑتے ہیں کہ صبح کے وقت میں جبکہ رات کی شبنم یا خنکی کی وجہ سے گرد و غبار اڑنے کا وقت نہیں ہوتا، ان گھوڑوں کے تیز دوڑنے کی وجہ سے فضا میں غبار ہی غبار ہو جاتا ہے۔ (درس قرآن)

﴿فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا﴾ اور اسی حال میں (دشمن کے) ہجوم میں جا گھستے ہیں۔

فَوَسَطْنَ (ف. وَسَطْنَ) پس۔ جا گھستے ہیں، ف، عاطفہ (وَسَطَ، يَسِطُ، وَسْطًا) کسی چیز کے بیچ میں ہونا، الوسط، کسی چیز کا مرکز، اردو زبان میں جانا پہچانا لفظ ہے، وَسَطْنَ ماضی جمع مؤنث غائب کا صیغہ گھوڑوں کے لیے استعمال ہوا ہے، غیر ذوی العقول کے لیے عربی زبان میں کبھی مؤنث کا صیغہ استعمال ہو جاتا ہے، انسان ذوی العقول اور دیگر چیزیں غیر ذوی العقول کہلاتی ہیں، بِهٖ (بِ. ہٖ) ساتھ۔ اس، یعنی اس گرد و غبار کے ساتھ جو ان کے تیز دوڑنے کی وجہ سے اٹھ رہا ہے، جَمْعًا، جماعت اور گروہ، اس کی جمع جُمُوعٌ آتی ہے۔ (القاموس الوحید)

اپنے مالکوں اور سواروں کے وفادار اور جانثار ان گھوڑوں کی قسم کھا کر اور ان کی وفاداری اور جانثاری کو بطور شہادت کے پیش فرما کر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ﴾

یقیناً انسان اپنے رب کا بڑا ناقدرشناس اور ناشکرا ہے۔

اِنَّ تحقیق، بلاشبہ، الْاِنْسَانَ انسان، اس سے مراد ہر وہ انسان ہے جو مالک حقیقی کا شکر گزار نہیں ہوتا، لِرَبِّهٖ (لِ. رَبِّهٖ) واسطے۔ رب، اپنے (کے)، لَكَنُوْدٌ (لَ. كَنُوْدٌ) البتہ۔ ناشکرا، (ہے) لام تاکیدی معنی دیتا ہے (كَنَدَ، يَكْنُدُ، كَنُدًا) نعمت کی ناشکری کرنا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''جوانسان گھوڑوں کی یہ ساری جاں نثاریاں دیکھتا ہے اور ان کی قربانیوں سے بہرہ مند ہوتا ہے، لیکن اسے یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ بھی اپنے رب کا غلام ہے اور اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی کی طرح اپنے رب کی اطاعت میں سرگرم و سینہ سپر رہے، وہ نہایت ناشکرا اور احسان فراموش ہے، گھوڑے جانور ہو کر اپنے مالک کا حق پہچانتے ہیں اور یہ انسان ہو کر اپنے خالق و مالک کا حق نہیں پہچانتا ہے۔

انسان کی ناشکری کا ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ انسان نہ گھوڑوں ہی کا خالق ہے اور نہ ان چیزوں ہی کا خالق ہے جن پر ان کی پرورش کا انحصار ہے، تاہم وہ نہایت بے جگری سے انسان کی خدمت محض اس وجہ سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے، اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا بھی خالق ہے اور اس کے کام آنے والے تمام جانوروں اور معاش و معیشت کے جملہ اسباب و وسائل کا بھی لیکن وہ رب کائنات کی بندگی کے حقوق و فرائض سے بے پروا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ﴾ اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔

وَ اور عاطفہ، اِنَّهٗ (اِنَّ. هٗ) بلاشبہ۔ وہ، هٗ کی ضمیر واحد مذکر انسان کی طرف جاتی ہے، عَلٰى ذٰلِكَ، اوپر۔ اس بات کے، لَشَهِيْدٌ (لَ. شَهِيْدٌ) ضرور بضرور۔ گواہ ہے۔

''انسان کے اس ناشکرے پن پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ خود اس پر سب سے بڑا گواہ ہے، یہ فقرہ اسی طرح کا ہے جس طرح ''سورۃ قیامۃ'' میں فرمایا ہے: ''بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (۱۴-۱۵) بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے۔''

جو باتیں انسان کی فطرت کے بدیہی مقتضیات [واضح ضروریات] میں سے ہیں، وہ دلیل کی محتاج نہیں ہوتیں، اُن کے حق میں سب سے بڑی گواہی خود انسان کی فطرت اور اس کے ضمیر کے اندر موجود

ہوتی ہے، انسان اگران سے گریز اختیار کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے حق میں اس کو کوئی دلیل نہیں ملی بلکہ ان کو وہ اپنے نفس کی سفلی خواہشوں [پست آرزوؤں] کے خلاف پاتا ہے، اس وجہ سے ان سے گریز کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے، ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ خود تو صرف انہی گھوڑوں کی قدر کرتا ہے جو اس کی کوئی قابل قدر خدمت انجام دیتے ہیں لیکن اپنے مالک اور رب کے متعلق یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کے ہاں نیکوکار اور بدکار میں کوئی فرق نہیں ہے، اس نے ان کے ساتھ جو معاملہ اس دنیا میں کیا ہے، اس سے بہتر معاملہ آخرت میں کرے گا، خواہ اس کے ایک حکم کی بھی وہ تعمیل نہ کرے بلکہ ساری زندگی اپنے نفس کی غلامی میں گزارے۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ﴾

اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔

وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے، اِنَّهٗ (اِنَّ. هٗ) بلاشبہ۔ وہ، هٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب انسان کی طرف جاتی ہے، لِحُبِّ الْخَیْرِ واسطے محبت، مال کے ''لام'' لیے کا معنی دیتا ہے، حُبّ خواہش، محبت اور اَلْخَیْر کے معنی مال و دولت کے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''شدت حب مال سے یہاں مراد وہی بے جا اور حد سے زیادہ دولت پرستی ہے، جو انسان کی عقل سلیم کو بالکل اندھا کر دیتی ہے اور تمام تر کفران و عدوان کی طرف لے جاتی ہے، ورنہ جائز حدود کے اندر مال کی تھوڑی محبت تو ایک امر طبعی ہے۔'' (تفسیر ماجدی)

﴿اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ﴾

کیا وہ وقت اس کے علم میں نہیں ہے، جب قبروں کے اندر جو (مدفون) ہیں انہیں باہر نکال لیا جائے گا۔

اَفَلَا، أَ، کیا، کلمہ استفہام، فَلَا (ف. لَا) پس۔ نہیں، یَعْلَمُ وہ جانتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، خبر رکھنا، اِذَا جب، وقت کو ظاہر کرتا ہے (ظرف زمان)، بُعْثِرَ

اٹھایا جائے گا،فعل ماضی مجہول واحد مذکر غائب، بَعْثَرَ، بکھیرنا، پھیلانا،منتشر کرنا،سامان کو الٹ پلٹ کرنا،چھپی ہوئی چیز کو برآمد کرنا، جانچ پڑتال کے لیے بکھیرنا۔(القاموس الوحید)مَا فِی جو کچھ بیچ میں، مَا جو کچھ،اسم موصول،فِیْ، اندر، درمیان(ہے)،الْقُبُوْرِ قبروں میں۔

﴿وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ اور جو کچھ دلوں میں ہے آشکارا ہو جائے گا۔

وَ اور، عاطفہ،حُصِّلَ اور حاصل کیا جائے گا،نکالا جائے گا ماضی مجہول واحد مذکر غائب،مَا جو (کچھ ہے)اسم موصول،فِی الصُّدُوْرِ سینوں میں،اس کا مفرد الصّدر ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

’’مطلب یہ ہے کہ یہ غافل انسان اس وقت اور اس دن کو نہیں جانتا جب قبروں میں دفن شدہ سارے مردے زندہ قبروں سے نکالے جائیں گے اور زندگی بھر کے ان کے اعمال کا پورا احتساب ہوگا اور سینوں کے بھید اور راز بھی جن کو وہ سمجھتا تھا کہ یہ ہمیشہ راز ہی رہیں گے،کبھی کسی کو ان کی اطلاع نہ ہوگی، وہ اس دن باہر نکال لیے جائیں گے،مثلاً نفاق ہے،ریا کاری ہے یا ایسی ہی چھپی ہوئی گندگیاں ہیں تو وہ ظاہر کر دی جائیں گی اور ان کا بھی محاسبہ ہوگا،دوسری جگہ فرمایا:یَوْمَ تُبْلَی السَّرَائِرُ یعنی اس دن پوشیدہ اور مخفی باتیں بھی جانچی اور پرکھی جائیں گی اور ان کا بھی پورا احتساب ہوگا۔‘‘(درس قرآن)

﴿اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ﴾

بے شک ان کا رب ان کے حال سے اس روز پورا پورا آگاہ ہوگا۔

اِنَّ تحقیق، بلاشبہ، رَبَّهُمْ (رَبَّ.هُمْ) رب۔ان کا ’’هُم‘‘ ضمیر جمع مذکر غائب، انسان کی طرف جاتی ہے،يَوْمَئِذٍ (يَوْمَ.اِذَا) دن۔اس،یعنی اس دن لَّخَبِيْرٌ (لَّ.خَبِيْرٌ) پورا پورا۔خبردار ہے، لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

’’یعنی جو رب ان کو قبروں سے نکال لے گا اور ان کے سینوں کے رازوں کو ظاہر کر دے گا، اس کے

متعلق ہر شخص جان سکتا ہے کہ وہ کتنا باخبر ہے اور اس سے کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی، چنانچہ پھر وہ ہر ایک کو اس کے عملوں کے مطابق اچھی یا بری جزا دے گا، یہ گویا ان اشخاص کو تنبیہ ہے جو رب کی نعمتیں تو استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے، اس کی ناشکری کرتے ہیں، اس طرح مال کی محبت میں گرفتار ہو کر مال کے وہ حقوق ادا نہیں کرتے جو اللہ نے اس میں دوسرے لوگوں کے رکھے ہیں۔'' (احسن البیان)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسان کو اللہ تعالیٰ نے کتنا شرف اور مرتبہ عطا کیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کی خدمت میں لگا دی ہے۔ گھوڑوں پر ہی نظر دوڑائیے کہ وہ گھاس پھونس ایسی گھٹیا غذا کھا کر بھی اپنے مالک سے بے مثال وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور انسان عمدہ سے عمدہ اور قیمتی سے قیمتی نعمتیں پا کر بھی مالک حقیقی کو فراموش کر دیتے ہیں۔

۲) یہ جسم وجان اور مال ودولت اور تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی عطا اور دین ہیں مگر حریص انسان اس میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں اور اسی نشے میں غرور وتکبر کا شکار ہو جاتے ہیں اور رب کائنات کی عبادت وطاعت سے منہ موڑے رکھتے ہیں۔

۳) ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ زندگی عارضی اور بالکل عارضی ہے۔ موت کے ساتھ ہی دوسری زندگی شروع ہو جاتی ہے، قبر یا تو جنت کے ٹھکانوں میں سے اچھا ٹھکانہ بن جاتی ہے یا پھر جہنم کے ٹھکانوں میں سے ٹھکانہ ہو جاتی ہے اور حساب وکتاب کے بعد پھر اچھی یا بری زندگی شروع ہو جائے گی۔

.................o..................

سُورَةُ الْقَارِعَة

یہ مکی سورتوں میں سے ہے، اس میں قیامت کی آمد اور اس کی ہولنا کیوں کا ذکر ہے، قرآن حکیم میں قیامت کے مختلف نام آئے ہیں جیسا کہ ''الساعة'' (گھڑی) ''القیامة'' (قیامت) ''الواقعه'' (یعنی قائم ہونے والی) ''اٰلاٰزفة'' (جلدی آنے والی) ''الحاقة'' (وہ حقیقت جو آ کر رہے گی)، ''الطامة'' (عظیم حقیقت)، ''الصّاخة'' (سخت اور گرجدار آواز والی)، ''القارعة'' کھڑکھڑانے والی جس میں زوردار دھما کے پیدا ہوں یعنی (عظیم حادثہ)، قَرَعَ یَقْرَعُ عربی میں کھٹکھٹانے کو کہتے ہیں جس میں غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو جگانا مقصود ہو گویا کہ ''اَلْقَارِعَة'' ایسی بڑی مصیبت ہے جو اچانک سر پر آ پڑے گی اور یہ ایک ایسی گھڑی ہوگی جو دنیا کی لذتوں اور اس کی آسائشوں میں ڈوبے ہوئے انسانوں پر اچانک آ جائے گی اور وہ بے دست پا ہو کر پیوند زمین ہو جائیں گے، کچھ شک نہیں کہ یہ دنیا کا آخری مرحلہ ہوگا اور اس میں نیک و بد سبھی لوگ ہوں گے، مگر یہ اپنے نتائج و انجام کے لحاظ سے مختلف ہو جائیں گے۔

سُوْرَۃُ الْقَارِعَۃ

آیات: ۱۱ رکوع: ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اَلْقَارِعَۃُ(۱) مَا الْقَارِعَۃُ(۲) وَمَا اَدْرٰیکَ مَا الْقَارِعَۃُ(۳) یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ(۴) وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ(۵) فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ(۶) فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ(۷) وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ(۸) فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ(۹) وَمَآ اَدْرٰیکَ مَاھِیَہْ(۱۰) نَارٌ حَامِیَۃٌ(۱۱)﴾

عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ اور تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ (یہ حادثہ قیامت ہے) جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگا رنگ دھنکی ہوئی اون کی طرح ہوں گے۔ جس کے اعمال (صالحہ) کا وزن بھاری ہوگا وہ دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے اعمال (صالحہ) کا وزن ہلکا ہوگا۔ اس کے لیے جائے قرار ہاویہ (گہری کھائی) ہے اور تم کیا جانو کہ یہ ہاویہ کیا ہے؟ یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

﴿اَلْقَارِعَۃُ، مَا الْقَارِعَۃُ، وَمَا اَدْرٰیکَ مَا الْقَارِعَۃُ﴾

عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ اور تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ (یہ حادثہ قیامت ہے)

اَلْقَارِعَۃُ عظیم حادثہ، اسم فاعل، (قَرَعَ، یَقْرَعُ قَرْعًا) کھٹکھٹانا، چوٹ لگانا، امام راغب اصفہانی

لکھتے ہیں: ''اُلقرع کے اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنے کے ہیں، اس سے ''قَرَعْتُهٗ بِالْمِقْرَعَةِ'' کا محاورہ ہے جس کے معنی کوڑے سے سرزنش کرنے کے ہیں۔'' پھر یہ لفظ قیامت، شامت اعمال، مصیبت آفت اور عظیم حادثہ، کے لیے بھی استعمال ہونے لگا (القاموس الوحید) جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ ''جن لوگوں نے اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے۔''

یہاں پر ''اَلْقَارِعَة'' کا لفظ آفت اور مصیبت کے معنی میں آیا ہے۔ مَا الْقَارِعَةُ کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ مَا حرف استفہام اَلْقَارِعَة، عظیم حادثہ (یعنی قیامت)، وَمَا اَدْرٰیکَ اور تم کیا جانو، وَ اور عاطفہ، (اَدْرٰ. کَ) جانو۔ تم، اَدْرٰ، یُدْرِی، باخبر کرنا، علم میں لانا، ''کَ''، ضمیر واحد مذکر حاضر۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''القارعة'' یہ قیامت کے مختلف ناموں میں سے ایک نام ہے، اس کے معنی ہیں ٹھونکنے والی، کھٹکھٹانے والی۔ قَرَعَ الْبَاب کے معنی ہیں اس نے دروازہ کو ٹھونکا یا کھٹکھٹایا اس نام سے قیامت کے اس خاص پہلو کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس طرح کوئی رات میں آنے والا دروازے کو ٹھونکتا اور گھر کے تمام سونے والوں کو دفعتاً ہڑبڑا دیتا ہے، وہی حال قیامت کا بھی ہوگا، اس کا وقت کسی کو نہیں معلوم کہ کب آدھمکے۔ اس کا ظہور اچانک ہوگا اور وہ دفعتاً سارے عالم میں ایک ہلچل برپا کر دے گی، اس کے اسی نام کے اندر یہ تنبیہ بھی مضمر ہے کہ جب یہ اس کائنات کی سب سے بڑی ہلچل ہے اور اس کا وقت کسی کو نہیں معلوم ہے تو سلامتی اسی میں ہے کہ اس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہے۔

''مَا الْقَارِعَةُ'' اس سوال نے اس آلام کی سنگینی میں مزید اضافہ کر دیا کہ جو لوگ اس کو کوئی معمولی بات سمجھ کر اس سے بے پروا ہیں وہ چوکنے ہوں اور کان کھول کر اس کا حال سن لیں اور اس کے لیے جس تیاری کی ضرورت ہے، اُس کی فکر کریں۔

''وَمَا اَدْرٰیکَ مَا الْقَارِعَةُ'' اس میں سوال کے ساتھ ساتھ مخاطب کی غفلت اور ناعاقبت بینی پر افسوس اور حسرت کا اظہار بھی ہے کہ تم کیا جانو یا کیا سمجھو کہ وہ اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کیا ہے اور ان

لوگوں پر کیا گزرے گی جو بار بار کی تنبیہ وتذکیر کے باوجود اس کا مذاق اڑائے جا رہے ہیں۔" (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ، وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾

جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی طرح ہوں گے۔

يَوْمَ جس دن ظرف زمان، يَكُونُ ہوں گے (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، النَّاسُ لوگ، كَالْفَرَاشِ (كَ. الْفَرَاشِ) مانند۔ پتنگوں (کے) اسم سے پہلے 'کَ' مانند کا معنی دیتا ہے، الْمَبْثُوْثِ بکھرے ہوئے (بَثَّ، يَبُثُّ، بَثًّا) پھیلانا، منتشر کرنا، اس سے اسم مفعول مَبْثُوْث پھیلے ہوئے، بکھرے ہوئے، وَتَكُوْنُ اور ہوں گے، الْجِبَالُ پہاڑ اس کا مفرد جَبَلٌ ہے، كَالْعِهْنِ (كَ. الْعِهْنِ) مانند، اون (کے)، الْمَنْفُوْشِ دھنکی ہوئی اسم مفعول (نَفَشَ، يَنْفُشُ، نَفْشًا) روئی یا اُون کا دھنکنے سے بکھرنا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"جب وہ حادثۂ عظیم برپا ہوگا، جس کے نتیجے میں دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اس وقت لوگ گھبراہٹ کی حالت میں اس طرح بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے ہر طرف پراگندہ اور منتشر ہوتے ہیں اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح اڑنے لگیں گے، رنگ برنگ کے اون سے پہاڑوں کو تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔" (تفہیم القرآن)

﴿فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ، فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾

جس کے اعمال (صالحہ) کا وزن بھاری ہوگا، وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔

فَأَمَّا پس، مَنْ جس شخص (کا) اسم موصول، ثَقُلَتْ بھاری ہوا، وزنی ہوا (ثَقُلَ، يَثْقُلُ. ثِقَلًا و ثَقَالَةً) بھاری اور وزنی ہونا، ثقالت، بوجھ، اردو میں استعمال ہوتا ہے، مَوَازِيْنُهُ (مَوَازِيْنُ. هُ) وزن۔ اس کا، 'هٗ' ضمیر واحد مذکر غائب اس شخص کی طرف جاتی ہے جس کے نیک اعمال اس کی برائیوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ فَهُوَ (فَ. هُوَ) پس، وہ ہوگا۔ هُوَ ضمیر واحد مذکر غائب بھی نیک شخص کی طرف جاتی ہے۔ فِيْ بیچ (درمیان)، عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ زندگی، خوشحالی (کی) (عَاشَ، يَعِيْشُ، عَيْشًا، وَعِيْشَةً) زندگی گزارنا، جینا اور عِيْشَةٌ، زندگی، رَاضِيَةٌ، اچھی، راضی خوشی کی، عِيْشَةٌ، موصوف ہے

اوراس کی صفت راضیۃٌ ہے، عربی میں صفت موصوف کی اعرابی حالت یکساں ہوتی ہے۔

﴿وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ، فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ﴾

اور جس کے اعمال (صالحہ) کا وزن ہلکا ہوگا، اس کے لیے جائے قرار ہاویہ (گہری کھائی) ہے۔

وَ اور عاطفہ، اَمَّا (حرف شرط وتفصیل) رہا یہ کہ، مَنْ جس شخص (کا)، خَفَّتْ ہلکا ہوا (خَفَّ، یَخِفُّ، خَفًّا) ہلکا ہونا، ، کم ہونا، خفیف، ہلکا، اردو میں استعمال ہوتا ہے، مَوَازِیْنُهٗ (مَوَازِیْنُ. ہٗ)، وزن۔ اس کا، ہٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب، اس شخص کی طرف جاتی ہے جس کی برائیاں اس کی نیکیوں پر حاوی ہو جائیں گی، ''فَاُمُّهٗ (فَ. اُمُّ. ہٗ) پس۔ ٹھکانہ۔ اس کا، اُمٌّ کے لفظی معنی ماں کے ہیں لیکن یہاں یہ ملجا اور ٹھکانے کے معنی میں ہے اور نہایت بلاغت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔'' (تدبر القرآن)

﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ، نَارٌ حَامِيَةٌ﴾

اور تم کیا جانو کہ یہ ہاویہ کیا ہے؟ یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

وَ اور، عاطفہ، اَدْرٰکَ (اَدْرٰ. کَ) جانو۔ تم، اَدْرٰی، یُدْرِی، باخبر کرنا، علم میں لانا، 'ک' ضمیر واحد مذکر حاضر، غافل انسان کی طرف ہے، مَاهِیَهْ، کیا ہے یہ؟ استفہام، یہ جہنم کی شدت، حرارت اور سنگینی کو بیان کیا جا رہا ہے۔ نَارٌ حَامِیَةٌ، آگ ہے، دہکتی ہوئی، تیز جلنے والی آگ۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ ان لوگوں کا حشر بیان ہو رہا ہے جن کے پاس باطل ہی باطل ہوگا۔ حق ان کے پاس ہوگا ہی نہیں یا ہوگا تو ان کے عقیدے اور اُن کی نیت نے اس کو بھی بالکل بے وزن کر دیا ہوگا، فرمایا کہ ان کا ٹھکانا کھڈ (کھائی) ہے، اس کھڈ کی وضاحت آگے فرما دی کہ وہ دوزخ کا کھڈ ہوگا جس میں آگ بھڑک رہی ہو گی۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) قیامت کا ظہور اچانک ہوگا جب دنیا کی یہ محفل جمی اور سجی ہوگی اور کسی کو کچھ خبر نہ ہوگی کہ یکا یک یہ

عالیشان اور پرشکوہ عمارتیں اپنے مکینوں کے ساتھ زمین بوس ہوجائیں گی، یہ دنیا کی تباہی و بربادی کا پہلا مرحلہ ہوگا۔

۲) دوسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ آج تک پیدا ہونے والے روئے زمین کے تمام انسان، رب کائنات کے حکم سے زندہ ہوجائیں گے اور انتہائی پریشانی کے عالم میں میدان محشر کی طرف حساب کتاب کے لیے بھاگ رہے ہوں گے ایسے ہی جیسے موسم برسات میں پتنگے فضا میں تیر رہے ہوتے ہیں۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی اور عزیز و اقارب، دوست و احباب ایک دوسرے کو پہچاننے کے باوجود بے رخی اور دل آزاری کا اظہار کریں گے۔

۳) بلند و بالا پہاڑ جن کی چوٹیاں سر کرنے کے لیے بڑی محنت اور مشقت درکار ہوتی تھی بے حقیقت ہو جائیں گے اور فضا میں یوں اڑ رہے ہوں گے گویا کہ وہ دھنکی ہوئی رنگ برنگ اُون ہے۔

۴) تمام انسان دو حصوں میں بٹ جائیں گے ایک وہ جنہوں نے حزم و احتیاط سے زندگی گزاری، ایمان اور اعمال صالحہ سے اپنے آپ کو مزین کیا، ان سے زندگی میں تھوڑی بہت خطائیں ضرور ہوئیں مگر نیکیوں کا پلڑا وزنی رہا، یہ کامیاب اور بامراد ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی جنت ان کا ٹھکانا ہوگا۔ جہاں دائمی عیش اور ابدی راحت کے سامان ہوں گے اور دوسرے وہ لوگ ہوں گے جو شیطان اور خواہشات نفس کے پجاری بن گئے اور عارضی زندگی تباہ و برباد کر ڈالی اور اگر کبھی بھولے سے کوئی نیکی سرزد ہوئی بھی تو برائیوں کا پلڑا وزنی رہا اور وہ ان کی ناکامی اور نامرادی کی علامت بن گیا اور بھڑکتی ہوئی آگ ان کی ہمیشہ ہمیشہ کی رہائش گاہ قرار پائی جہاں کسی کروٹ آرام اور چین نصیب نہ ہوگا۔

۵) عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے عقائد و اعمال کو ہر وقت سیدھا اور درست رکھے، احکام الٰہی اور اسوہ رسول ﷺ کی پیروی کو اپنی زندگی کا شعار بنائے اور یہ خیال کرے کہ موت اس کے سر پر کھڑی ہے، ویسے بھی کوئی شخص اپنی موت سے آگاہ نہیں کہ وہ کب اور کہاں آجائے۔ موت کے ساتھ عمل کرنے کی زندگی منقطع ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو فہم و بصیرت سے نوازے۔ آمین!

..................o..................

سُورَۃُ التَّکَاثُر

پہلی آیۃ مبارکہ کے لفظ ''التَّکَاثُرُ'' کواس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔اس سورۃ مبارکہ میں انسان کوخوابِ غفلت سے بیدار کیا جارہا ہے کہ دنیا کی حرص وہوس انسان کوآخرت کے بارے میں اندھا اور بہرا بنادیتی ہے اور وہ اِس چندروزہ حیاتِ مستعار میں اپنے رب سے غافل ہوجاتا ہے۔

اِس میں کلام نہیں ہے کہ روح وجسم کے تعلق کو برقرار رکھنے کے لیے اسے کھانے پینے کی ضرورت ہے اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے لیے وہ دوڑ دھوپ کرتا ہے اور اسے اس کے حصول کے لیے کوشش کرنی بھی چاہیے کہ رب کائنات نے اسے محنت کے لیے پیدا کیا ہے، مگراس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شب وروز دھن دولت اکٹھی کرنا ہی اس کا مقصد حیات بن جائے اور فکرآخرت کو یکسر بھلادے اور عبادت وریاضت میں اس کی کوئی دلچسپی نہ رہے یا حصول دولت میں اتنا مگن ہوجائے کہ اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی وغمخواری کے احساسات بھی مردہ ہوجائیں، اور وہ اسی ادھیڑبن میں رہے اور فرشتۂ اجل اُس کے دروازے پر دستک دے ڈالے اور اس وقت کفِ افسوس ملنے کے سوا اس کے پاس کچھ باقی نہ رہ جائے، اس وقت اسے معلوم ہوجائے گا کہ دنیا طلبی کے یہ جذبات اُخروی زندگی کے لیے یقیناً نقصان دہ تھے، اس برے انجام سے لوگوں کو متنبہ کیا جارہا ہے کہ یہ زندگی اور اس کی نعمتیں تمہاری آزمائش ہیں، ان کا مناسب اور جائز استعمال کرو، دولت کماؤ بھی اور اللہ کی رضا کے لیے غربا ومساکین پر خرچ بھی کرو، خود بھی کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ کچھ کھانے کمانے کے لیے وقت نکالو، تو اللہ کی بندگی کے لیے اپنے آپ کو وقف بھی کرو، اس طرح ایک عاجز، عادل اور فرمانبردار بندے کی حیثیت سے اپنے رب کے حضور پہنچ کر کامیاب ہوجاؤ۔

سُوۡرَۃُ التَّکَاثُر

آیات:۸ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ(۱) حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ(۲) کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ(۳) ثُمَّ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ(۴) کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ(۵) لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ(۶) ثُمَّ لَتَرَوُنَّہَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ(۷) ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ(۸)﴾

(اے لوگو!) تمھیں مال و جاہ میں اضافے کی طلب نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو، ہاں ہاں! تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، (پھر سن لو) ابھی ابھی تمہیں علم ہو جائے گا، ہاں ہاں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے جانتے ہوتے کہ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا)، پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے پھر اس دن تم سے ضرور بضرور نعمتوں کا سوال ہوگا۔

﴿اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ﴾

تمھیں مال و جاہ میں اضافے کی طلب نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔

اَلۡہٰکُمۡ (اَلۡھٰی. کُمۡ) غافل کر دیا۔ تم (کو) "کُمۡ" ضمیر جمع مذکر حاضر، ان تمام انسانوں کی طرف جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں (اَلۡھٰی، یُلۡھِیۡ) غافل کرنا،

کھیل تماشے میں مصروف کر دینا، اللّھْو، کھیل کود، تفریح طبع، مشغلہ، بہلاوا، (القاموس الوحید) لہو و لعب اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، التَّکَاثُرُ یہ باب تفاعل کے وزن پر ہے اور اس کا مطلب ہے مال و دولت کی کثرت میں باہم مقابلہ کرنا، اردو میں اکثر، کثرت جانے پہچانے الفاظ ہیں، حَتّٰی یہاں تک (کہ) یہ لفظ غایت و انتہا کے لیے استعمال ہوتا ہے، زُرْتُمُ تم نے زیارت کر لی فعل ماضی جمع مذکر حاضر (زَارَ، یَزُوْرُ) زیارت کرنا، جانا، اَلْمَقَابِرَ قبروں (کی) اس کا مفرد اَلْمَقْبَرَۃ ہے، یہ اردو میں بھی معروف ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''تکاثر کے معنی ہیں مال و دولت کی کثرت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی تگ و دو، عرب جاہلیت میں حفاظت و مدافعت کی ذمہ داری چونکہ خاندان اور قبیلہ ہی پر ہوتی تھی، اس وجہ سے قبیلہ میں سرداری کا مقام اسی خاندان کو حاصل ہوتا جس کے افراد زیادہ ہوں۔ اس چیز نے قدرتی طور پر ان کے ہاں مال کے تکاثر کے ساتھ ساتھ اولاد کے تکاثر کے جذبہ کو بھی بہت قوی کر دیا تھا، چنانچہ ان کے لٹریچر پر جن کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ جس طرح وہ اپنے مال کی کثرت پر فخر کرتے، اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اولاد کی کثرت پر بھی فخر کرتے۔

اب موجودہ دور میں اجتماعی زندگی کے بدلے ہوئے نظام اور خاص طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے تصور نے اولاد کی کثرت کے رجحان کو دبا کر اس کی جگہ معیارِ زندگی کے رجحان کو غالب کر دیا ہے، اس دور کی عام بیماری یہی ہے، مشکل ہی سے اس زمانے میں کوئی شخص اس وبا کے اثر سے محفوظ ملے گا، ہر شخص رات دن معیار زندگی اونچا کرنے کی دھن میں ہے اور چونکہ اس کی کوئی حد معین نہیں ہے، اس وجہ سے جو اس میدان میں گامزن ہیں ان کو اپنا ہر قدم پہلا قدم معلوم ہوتا ہے۔ آخری منزل نگاہوں سے اوجھل ہے، کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ کب آئے گی اور کبھی آئے گی بھی یا نہیں، ظاہر ہے کہ معیار زندگی کی بلندی کا سارا انحصار مال پر ہے، تو جب معیار کی کوئی حد معین نہیں ہے تو مال کی حرص میں بھی کسی کمی کا امکان نہیں ہے، چنانچہ جس رفتار سے زندگی کا معیار اونچا ہو رہا ہے اس سے زیادہ شدت کے ساتھ مال کی حرص بڑھتی جا رہی ہے، یہی چیز ہے جس کو قرآن نے 'تکاثر' سے تعبیر کیا ہے اور اس کا اثر یہ بتایا ہے کہ اس

نے ہر شخص کو اسی طرح اپنے دامِ فریب میں گرفتار کرلیا ہے کہ اس میں عمر بیت جاتی ہے اور کسی کو اس سوال پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے یا نہیں، اور ہے تو اس کے لیے بھی کچھ کرنا ہے یا نہیں۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ، ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ﴾

ہاں ہاں! تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا (پھر سن لو) ابھی ابھی تمہیں علم ہو جائے گا۔

كَلَّا (کلمۂ تنبیہ و توبیخ) ہرگز نہیں، یعنی جو بات تم سوچتے اور سمجھتے ہو ایسا ہرگز نہیں ہے، یا پھر اس کا ترجمہ ہاں ہاں کر سکتے ہیں یعنی فکر نہ کرو، سَوۡفَ عنقریب (حرف استقبال)، تَعۡلَمُوۡنَ تمہیں معلوم ہو جائے گا، فعل مضارع جمع مذکر حاضر (عَلِمَ، يَعۡلَمُ، عِلۡمًا) جاننا، معلوم ہونا، ثُمَّ پھر (حرف عطف)، كَلَّا ہاں ہاں! سَوۡفَ عنقریب، تَعۡلَمُوۡنَ تم جان لوگے، عربی زبان کا اسلوب ہے جس کسی جملے میں تکرار آجائے اس سے معاملے کی شدت اور سنگینی کا احساس دلایا جا رہا ہوتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یعنی یہ ساری غفلتیں محض عارضی ہیں، آنکھ بند ہوتے ہی عالم برزخ شروع ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ کشف حقائق بھی...... خود ہی جان لوگے، کہ اصل حقیقت کیا تھی اور تم اس دنیا میں کس شدید حماقت اور بھول میں پڑے رہے۔'' (تفسیر ماجدی)

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اس دنیا میں خواہ کتنی ہی طویل عمر ہو جائے آخرت کے مقابلے میں یہ چند ہی لمحات ہیں، ذرا اس آیہ مبارکہ پر غور کیجیے:

وَ يَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ كَاَنۡ لَّمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ (یونس:۴۵) ''اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (دنیا کی زندگی انہیں ایسے محسوس ہوگی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کو ٹھہرے تھے۔

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنَ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ﴾

ہاں ہاں! اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے جانتے ہوتے کہ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔(تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا)

كَلَّا (حرف تنبیہ) ہاں ہاں! لَوْ اگر (حرف شرط)، تَعْلَمُوْنَ تم جانتے فعل مضارع جمع مذکر مخاطب(عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، عِلْمَ الْيَقِيْنَ، یقینی علم، لَتَرَوُنَّ (لَ. تَرَوُنَّ) ضرور بضرور۔تم دیکھو گے(رَاٰى، يَرٰى، رُؤْيَةً) دیکھنا، لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے، ''نّ'' شدوالا مزید تاکید پیدا کر رہا ہے، گویا اس جملے میں زبردست تاکید پیدا ہورہی ہے اس لیے ترجمہ میں ضرور بضرور کا اضافہ کیا گیا ہے، الْجَحِيْمَ جہنم (کو)۔

﴿ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ، ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾

پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے پھر اس دن تم سے ضرور بضرور نعمتوں کا سوال ہوگا۔

ثُمَّ پھر (حرف عطف) سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے، لَتَرَوُنَّهَا (لَ. تَرَوُنَّ. هَا) ضرور بضرور، تم دیکھو گے، اسے (جہنم کو) لام تاکیدی معنی دیتا ہے، تَرَوُنَّ مضارع جمع مذکر حاضر، 'نَ' (شدوالی) ثقیلہ کہلاتی ہے، اس سے مزید تاکید کا معنی پیدا ہوتا ہے، 'ھا' کی ضمیر واحد مؤنث غائب الْجَحِيْمَ [جہنم] کی طرف جاتی ہے، عَيْنَ الْيَقِيْنِ، یقین کی آنکھ (سے)، ثُمَّ پھر، حرف عطف، لَتُسْئَلُنَّ تم سے سوال کیا جائے گا (لَ. تُسْئَلُ. نَّ) ضرور بضرور تم سے سوال ہوگا، لام تاکیدی معنی دیتا ہے، عَنِ النَّعِيْمِ نعمتوں کے بارے میں (جو دنیا میں تمہیں عطا کی گئیں)۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنَ، یعنی اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ جہنم کو لازماً دیکھو گے۔ 'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' پر لام، اس یقین کی تعبیر کے لیے ہے جس کا ہونا مطلوب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ علم یقین جو ان باتوں کو ماننے کے لیے مطلوب ہے اس کے وسائل اللہ تعالیٰ

نے انفُس و آفاق کے شواہد اور قرآن کی آیاتِ بینات میں رکھ دیے ہیں، اس وجہ سے ہر عاقل مکلّف ہے کہ ان کو سمجھے اور مانے، جو ان سے گریز کرتا ہے خواہ سمجھنے سے گریز کرتا ہے یا اس کے قبول کرنے سے، وہ اپنی بدبختی کا ذمہ دار خود ہے، عنداللہ وہ اپنے اس گریز کی سزا بھگتے گا۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ ایک عاقل کو اس دنیا میں غیب کے حقائق کا علم یقین تو حاصل ہوسکتا ہے اس لیے کہ علم یقین دلائل سے حاصل ہوتا ہے جو انفس و آفاق اور قرآن میں بیان کر دیے گئے ہیں لیکن عین الیقین کا درجہ اس کو آخرت ہی میں حاصل ہوگا اس لیے کہ اس کا تعلق معائنہ و مشاہدہ سے ہے، جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ چیز اس دنیا میں بھی حاصل ہوتی ہے، ان کا دعویٰ ہمارے نزدیک بے بنیاد ہے اس دنیا میں عین الیقین نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس بات کا علم الیقین حاصل ہوتا ہے کہ قرآن جو کچھ ہمیں بتا رہا ہے، وہ ایک دن ہم آنکھوں سے بھی دیکھیں گے، عین الیقین اس دن حاصل ہوگا جس دن تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں گے۔

''ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ'' یہ بات بھی ''لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنَ'' کے تحت ہی ہے یعنی اگر تمہیں اس بات کا علم ہوتا کہ اس دن تم سے تمام نعمتوں کی پرسش ہونی ہے...... پرسش سے مراد ظاہر ہے کہ وہ سزا ہے جو ان کو ناشکری، ناقدری اور ان کے سوءِ استعمال کے نتیجہ میں بھگتنی پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنی قوتیں وصلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور جو وسائل و ذرائع بھی بخشے ہیں، وہ سب ''نعیم'' میں داخل ہیں، ان کا فطری حق یہ ہے کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار رہا جائے اور ان کو اس کے مقرر کردہ حدود کے اندر ان کاموں میں استعمال کیا جائے جن کے لیے وہ عطا ہوئے ہیں، کوئی نعمت اگر ضائع کی گئی یا وہ خالق کی پسند کے خلاف استعمال ہوئی تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا دے...... انسان کے کان، آنکھ، دل، دماغ اور تمام اعضا و جوارح نعمت ہیں، اِسی طرح اس کو جو ظاہری و باطنی قوتیں اور صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں وہ بھی نعمت ہیں، ان کا فطری حق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی ہے کہ انسان ان کو برتے اور اپنے رب کا شکر گزار رہے، اس شکر گزاری کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ ان کے برتنے میں نہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کرے اور نہ ان میں سے کسی کے عشق میں اس طرح مبتلا ہو جائے کہ اس کو معبود بنا بیٹھے اور اللہ کو بھول جائے، جو لوگ اس طرح کے کسی تجاوز میں مبتلا

ہوں گے، وہ قیامت کے دن لازماً اس کی سزا بھگتیں گے۔'' (تدبر قرآن، ج:۸)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) مال ودولت سامانِ زیست ہے جسے جائز اور حلال طریقے سے حاصل کرنا عین عبادت ہے مگر یہ مقصد زیست نہیں ہے بقول شخصے کہ کھاؤ زندہ رہنے اور رب کی بندگی کے لیے نہ کہ کھانے کو زندگی کا مقصد بنالو، اسلام نہ تو رہبانیت سکھاتا ہے کہ نیکی کے حصول کے لیے جنگلوں اور غاروں کی پناہ لو اور نہ ہی صرف دنیادار بناتا ہے کہ کوئی شخص صبح وشام اسی میں کھویا رہے، وہ توازن اور اعتدال کی راہ پر چلاتا ہے...... اگر تم نے حق حلال کی روزی کمائی ہے تو اس سے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ بھرو، ہاں کچھ زائد مال ہے تو غربا و مساکین کی مدد بھی کردو کہ یہ سب کچھ تم پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، تو اس کے ساتھ ساتھ تم رب کائنات کے حضور سجدۂ شکر بھی بجالایا کرو۔ گویا یہ دین معاشی ومعاشرتی اور روحانی و اخلاقی اقدار کا حسین امتزاج ہے، جس کی بندۂ مومن اپنے رب کے حضور بھیک مانگتا رہتا ہے:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

''اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی سے نواز اور آتشِ جہنم سے بچا۔'' آمین!

۲) صرف مال و دولت ہی کی ہوس نہ صرف افراد کے لیے فساد کا سامان ہے بلکہ اقوام کے لیے بھی تباہی وخسارے کا باعث ہے...... اس کا لازمی نتیجہ فتنہ انگیزی، فساد فی الارض، باہمی جنگ وجدال اور انسانیت سوزی کی شکل میں رونما ہوتا ہے، اس وقت یورپی برادری اور ان کا لیڈر امریکہ اسی غرور میں مبتلا ہیں اور انہوں نے دنیا بھر میں طوفان مچا رکھا ہے۔

بالآخر افراد اور قوموں کو زور اور زر عمیق غار میں دھکیل دیتا ہے یا تو اس عارضی دنیا میں ان کا حساب چکا دیا جاتا ہے یا پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد انہیں دائمی عذاب میں جکڑ دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات عمل میں دیر تو ہے مگر اندھیر نہیں۔

..................o..................

سُورَةُ الْعَصر

سورۃ العصر مکی ہے، یہ چھوٹی سی سورۂ مبارکہ معنی اور مطالب کے لحاظ سے بڑی جامع ہے، امام شافعیؒ کا یہ قول مشہور ہے کہ تنہا اسی سورۃ پر لوگ غور وفکر کریں تو یہ ان کی ہدایت اور تعلیم، کامیابی اور کامرانی کے لیے کافی ہے اس میں دین کی پوری دعوت آ گئی ہے اور فلاح دارین کا مکمل پروگرام بتا دیا گیا ہے، رب کریم کے ان گنت انعامات میں سے قرآن بہت بڑا انعام ہے جو خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا اور یہ سورۃ پورے قرآن کا خلاصہ ہے۔

سُوْرَۃُ الْعَصْرِ

آیات:۳ رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَالْعَصْرِ (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۲) اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳)﴾

زمانے کے حالات شاہد ہیں کہ انسان درحقیقت گھاٹے اور خسارے میں ہے مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے، صالح اعمال کیے اور باہم حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے

﴿وَالْعَصْرِ﴾ زمانے کے حالات شاہد ہیں، (قسم ہے زمانے کی)۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم اس کی عظمت یا اس کے کمالات و عجائب کی بنا پر نہیں کھائی ہے بلکہ اس بنا پر کھائی ہے کہ وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے پس زمانے کی قسم کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جن میں یہ چار صفتیں پائی جاتی ہیں: (۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔'' (تفہیم القرآن)

مولانا امین احسن اصلاحی ''تدبر قرآن'' میں مولانا فراہیؒ کے حوالے سے ''والعصر'' پر لکھتے ہیں:

''لفظ عصر'' ایک طرف زمانہ گزشتہ کے احوال و واقعات یاد دلا رہا ہے، دوسری طرف اس کی مخصوص

صفت تیز روی اور برق رفتاری کی طرف بھی متوجہ کر رہا ہے، ان دونوں حقیقتوں کی طرف اشارہ سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں، ایک یہ کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے ان کے اعمال کے اعتبار سے نافذ ہوں گے، دوسرا یہ کہ ہم کو زمانے سے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تیز روی اور برق رفتاری ہے، زیادہ سے زیادہ مستعدی سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اس حقیقت کو مولانا فراہیؒ اس مثال سے بھی سمجھاتے ہیں۔

اس معاملے میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے، لیکن بجائے اس کے کہ جلد سے جلد اس کو بیچ کر اپنے دام کھرے کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشا دیکھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے ناعاقبت اندیش تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

مولانا فراہیؒ پھر بتاتے ہیں:

''علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویت صبر کا بھی ہے، وہ اس طرح کہ اس تھوڑی سی مدت میں اگر انسان چاہے، تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ جمع کر سکتا ہے، ایک بدبخت انسان اس حیاتِ فانی کی چند روزہ لذتوں میں ریجھ کر اپنے آپ کو ابدی مسرت و کامیابی سے محروم کر لیتا ہے، لیکن ایک عاقل اسی فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب اور برقِ خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ اور ضبطِ نفس کی آزمائشیں جھیل کر...... اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی محبت کا ابدی تخت و تاج حاصل کر لیتا ہے۔'' (تدبر قرآن)

﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ﴾ <u>انسان درحقیقت گھاٹے اور خسارے میں ہے۔</u>

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ وہ اصل بات ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے، جب ایک طرف مہلتِ حیات کی اہمیت اور قدر و قیمت کا حال یہ ہے کہ اسی کے بدلے میں انسان ابدی بادشاہی حاصل کر سکتا ہے اور اگر اس سے غفلت برتے تو اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔ دوسری طرف اس کی تیز روی کا یہ

حال ہے کہ ہر سیکنڈ کے ساتھ وہ ماضی کے اندر تحلیل ہوتی جارہی ہے اور اس پر انسان کا کوئی قابو نہیں تو وہ سارے انسان انتہائی خسارے میں ہوئے جن کا راس المال اس تیزی سے برباد ہو رہا ہے اور وہ اس سے غافل ہیں، چنانچہ اس کو شہادت میں پیش کر کے فرمایا کہ انسان گھاٹے میں ہیں بجز اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے۔'' (تدبر قرآن)

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے۔

ایمان کی سب سے بڑی حقیقت تو رب کائنات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو زبان کے اقرار اور دِل کے یقین کے ساتھ ماننا اور اس کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ کرنا پھر ساری زندگی اسی کی اطاعت اور فرمانبرداری کا دم بھرنا ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''الایمان، تصدیق کرنا، ماننا یا اصطلاحی معنوں میں اسلامی عقائد وارکان کی سچائی کو دل سے تسلیم کرنا اور زبان سے اس کا اظہار کرنا، اسلام نے ایمان کا جو تصور پیش کیا ہے وہ زبردستی اطاعت و فرمانبرداری کا نام نہیں بلکہ اس عقیدے اور نظریہ کو قبول کر لینے کا نام ہے جس کو ذہن وقلب میں سمو لینے سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، ایمان ہمیں کس درجہ اقدار سے مالا مال کرتا ہے، اس کا اندازہ ان پانچ باتوں سے ہوتا ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیہ مبارکہ میں ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ:۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کو قبلہ سمجھ کر ان کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، روزِ آخرت پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائیں۔''

یہ پانچ بنیادی باتیں ہیں: (۱) اللہ پر ایمان (۲) آخرت پر ایمان (۳) فرشتوں پر ایمان (۴) کتب پر ایمان اور (۵) نبیوں پر ایمان۔

جب ہم اللہ پر ایمان لے آئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم زندگی کے مطمح نظر کو پا گئے اور اس رب

کریم سے اپنا رشتہ جوڑ لیا جو تمام اقدارِ حیات کا منبع و سرچشمہ ہے، جو ہمہ خیر، ہمہ حسن اور ہمہ خوبی ہے، اس طرح گویا زندگی کو ایک سانچہ ملا اور ایک راہ متعین ہوئی جو نیکی، جمال اور حسن و خوبی کی راہ ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے یہ معنی بھی ہیں کہ ہمارا احساسِ تنہائی و بیچارگی ختم ہوا اور ہم نے ایک ایسا مضبوط سہارا ڈھونڈ لیا جو نشیب و فرازِ حیات میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ یہی ہے جو ہماری ضرورتوں سے آگاہ ہے اور ہماری دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے، جو دکھ درد میں ہمارے زخموں پر پھاہا رکھتا ہے اور مصائب و مشکلات میں ہماری راہنمائی کرتا اور نجات و مخلصی کی راہ سجھاتا ہے۔

ایمان بالآخرت نے ہمیں موت کے ڈر سے آزادی بخشی اور اخروی زندگی کے بارے میں یقین دلایا کہ یہ رواں دواں جاودانی ہے، اس عقیدے سے ہم میں احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے کیونکہ اگر آخرت کا تصور صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دن ہمیں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا اور اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں جواب دینا ہے۔

ملائکہ پر ایمان سے ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ دراصل اس کائنات میں ارادۂ الٰہی کی حکمرانی ہے نیز یہ کہ مادہ ہی سب کچھ نہیں بلکہ مادی سطح کے علاوہ وجود کی اور سطحیں بھی ہیں۔

کتاب پر ایمان لانے سے ہمیں یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ قانونِ فطرت جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے ہمیں الفاظ و حروف کی صورت میں ایک مدوّن و مرتب شکل میں مل جاتا ہے۔

انبیاء و رسل کے وجود کو تسلیم کرنے سے دانش و حکمت کے ان نہایت ہی قیمتی خزانوں سے ہم آشنا ہو جاتے ہیں جن سے ہزاروں نبی اور رسول اپنے اپنے دور میں بہرہ مند رہے، ان پر ایمان کے یہ معنی بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عنایت نے کسی دور میں بھی انسان کو رشد و ہدایت کی برکات سے غافل نہیں رکھا۔'' (لسان القرآن، ج:۱)

﴿وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اور نیک اعمال سرانجام دیے۔

اس سے مراد وہ سب اعمال ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں حکم دیا، یا جنہیں خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے ترغیب دی، اس کا دائرہ بہت وسیع

ہے۔اس میں نماز، روزہ، حج، صدقات وزکوٰۃ، اخلاص اوراحسان جیسی عبادات بھی داخل ہیں اوراچھے معاشرتی آداب بھی شامل ہیں جیسے والدین کی خدمت، پڑوسیوں سے حسن سلوک، بیماروں کی عیادت اوران کی تیمارداری، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت، غربا و مساکین کی خدمت اوراعانت، تجارت میں دیانت اورامانتداری، معاملات میں نیک نیتی اور کھرا پن وغیرہ تمام امور اعمال صالحہ میں شمار ہوتے ہیں۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

"عمل صالح ایمان کا فطری وطبعی ثمرہ ہے، جونہی انسانی قلب میں ایمان کی حقیقت جاگزیں ہوتی ہے،اسی لحہ وہ عمل صالح کی شکل اختیار کر لیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایمان ایک ایجابی متحرک حقیقت ہے، جونہی یہ حقیقت دل میں پیوست ہوتی ہے وہ بذات خود عمل صالح کی صورت میں خارج میں نمودار ہوتی ہے، اگر ایمان یہ فطری حرکت اختیار نہیں کرتا تو وہ مصنوعی یا مردہ ایمان ہے، ایمان کی مثال پھول کی طرح ہے، پھول اپنی خوشبو روک نہیں سکتا، خوشبو طبعی وفطری طور پر اس سے پھوٹ کر رہے گی۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ابھی دل میں موجود نہیں ہے۔

اسی سے ایمان کی قدر وقیمت سامنے آتی ہے، وہ حرکت وعمل ہے، وہ بناو تعمیر ہے، اس کا رخ اللہ کی طرف ہے، وہ دل کی مخفی حالتوں میں سے کوئی سلبی ومنفی حالت نہیں جو اپنے اندرون میں سمٹ کر رہتی ہو، وہ کوئی معصوم سا جذبہ بھی نہیں جو حرکت وعمل کی صورت میں نمودار نہ ہوتا ہو، وہ اسلام کی نمایاں قوت ہے جس سے عملی زندگی میں عظیم تعمیر کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔

یہ بات اسی وقت تک ہے، جب تک ایمان نظام الٰہی سے عملاً مربوط ہے...... یہ نظام عملی زندگی سے تعلق رکھنے والی ایک دائمی حرکت ہے جو نظم اور منصوبہ کے تحت وجود میں آتی ہے اور ایک خاص غرض و غایت کی طرف اس کا رخ ہوتا ہے، نوع انسانی کے لیے ایمان کی قیادت یہ ہے کہ حرکت کے اس نظام کو، جو عین کائنات کی فطرت ہے قائم ومضبوط کیا جائے، ایک عمدہ، پاکیزہ اور تعمیری تحریک جو اس نظام کے لائق ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے صادر ہوا ہے۔" (فی ظلال القرآن)

﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ، وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾

اور باہم حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''جن چار چیزوں پر انسان کی فلاح اور کامیابی کا دارومدار ہے ان میں تیسری اور چوتھی چیز ''تواصی بالحق اور تواصی بالصبر'' ہے یعنی حق اور صبر کی وصیت وتاکید کرنا۔ ''حق'' سے مراد ہر وہ اچھی بات اور ہر وہ اچھا کام ہے جس میں ایمان اور عمل صالح کے سارے شعبے شامل ہیں اور صبر کا مطلب ہے نفس پر قابو رکھنا اور ناموافق حالات میں بھی حق پر قائم رہنا، اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تواصی بالحق کا مطلب ہوا دوسروں کو ایمان وعمل صالح اور ہر اچھی بات اور اچھے کام کی نصیحت ووصیت کرنا، اسی کا دوسرا عنوان ''امر بالمعروف'' ہے، اور تواصی بالصبر کا مطلب ہوا نفس کو قابو میں رکھنے کی اور معصیتوں سے اس کو روکے رکھنے کی دوسروں کو تاکید ووصیت کرنا، اس کا دوسرا عنوان ''نهی عن المنکر'' ہے۔

تو معلوم ہوا کہ خسارے اور ناکامی سے محفوظ رہنے اور فلاح وکامیابی حاصل کرنے کے لیے جس طرح ایمان لانا اور اعمال صالحہ کرنا شرط ہے اسی طرح دوسروں کو ایمان وعمل صالح کی اور اچھی باتوں اور اچھے کاموں کی دعوت دینا اور اس کی وصیت وتاکید کرنا اور ہر طرح کی معصیتوں اور برائیوں سے نفس کو روکنے کی نصیحت ووصیت کرنا بھی ضروری ہے، یہ بھی ہمارے فرائض میں ہے اور اپنے اپنے حالات کے مطابق ہم اس کے مکلّف ہیں، واقعہ یہ ہے کہ عمل صالح کے وسیع دائرہ میں ''امر بالمعروف'' اور ''نھی عن المنکر'' بھی شامل ہیں، چونکہ ہم بندوں کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے نفس کے ذمہ دار ہیں دوسروں کے ذمہ دار نہیں، اس لیے ''تواصی بالحق'' اور ''تواصی بالصبر'' کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔'' (درس قرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اس سورۂ مبارکہ سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس شخص میں ایمان نہیں ہے، جو رب کائنات کی غلامی میں نہیں آتا، اس کے عمل میں راست بازی اور سچائی نہیں ہوتی، وہ صبر وانصاف

ایسی خوبیوں سے محروم ہوتا ہے اوران باتوں سے تہی دامن ہونا شرف انسانیت کوضائع کرنا ہے اور یہ بہت بڑے خسارے کی بات ہے۔

۲) ’’ایمان‘‘ ہمیں امن وسلامتی سے ہمکنار کر دیتا ہے، اعمال صالحہ اس ایمان کو پروان چڑھاتے ہیں اوراسے مضبوط اور توانا بناتے ہیں۔ ایمان کی مثال بیج کی ہے جو دل کی زمین میں بویا جاتا ہے اور اعمال صالحہ سے وہ بیج پھوٹتا ہے اور خوشنما پودے کی شکل میں ظاہر ہوتا، وقت کے دھارے کے ساتھ وہ پھلتا پھولتا اور تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے پھراس کے گھنے سایہ میں لوگ راحت وآرام پاتے ہیں گویا مؤمن کی زندگی شجرِ سایہ دار کی سی ہوتی ہے، وہ اس خوشگوار زندگی میں دوسرے انسانوں کو بھی شامل کرنا چاہتا ہے، اس لیے تواصی بالحق کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

۳) شیطان اور نفس اس راہ میں آڑے آتے ہیں، مصائب ومشکلات کا سامنا ہوتا ہے، اللہ پر مضبوط ایمان اسے استقامت اور قوت عطا کرتا ہے، وہ صبر اور سلامتی سے اس منزل کو عبور کر لیتا ہے اور ساحل مراد سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

۴) ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ایک ایسی مضبوط زنجیر ہے کہ اسے درمیان میں کہیں سے بھی ٹوٹنا نہ چاہیے، اس میں جہاں بھی خلا پیدا ہوگا، یہ زنجیر کمزور ہو جائے گی اور سالک کے لیے منزل مقصود پر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔

..................o..................

سُوۡرَةُ الۡهُمَزَة

اس سورۃ مبارکہ میں ان اخلاقی برائیوں کی مذمت کی گئی ہے جو ایام جاہلیت میں عرب معاشرے میں خاص طور پر مالدار لوگوں میں پائی جاتی تھیں اور دور حاضر میں بھی دولت اور تکبر کے نشے میں چور انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ غرباء و مساکین کی ہنسی اڑانا، تمسخر و استہزا کرنا، پھبتیاں کسنا، نقل اتارنا، تحقیر آمیز اشارے اور حرکتیں کرنا، خواہ زبان سے ہوں یا ہاتھوں یا آنکھوں کے اشاروں سے، یہ سب باتیں 'ھمزہ' کے مفہوم میں آجاتی ہیں جبکہ دوسروں کی پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرنا، چغلیاں کھا کھا کر لگائی بجھائی کرتے پھرنا، شر اور فساد کی راہیں کھولنا، فتنہ اور فساد پھیلانا، یہ سب باتیں 'لُمَزَہ' کے زمرے میں آتی ہیں۔

جس زمانے میں یہ سورہ مبارکہ نازل ہوئی اس وقت اس کا خاص مصداق وہاں کے وہ کفار و مشرکین تھے جو اہل ایمان کو تمسخر و استہزا کا نشانہ بناتے، پھبتیاں کستے، اشارے بازی کرتے اور محفل جما کر مسلمانوں کے خلاف منصوبے بناتے تھے۔

ان اخلاقی رذائل کے ساتھ ساتھ انہیں مال و دولت پر بھی غرور تھا۔ جس انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد مال و دولت کی پرستش اور دن رات اس کو جمع کرنے کے چکر میں رہنا ہو، اسے انسانوں سے نہیں دھن دولت سے پیار ہوتا ہے اور وہ اسے غربا و مساکین، یتامیٰ و بیوگان پر خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے۔

قرآن حکیم ایسے لوگوں سے یہ پوچھتا ہے کہ آیا ان کی دولت اللہ تعالیٰ کے دردناک عذاب سے انہیں بچا سکے گی اور وہ دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے؟ یہ عارضی اور فنا ہونے والی دنیا ہے، جو اسے غرور اور تکبر سے گزاریں گے انہیں بالآخر دردناک عذاب کا مزہ چکھنا پڑے گا۔

روز قیامت سرکش اور مغرور، منکر اور مشرک لوگ سخت عذاب میں ہوں گے، بلند و بالا مضبوط ستونوں کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیے جائیں گے جہاں سے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ (العیاذ باللہ)

آیات:۹ سُورَةُ الْهُمَزَة رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ(۱) الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ
عَدَّدَہٗ(۲) یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ(۳) کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی
الۡحُطَمَۃِ(۴) وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحُطَمَۃُ(۵) نَارُ اللّٰہِ
الۡمُوۡقَدَۃُ(۶) الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ(۷) اِنَّہَا عَلَیۡہِمۡ
مُّؤۡصَدَۃٌ(۸) فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ(۹)

تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا عادی ہے، جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشگی کی زندگی دے دے گا۔ ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ (حطمہ) میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں تک پہنچے گی، وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں۔ (گھرے ہوئے ہوں گے)

﴿وَیۡلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ﴾

تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا عادی ہے۔

وَیۡلٌ ہلاکت، آفت، تباہی، بربادی (جہنم کی وادی) مفردات القرآن، لِّکُلِّ (لِ. کُلِّ) لیے، ہر (اس شخص کے)، ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ وہ شخص جو کسی کے سامنے طعن و تشنیع کا مرتکب ہوتا ہے وہ ھُمَزَۃٍ

(زبردست عیب گر) کہلاتا ہے اور اللُّمَزَةِ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی پیٹھ پیچھے غیبت اور چغلی کرتا پھرے، (یہ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ رَجُلٌ هُمَزَةٌ اور اِمْرَأَةٌ هُمَزَةٌ کہا جاتا ہے اسی طرح لُمَزَةٌ کا استعمال ہے)[القاموس الوحید]

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ، کی عادت مہذب اور شائستہ سوسائٹی میں ہمیشہ عیب سمجھی گئی ہے، تمام آسمانی مذاہب میں اس کی ممانعت وارد ہے۔قرآن مجید میں نہایت واضح الفاظ میں اس سے روکا گیا ہے۔ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (الحجرات:۱۱) آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے پر پھبتیاں چست کرو۔

لیکن جدید جاہلیت کی طرح قدیم جاہلیت میں بھی اس فن کو بڑا فروغ حاصل رہا ہے، اس زمانے میں جس طرح اخباروں میں مزاحیہ کالم بھی ہوتے ہیں اور کارٹون بھی چھپتے ہیں جو اشاروں کی زبان میں حریفوں کی تضحیک کرتے ہیں، اسی طرح قدیم زمانے میں نقال، بھانڈ اور فقرہ باز ہوتے تھے جو اُجرت لے کر شریفوں کی پگڑیاں اچھالتے اور اپنے سرپرستوں کا جی خوش کرتے، سورۂ قلم میں قریش کے لیڈروں اور ان غنڈوں پر قرآن نے جو جامع تبصرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی مسلمانوں کی تواصی بالحق والصبر ، کی دعوت کو اسی حربے سے شکست دینے کی کوشش کی جو حربے اس زمانے کے پیشہ ور لیڈر اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لیے اختیار کرتے ہیں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ان ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت فرمائی گئی:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ(۱۰) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ(۱۱) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ(۱۲) عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ(۱۳) اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ(۱۴)[القلم]

ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے، طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفا کار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے، اس بنا پر کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے۔

﴿الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ﴾ جو مال جمع کرتا اور اُس کو گن گن کو رکھتا ہے۔

الَّذِیْ جس نے، اسم موصول، جَمَعَ جمع کیا، ماضی واحد مذکر غائب (جَمَعَ یَجْمَعُ جَمْعًا) جمع کرنا، اجتماع، جہاں لوگ جمع ہوں، اردو میں جانے پہچانے الفاظ ہیں، مَالًا مال و دولت، وَ اور، عَدَّدَهٗ (عَدَّدَ. هٗ) گن گن کر رکھا۔ اسے، 'هٗ' کی ضمیر مال کی طرف جاتی ہے (عَدَّدَ. یُعَدِّدُ) گننا، شمار کرنا، عدد، معدود، تعداد۔ یہ الفاظ اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

'الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ' یعنی حقوق کی یاددہانی اور نصیحت کرنے والوں کو تو انہوں نے ھمز و لمز کے حربے سے چپ کرانے کی کوشش کی اور خود مال جمع کرنے اور اس کو گن گن کر سینتے میں لگے رہے، مال کے حریص و بخیل مالداروں کی یہ نہایت جامع تصویر ہے، ان کا دل و دماغ ہمیشہ اپنے سرمایہ کے حساب کتاب میں لگا رہتا ہے، کس کاروبار میں کتنا منافع ہوا؟ فلاں سرمائے سے پرافٹ کی کتنی توقع ہے؟ فلاں خسارہ جو ہوا ہے، اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ اگلے سال تک سرمایہ کی مجموعی مقدار کہاں تک پہنچ جائے گی؟ اس طرح کے سوال ہمیشہ ان کے دل و دماغ کو گھیرے رہتے ہیں۔ اگر کسی نے ذکر کیا کہ فلاں نے غریبوں اور یتیموں کی امداد کے لیے اتنا خرچ کیا ہے تو اس پر پھبتی چست کر دی کہ شیخی باز ہے، اپنی دولت مندی کی دھونس جماتا ہے، آخر ہم بھی تو ڈھیروں مال لٹاتے ہیں لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔'' (تدبر قرآن)

﴿یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ﴾

وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشگی کی زندگی دے دے گا۔

یَحْسَبُ وہ خیال کرتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (حَسِبَ، یَحْسَبُ، حِسْبَانًا) خیال کرنا، گمان کرنا، اَنَّ مَالَهٗ یہ کہ اس کا مال 'هٗ' کی ضمیر اس حریص شخص کی طرف جاتی ہے جو مال کا پجاری بنا بیٹھا ہے، اَخْلَدَهٗ (اَخْلَدَ. هٗ) ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ اسے (یعنی اس حریص شخص کو) اَخْلَدَ، یُخْلِدُ، دوام عطا کرنا، حیات ابدی بخشنا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوداں بخش دے گا یعنی دولت جمع کرنے اور اسے گن گن کر رکھنے میں وہ ایسا منہمک ہے کہ اسے اپنی موت یاد نہیں رہی ہے اور اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ایک وقت اس کو یہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو جانا پڑے گا۔'' (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ، وَ مَآ اَدْرٰيكَ مَا الْحُطَمَةُ﴾

ہرگز نہیں وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ (حطمۃ) میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟

كَلَّا ہرگز نہیں، یعنی ایسی کوئی بات نہیں جیسا کہ یہ (حریص شخص) خیال کرتا ہے، (طبری) لَيُنبَذَنَّ (لَ. يُنبَذَنَّ) وہ ضرور بضرور ڈال دیا جائے گا، مضارع مجہول واحد مذکر غائب، (نَبَذَ، يَنبِذُ، نَبْذًا) کسی چیز کی پروانہ کرتے ہوئے اسے پھینک دینا، ''لام'' تاکیدی معنی دے رہا ہے اور ''ن ثقیلہ'' مزید تاکید پیدا کر رہا ہے، فِي الْحُطَمَةِ، بیچ حطمہ (کے)۔

امام طبریؒ لکھتے ہیں:

''قیامت کے روز اسے ''حطمہ'' میں ڈالا جائے گا جو دوزخ کے ناموں میں سے نام ہے جیسا کہ جہنم اور سقر اس کے نام ہیں اور حطمہ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جو چیز بھی اس میں ڈالی جائے گی وہ چکنا چور ہو جائے گی۔'' (تفسیر طبری)

وَ مَآ اَدْرٰيكَ اور تم کیا جانو، وَ اور عاطفہ، مَا کیا، استفہامیہ (اَدرٰی، یُدرِی) باخبر کرنا، علم میں لانا اور (دَرَىٰ، يَدْرِى) خود جاننا، درایت اردو میں عقل اور سمجھ کے معنوں میں آتا ہے، مَا الْحُطَمَةُ (کہ) حطمہ کیا ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''یہ اس (حطمہ) کی شدت اور ہولناکی کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ اتنی شدید آگ کی حقیقت کون جانے؟ یہ حطمہ تو ہڈیوں کو چکنا چور کر دے اور گوشت پوست کو بھسم کر ڈالے اور آناً فاناً دلوں تک پہنچ جائے۔'' (صفوۃ التفاسیر) پھر قرآن اسی بات کی تفصیل آگے بیان کرتا ہے:

﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ، الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ﴾

اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی، جو دلوں تک پہنچے گی۔

نَارُ اللّٰهِ آگ ہے اللہ کی، نَار مضاف، اللّٰه مضاف الیہ، الْمُوْقَدَةُ، خوب بھڑکائی ہوئی، اسم مفعول (وَقَدَ، يَقِدُ، وَقْدًا، وُقُوْدًا) آگ جلنا، أَوْقَدَ النَّارَ آگ جلانا، اَلْوُقُود۔ ایندھن (القاموس الوحید) الَّتِيْ جو، اسم موصول، تَطَّلِعُ جا پہنچے (گی) مضارع واحد مؤنث غائب (اِطَّلَعَ، يَطَّلِعُ) پہنچنا، اطلاع، خبر اردو میں استعمال ہوتا ہے یعنی یہ آگ دلوں تک پہنچے گی کہ اسے اللہ تعالیٰ قدرت والے نے حکم دیا ہوگا، عَلَى الْاَفْئِدَة اوپر، دلوں (کے) فُؤاد، دل اس کا مفرد ہے۔

﴿اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ، فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾

وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے)۔

اِنَّهَا (اِنّ.هَا) بلاشبہ۔ وہ هَا کی ضمیر واحد مؤنث غائب آگ کی طرف جاتی ہے، عَلَيْهِمْ (عَلَىٰ.هِمْ) اوپر۔ ان کے، هم کی ضمیر جمع مذکر غائب مجرموں کی طرف جاتی ہے، مُّؤْصَدَةٌ بند کردی جائے گی، اسم مفعول (وَصَدَ، يَصِدُ) بند کرنا، وَصَدَ الباب دروازہ بند کرنا، راستہ روکنا جیسا کہ اصحاب غار سے متعلق حدیث میں آتا ہے "فَوَقَعَ الْجَبَلُ عَلٰى بَابِ الْكَهْفِ فَاوصَدَهٗ" پہاڑ کا کچھ حصہ غار کے دروازہ پر گرا اور اس کا راستہ بند کر دیا (القاموس الوحید) فِيْ عَمَدٍ بیچ ستونوں کے، اس کا مفرد عِمَادٌ آتا ہے، جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے "الصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْن" نماز دین کا ستون ہے، مُّمَدَّدَةٍ لمبے لمبے (طول طویل) (مَدَّ. يَمُدُّ) پھیلانا، کھینچ کر بڑھانا، زیادہ کرنا، مَمْدُوْدٌ پھیلا ہوا، مُمَدَّدٌ بہت وسیع عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ، بہت بلند و بالا ستون۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ پھر وہ آگ ان ظالموں پر بند کر دی جائے گی۔ ہماری اس دنیا میں بھی یہی ہوتا ہے کہ آگ جب کھلی رہتی ہے تو اس کی تپش اور گرمی ہر طرف جاتی ہے اور تقسیم ہو جاتی ہے لیکن اگر کسی

طریقے سے اسے بند کر دیا جائے تو اس بند دائرہ میں اس کی تپش اور گرمی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، بھٹے میں آگ کو بند کر کے جس طرح اینٹیں پکائی جاتی ہیں اور ہمارے گھروں میں جو کُکر میں کھانا پکایا جاتا ہے اس کا فلسفہ یہی ہے تو دوزخ کی آگ جب دوزخیوں پر بند کردی جائے گی تو اس کے جلانے کی صلاحیت صرف انہی پر صرف ہوگی اَللّٰھُمَّ احْفِظْنَا! اللّٰھُمَّ احْفِظْنَا!"فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ" کے میرے نزدیک راجح اور آسان معنی یہ ہیں کہ جہنمی جکڑے ہوئے ہوں گے لمبے لمبے ستونوں میں۔(درس قرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) جب دھن دولت جمع کرنا ہی زندگی کا مقصد بن جائے تو انسان حرص وطمع کے ساتھ ساتھ تکبر وغرور کا شکار بھی ہو جاتا ہے، پھر یہ کم ظرف یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب میرے برابر کا کوئی نہیں، وہ اپنے سے کم حیثیت والوں کو ذلیل سمجھنے لگتا ہے، غربا ومساکین کو خاطر میں نہیں لاتا ہے، ان میں عیب نکالتا اور ان پر پھبتیاں کستا ہے، اشاروں کنایوں سے ذلیل کرتا ہے، اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے کوئی حبّہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے، اسی پر بس نہیں کرتا، وہ کمزوروں اور بے بسوں پر ظلم اور زیادتی کرنے پر اتر آتا ہے اور اس سرکشی میں نت نئے حربے استعمال میں لاتا ہے۔

۲) اس بات کا تعلق صرف دورِ جاہلیت سے ہی نہیں ہے بلکہ یہ مرض ہر دور اور ہر زمانے میں رہا ہے اور دورِ حاضر نے تو ماضی کو بھی مات کر دیا ہے، ذرا غور کیجیے کہ امریکہ اور ان کے ساتھیوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں؟ اس کا مشاہدہ ہر عاقل بالغ شہری اور دیہاتی کر سکتا ہے۔

۳) صرف دینِ اسلام ہی وہ صاف ستھرا طریقِ حیات ہے جو اعتدال اور سلامتی کی راہ پر چلاتا ہے، وہ دولت کو جمع کرنے کی نہیں، خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، وہ غربا ومساکین کی تحقیر نہیں تکریم کا سبق سکھاتا ہے، وہ نسلِ انسانیت کے حقوق کی نگہبانی کا درس دیتا ہے، اس طرح دنیا کو آخرت کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اور آخرت میں ہر بات کی جوابدہی کے لیے تیار کرتا ہے۔

۴) زر پرستوں کے سامنے صرف دنیا ہی دنیا ہے، یہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس کے لیے وہ ہر جتن اور کوشش کرتے ہیں، اور ہر ظلم وجور کو روا رکھتے ہیں۔ یہ لوگ آخرت میں اپنے انجام کو پالیں گے۔

.................o.................

سُورَةُ الْـفِيل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے مبارک سال میں یمن کے متعصب عیسائی حکمران ابرہہ نے چاہا کہ کسی طرح لوگوں کی عقیدت ومحبت خانۂ کعبہ سے ختم ہوجائے اور وہ زیارت وحج کے لیے وہاں جانے کے بجائے یمن کے دارالحکومت صنعا میں آیا کریں، اس غرض سے اس نے وہاں ایک شاندار فلک بوس گرجا گھر کی عمارت تعمیر کروائی، اسے سونے چاندی اور عجیب وغریب ہیرے جواہرات سے مرصع کروایا اور دور دور تک اعلان کروا دیا کہ لوگ حج کے موسم میں بیت اللہ کا رخ کرنے کے بجائے صنعا میں گرجا گھر کی زیارت کو آئیں۔ اہل عرب میں اگرچہ بت پرستی غالب آچکی تھی مگر دین ابراہیم اور کعبہ کی عظمت ومحبت ان کے دلوں میں رچی بسی تھی، یہ اعلان سن کران میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی، اور کسی شخص نے راہ پاکر اس گرجا گھر میں غلاظت پھینک دی۔ جب ابرہہ کو اس بات کی اطلاع ملی تو وہ بڑا لال پیلا ہوا، ادھر شیطان نے اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ لوگوں کا تعلق بیت اللہ سے ختم کرنے کے لیے (نعوذُ باللہ) کعبہ کو نیست ونابود کرنا ضروری ہوگا۔ ابرہہ کی حکومت حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے ماتحت تھی، اس نے خانہ کعبہ پر حملے کا ارادہ کرلیا اور اسی فوجی مہم کے سلسلے میں حبشہ کی حکومت سے مدد طلب کی تو اسے بطور خاص ہاتھیوں کا ایک دستہ بھیجا گیا۔

ابرہہ کوئی ساٹھ ہزار کا لشکر جرار لے کر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا جس کا ہراول دستہ ہاتھیوں پر مشتمل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قریش مکہ اس پُرشکوہ لشکر کو دیکھتے ہی شہر خالی کردیں گے اور وہ آسانی سے خانہ کعبہ کو توڑ پھوڑ ڈالے گا، شہر سے کوئی دو چار میل کے فاصلے پر اس نے پڑاؤ ڈالا، وہاں اونٹوں کی چراگاہ تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّ امجد عبدالمطلب کے دوسو اونٹ چر رہے

تھےاس نے ان پر قبضہ کرلیا اور ایک سفیر کے ذریعے قریش مکہ کو پیغام بھیجا کہ ''میرا مقصد تم سے جنگ کرنا نہیں بلکہ صرف کعبہ کو ڈھانا ہے، لہٰذا تمہارا بھلا اسی بات میں ہے کہ شہر خالی کر دو۔'' رئیس شہر عبدالمطلب نے جب یہ بات سنی تو جواب میں کہا، ''یہ اللہ کا گھر ہے جسے اس کے خلیل ابراہیم نے تعمیر کیا تھا، اسے ڈھانے کی کوشش کرنا اللہ سے لڑائی مول لینا ہے، اس لیے تمہارے حاکم کو ہمارا نیک مشورہ یہی ہے کہ اپنے ارادے سے باز رہے اور واپس چلا جائے تاہم وہ سفیر عبدالمطلب کو اپنے ساتھ ابرہہ کے پاس لایا اور ابرہہ نے وہی بات دہرائی جو سفیر نے عبدالمطلب سے کہی تھی اور عبدالمطلب نے ایسا جواب دیا جو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور جسے تاریخ نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا۔ ''اِنِّیْ اَنَا رَبُّ الْاِبِلِ وَ اِنَّ لِلْبَیْتِ رَبًّا سَیَمْنَعُہٗ'' میری ملکیت کی چیز تو بس میرے یہ اونٹ ہیں (اس لیے میں نے ان ہی کے بارے میں تم سے مطالبہ کیا) رہا کعبہ تو اس کا جو مالک ہے وہ خود ہی اس کی حفاظت کرے گا۔

اس کے بعد ابرہہ نے لشکر کو مکہ کی طرف بڑھنے کا حکم دے دیا، ادھر وہ بیت اللہ کی طرف بڑھنے لگا اُدھر اللہ کا حکم بھی آ گیا، پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں میں نوکدار کنکریاں لیے ہوئے آئے اور اس لشکر پر برسانے لگے، جس کسی کو یہ کنکر لگ جاتا، اس کے لیے موت کا سامان ثابت ہوتا، ان پرندوں کی ایسی یلغار تھی کہ آناً فاناً وہ تمام کا تمام لشکر بھوسے بلکہ کھائے ہوئے بھوسے کی طرح ہو گیا، اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور قوت کا پتہ دینے لگا۔

سُورَةُ الْـفِيُل

آیات:۹ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ(۱) اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِیۡ تَضۡلِيۡلٍ(۲) وَّ اَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ(۳) تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ(۴) فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ(۵)﴾

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور اس نے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیجے جو ان پر (نوکدار) کنکریاں برساتے تھے، پھر اللہ نے انہیں کھائے ہوئے بھس کی مانند بنا دیا

﴿اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ﴾

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟

اَلَمۡ کیا نہیں، اَ کیا، ہمزۂ استفہام، لَمۡ نہیں، حرف نفی و جزم، تَرَ دیکھا آپ نے، فعل مضارع واحد مذکر حاضر (رَاٰی، یَرٰی، رُؤیَةً) دیکھنا، کَیۡفَ کیسے، اسم استفہام، فَعَلَ سلوک کیا، ماضی واحد مذکر غائب (فَعَلَ، یَفۡعَلُ، فِعۡلًا) سلوک کرنا، معاملہ کرنا، رَبُّکَ (رَبُّ. کَ) رب، آپ کے (نے) 'ک' ضمیر واحد مذکر مخاطب، بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ہاتھی والوں کے ساتھ، 'ب' حرف جار، اَصۡحَابٌ کا مفرد صَاحِبٌ ہے، فِیۡل، ہاتھی۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر اصل مخاطب نہ صرف قریش بلکہ عرب کے عام لوگ ہیں جو اس سارے قصے سے خوب واقف تھے، قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اَلَمْ تر (کیا تو نے نہیں دیکھا) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اس سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ عام لوگوں کو مخاطب کرنا ہے (مثال کے طور پر آیات ملاحظہ ہوں، ابراہیم آیت:۱۹، الحج آیت: ۱۸، ۶۵، النور آیت: ۴۳، لقمان، آیت ۲۹، ۳۱، فاطر آیت: ۲۷، الزمر آیت ۱۲) پھر (تر) دیکھنے کا لفظ اس مقام پر اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ مکہ اور اطراف مکہ اور عرب کے ایک وسیع علاقے میں مکہ سے یمن تک ایسے بہت سے لوگ اس وقت زندہ موجود تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اصحاب الفیل (ہاتھی والوں) کی تباہی کا واقعہ دیکھا تھا، کیونکہ اس واقعہ کو گزرے ہوئے چالیس پینتالیس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہوا تھا اور سارا عرب ہی اس کی ایسی متواتر خبریں دیکھنے والوں سے سن چکا تھا کہ یہ واقعہ لوگوں کے لیے آنکھوں دیکھے واقعہ کی طرح یقینی تھا نیز یہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی تفصیل اس امر کی بیان نہیں کی کہ یہ ہاتھی والے کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کس غرض کے لیے آئے تھے، یہ باتیں سب کو معلوم تھیں۔“ (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ﴾ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟

اَ کیا، کلمہ استفہام، لَمْ نہیں، حرف نفی و جزم (بعد والے حرف کو جزم دیتا ہے)، یَجْعَلُ بنایا (جَعَلَ، یَجْعَلُ، جَعْلًا) بنانا، کَیْدَهُمْ (کَیْدَ. هُمْ) مکر، ان کا، هُمْ کی ضمیر جمع مذکر غائب 'اَصْحَابُ الْفِيْل' کی طرف جاتی ہے، فِيْ تَضْلِيْلٍ رائیگاں، برباد۔

محمد جمال الدین القاسمی لکھتے ہیں:

”(ابرہہ اور اس کا لشکر) جو خانہ کعبہ کی تخریب کاری کے لیے نکلا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے بری طرح ناکام و نامراد بنا دیا۔“ (تفسیر القاسمی)

﴿وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ اور اس نے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیجے۔

وَّ اَرْسَلَ اور بھیجے، ماضی واحد مذکر غائب (اَرْسَلَ، یُرْسِلُ، اِرْسَالًا) بھیجنا، ارسال کرنا اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، عَلَیْهِمْ (عَلٰی. هِمْ) اوپر، ان کے هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب 'اصحاب الفیل' کی طرف جاتی ہے، طَیْرًا پرندے، اَبَابِیْلَ غول کے غول، جھنڈ کے جھنڈ، یہ لفظ کثرت بتانے کے لیے آتا ہے اور جمع استعمال ہوتا ہے، اس کا مفرد نہیں آتا۔ (القاموس الوحید)

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا لشکر پرندوں میں سے مسلط کر دیا جو جھنڈ کے جھنڈ ان پر آتے اور پے در پے انہیں ہر طرف سے گھیر لیتے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ﴾ جو ان پر (نوکدار) کنکریاں برساتے تھے۔

تَرْمِیْهِمْ (وہ پرندے) پھینکتے تھے ان پر، مارتے تھے ان پر فعل مضارع (رَمٰی، یَرْمِیْ، رَمَاءً) پھینکنا، مارنا، هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب اصحاب الفیل کی طرف جاتی ہے، بِحِجَارَةٍ (بِ. حِجَارَةٍ) ساتھ، پتھروں (کے)، مِنْ سِجِّیْلٍ نوکیلے، السِّجِّیْلِ، کنکر، سخت مٹی۔ (القاموس الوحید)

﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ﴾ پس اللہ نے انہیں کھائے ہوئے بھس کی مانند بنا دیا۔

فَجَعَلَهُمْ (فَ. جَعَلَ. هُمْ) پس، کر دیا، انہیں، ف عاطفہ، سلسلہ کلام کے لیے، جَعَلَ، بنایا، کر دیا فعل ماضی واحد مذکر غائب (جَعَلَ، یَجْعَلُ، جَعْلًا) بنانا، کرنا، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب اصحاب الفیل کی طرف جاتی ہے، كَعَصْفٍ (كَ. عَصْفٍ) مانند، بھوسے (کے)، اناج کے پودوں کی سوکھی پتیاں جن کے دانے مویشی چر گئے ہوں یا انسان نے نکال لیے ہوں، مَّأْكُوْلٍ کھائے ہوئے، اسم مفعول (اَكَلَ، یَأْكُلُ، اَكْلًا) کھانا، مأکولات، کھانے کی چیزیں۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

عَصْفٌ کے معنی ہیں درختوں کے خشک پتے، اس کی صفت مأکولٌ بیان کی گئی ہے جس کے معنی ہیں کھایا ہوا، ریزہ ریزہ، حشرات الارض ان خشک پتوں کو کھا کر ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں یا حیوانات انہیں

کھاتے ہیں تو چبا کے باریک کر دیتے ہیں۔ یہ جھنڈ کے جھنڈ پرندوں کے برسائے ہوئے پتھروں کے اثر سے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی حسی تصویر ہے۔(فی ظلال القرآن)

یہ چھوٹی سی سورۃ مبارکہ اپنے اندر حقائق و معارف کا بحر بے کراں لیے ہوئے ہے۔ سید قطب شہید نے اس کے ذیل میں بڑی معرفت کی باتیں پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) پہلی بات جو واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہ چاہا کہ اپنے گھر کی حفاظت کے معاملے کو کلیۃً مشرکین کے حوالے کر دے اگرچہ وہ اس گھر کے ذریعہ عزت و افتخار پاتے، اس کی حفاظت کرتے اور اس کے باعث حفظ و امان پاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جب چاہا کہ اپنے گھر کی حفاظت کرے اور اس کے لیے اپنی حمایت و غیرت کو علی الاعلان ظاہر کرے تو اس نے مشرکین کو تو حملہ آور قوت کے سامنے شکست خوردہ حالت میں بے یارو مددگار چھوڑ دیا اور پھر قدرت الٰہی نے کھلم کھلا اس معاملہ میں مداخلت کی تاکہ وہ خود اپنے مقدس و محترم گھر کی حفاظت کرے، مشرکین کا اس سلسلے میں کوئی ہاتھ نہ ہو اور حمیتِ جاہلیت کے ساتھ اس گھر کی حفاظت ان کا کوئی کارنامہ قرار نہ پا سکے......اس پہلو کو سامنے رکھیے تو یہ بات قوی، راجح اور قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ حملہ آوروں کی ہلاکت معروف سنت الٰہی کے تحت نہیں خارقِ عادت طریقہ پر ہوئی۔ (یعنی معجزانہ اور حیرت انگیز طریق سے ہوئی)

۲) اللہ کے محترم گھر کی حفاظت کے سلسلے میں قدرتِ الٰہی کی اس کھلی مداخلت کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد قریش اور عرب کے لوگ اللہ کے دین کو قبول کرنے میں پیش قدمی اور ایک دوسرے سے سبقت کرتے اور خانہ کعبہ کی تولیت، اس پر ان کی مفاخرت اور بت پرستی کا نظام جو انہوں نے خانہ کعبہ کے گرد قائم کر رکھا تھا، یہ چیزیں ان کے اسلام لانے میں مانع نہ ہوتیں۔ اس واقعہ کی اس انداز میں یاد دہانی دراصل ان پر شدید تنقید ہے اور ان کے مخالفانہ رویہ پر تعجب و حیرت کا اظہار بھی!

۳) اس واقعہ سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب......ابرہہ اور اس کے لشکر کو

موقع نہیں دیا کہ وہ اس کے محترم گھر کو منہدم کر دیں یا اس مقدس سرزمین پر قبضہ جمالیں حالانکہ شرک اس گھر کو ناپاک کر رہا تھا اور مشرکین اس کے متولی ومجاور بنے ہوئے تھے، یہ اِس لیے کہ یہ گھر اربابِ اقتدار کے تسلط سے آزاد اور سازشیں کرنے والوں کے کید ومکر سے محفوظ رہے اور اس سر زمین کی آزادی برقرار رہے اور ایک نیا عقیدہ پوری آزادی کے ساتھ اس میں پروان چڑھ سکے جس پر نہ کسی فرمانروا کا کنٹرول ہو اور نہ اس کے خلاف کسی جابر ومستبد کا جبر واستبداد! اور کوئی اقتدار اس دین پر کنٹرول نہ کر سکے جو تمام ادیان اور پوری نوع انسانی پر کنٹرول کرنے آیا تھا...... جو اس لیے آیا تھا کہ نوع انسانی کی قیادت کرے، نہ اس لیے کہ کوئی اس کا قائد ورہنما بنے، اللہ نے اپنے گھر اور اپنے دین کے لیے یہ انتظام کیا قبل اس کے کسی کے علم میں یہ بات آئے کہ اس دین کا نبی اس سال پیدا ہوا ہے۔

۴) اصحاب الفیل کے واقعہ سے واضح ہونے والی اس حقیقت کے پیش نظر آج ہم مقدس مقامات کے سلسلے میں عالمی صلیبی اور عالمی صہیونی طاقتوں کے حرص وطمع اور مکر وفریب کی ناپاک تدبیروں کے جنہیں ہم بخوبی جانتے ہیں...... علی الرغم محسوس کرتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ وہ اپنی ناپاک حرص و آز کی تکمیل کے لیے مخفی اور کمینہ تدابیر اختیار کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے، مگر جس رب نے اپنے گھر کو اہل کتاب کے تسلط سے اس وقت بچایا جبکہ اس کے متولی ومجاور مشرکین تھے، وہ ان شاء اللہ اب بھی اس گھر کی اور اپنے رسول کے شہر مدینہ کی حفاظت فرمائے گا اور سازشیں کرنے والوں کی سازشوں اور کید ومکر کرنے والوں کے کید ومکر کو ناکام بنا دے گا۔

۵) یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اہل عرب کا زمین میں کوئی کردار اور اسلام سے پہلے ان کا کوئی قابل ذکر وجود نہ تھا، وہ یمن، ایران یا حبشہ کے زیرنگین تھے، یہاں ان کی حکومت کبھی قائم ہوتی تو ایران کی زیرحمایت اور سرپرستی میں قائم ہوتی، شمال میں شام براہ راست رومی حکومت کے تحت تھا یا وہاں کبھی عربی حکومت وجود میں آتی تو وہ صرف رومی اقتدار کے تحت، اجنبی اقتدار کے تسلط سے جزیرۃ العرب کا صرف درمیانی حصہ بچا ہوا تھا لیکن وہ بدویت اور شدید انتشار وافتراق کی حالت میں تھا اور عالمی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی، عرب قبائل میں چالیس

چالیس برس تک جنگیں برپا رہتی تھیں مگر وہ پڑوسی طاقتور حکومتوں کی نظر میں کوئی وزن نہ رکھتے تھے۔ عام الفیل میں ان کی بے چارگی اور ناطاقتی کا جو مظاہرہ ہوا وہ کسی اجنبی طاقت کے حملہ کی صورت میں ان کی قوت کو جاننے کا صحیح پیمانہ تھا۔

٦) عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عربوں کو اسلام کے جھنڈے کے نیچے ایک عالمی کردار ادا کرنے کا موقع ملا، انہیں ایسی قوت حاصل ہوئی جس کا وزن محسوس کیا جانے لگا...... اس قوت کے سیلاب میں ملک کے ملک بہہ گئے اور حکومتوں کے تخت الٹ گئے، انہوں نے جاہلیت کی جھوٹی اور گمراہ کن قیادتوں کو میدان سے ہٹا کر نوع انسانی کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اہل عرب کو تاریخ میں پہلی بار یہ موقع اس لیے ملا کہ وہ بھول گئے تھے کہ وہ عرب ہیں، وہ قومیت کے نعرے اور نسلی عصبیت کو فراموش کر چکے تھے، انہیں صرف یہ یاد رہا تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور صرف مسلمان، انہوں نے اسلام کا اور صرف اسلام کا جھنڈا بلند کیا تھا، وہ ایک عظیم اور طاقتور عقیدے کے حامل تھے۔ نوع انسانی کے سامنے اسے ان کے لیے رحمت اور اللہ کے عظیم احسان کی صورت میں پیش کر رہے تھے، وہ قومیت، وطنیت اور نسلی وقومی برتری وعصبیت کے حامل نہ تھے، وہ ایک آسمانی فکر کے علمبردار تھے جس کے علم کو وہ لوگوں میں عام کر رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی زمینی مسلک ومذہب نہ تھا جس کے آگے وہ لوگوں کی گردنیں جھکاتے ہوں، وہ صرف جہاد فی سبیل اللہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنے ملک سے نکلے، وہ اس لیے نہیں نکلے کہ عربوں کی بادشاہت کو زمین پر قائم کریں اور اس کے سائے میں عیش وتنعم کی زندگی گزاریں اور اس کے سہارے دنیا میں اپنی بڑائی کا بول بالا کریں اور اپنی ناک اونچی رکھیں اور انسانوں کو رومی وایرانی اقتدار کے شکنجہ سے نکال کر اہل عرب کے اقتدار کو ان پر مسلط کر دیں، نہیں نہیں، وہ صرف اس لیے اٹھے تھے کہ انسانوں کو تمام بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہ کی بندگی کے دائرے میں لے آئیں جیسا کہ مسلمانوں کے قاصد ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے یزدگرد...... شاہ ایران، کے دربار میں واضح کیا تھا۔

”اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم انسانوں کو بندوں کی بندگی وغلامی سے نکال کر اللہ واحد کی بندگی وغلامی اور دنیا کے تنگ دائرے سے نکال کر آخرت کی وسیع ترین زندگی اور مختلف مذاہب و

مسالک کے ظلم وجور سے نجات دلا کر اسلام کے عدل وانصاف کے دائرے میں لے آئیں۔"

۷) اس زمانے میں اہل عرب کا وجود تھا، وہ ایک قوت تھے، اہل عالم کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی، لیکن یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تھا اور اس کی راہ میں تھا، یہی اُن کی قوت تھی اور جب تک وہ اس راہ راست پر پوری طرح ثابت قدم رہے، وہ دنیا کے قائد بنے رہے، لیکن جب وہ اس راستے سے بھٹک گئے، انہیں اپنی نسلی قومیت اور قومی عصبیت یاد آ گئی اور نسلی وقومی برتری کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے انہوں نے اللہ کے جھنڈے کو چھوڑ دیا، تو زمین نے انہیں اٹھا کر پھینک دیا اور قوموں نے انہیں پیروں تلے روند ڈالا، انہوں نے اللہ کو چھوڑا تو اللہ نے انہیں چھوڑ دیا، انہوں نے اللہ کو فراموش کیا تو اللہ نے انہیں فراموش کر دیا۔

عرب اسلام کے بغیر کیا ہیں؟ اسلامی فکر سے خالی ہو جانے پر انہوں نے نوع انسانی کے سامنے کونسا فکر پیش کیا یا کر سکتے ہیں؟ اس قوم کی کوئی قدر و قیمت نہیں جو نوع انسانی کو کوئی فکر اور کوئی نظریۂ حیات نہ دے سکے، تاریخ کے کسی بھی دور میں جس قوم نے نوع انسانی کی قیادت کی وہ کسی نہ کسی نظریۂ حیات کی ضرور نمائندگی کرتی تھی، جو قومیں کسی فکر اور کسی نظریہ حیات کی نمائندہ وعلم بردار نہ تھیں مثلاً تاتاری جنہوں نے مشرق روند ڈالا یا بربری قوم جس نے مغرب میں رومی سلطنت کا صفایا کر دیا، وہ طویل زندگی نہ پا سکیں اور جن قوموں کو فتح کیا تھا انہیں میں جذب ہو گئیں...... اہل عرب جس واحد عقیدے کو نوع انسانی کے سامنے پیش کرتے تھے وہ اسلامی عقیدہ ہی تھا۔ اسی عقیدے نے انہیں وہ رفعت وسر بلندی بخشی کہ وہ دنیا کے قائد وامام بن گئے، اسی سے دور ہو جانے کے بعد نہ ان کا زمین میں کوئی کام ہے اور نہ انسانی تاریخ میں کوئی رول...... یہ وہ اہم حقیقت ہے جسے اہل عرب کو اچھی طرح یاد کرنا اور یاد رکھنا ضروری ہے اگر وہ زندگی، قوت اور عالمی قیادت کے طلبگار ہوں...... اللہ ہی گمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف لانے والا ہے۔" [فی ظلال القرآن]

اب بھی اگر عالم اسلام کے مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اپنی عسکری قوت کو مضبوط اور توانا بنالیں تو اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایمان اور عمل کو اپنا زادِ راہ بنائیں۔

..................o..................

سُورَۃُ الْقُرَیْش

مکہ مکرمہ میں قبیلہ قریش کو ہر طرح سے سیادت وقیادت حاصل تھی، وہ بیت اللہ کے خادم تھے اور ایام حج میں زیارت کرنے والوں کے قیام وطعام کا انتظام وانصرام کرتے تھے جس سے انہیں بہت مالی فوائد حاصل ہوتے تھے۔اسی طرح تجارت پر بھی زیادہ تر اسی قبیلے کے لوگ چھائے ہوئے تھے، ان کے تجارتی قافلے بغیر روک ٹوک اور بلاخوف وخطر موسم سرما میں یمن اور حبشہ کی طرف جبکہ موسم گرما میں شام اور فلسطین کا سفر کرتے تھے، سرما کا سفر گرم علاقوں کی طرف ہوتا جبکہ گرما کا سفر خوشگوار اور معتدل علاقوں کی طرف ہوتا تھا۔ جو راحت وآرام سے اور بخیر وخوبی طے پاتا اور ان تجارتی راستوں میں بسنے والے لوگ، حرم کے خدام ہونے کے سبب انہیں کچھ نہیں کہتے تھے بلکہ ان کی خاطر مدارات ہوتی تھیں اور انہیں یہ ساری سہولتیں اور مراعات حرم میں بسنے کی وجہ سے ملی تھیں۔

قریش مکہ کو حکم ہو رہا ہے کہ جس رب نے انہیں دشمنوں سے محفوظ رکھا، بیت اللہ کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنایا اور ان کی معاش کا بہتر بندوبست فرمایا انہیں بھی چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کی بندگی بجا لائیں، شرک اور بت پرستی کو چھوڑ کر اس کے مطیع اور فرمانبردار بندے بن جائیں اور خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس پیغام حق کو لے کر تشریف لائے ہیں اسے دل وجان سے تسلیم کریں۔

''سورۃ قریش'' سابقہ سورت ''الفیل'' کا گویا ضمیمہ اور تتمہ ہے، سابق سورت میں اہل مکہ اور خاص طور پر قریش پر ہونے والے رب عظیم کے احسان اور اس کی قدرت کا تذکرہ تھا کہ کس طرح اس نے ابرہہ کے ہاتھیوں والے لشکر کو چڑیوں کے جھنڈ بھیج کر تباہ وبرباد کر ڈالا اور انہیں امن وسلامتی سے بہرہ ور کیا۔

سُوْرَةُ الْقُرَیْش

آیات:۴ رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (۱) اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ (۲)
فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ (۳) الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ
جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۴)﴾

قریش (مکہ) عادی ہوئے اورانہیں جاڑے اور گرمی کے سفر کا عادی ہونا (رب کریم کی رحمت سے میسر ہوا) توانہیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، جس نے ان کو بھوک میں کھانے کے لیے (رزق) دیا اور (دشمن کے) خوف سے امن بخشا۔

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ، اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ﴾

قریش (مکہ) عادی ہوئے اورانہیں جاڑے اور گرمی کے سفر کا عادی ہونا (رب کریم کی رحمت سے میسر ہوا)۔

لِاِیْلٰفِ (لِ.اِیْلٰفِ) لیے، مانوس (عادی) ہونے کے (اَلِفَ، یَألَفُ، اِلْفًا وَ اَلْفًا، وَاِلَافًا) مانوس ہونا، عادی ہونا، اَلْاُلْفَةُ محبت و اتفاق، انسیت، دوستی، تعلق اردو میں بھی جانا پہچانا لفظ ہے، (القاموس الوحید) قُرَیْشٍ قبیلۂ قریش، اِلٰفِهِمْ (اِلٰفِ.هِمْ) عادی ہونا۔ ان کا، 'ھم' ضمیر جمع مذکر غائب افرادِ قریش کی طرف جاتی ہے، رِحْلَةَ سفر (کرنا ان کا)، (رَحَلَ، یَرْحَلُ، رَحْلًا) رَحِیْلًا وَ رِحْلَةً عَنِ الْمَکَانِ کسی جگہ سے سفر کرنا، کوچ کرنا، اَلرَّاحِلَةُ، سواری اور بار برداری کا اونٹ، الشِّتَآءِ

جاڑے (سرما) کا (القاموس الوحید)، وَالصَّيْفِ اور گرما کا۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''سورۃ قریش کے مضمون اور پیغام کو سمجھنے کے لیے ایک بات تو یہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ مکہ میں اگرچہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلے بھی آباد تھے لیکن سرداری اور قیادت کا مقام قریش ہی کو حاصل تھا اور اس کی وجہ سے صورتِ حال یہ تھی کہ کسی چیز کے قبول کر لینے یا رد کر دینے کے بارے میں قریش جو رویہ اختیار کرتے، امید کی جاتی کہ دوسرے لوگ بھی وہی رویہ اختیار کریں گے، دوسری بات یہ سامنے رہنی چاہیے کہ مکہ والوں کی معاش کا زیادہ تر دارومدار تجارت پر تھا اور یہ تجارت بھی قریش ہی کے ہاتھ میں تھی، خود مکہ معظّمہ اور اس کے آس پاس کے علاقہ کا حال یہ تھا کہ نہ وہاں زراعت تھی نہ کوئی اور ایسی چیز جس سے لوگوں کی معاشی ضرورتیں پوری ہوتیں، تجارت واحد ذریعۂ معاش تھا، قریش میں جو سرمایہ دار تھے وہ تو تجارت کرتے ہی تھے لیکن جن کے پاس اپنا سرمایہ نہیں تھا وہ بھی سرمایہ والوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے تھے، پھر ان میں جو فیاض اور اہل سخاوت تھے وہ تجارتی منافع ہی کے بل پر غریبوں اور مفلسوں کی بھی مدد کرتے تھے، اس طرح قریش کی تجارت سے سب کو سہارا ملتا تھا، اس تجارت کا نظام یہ تھا کہ حجاز جس کا مرکزی شہر مکہ معظّمہ تھا اور ہے، اس کے ایک طرف شام تھا جو سرد ملک ہے اور دوسری طرف یمن جو گرم علاقہ ہے، قریش کے تجارتی قافلے گرمی کے موسم میں شام کی طرف اور سردی کے زمانہ میں یمن کی طرف جاتے اور ایک ملک کی پیداوار اور مصنوعات دوسرے ملک تک پہنچاتے اور خود حجاز کے علاقہ میں بھی فروخت کرتے۔ اس زمانے میں یہ راستے مأمون نہیں تھے، تجارتی قافلے لٹ بھی جاتے تھے۔ چونکہ ان علاقوں میں عام طور سے وہ لوگ آباد تھے جو کعبہ کی عظمت اور تقدس کا عقیدہ رکھتے تھے اور اس کو بیت اللہ مانتے تھے اور قریش کے بارے میں جانتے تھے کہ یہ اس کے خادم اور پڑوسی ہیں اور حج کے زمانہ میں دور دراز سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں اس لیے ان کے تجارتی قافلوں سے وہ تعرض نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی خاطر مدارت ہوتی تھی، پھر ان تجارتی سفروں کی وجہ سے قریش گرمی کے موسم میں مکہ معظّمہ کی سخت گرمی سے اور سردی کے موسم میں وہاں کی سردی سے محفوظ رہتے تھے، اس وجہ سے یہ دونوں سفر قریش بڑے ذوق وشوق سے کرتے تھے اور یہ ان کی معاشی ضرورت ہونے کے علاوہ ان کی

مرغوب ومحبوب تفریح بھی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ ساری نعمتیں اور سہولتیں اُن کو خانہ کعبہ ہی کے طفیل، فی الحقیقت رب کعبہ کی طرف سے حاصل ہو رہی تھیں، تو اس سورہ میں بھی ان سب باتوں کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے قریش سے فرمایا گیا ہے کہ اس کعبہ کے طفیل رب کعبہ کی طرف سے جو نوازشیں تم پر ہو رہی ہیں کہ ان تجارتی سفروں کے ذریعہ تمہارا معاشی اور غذائی مسئلہ حل ہو رہا ہے اور بھوک کے عذاب سے تم کو نجات ملی ہوئی ہے اور تمہارے قافلے امن اور اطمینان کے ساتھ چلتے ہیں، تم کو وہ خوف وخطر نہیں ہوتا جو دوسروں کو ہوتا ہے اور یہ سفر تم کو مرغوب بھی ہیں تو اس سب حق ہے کہ تم رب کعبہ ہی کی عبادت اور بندگی کرو، جس کے فضل وکرم سے تم کو یہ سب کچھ حاصل ہو رہا ہے۔" (درس قرآن)

﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ، الَّذِیْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾

تو انہیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، جس نے ان کو بھوک میں کھانے کے لیے (رزق) دیا اور (دشمن کے) خوف سے امن بخشا۔

فَلْيَعْبُدُوْا (فَ. لْ. يَعْبُدُوْا) پس، چاہیے، کہ وہ عبادت کریں، فعل امر جمع مذکر غائب، لام تاکیدی معنی دے رہا ہے (عَبَدَ، يَعْبُدُ، عِبَادَةً وَ عُبُوْدِيَّةً) اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا، عبادت کا لفظ اردو میں بھی جانا پہچانا ہے، رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ، اس گھر کے رب کی یعنی اللہ جل جلالہ کی، الَّذِیْ جس نے اسم موصول، اَطْعَمَهُمْ (اَطْعَمَ. هُمْ) کھانا دیا، ان کو اَطْعَمَ (اَطْعَمَ، يُطْعِمُ، اِطْعَامًا) کھانا کھلانا، 'هُم' کی ضمیر جمع مذکر غائب قریش کی طرف جاتی ہے، مِّنْ جُوْعٍ بھوک میں، اَلْعَطْشُ وَ الْجُوْعِ بھوک پیاس اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، وَ اٰمَنَهُمْ (اٰمَنَ. هُمْ) اور، امن دیا، ان کو اٰمَنَ واحد مذکر غائب (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) امن دینا، بے خوف کرنا، هُمْ کی ضمیر قریش کی طرف جاتی ہے مِن خَوْفٍ خوف سے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

"اس عبارت کو پھیلایا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کے علاقے کی حالت تو یہ تھی کہ وہ بھوکے مرتے لیکن اللہ نے انہیں کھانے کو دیا اور اس بھوک سے نجات دلا کر انہیں شکم سیر کیا۔" وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ

خَوۡفٍ ''یعنی ان کی ناتوانی کی جو حالت اور گردوپیش کے سماج کی جو کیفیت تھی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ خوف وخطر کی حالت میں رہتے لیکن اللہ نے انہیں خوف سے نجات بخشی اور امن وامان کی نعمت عطا کی۔

اس یاددہانی سے دلوں میں حیا پیدا ہوتی اور شرمساری ابھرتی ہے، قریش بیت اللہ کی قدر و قیمت اور اپنی زندگی میں اس کے اثرات سے نا آشنا نہ تھے، مصائب وشدائد میں وہ بتوں کی نہیں، صرف اس گھر کے رب کی پناہ لیتے تھے، دیکھو! یہ عبدالمطلب ہیں، وہ ابرہہ کا مقابلہ کسی لشکر یا قوت سے نہیں کرتے، وہ اس کے مقابلہ کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کا سہارا ڈھونڈتے ہیں جس نے اس گھر کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اس وقت وہ کسی بت کو مقابلے کے لیے میدان میں نہیں لاتے، وہ یہ نہیں کہتے کہ ''دیوتا اس گھر کی حفاظت کریں گے''۔ انہوں نے ابرہہ سے صرف یہ کہا ''میں اپنے اونٹوں کا مالک ہوں، رہا یہ گھر تو اس کا ایک 'رب' ہے، وہ ضرور اس کی حفاظت فرمائے گا، لیکن 'جاہلیت' کی کج روی کسی منطق کی قائل نہیں ہوتی، وہ حق کو تسلیم نہیں کرتی، وہ معقول بات کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتی۔'' (فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اس سورۂ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرتی زندگی کے مسائل میں دو بنیادی باتیں رزق کی فراوانی اور دشمن کے حملوں سے بے خوفی کا حاصل ہونا ہے، اس سے معاشرتی زندگی پنپتی، آگے بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے، تمام شعبہ ہائے زندگی میں ترقی ہوتی ہے مگر شرط ہے کہ وہاں کے لوگوں میں آگے بڑھنے اور محنت کا جذبہ موجود ہو۔

۲) جو لوگ ایسی فارغ البالی اور اطمینان حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے قدردان نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سے وہ نعمتیں سلب کر لی جاتی ہیں قرآن حکیم میں اس کا ذکر اس طرح آتا ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرۡيَةً كَانَتۡ اٰمِنَةً مُّطۡمَئِنَّةً يَّاۡتِيۡهَا رِزۡقُهَا رَغَدًا مِّنۡ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَالۡخَوۡفِ بِمَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ (النحل:۱۱۲) ''اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک بستی تھی جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن اور اطمینان کی نعمت نصیب تھی اور اس کے لیے رزق ہر جگہ سے وافر آجاتا تھا، پھر اس بستی والوں نے اللہ تعالیٰ کی

نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کے اس کرتوت کی بنا پر ان کو بھوک اور خوف کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔"

۳) سورۂ مبارکہ امت مسلمہ کے لیے بالخصوص اور پاکستانی معاشرے کے لیے بالعموم ایک خاص پیغام رکھتی ہے:

امت مسلمہ خصوصاً عرب ریاستوں کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ معدنی دولت سے نوازا تھا، بجائے اس کے کہ یہ دولت امت مسلمہ کی فلاح و بہبود پر صرف ہوتی اور جدید اسلحہ سے اپنے آپ کو لیس کر کے اجتماعی قوت کو مضبوط بنایا جاتا، عربوں نے اس دولت کو یا تو عیش وعشرت میں اڑا ڈالا یا پھر یورپ اور امریکہ کے بنکوں میں جمع کرا دیا، اس رقم سے دشمنوں نے فائدہ اٹھا کر اسلحہ سازی کی فیکٹریاں بنائیں اور اسے مسلمانوں پر چلایا، ہمارے شہروں اور بستیوں کو تباہ و برباد کر ڈالا، افغانستان اور عراق کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔

۴) حصول پاکستان کے لیے ان گنت جانی و مالی قربانیاں دی گئیں کہ اس خطۂ زمین میں اللہ تعالیٰ کا قانون جاری وساری ہوگا مگر حریص اور لالچی سیاست دانوں نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا اور نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود اسلام کا عادلانہ نظام یہاں جاری نہ ہوسکا اور آج ملک اخلاقی، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی لحاظ سے جہاں کھڑا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

..................o..................

سُوۡرَةُ الۡمَاعُوۡن

اس سورۃ مبارکہ میں ان لوگوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جن کی زندگیوں میں اگرچہ بظاہر کچھ مذہبی رسومات پائی جاتی تھیں مگران کا اصل کردار اللہ تعالیٰ کے خوف سے دوری اور فکر آخرت سے بے نیازی تھی، مثلاً قریش مکہ کعبہ کے متولی تھے اور سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا اسماعیلؑ سے نسبت کا دعویٰ تھا مگر اپنے فکر وعمل میں اس دین حنیف سے کہیں دور جا پڑے تھے جس کی اشاعت یہ جلیل القدر پیغمبر زندگی بھر کرتے رہے، توحید و اخلاص کی جگہ شرک اور ریا کاری نے لے لی تھی، اُن کی نماز کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے: وَمَا كَانَ صَلٰوتُهُمۡ عِنۡدَ الۡبَيۡتِ اِلَّا مُكَآءً وَ تَصۡدِيَةً (الانفال:۳۵) بیت اللہ کے نزدیک ان کی نماز کیا ہوتی ہے، بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ہیں۔

مذہبی رسوم اور عبادات کے ساتھ یہ معاملہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کے ذہن سے آخرت کا تصور نکل گیا ہو اور جسے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا کوئی ڈر نہ رہا ہو، اور جب مادی زندگی ہی اس کا مقصودِ حیات بن جائے تو اس کے دل میں غرباء و مساکین کے ساتھ ہمدردی، بیوگان اور یتامیٰ کے ساتھ حسنِ سلوک ایسے وزنی اعمال کوئی حقیقت نہیں رکھتے، وہ بندگی رب سے دور اور خدمت خلق سے محروم ہو جاتا ہے، وہ خواہشات نفس کا پجاری اور شیاطین کا ہمنوا بن جاتا ہے، دھن دولت اور خواہشات نفس سے پیار اسے تنگ دلی اور کنجوسی کی راہ پر ڈال دیتے ہیں اور یہ مرض ایسا شدید ہو جاتا ہے کہ پاس پڑوس میں کوئی معمولی معمولی چیزیں مثلاً نمک مرچ، دیا سلائی اور سوئی دھاگہ عاریتاً مانگ بیٹھے تو صاف انکار کر دیتا ہے، اسی قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور اور اس کے عذاب کا شکار ہوتے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

سُورَۃُ الْمَاعُوْن

آیات:۷ رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ(۱) فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ(۲) وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ(۳) فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ(۴) الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ(۵) الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ(۶) وَ یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ(۷)﴾

(اے نبیؐ!) کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو جزا وسزا کے دن کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا، تو خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ﴾

(اے نبیؐ!) کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو جزا وسزا کے دن کو جھٹلاتا ہے۔

اَرَءَیْتَ کیا آپ نے دیکھا، أ کیا، استفہام، رَئَیْتَ آپ نے دیکھا، ماضی واحد مذکر حاضر (رَاٰی، یَرٰی، رُؤْیَۃً) دیکھنا، الَّذِیْ جو، اسم موصول، یُکَذِّبُ جھٹلاتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (کَذَّبَ، یُکَذِّبُ، تَکْذِیْبًا) جھٹلانا، کذب بیانی [جھوٹ بولنا] اردو میں استعمال ہوتا ہے، بِالدِّیْنِ (بِ. الدِّیْنِ) روز جزا و سزا، کو۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

'اَرَءَيْتَ' ''تم نے دیکھا کا خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر قرآن کا اندازِ بیان یہ ہے کہ ایسے مواقع پر وہ عموماً ہر صاحبِ عقل اور سوچنے سمجھنے والے شخص کو مخاطب کرتا ہے اور دیکھنے کا مطلب آنکھوں سے دیکھنا بھی ہے کیونکہ آگے لوگوں کا جو حال بیان کیا گیا ہے وہ ہر دیکھنے والا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، اور اس کا مطلب جاننا، سمجھنا اور غور کرنا بھی ہے، عربی کی طرح اردو میں بھی دیکھنے کا لفظ اس دوسرے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ''میں دیکھ رہا ہوں'' اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں جانتا ہوں، یا مجھے خبر ہے یا مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ''ذرا یہ بھی تو دیکھو'' اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذرا اس بات پر بھی غور کرو، پس اگر لفظ ''اَرَايْتَ'' کو اس دوسرے معنی میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''جانتے ہو وہ کیسا شخص ہے جو سزا و جزا کو جھٹلاتا ہے؟'' یا ''تم نے غور کیا اس شخص کے حال پر جو جزائے اعمال کی تکذیب کرتا ہے؟'' (تفہیم القرآن، ج:٦)

''الدّین'' کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں آخرت کی جزائے اعمال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دین اسلام کے لیے بھی، لیکن جو مضمون آگے بیان ہوا ہے اس کے ساتھ پہلا معنی زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اگرچہ دوسرا معنی بھی سلسلۂ کلام سے غیر مطابق نہیں ہے۔ گویا کوئی شخص دین اسلام کو نہ مانے یا اسے آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کا یقین نہ ہو تو وہی بے خوفی کی زندگی گزارتا ہے اور خواہشات نفس کی پیروی کرتا ہے۔ (حوالہ ایضاً)

﴿فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ﴾ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

فَذٰلِكَ (فَ. ذٰلِكَ) پس۔ یہ وہی (شخص) ہے۔ ذٰلِكَ، اسم اشارہ بعید واحد مذکر، جب قریب کے لیے استعمال ہو تو بیان میں زور پیدا کرتا ہے، اَلَّذِىْ جو، اسم موصول، يَدُعُّ وہ دھکے دیتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (دَعَّ. يَدُعُّ. دَعًّا) بے رحمی کے ساتھ کسی کو دھکے دینا (القاموس الوحید) اَلْيَتِيْمَ، نابالغ بچہ جس کا والد فوت ہو جائے۔ (حوالہ ایضاً) اس کی جمع یتامیٰ آتی ہے۔

﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔

وَلَا يَحُضُّ اور نہیں ترغیب دیتا، وَ اور، عاطفہ، لا نہیں، نافیہ (حَضَّ، یَحُضُّ، حَضًّا) ترغیب دینا، زور دینا، اکسانا، شوق دلانا۔ (القاموس الوحید) عَلٰى طَعَامِ کھانا کھلانے پر، الْمِسْكِيْن مسکین (کو) وہ شخص جس کے پاس بال بچوں کی کفایت بھر سامانِ زیست نہ ہو، اس کی جمع مساکین آتی ہے۔ (القاموس الوحید)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''قرآن کا یہ جواب ایمان کی رسمی اور قانونی تعریف کے پیش نظر حیرت انگیز ہے مگر یہی ایمان کا مغز اور اس کی حقیقت ہے، جو شخص دین کو جھٹلاتا ہے، وہی تو یتیم کو دھکے دیتا ہے یعنی اس کو ستاتا اور اس کی بے عزتی کرتا ہے، وہی غریبوں کو کھلانے پلانے اور ان کی دیکھ بھال اور خدمت کرنے کی لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا، اگر اس نے سچ مچ دین کی تصدیق کی ہوتی اور ایمان کی حقیقت اس کے دل میں جاگزیں ہو چکی ہوتی تو وہ یتیم کو دھکے نہ دیتا اور نہ غریبوں کو کھلانے پلانے کی ترغیب و تاکید سے باز رہتا۔

دین کی تصدیق کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ زبان سے کچھ کلمات ادا کر دیے جائیں بلکہ ایمان دل کی تبدیلی کا نام ہے۔ دل کی اس تبدیلی کے نتیجے میں انسان اعمال خیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور نوع انسانی کے افراد کے ساتھ...... جو اس کے بھائی اور اس کی دیکھ بھال اور مدد اور حمایت کے مستحق ہیں...... مرحمت اور مواسات کی روش اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ انسانوں سے صرف چند کلمات ادا کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ ان کلمات کے ساتھ وہ ''اعمال'' کا بھی مطالبہ کرتا ہے جن سے ان کلمات کی تصدیق ہوتی ہو، اور نہ یہ کلمات ہوا میں اڑنے والے ذرات کی مانند ہیں، اللہ کے یہاں نہ ان کا کوئی وزن ہے اور نہ اعتبار۔''

(فی ظلال القرآن)

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ، الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ، الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ، وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ﴾

<u>تو خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی ضروریات کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔</u>

فَوَيْلٌ (فَ. وَيْلٌ) پس (تو)۔خرابی ہے (تباہی ہے)، اَلْوَيْلُ نزولِ آفت، ہلاکت، کلمۂ عذاب، بربادی اور تباہی (القاموس الوحید)، لِّلْمُصَلِّيْنَ (لِ. لْمُصَلِّيْنَ) لیے، ان نمازیوں (کے) اس کا مفرد مُصَلِّي ہے، الَّذِيْنَ جو اسم موصول، اس کا مفرد الذی ہے، هُمْ وہ، ضمیر جمع مذکر غائب، مُصَلِّيْنَ [نمازیوں] کی طرف جاتی ہے، عَنْ صَلَاتِهِمْ (عَنْ، صَلَاتِ. هِمْ) اپنی، نمازوں، سے، وہ، سَاهُوْنَ، غافل ہیں، اسم فاعل جمع مذکر (سَهَا، يَسْهُوْ، سَهْوًا) بھولنا، غافل ہونا بے خبر ہونا، سَهَا فِي الصَّلٰوة نماز میں کوئی جز بھول جانا، سہو ہونا اور سَهَا عنِ الصّلٰوةِ نماز کو چھوڑنا، غافل ہونا، (القاموس الوحید)، الَّذِيْنَ (جو) اسم موصول، هُمْ وہ، ضمیر جمع مذکر غائب، يُرَآءُوْنَ، ریاکاری کرتے ہیں، (رَاءَ، يُرَآءُ، رِيَاءً) ریاکاری کرنا، دکھاوا کرنا، الرِيّاءَ دکھاوا، نفاق، وَ يَمْنَعُوْنَ اور منع کرتے ہیں، روکتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب (مَنَعَ، يَمْنَعُ، مَنْعًا) روکنا منع کرنا، اردو میں بھی جانا پہچانا لفظ ہے، اَلْمَاعُوْنَ معمولی اشیاء جیسا کہ چمچہ، پیالہ، چھوٹے موٹے برتن۔ (القاموس الوحید)

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یہ لوگ نماز پڑھتے ہیں، نماز قائم نہیں کرتے، یہ نماز کی حرکات...... قیام، قعود، رکوع، سجود...... ادا کرتے ہیں، نماز کی دعائیں بھی پڑھتے ہیں لیکن ان کے دل ان حرکات اور دعاؤں کے ساتھ نہیں ہوتے، اُن کی روحوں کو نماز کی حقیقت اور اس میں پڑھی جانے والی قرأتوں، دعاؤں اور تسبیحوں کی حقیقتوں کا استحضار نہیں ہوتا، وہ خالصتاً اللہ کے لیے نہیں، لوگوں کے دکھاوے کے لیے نماز پڑھتے ہیں، اسی واسطے نماز ادا کرنے کے باوجود نماز سے غافل ہیں، کیونکہ وہ نماز کو قائم نہیں کررہے ہیں اور مطلوب نماز پڑھنا نہیں، نماز کو قائم کرنا ہے اور نماز کی اقامت ہو نہیں سکتی جب تک اس کی حقیقت کا استحضار نہ ہو اور نماز کی ادائیگی خالصتاً لوجہ اللہ نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اس نماز کا اثر ان نمازیوں کے...... جو نماز کی حقیقت سے غافل ہیں...... دلوں پر نہیں پڑتا، وہ اپنے انسانی بھائیوں کی مدد، ان سے حسن سلوک اور ان کے ساتھ مرحمت و مواسات سے گریز کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں بھی اللہ کے بندوں کو نہیں دیتے، اگر وہ سچ مچ نماز قائم کرتے اور اللہ کے لیے نماز ادا کرتے تو اس کے بندوں کی مدد سے دریغ نہ کرتے...... یہ ہے سچی اور عند اللہ مقبول

عبادت کی اسلامی کسوٹی!(فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) بندۂ مومن کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس کی وجہ سے اسے اپنے رب کے سامنے خفت اور شرمندگی اٹھانی پڑے۔ ''تزکیہ نفس'' اس کی زندگی کی شان ہوتی ہے، وہ زکوٰۃ وصدقات غربا ومساکین کو اللہ کی رضا اور نفس کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے۔ **اَلَّذِی یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی** (الیل:۱۸) ''وہ اپنا مال (اللہ کی راہ میں) دیتا ہے تاکہ اپنا نفس پاک کرے۔'' حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی اسے کامیابی سے ہمکنار کردیتی ہے، اس کے برعکس جب اللہ کا خوف دل میں نہ رہے اور حبّ دنیا ہی زندگی کا مقصد ٹھہرے تو دل میں سختی پیدا ہوجاتی ہے، پھر اسے غربا و یتامیٰ سے نہیں مال سے پیار ہوتا ہے، اس کا نقشہ قرآن حکیم نے اس طرح کھینچا: **اَلَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ** (الھمزہ:۲) ''اس نے مال جمع کیا اور اسے بار بار گنتا رہا۔'' یہ حرص وہوس ختم نہیں ہوتی یہاں تک کہ قبر کی مٹی ہی اس کی یہ خواہش روکتی ہے۔

اَلۡھٰکُمُ التَّکَاثُرُ، حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ (التکاثر:۱-۲) ''تم کو غفلت میں رکھا زیادہ سے زیادہ کی طلب نے یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔

۲) قرآن حکیم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اخلاق اور عظیم کردار یتامی ومساکین کی خدمت گزاری بتایا ہے: **وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسۡکِیۡنًا وَّ یَتِیۡمًا وَّاَسِیۡرًا** (الدہر:۸) ''اور (وہ) اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

جبکہ دھن دولت کو مقصد زندگی بنانے والوں میں قارون اور ہامان ایسے لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے اور دونوں کے انجام کو بھی بیان کردیا گیا ہے۔ اول الذکر کا انعام اس طرح بیان ہوا: **وَجَزٰیھُمۡ بِمَا صَبَرُوۡا جَنَّۃً وَ حَرِیۡرًا** (الدھر:۱۲) ''ان کے صبر کے بدلے میں اللہ انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔''

ثانی الذکر کا انجام قرآن اس طرح بتاتا ہے: **فَخَسَفۡنَا بِہٖ وَ بِدَارِہِ الۡاَرۡضَ، فَمَا کَانَ لَہٗ مِنۡ**

فِئَةٍ يَّنۡصُرُوۡنَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (القصص:۸۱) ''آخرکارہم نے اس (یعنی قارون) کواوراس کے گھر کو (خزانوں سمیت) زمین میں دھنسا دیا، پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا۔

غور کیجیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے جان و مال سمیت اپنا سب کچھ مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا جیسے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ وغیرہ، اور منافقین میں سے ایسا گروہ بھی تھا جو برملا کہتا: لَا تُنۡفِقُوۡا عَلٰی مَنۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ حَتّٰی يَنۡفَضُّوۡا (المنافقون:۷) ''رسول کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔''

۳) عبادت کو ریاکاری سے پاک رکھنا، روزمرہ استعمال کی معمولی چیزوں کو مستعار دینے میں بخل سے کام نہ لینا، یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کا خیال رکھنا، ایک دوسرے کے غمخوار اور غمگسار افراد پر مشتمل معاشرے کی ناگزیر صفات ہیں اور اسلام سے بڑھ کر ایسا پاکیزہ معاشرہ کونسا ہو سکتا ہے جس کے افراد باہمی اخوت و ہمدردی اور ایثار و قربانی کے جذبے سے سرشار ہوں۔ لیکن آج صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ ہر نمازی اور بے نمازی کو قرآن مجید کی اس سورت کی روشنی میں اپنے اعمال و کردار کا جائزہ لینا چاہیے۔

..................o..................

سُوۡرَۃُ الۡکَوۡثَر

یہ سورۂ مبارکہ داعیِ حق کی تصویر کشی کرتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والے ساتھی کس طرح مخالفین کے کید و مکر اور اذیت رسانیوں کی زد میں تھے، اپنے بیگانے بن گئے، رشتہ داروں نے ظلم و ستم ڈھائے، قریبیوں نے راستے میں کانٹے بچھائے اور اعزہ نے جینا دوبھر کردیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرینہ اولاد کی وفات ہوئی تو غیروں کے علاوہ اپنوں نے بھی اس موقع پر خوشیاں منائیں اور کہنے لگے کہ آپ کا یہ مشن زیادہ دیر تک نہیں چلے گا، آپ کی رحلت کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوجائے گا۔

ان پریشان کن حالات میں اس سورۃ مبارکہ میں آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کا غم غلط کرتا ہے، خیر و برکت کی عظیم خوشخبری دیتا ہے، آپ کے دشمنوں کو بے نام و نشان کردینے کی وعید سناتا ہے اور ساتھ ہی آپ کو رب کا شکر ادا کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا اور آخرت میں ''خیر کثیر'' کا مژدہ جانفزا سنایا گیا، دنیا میں آپ ﷺ کی امت پھلے پھولے گی، آپ ﷺ کے کھاتے میں ان گنت نیکیاں جمع ہوجائیں گی، دنیا کی ہر مسجد کے مینار سے جہاں مؤذن **اَشۡهَدُ اَنۡ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** کی صدا بلند کرے گا، وہاں **اَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوۡلُ اللّٰهِ** کی صداقت کا اعلان بھی کرے گا، اور کلمہ طیبہ اس اقرار کے بغیر مکمل نہ ہوگا اور آپ کی سیرت طیبہ کا اتباع رب کی رضا کا نشان ٹھہرے گا اور جہاں آپ کا نام آئے گا وہاں صلی اللہ علیہ وسلم زبانوں پر جاری و ساری ہوجائے گا اور آخرت میں حوض کوثر ہوگا کہ میدان محشر میں آپ ﷺ اپنے امتیوں کو اس پاکیزہ مشروب کے جام بھر بھر کے پلائیں گے اور جنت میں ابدی اور دائمی باغ و بہار اور نہر کوثر رواں دواں ہوگی۔

آج جو لوگ آپ کی دعوت کا مذاق اڑا رہے ہیں یا آئندہ جو لوگ مذاق اڑائیں گے، وہ بے نام و نشان ہو جائیں گے، ان کے نام حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے، دنیا اور آخرت میں سوائے ذلت و رسوائی کے ان کے حصے میں کچھ نہ آئے گا، لہٰذا آپ کا رب آپ کو اور آپ کے متبعین کو حکم دیتا ہے کہ عبادت و ریاضت پر جم جائیں اور آپ کی ہر جانی و مالی قربانی صرف اور صرف اُسی کی رضا کی خاطر ہونی چاہیے اور زبانوں پر اسی کا ترانہ جاری ہونا چاہیے۔

سُوْرَةُ الْکَوْثَر

آیات:۳　رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ(۱) فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ(۲) اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ(۳)

(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو خیرِ کثیر سے نوازا ہے، پس آپ اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھیے اور صرف اسی کے لیے قربانی کیجیے، بے شک آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہے۔

﴿اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ﴾

(اے نبی ﷺ) ہم نے آپ کو خیر کثیر سے نوازا ہے۔

اِنَّآ (اِنّ. نا) بے شک۔ ہم نے، ''نَا'' ضمیر جمع متکلم رب کریم کی طرف جاتی ہے اور اُس ذاتِ واحد کی طرف جمع کا صیغہ بطورِ عزت کے آتا ہے، اِنّ اور نا میں ثقالت کی وجہ سے قاعدہ ادغام کے تحت ایک 'ن' غائب کر دیا گیا ہے، اَعۡطَیۡنٰکَ (اَعۡطَیۡنَا. کَ) ہم نے عطا کیا، آپ کو، الۡکَوۡثَرَ حوض کوثر، نہر کوثر، اور ''خیر کثیر''۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''لفظ 'کوثر' کثرت سے بنا ہے، اس سے مراد مطلق اور غیر محدود کثرت ہے، یہ لفظ اس کے بالکل برعکس مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو یہ ''سفہاء'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کہتے تھے، ہم نے آپ کو جو ''خیر کثیر'' عطا کی ہے، وہ بہت زیادہ ہے، وہ کبھی ختم اور منقطع ہونے والی نہیں ہے، جو شخص اس

''خیر کثیر'' کو جو اللہ نے اپنے نبی کو بخشی ہے دیکھنا چاہے، اسے وہ ہر جگہ جس طرح بھی نظر دوڑائے، یا خیال کرے، پاسکتا ہے۔

وہ اس ''خیر کثیر'' کو آپ کی ''نبوت'' میں پاسکتا ہے یعنی عظیم حق اور عظیم وجود سے ربط و تعلق میں۔ اور جس نے اللہ کو پالیا اس نے سب کچھ پالیا۔

وہ اس ''خیر کثیر'' کو قرآن میں پاسکتا ہے جو آپ پر نازل ہوا......اور جس کی ایک سورۃ ''الکوثر'' ہے......اس قرآن کے ''خیر کثیر'' کی کوئی انتہا نہیں...... یہ ایک طاقتور جوش مارتا چشمہ ہے جس کے فیضان کی کوئی حد نہیں۔

وہ اس ''خیر کثیر'' کو ان ملاء اعلیٰ میں پاسکتا ہے جو رسول پر درود بھیجتے ہیں، پھر غور کرو جہاں ربّ کائنات کی توحید کا ذکر ہے، وہاں محمد ﷺ کی رسالت کا بیان بھی ہے۔

وہ اس ''خیر کثیر'' کو رسول کی ''سنت'' میں پاسکتا ہے جو صدہا سال سے زمین کے اطراف و جوانب میں جاری و ساری ہے۔ کروڑوں انسان، کروڑوں انسانوں کے بعد اس ''سنت'' کی پیروی میں منہمک ہیں، یہ 'سنت' کروڑوں زبانوں اور لبوں پر بھی جاری ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا ورد رکھتے ہیں، یہ ان کروڑوں دلوں میں بھی پیوست ہے جنہیں آپ کی سیرت اور آپ کی یاد سے الفت و محبت ہے اور یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا۔

وہ اِس ''خیر کثیر'' کو اس عظیم ''فیضان'' میں پاسکتا ہے جو آپ کی ذات اور آپ کے ''طریق زندگی'' سے تمام زمانوں اور تمام مقامات میں نوع انسانی پر ہوا ہے، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا، خواہ یہ وہ لوگ ہوں جنہوں نے اس خیر کو پہچانا اور وہ اس پر ایمان لے آئے یا جنہوں نے اس حق کو نہیں پہچانا مگر اس کے فیضان سے انہیں بھی حصہ ملا۔

بہرحال وہ اس ''خیر کثیر'' کو مختلف مظاہر میں پاسکتا ہے اگر ہم ان مظاہر کا استقصا کرنا چاہیں تو یہ اس ''خیر کثیر'' کو قلیل کر دینے کے مترادف ہوگا۔

بلاشبہ یہ ''کوثر'' ہے، اس کے فیضان کی کوئی انتہا ہے، نہ اس کے معارف کا کوئی شمار، نہ اس کے مطالب کی کوئی حد، اسی لیے قرآن نے کسی تحدید و تعیین کے بغیر اس ''خیر کثیر'' کا ذکر کیا تا کہ وہ ہر اس

شے پر حاوی و مشتمل ہو جو خیر بھی ہو اور زیادہ بھی۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ﴾

پس آپ اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھیے اور صرف اسی کے لیے قربانی کیجیے۔

فَصَلِّ (ف. صَلِّ) پس۔ نماز پڑھیے، (صَلّٰی، یُصَلِّیْ، صَلَاۃً) نماز پڑھنا، لِرَبِّکَ (لِ. رَبِّکَ) لیے، اپنے رب کے، ل حرف جار ک ضمیر واحد مذکر حاضر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے مگر اس میں ہر صاحب ایمان اور آپ کا ہر امتی آ جاتا ہے، وَانۡحَرۡ اور اپنے رب کے لیے ہی قربانی کیجیے (نَحَرَ، یَنۡحَرُ، نَحۡرًا) ذبح کرنا۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کو ''خیر کثیر'' بخش دیا تو آپ اس انعام واحسان کا شکر اس طرح ادا کریں کہ کامل اخلاص کے ساتھ اپنے رب کے حضور نماز ادا کیا کریں اور اسی کے لیے قربانی کیا کریں ''نحر'' عربی زبان میں زیادہ تر اونٹ کی قربانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن دوسرے جانوروں کی قربانی کے لیے بھی بولا جاتا ہے یہاں نماز کے ساتھ عبادات میں سے قربانی کا ذکر کیا گیا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مشرکین اپنے بتوں اور معبودانِ باطل کے لیے قربانی والی عبادت زیادہ کرتے تھے، اس لیے صرف اللہ کے لیے قربانی ان کے اس شرک کے خلاف عملی جہاد بھی تھا، اور ہجرت سے پہلے جب تک زکوٰۃ کے تفصیلی احکام نہیں آئے تھے اور اس کا نصاب بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا، تو اس وقت زکوٰۃ کا مطلب صرف یہی تھا کہ اپنی کمائی سے غریبوں پر بھی خرچ کیا جائے، ان کو کھلایا پلایا جائے، اس طرح مکی دور میں قربانی بھی زکوٰۃ کے وسیع مفہوم کے تحت آ جاتی تھی الغرض اس آیت میں رسول اللہ کو حکم دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام کے شکر میں کہ اس نے آپ کو کوثر بخش دیا ہے، آپ کامل اخلاص کے ساتھ اس رب کے حضور میں نماز ادا کیجیے اور اسی کے لیے قربانی کیجیے۔ (درس قرآن)

﴿اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ﴾

بے شک آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہے۔

اِنَّ بے شک، بلاشبہ، جملے میں زورِ بیان کے لیے آتا ہے،شَانِئَکَ (شَانِئً. کَ) دشمن۔آپ کا (شَنَأَ، یَشْنَأُ، شنأً) بغض رکھنا،نفرت کرنا،شانِئٌ، دشمن،ھُوَ وہی (ہے)،اَلْاَبْتَرُ دُم بریدہ، ناقص، بےفیض، بےنسل انسان، ذلیل وخوار(القاموس الوحید)

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اس سورت کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَبْتَرُ...... بے نام ونشان......نہیں،صاحب ''خیر کثیر'' ہیں،اس آیت میں اللہ تعالیٰ کید کرنے والوں کے کید اور مکر کوانہی پر الٹا دیتا ہے،وہ پُر زور الفاظ میں فرماتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابتر ، نہیں ہیں،ابتر تو ان کے بدخواہ،ان کے دشمن اور انہیں ناپسند کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے مخالفین کے سلسلے میں اپنی اس وعید کو سچ کر دکھایا،مخالفین کا دنیا سے نام ونشان مٹ گیا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آوازہ وشہرہ پھیلا اور بلند ہوتا چلا گیا،آج ہم اس عظیم قول کی صداقت کا اتنی واضح اور اتنی وسیع وعریض صورت میں مشاہدہ کر رہے ہیں کہ اس قول کریم کے اولین سامعین کو اس قسم کا مشاہدہ نہ ہوسکا تھا۔

ایمان،حق اور خیر ختم ہونے کے لیے نہیں ہیں،اُن کی شاخیں دور دور تک پھیلی اور جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہیں......فنا تو کفر، باطل اور شر کے لیے ہے،خواہ وقتی طور پر وہ پھلے پھولے اور طاقت حاصل کر لے۔

ممکن نہیں کہ خیر اور حق کی طرف دعوت ختم ہوجائے۔آخر یہ کیسے ممکن ہے جبکہ اس دعوت کا ربط اس رب العالمین سے ہے جو زندہ جاوید،باقی رہنے والا اور ازلی وابدی ہے......زوال کفر، باطل اور ان کے علمبرداروں کے لیے ہے خواہ کچھ عرصہ ایسا محسوس ہو کہ ان کی عمر دراز اور ان کی جڑیں زمین میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں، سچ فرمایا اللہ تعالیٰ بزرگ وبرتر نے......جھوٹ کہا ارباب کید ومکر نے۔''(فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین حق کے ساتھ تشریف لائے اس کا حسن ابدی اور لازوال ہے اور رب کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیر کثیر سے نوازا ہے کہ اس کا صلہ دنیا اور آخرت میں لامحدود ہے، دنیا میں عزت اور سرفرازی اور آخرت میں جنت اور مقام محمود ہے اور آپ کے دشمن ہی دنیا میں بے نام ونشان اور آخرت میں ذلیل وخوار ہیں۔

۲) اس سورۃ مبارکہ میں اگرچہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے لیکن آپ ﷺ کے ساتھ یقیناً آپ ﷺ کی امت کو بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ روحانی وجسمانی اور دینی ودنیوی ہر قسم کی نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہے، خاص طور سے اخلاص کے ساتھ نماز اور قربانی کا اہتمام کرے، اس کے ساتھ یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر امت اس پر عمل پیرا رہے گی تو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اس کے شامل حال ہوگی اور ان کا دشمن ہی بے نام ونشان ہو جائے گا۔

۳) جب تک افرادِ امت صابر وشاکر اور شیر وشکر رہے اور نہ صرف حالت امن میں بلکہ میدان جنگ میں بھی ان کی پیشانیاں رب کائنات کے حضور جھکتی رہیں تو ہر میدان میں کامیابیاں ان کے قدم چومتی رہیں۔

۴) آج ہماری حالت دگرگوں ہو چکی ہے......اکثریت نمازوں سے غافل، اتفاق واتحاد سے بیگانہ، محبت ومودت سے خالی اور ایثار وقربانی سے ناآشنا ہے......یہی ہمارے زوال کے اسباب ہیں۔

۵) مسلمانو! اٹھو، خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ، قرآن وسنت کو مشعل راہ بناؤ اور اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرو۔ رب کریم کی رحمت تمہیں پکار رہی ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران:۱۳۹)

’’تم دل شکستہ نہ ہو جاؤ، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو۔‘‘

.................o.................

سُوْرَةُ الْکٰفِرُوْن

یہ مکی سورت ہے اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ اسلام پیش کرتے ہوئے کچھ عرصہ بیت گیا اور کفار نے پوری شدت اور قوت سے اس دعوت کو دبانے اور مٹانے کی پوری کوشش کی، اسلام قبول کرنے والوں کو ڈرایا دھمکایا، مارا پیٹا، کبھی انہیں شعب ابی طالب میں کھلے آسمان تلے محصور و مجبور بنا کر رکھ دیا اور کبھی ظلم وستم کے ایسے پہاڑ توڑے کہ انہیں حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی مگر انہوں نے نہ اسلام کو چھوڑا اور نہ حق بات سے منہ موڑا، تو قریش مکہ نے اس دعوت کو روکنے اور اسے کمزور کرنے کا نیا طریقہ اختیار کیا۔

''عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ کو اتنا مال دیے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں، آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کیے دیتے ہیں، ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں، اگر یہ آپ کو منظور نہیں تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں، آپ ﷺ نے فرمایا ''اچھا، ٹھہرو میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔'' اس پر وحی نازل ہوئی، **قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ**...... اور یہ کہ **قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْنِیْٓ اَعْبُدُ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ** (الزمر:۶۴) ''اے نادانو! کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں۔'' (ابن جریر بحوالہ تفہیم)

سُوْرَةُ الْکٰفِرُوْن

آیات:٦ رکوع:١

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ(١) لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ(٢) وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ(٣) وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ(٤) وَلَاۤ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ(٥) لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ(٦)﴾

(اے نبیؐ) آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! میں عبادت نہیں کرتا ان کی جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور میں (کبھی اور قطعاً) ان کی عبادت کرنے والا نہیں جن کی تم بندگی کرتے ہو اور تم (بھی کبھی) عبادت کرنے والے نہیں جس کی میں بندگی کرتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین!

﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ﴾

(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! میں عبادت نہیں کرتا ان کی جن کی تم عبادت کرتے ہو۔

قُلْ کہیے (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا اس سے فعل امر واحد مذکر حاضر 'قُلْ'، يٰۤاَيُّهَا اے یا، حرف ندا، ایُّ، منادی، "ھا" زائد ہے اور تنبیہ کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، اَلْكٰفِرُوْنَ اس کا مفرد، اَلْكَافِرُ ہے، کافر، انکار کرنے والا، لَاۤ نہیں، نافیہ، اَعْبُدُ میں عبادت کرتا ہوں مضارع واحد متکلم (عَبَدَ، يَعْبُدُ، عِبَادَةً) عبادت کرنا، بندگی کرنا، مَا تَعْبُدُوْنَ جن کی تم بندگی کرتے ہو، فعل مضارع جمع مذکر حاضر یعنی

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کفار سے جو آپ کو اپنے ہاتھوں سے تراشے بتوں کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں برملا کہہ دیجیے کہ میں ان بے جان مورتیوں کی بندگی نہیں کرتا جن کی تم بندگی کرتے ہو، میں تو رب واحد کا عبادت گزار ہوں جو زندہ و پاکیزہ ہے، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کائنات اور اس کی ہر چیز کو پیدا کرنے والا اور روزی رساں ہے۔

﴿وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ﴾

اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

وَ اور، عاطفہ (سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے) لَآ نہیں، نافیہ، اَنۡتُمۡ تم، ضمیر جمع مذکر حاضر، عٰبِدُوۡنَ بندگی کرنے والے ہو (عَبَدَ، یَعۡبُدُ) سے اسم فاعل جمع مذکر، مَآ جس کی، اسم موصول، اَعۡبُدُ میں بندگی کرتا ہوں مضارع واحد متکلم۔

یعنی اے مشرکین مکہ! تم اپنے کفر اور شرک میں اتنے پختہ اور مضبوط ہو چکے ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہٗ کی بندگی سے عار اور ضد ہے، میں تو اس کا بندہ ہوں اور اسی کی بندگی میرا اشعار ہے، جبکہ بے جان پتھروں کے آگے جھکنا تمہارا مزاج ہے۔

﴿وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ، وَلَآ اَنۡتُمۡ عَابِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ﴾

اور میں (کبھی اور قطعاً) عبادت کرنے والا نہیں جن کی تم بندگی کرتے ہو اور تم (بھی کبھی) عبادت کرنے والے نہیں جس کی میں بندگی کرتا ہوں۔

وَ اور عاطفہ، اَنَا میں ضمیر واحد متکلم، عَابِدٌ عبادت کرنے والا، اسم فاعل واحد مذکر، مَّا جن کی اسم موصول، عَبَدۡتُّمۡ، تم عبادت کرتے ہو، ماضی جمع مذکر حاضر، ان تکراری جملوں سے تاکیدی معنی پیدا ہوتے ہیں اور اس سے کلام میں زور پیدا ہوتا ہے اور یہ عربی زبان کا وصف ہے، کفار کو فیصلہ کن بات سنائی جا رہی ہے کہ وہ کان کھول کر سن لیں کہ میں کبھی بھی ان کے بتوں کی بندگی نہیں کروں گا اور وہ بھی ایسے ضدی اور ہٹ دھرم ہیں کہ میرے رب واحد کی بندگی کے لیے تیار نہ ہوں گے۔

﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾

(کہہ دیجیے) تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین!

﴿لَكُمْ (لَ. كُمْ) لیے، تمہارے۔ لام حرف جر كُمْ، ضمیر جمع مذکر حاضر، دِيْنُكُمْ (دِيْنُ. كُمْ) دین، تمہارا، وَلِيَ (وَ. لِيَ) اور، میرے لیے، دِيْنِ میرا دین، یعنی تمہارے لیے شرک اور کفر کا راستہ ہے اور میرے لیے ایمان اور اسلام کا راستہ ہے۔ یہ اصل میں دِيْـنِي تھا جملہ ختم کرنے کے لیے اختصار کر کے ی ختم کر دی صرف زیر باقی رہ گئی جو "ی" کی قائم مقام ہے۔

جناب عبدالحی صاحب لکھتے ہیں:

"سورۃ کی پہلی آیت میں اسلام کے مخالفوں کو کافر کہہ کر پکارا گیا ہے، ابتدائے دعوت کے مرحلے میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوا ہے، کافر کا مطلب ہے انکار کرنے والا، نہ ماننے والا، آپ جب تک کسی کے سامنے ایک بات پوری طرح کھول کر نہ رکھیں، اسے سمجھانے کی پوری کوشش نہ کریں، دلائل سے اپنی بات کو مضبوط نہ کریں اور جب تک یہ اندازہ نہ ہو جائے کہ آپ جسے سمجھا رہے ہیں وہ یا تو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا یا سمجھنے کے بعد بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس وقت تک آپ اسے "انکار کرنے والا" بات نہ ماننے والا، یعنی کافر نہیں کہہ سکتے۔

چنانچہ دعوت کے ابتدائی دور میں اسلام نہ لانے والوں کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہوا ہے لیکن اب اس آخری مرحلے میں اسلام کے مخالفوں کو "يَـٰٓأَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" اے کافرو! کہہ کر پکارا گیا ہے، یہ اس لیے کہ داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید، رسالت، آخرت اور دوسری تمام باتوں کو اچھی طرح کھول کھول کر سمجھایا، ہر بات کے لیے مختلف انداز سے بے شمار دلائل پیش کیے، اعتراضات کو حل کیا، الجھنوں کو صاف کیا، دعوتِ اسلامی سے متاثر ہونے والی زندگیوں کا عملی نمونہ سامنے رکھا، غرض یہ کہ کوئی پہلو ایسا نہ چھوڑا کہ اگر کوئی انسان بات سمجھنا چاہے، تو وہ سمجھ نہ سکے لیکن اس کے بعد جو لوگ اپنی ضد پر اڑے رہے اور اپنے مقام سے چمٹے رہے، ان کے بارے میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ اب یہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں، اُن کے مفادات، ان کی خواہشات اور ان کی خاندانی روایات ہی ان

کے پاؤں کی بیڑیاں بنی ہوئی ہیں، چنانچہ اس موقع پر انہیں ''اے کافرو!'' کہہ کر پکارا گیا۔

سورہ مبارکہ کا پہلا لفظ ''قُلْ'' ہے یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آگے جو بات کہی جا رہی ہے وہ بھی مالک کائنات کا ایک فرمان ہے، کچھ ہماری اپنی بات نہیں ہے۔

جو بات کہی گئی ہے، وہ نہایت اہم ہے، فرمایا کہ آپ کہہ دیجیے کہ میں ان (پتھر سے تراشے ہوئے) معبودوں کی پرستش کرنے والا نہیں ہوں جن کو تم پوجتے ہو اور نہ تم اب اس معبود برحق کی طرف پلٹنے والے ہو جس کی عبادت میں کر رہا ہوں، اس کے بعد اسی بات کو ایک دوسرے انداز میں اس طرح دہرایا گیا کہ جن جن معبودوں کی تم نے پرستش کی ہے، میں ان کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں اور نہ تم اس معبود کی عبادت کرو گے جس کے آگے میں نے اپنا سَر جھکایا ہے۔

یہ بڑی اہم بات ہے، اس میں بڑے زور کے ساتھ ایک تو اس بات کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ اب اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے کہ میں اپنے راستے کو چھوڑ کر تمہاری روش پر آ جاؤں، تمہیں اس طرف سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیے اور کوئی ایسی امید دل میں نہ رکھنی چاہیے کہ اب میں کسی طرح کے خوف یا لالچ یا کسی اور وجہ سے اپنے اختیار کیے ہوئے راستے کو چھوڑ سکتا ہوں اور اتنا ہی نہیں بلکہ آئندہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں اس طرف سے مایوس ہو جانا چاہیے کہ میں اس طرح کی کسی مصالحت کے لیے تیار ہو جاؤں، یا اپنے دین کو چھوڑ کر تمہارے دین کو اختیار کر لوں، میں نے جو کچھ اختیار کیا ہے، علم اور عقل کی پوری روشنی میں سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ میرا ہی راستہ حق ہے، نجات کا دارومدار صرف اسی راستے پر ہے، اور چونکہ مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ اصل معاملہ اس زندگی کا ہے جو اس موجودہ زندگی کے بعد شروع ہونے والی ہے، اس لیے موجودہ زندگی کی کوئی تکلیف یا کوئی راحت مجھے یہ سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتی کہ میں اپنی روش کے بارے میں کوئی اور فیصلہ کروں، میں نے جو کچھ فیصلہ کیا ہے، میں اسی پر قائم رہوں گا اور جہاں تک تمہارا معاملہ ہے تو تمہارے بارے میں مجھے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ اب تم بھی اپنی روش سے باز آنے والے نہیں ہو، اس لیے اب میری طرف سے آخری اعلان یہ ہے کہ تمہاری یہ روش تمھیں مبارک ہو، تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے۔'' (آسان تفسیر)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) یہ سورۃ مبارکہ مسلمانوں کے موجودہ حالات میں نصیحت وموعظت کا عظیم پیغام رکھتی ہے کہ انہیں سخت سے سخت حالات اور کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی حق وصداقت کے مؤقف پر جمے رہنا چاہیے، چاہے معاملہ ڈرانے اور دھمکانے کا ہو یا مالی امداد اور منفعت کا ہو، جس طرح کفر کے مقابلے میں حق پر ڈٹے رہنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچی اور آخر کار فتح مکہ پر اسلام کا پرچم بلند ہوا اور پھر یہ بلند سے بلند تر ہوتا ہی چلا گیا اور کتنے ہی چھوٹے چھوٹے لشکر بڑے بڑے لشکروں پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے غالب ہوتے رہے جس کی قرآن یوں شہادت دیتا ہے: كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ:۲۴۹)

"بار ہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے حکم سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔"

روم اور فارس کی سلطنتیں اپنے وقت میں بڑا کروفر اور شان وشوکت رکھتی تھیں مگر مسلمان مجاہدوں کے سامنے وہ ٹھہر نہ سکیں، یقیناً اسی طرح آج بھی اللہ تعالیٰ کی مدد مسلمانوں کو پہنچ کر رہے گی، شرط ایمان کی پختگی اور عمل کی پاکیزگی ہے۔

۲) مگر جب سے مسلمانوں نے قرآن کی بلند تعلیمات سے منہ موڑا ہے بزدلی اور مداہنت ان میں در آئی ہے، ایمان واتحاد کی جگہ نفاق اور افتراق نے راہ پالی ہے، دشمنوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔

۳) خاص طور پر عالم اسلام کے بزدل اور منافق حکمران یورپ کے ظالم سربراہوں کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کا دم بھرتے ہیں، ان کے اشاروں پر اپنے تعلیمی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگاتے ہیں اور کبھی جدید اسلام لانے کا پیغام سناتے ہیں، یہ ساری باتیں وہ مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

۴) یادرکھیے اسلام وہی ہے جو خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا، کتاب ہدایت قرآن مجید ہے اور اس کے ساتھ سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ یہ تعلیمات کھری، اٹل اور زندہ وتابندہ ہیں اور کسی کو بھی اس میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

سُوْرَةُ النَّصر

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کے لیے آپ دنیا میں بھیجے گئے تھے، اس کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کی حمد اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں کہ اس کے فضل سے آپ اتنا بڑا کام انجام دینے میں کامیاب ہوئے اور اس سے دعا کریں کہ اس خدمت کی انجام دہی میں جو بھول چوک یا کوتاہی بھی آپ سے ہوئی ہے، وہ معاف فرما دے۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَ بِحَمْدِکَ اَسْتَغْفِرُکَ وَ اَتُوْبُ اِلَیْکَ (بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں، سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَ اَتُوْبُ اِلَیْہِ) کثرت سے پڑھا کرتے تھے، میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ ﷺ! یہ کیسے کلمات ہیں جو آپ نے اب پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟'' فرمایا ''میرے لیے ایک علامت مقرر کر دی گئی ہے کہ جب میں اسے دیکھوں تو یہ الفاظ کہا کروں اور وہ یہ ہے: ''اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ'' اس سے ملتی جلتی بعض روایات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپ اپنے رکوع و سجود میں بکثرت یہ الفاظ کہتے تھے: ''سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَ بِحَمْدِکَ، اللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ''۔

ام المؤمنین سیدہ اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر آپ کے آخری زمانہ حیات میں اٹھتے بیٹھتے اور آتے جاتے یہ الفاظ جاری رہتے: ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ'' میں نے ایک روز پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ کثرت سے یہ ذکر کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے، پھر آپ نے یہ سورۃ مبارکہ (سورۃُ النصر) پڑھی۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب سے یہ سورۃ مبارکہ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ ذکر فرماتے رہتے: سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَ بِحَمْدِکَ، اللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ سُبْحٰنَکَ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِکَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ

معلوم یہ ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں الفاظ کی تھوڑی بہت تبدیلی سے زبان مبارک سے رب کائنات کی تسبیح و تحمید اور اس کے حضور اس کی رحمت اور بخشش کی طلب جاری رہتی تھی اور اس میں امت کے ہر فرد کو تاکید اور نصیحت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور تقلید کرے۔

سُوْرَۃُ النَّصر

آیات:۳ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ(۱) وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا(۲) فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا(۳)﴾

جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آ پہنچے اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتے دیکھ لیں، تو آپ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجیے اور اس سے مغفرت کی دعا کیجیے، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ﴾ جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آ پہنچے۔

اِذَا جب، جَآءَ آن پہنچے ماضی واحد مذکر غائب (جاءَ، یَجِیءُ) آنا، ملنا، نَصۡرُ مدد، وَالۡفَتۡحُ اور فتح۔

﴿وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا﴾

اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتے دیکھ لیں۔

وَ رَاَیۡتَ اور آپ دیکھیں، ماضی واحد مذکر حاضر (رَاٰی، یَرٰی، رُؤۡیَۃً) دیکھنا، النَّاسَ لوگوں (کو) یَدۡخُلُوۡنَ داخل ہوتے ہوئے، مضارع جمع مذکر غائب (دَخَلَ، یَدۡخُلُ، دُخُوۡلًا) داخل ہونا، فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اللہ کے دین میں، اَفۡوَاجًا فوج در فوج، جوق در جوق۔

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا﴾

تو آپ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجیے اوراس سے مغفرت کی دعا کیجیے، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

فَسَبِّحْ (ف. سَبِّحْ) پس۔ تسبیح کیجیے (پاکی بیان کیجیے) (سَبَّحَ، یُسَبِّحُ، تَسْبِیْحًا) اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا، بڑائی اور عظمت کا اظہار کرنا (سبحان اللہ کے الفاظ زبان سے کہنا) السُّبُّوحُ ہر برائی اور بھول سے بالکل پاک، پاک و برتر، اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے، سُبْحَانَ اللّٰهِ، اللہ تعالیٰ ہر عیب اور برائی سے پاک ہے، سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، زمین آسمان کی ہر چیز اس کی پاکی بیان کررہی ہے۔ (القاموس الوحید) بِحَمْدِ رَبِّکَ (ساتھ خوبیوں کے۔ رب اپنے کی) حَمِدَ یَحْمَدُ حَمْدًا، تعریف کرنا، شکرادا کرنا، اسی کی تعریف ہے اس کے ان گنت کمالات پر اور اسی کا شکر ہے اس کے لاتعداد احسانات پر، وَاسْتَغْفِرْهُ اور اس سے بخشش کی دعا کیجیے اِسْتَغْفِرْ فعل امر واحد مذکر حاضر، ہٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف جاتی ہے (اِسْتَغْفَرَ، یَسْتَغْفِرُ، اِسْتِغْفَارٌ) اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہنا، (اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ) میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگتا ہوں، اِنَّهٗ (اِنَّ. هٗ) بلاشبہ۔ وہ ہے، ہٗ کی ضمیر اللہ کی طرف جاتی ہے، کَانَ تَوَّابًا وہ ہے، بہت زیادہ معاف کرنے والا (توبہ قبول کرنے والا) توّاب، اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو ہر لمحہ اور ہر وقت اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور انہیں معاف کر دیتا ہے لیکن یہ بات بھی ضروری ہے کہ بندے اس کے وفادار اور اطاعت گزار بن کر رہیں۔

جناب محمد عبدالحئی صاحب لکھتے ہیں:

''مکہ میں اسلامی تحریک کو اپنے ابتدائی تیرہ سالوں میں جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا وہ انتہائی سخت تھے اور ان کے نتیجے میں مسلمانوں کو اپنا وطن، کاروبار اور جائیدادیں چھوڑ کر ایک دوسرے شہر مدینہ میں پناہ لینا پڑی، یہاں بھی سات آٹھ سال کی مدت میں کسی وقت چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ چاروں طرف سے مخالفوں کے حملوں اور آئے دن ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کا مقابلہ ہی کرتے

رہنا پڑا، آخرکار اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق اب وہ وقت قریب آ گیا جب اسلام کو عرب کی تمام طاقتوں پر غالب ہونا ہی تھا اور مسلمان جس مکہ سے نکالے گئے تھے وہاں انہیں فاتح کی حیثیت سے داخل ہونا تھا، اسلامی تاریخ میں یہ بڑا اہم واقعہ ہے اور اس کا نام فتح مکہ ہے، یہ فتح، ہجرت کے آٹھویں سال رمضان کے مہینے میں حاصل ہوئی، فتح مکہ دراصل کسی ایک شہر پر مسلمانوں کے قبضے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ آخری ضرب تھی جس کے بعد عرب میں کفر کا زور بالکل ٹوٹ گیا اور تاریخ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اب اس ملک میں اسلام ہی کو غالب ہو کر رہنا ہے، اس واقعہ کی اصل اہمیت اسی لحاظ سے ہے۔

جب کوئی تحریک یا نیا طرز فکر لوگوں کے سامنے آتا ہے تو ایک عرصے تک اسے ایسے لوگوں سے نمٹنا پڑتا ہے جو اپنی روش کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور آخر وقت تک عقیدوں اور اپنے رواجوں اور اپنے باپ دادا کے طریقوں سے چمٹے رہتے ہیں، ساتھ ہی ایسے لوگ بھی برابر بڑھتے رہتے ہیں جو اس نئی تحریک کا ساتھ دیتے ہیں اور نئے افکار کو قبول کر لیتے ہیں، ایک عرصے تک دونوں میں کش مکش جاری رہتی ہے۔ اس مدت میں عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد آخری نتیجوں کا انتظار کرتی رہتی ہے، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ذہن اور مزاج کے اعتبار سے خود کسی فیصلے پر پہنچنے کے بجائے یہ انتظار کرتے رہتے ہیں کہ دیکھیں آخر میں کس کا پلہ بھاری رہتا ہے، چنانچہ جب اس کشمکش کے نتیجے میں کسی ایک گروہ کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تو یہ سب اسی کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کچھ ایسی ہی صورت حال اس وقت عرب میں بھی تھی، ایک طرف اسلامی عقیدے اور اسلامی افکار کی تبلیغ ہو رہی تھی، دوسری طرف لوگ اس کی مخالفت پر کمر باندھے ہوئے تھے اور ایک عرصہ سے دونوں میں کش مکش جاری تھی، اسلام کا پلہ رفتہ رفتہ بھاری پڑتا جا رہا تھا، اب وہ وقت آ گیا تھا کہ اسلام اور کفر کے درمیان آخری فیصلہ ہو جائے، یہ فیصلہ فتح مکہ کی صورت میں سامنے آیا، مکہ فتح ہونے کے بعد کفر نے میدان چھوڑ دیا اور وہ لوگ جو آخری فیصلے کے انتظار میں تھے، اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے، یہاں تک کہ پورے ملک سے شرک اور کفر کا نام ونشان مٹ گیا۔

تحریکوں کے علمبرداروں کے لیے فیصلے کا یہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے، عام طور پر دنیوی مفاد پر اٹھنے والی تحریکوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ ایسے موقع پر ان کے نام لیوا آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، وہ تحریک کی

کامیابی کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں اور اپنی تدبیروں، جاں نثاریوں اور قربانیوں کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں، لیکن یہ بات ایک اسلامی تحریک کے مزاج کے بالکل خلاف ہے، مؤمن کے سوچنے کا ڈھنگ عام لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے، وہ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اصل طاقت اللہ کے ہاتھ میں ہے، جو کچھ ہوتا ہے اسی کی منشا سے ہوتا ہے اور بندہ جو کچھ کرتا ہے وہ اسی کی دی ہوئی توفیق سے کرتا ہے، سورۃ ختم کرتے ہوئے اسی ذہن کو نہایت مؤثر الفاظ میں تقویت دی گئی ہے، فرمایا گیا ہے کہ دیکھو اب عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ تمہیں اس ملک میں سربلندی اور غلبہ حاصل ہوگا، اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی اور مکہ فتح ہو جائے گا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس وقت تم دیکھو گے کہ سارا ملک اسلام کے غلبہ کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا اور لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے کے لیے تمہاری طرف بڑھیں گے، یہ وقت بڑا نازک ہوگا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت تم سے کوئی کوتاہی ہو جائے اور ایک مدت تک پریشانیاں اور تکلیفیں جھیلنے کے بعد اپنی حالت کی اس تبدیلی پر تم کسی قسم کی غلطی کر بیٹھو، مثلاً اپنے مخالفوں سے بدلہ لینے کے لیے تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی عمل کرنے لگو جیسا انہوں نے تمہارے ساتھ کیا یا تمہارے دل میں کسی درجہ میں یہ خیال آنے لگے کہ یہ فتح تمہاری اپنی کوششوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے یا اللہ نہ کرے آرام اور آسائش کی کیفیت میں تمہارا تعلق اس سے کمزور پڑنے لگے، اگر کہیں ایسا ہوا تو یہ حقیقت میں ایک بڑی ناکامی ہوگی۔ اس سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہر حال میں تم اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے رہو، اسی کی تسبیح میں لگے رہو اور اس یقین کو ہر وقت زندہ اور تازہ رکھو کہ اصل طاقت اسی کی ہے، جو کچھ ہوگا اسی کے فضل سے ہوگا، اس کی منشا کے بغیر کچھ بھی نہ ہو سکے گا اور ساتھ ہی اس سے اپنی کوتاہیوں کی معافی چاہتے رہو، کیوں کہ انسان بہر حال اپنے اندر بہت سی کمزوریاں رکھتا ہے جن کی وجہ سے قدم قدم پر اس سے غلطیاں ہو جاتی ہیں، وہ بھول جاتا ہے، وہ غفلت کا شکار ہو جاتا ہے، جذبات اور خواہشات اس پر قابو پا لیتے ہیں، اس لیے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں پر نظر رکھے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے مغفرت طلب کرتا رہے بلاشبہ وہ اپنے بندوں کے حال پر بڑا ہی مہربان ہے، وہ ان کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے اور انہیں صحیح راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا رہتا ہے۔" (آسان تفسیر)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) فتح مکہ دراصل اس شاندار فتح کا آغاز تھا جس میں کفر کا زور ٹوٹ گیا تھا اور تاریخ نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اب اس ملک میں صرف اسلام کا بول بالا ہوگا، ادھر فتح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کریمانہ اخلاق اور حسنِ سلوک نے لوگوں کے دلوں کو فتح کر لیا تھا، وہ لوگ جنہوں نے تیرہ برس آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کے لیے مکہ کی سرزمین تنگ کر دی تھی اور انہیں ہر طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دی تھیں آپ ﷺ نے ان سب کو معاف کر دیا، آپ کے اس رویہ کو دیکھ کر سینکڑوں اور ہزاروں لوگ مسلمان ہو گئے، پھر یہ سلسلہ بفضل تعالیٰ پھیلتا ہی چلا گیا، فتح مکہ 8 ہجری میں ہوئی، 9 ہجری کو سال وفود کہا جاتا ہے جس میں عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے لگے یہاں تک کہ 10 ہجری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے تو اس وقت پورا عرب اسلام کے زیرِ نگیں آ چکا تھا۔ (الحمدللہ) یہ تمام تر فتوحات اللہ کے فضل سے ہوئیں، اس لیے حکم ہوتا ہے کہ اس کے شکر گزار اور احسان مند رہو، تمہاری زبانیں اسی کی تسبیح وتحمید سے تر ہو جائیں اور اپنی خطاؤں اور غلطیوں پر اسی کے حضور توبہ واستغفار کرو۔

سیرت طیبہ کا مطالعہ کیجیے کہ فتح مکہ پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر میں داخل ہوئے تو اونٹنی پر سوار تھے اور جبین نیاز رب ذوالجلال کے حضور جھکی ہوئی تھی اور زبان پر اسی کی حمد وثنا جاری وساری تھی۔ اس موقع پر نہ شادیانے تھے نہ نقارے، نہ شور وشغب اور نہ فتنہ وفساد، نہ لوٹ مار اور نہ قتل وغارت، شاید دنیا نے پہلی دفعہ پرامن فتح کا نظارہ کیا ہوگا، جتنی پرسکون یہ فتح تھی اس سے کہیں زیادہ اس کا فاتح امین اور سلامتی والا تھا۔ اس نیلگوں آسمان کے نیچے اس سے زیادہ سلیم اور حلیم نہ پیدا ہوا اور نہ ہوگا، یہ بھی اسی رب قدیر کا فضل تھا۔

۲) یہ آیات امت مسلمہ کے لیے لمحہ فکریہ مہیا کرتی ہیں، ہمارے اسلاف کا سیل رواں کہیں تھمتا نہ تھا، وہ جہاں جاتے، فتح ونصرت ان کے قدم چومتی اور وہ وہاں امن اور سلامتی کے جھنڈے گاڑ دیتے اور

ہر وقت اللہ کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی۔ آج وہی امت ذلت اور خواری کی عمیق کھائی میں گری پڑی ہے اور ہر طرف سے اس پر نکبت وادبار کی گھٹا چھا رہی ہے۔

۳) یہ آیات پاکستانی قوم کے لیے بھی عظیم پیغام رکھتی ہیں، ہم نے یہ ملک لاتعداد جانی و مالی قربانیوں سے حاصل کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں آزادی کی نعمت سے بہرہ ور فرمایا، حصول وطن کا مقصد صرف اور صرف ایک ہی تھا کہ یہاں پر رب کائنات کے قانون کا نفاذ ہوگا تا کہ ہر شخص اس گہوارۂ امن میں باعزت زندگی گزار سکے، پاکستان معرض وجود میں آئے اٹھاون برس کا طویل عرصہ بیت چکا ہے مگر افسوس کہ ہمارا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ ہم ہر سال یوم آزادی مناتے ہیں اور یہ دن شکرانے اور محاسبے کے بجائے شور وغل اور کھیل تماشوں میں گزار دیتے ہیں اور اس لہو ولعب میں کئی قیمتی جانیں بھی ضائع کر دیتے ہیں، جو یقیناً بہت بڑا جرم ہے اور یوم جزا وسزا اس کا حساب دینا ہوگا۔

۴) مسلمانو! ذرا ہوش کے ناخن لو! تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب ''قرآن حکیم'' موجود ہے اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی جیتی جاگتی تصویر ہے، تم اپنے رب کو بھلا چکے ہو حالانکہ وہ تمہیں اپنی رحمت کی طرف بلا رہا ہے۔

..................o..................

سُورَةُ اللَّھَب

خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام پر جس شخص نے بڑھ چڑھ کر آپ کو تکلیف پہنچائی وہ آپ کا حقیقی چچا ابولہب تھا......اس کا اصل نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا......حسن اور چہرے کی چمک دمک کے باعث 'ابولہب' (شعلہ رو) نام پڑ گیا، اس کی بیوی ام جمیل بنت حرب، ابوسفیان کی بہن تھی، وہ بھی اس ایذا رسانی میں اپنے خاوند کی پوری طرح معاون تھی، اس سورۃ مبارکہ میں ان کے انجام بد کا تذکرہ ہے۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم اور سیرت کی عام کتابوں میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی: وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ (شعرا:۲۱۴) جس میں حکم دیا گیا ہے کہ آپ خاص طور سے اپنے قریبی رشتہ داروں اور قبیلہ والوں کو شرک و کفر کے نتیجہ میں آنے والے عذابِ الٰہی سے ڈرایئے اور ان کے دلوں میں فکرِ آخرت پیدا کرنے کی کوشش کیجیے جس سے وہ غافل ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر قبیلۂ قریش کی مختلف شاخوں کو نام بنام نہایت بلند آواز سے پکارا گویا کہ آپ ان کو کسی بڑے اور فوری خطرہ سے خبردار کرنا چاہتے ہیں، آپ کی یہ غیر معمولی پکار سن کر وہ لوگ جمع ہو گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفا پہاڑ کی چوٹی پر تھے اور سامنے اس کے دامن میں قریش کے سرداروں اور ذمہ داروں کا مجمع تھا، آپ نے ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا "بتاؤ اگر میں تم سے کہوں کہ کوئی دشمن لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے اس پہاڑ کے دوسری طرف آ گیا ہے اور وہ تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے، تو کیا تم میری اس بات کو سچ مانو گے اور اس حالت میں جو کچھ کرنا چاہیے وہ کرو گے؟ سب نے کہا ہاں، ہم آپ کی بات کو سچ مانیں گے کیونکہ ہم نے کبھی آپ کو غلط بات

کہتے نہیں سنا، اس کے بعد آپ نے ان سے فرمایا سنو! میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں ایک شدید عذاب سے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ اس عذابِ شدید سے بچنے کی فکر کرو اور اپنے خالق و مالک کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرلو، آپ کی یہ بات سن کر جو انتہائی خلوص اور دلسوزی کے ساتھ کہی گئی تھی، ابولہب نے نہایت گستاخانہ انداز میں کہا ''تَبًّا لَّکَ أَلِھٰذا جَمَعْتَنَا؟'' ہلاکت و بربادی ہو تیرے لیے، کیا یہی سنانے کے لیے تو نے ہم سب کو جمع کیا تھا۔

روایت میں ہے کہ اسی دور میں یہ سورۃ لہب نازل ہوئی۔ اس میں پیشین گوئی کے طور پر اعلان فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ خود یہ ابولہب اس دنیا میں بھی تباہ و برباد ہوگا، اور آخرت میں یہ دوزخ کا ایندھن بنے گا اور اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ دوزخ میں ڈالی جائے گی جو اسلام دشمنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں اس کی شریک و رفیق تھی۔ پھر ابولہب کو دنیا میں ذلت اور رسوائی ہوئی، اس کی موت نہایت عبرتناک تھی، اسے عدَسہ کی بیماری ہوگئی، جس کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اسے چھوڑ دیا کیونکہ انہیں چھوت لگنے کا ڈر تھا، مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور بو پھیلنے لگی، آخرکار جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے تو ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے کچھ حبشیوں کو اجرت دے کر اس کی لاش اٹھوائی اور انہی مزدوروں نے اس کو دفن کیا اور دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑی سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اسے ڈھانک دیا۔

(بحوالہ درس قرآن، مولانا نعمانی اور تفہیم القرآن، سید مودودیؒ)

آیات:۵ **سُوْرَۃُ اللّھَب** رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّ تَبَّ(۱) مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ(۲) سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ(۳) وَّ امْرَاَتُہٗ ط حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ(۴) فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ(۵)

دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے ابولہب کے اور وہ برباد ہوگیا، نہ اس کا مال اس کے کام آیا، اور نہ اس کی کمائی ہی، وہ عنقریب بھڑکنے والی آگ میں جائے گا اور اس کی بیوی بھی (جائے گی) جو لوگوں کے درمیان آگ لگاتی پھرتی تھی، اس کی گردن میں مونج کی ایک رسی ہوگی۔

﴿تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّ تَبَّ﴾ دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے ابولہب کے اور وہ برباد ہوگیا۔

تَبَّتْ ٹوٹ گئے، ماضی واحد مؤنث غائب (تَبَّ، یَتِبُّ، تَبًّا) کٹ جانا، نقصان اٹھانا، ہلاک ہونا، ٹوٹ جانا، یَدَآ دونوں ہاتھ، تثنیہ اصل میں یَدَانِ تھا، اس کا نون اضافت کی وجہ سے حذف ہوا، اَبِیْ لَھَبٍ ابولہب (کے)، وَّ تَبَّ اور وہ ہلاک ہوا، برباد ہوا۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''یَدٌ'' کے اصل معنی ہاتھ کے ہیں اور چونکہ انسان کے اعضا میں ہاتھوں کی خاص اہمیت ہے، آدمی زیادہ تر کام ہاتھوں ہی سے کرتا ہے، اس وجہ سے کبھی کبھی ہاتھوں سے مراد اس کی ذات ہوتی ہے، قرآن حکیم میں جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰکَ (الحج:۱۰) یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے۔

اس محاورے کے مطابق ''یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ'' سے مراد خود ابولہب کی ذات اور اس کی شخصیت ہے، اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مغرور، اپنے وقت کا فرعون، ابولہب جس نے ہمارے رسول ﷺ کی دعوتِ حق کے جواب میں ''تبًّا لکَ'' کہا ہے وہ خود سن لے اور سب سن لیں کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ خود تباہ و برباد ہوگا، آگے بطور تاکید کے فرمایا گیا ہے ''وَتَبَّ'' مطلب یہ ہے کہ اس کی تباہی و بربادی یقینی ہے، اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، تَبَّتْ اور تَبَّ دونوں ماضی کے صیغے ہیں، جب مستقبل میں ہونے والے کسی واقعہ کو ماضی کے صیغے سے بیان کیا جاتا ہے تو مطلب یہی ہوتا ہے کہ یہ بات ایسی یقینی ہے جیسے کہ ماضی میں ہو چکی ہے۔ قیامت اور آخرت میں ہونے والے واقعات کا ذکر قرآن مجید میں جابجا اسی طرح ماضی کے صیغوں سے کیا گیا ہے مثلاً: وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ ط ثُمَّ نُفِخَ فِیْہِ اُخْرٰی فَاِذَا ھُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ (الزمر:۶۸) ''اور اس روز (قیامت کو) صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین والے سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے مگر جسے اللہ چاہے (اسے موت نہ آئے گی) پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا، پس وہ ایک دم کھڑے ہو کر دیکھنے لگ جائیں گے۔'' (درس قرآن)

﴿مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ﴾

نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی ہی۔

مَآ اَغْنٰی نہ، کام آیا، مَآ نافیہ، (اَغْنٰی، یُغْنِیُ، اِغْنَاءً) کام آنا، کافی ہونا، عَنْهُ (عَنْ. ہٗ) اس۔ سے، ''ہٗ'' کی ضمیر واحد مذکر غائب ابولہب کی طرف جاتی ہے، مَالُهٗ (مَالُ. ہٗ) مال۔ اس کا، پھر ''ہٗ'' کی ضمیر ابولہب کی طرف جاتی ہے، وَمَا اور جو، ''مَا'' موصولہ ہے، کَسَبَ کمایا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (کَسَبَ یَکْسِبُ، کَسْبًا) کمانا، کوئی کام کرنا جس کا انجام اچھا یا برا ہو۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''ابولہب کا جاہ وحشم اور مال ومتاع اس کے لیے قطعی کوئی فائدہ نہ دے سکا اور اسے عذاب الٰہی سے نہ بچاسکا۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿سَيَصۡلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ وہ عنقریب بھڑکنے والی آگ میں جائے گا۔

سَيَصۡلٰى (سَ. يَصۡلٰى) وہ عنقریب پڑے گا، جائے گا، داخل ہوگا، 'س' حرف استقبال، صَلَى يَصۡلٰى، صَلۡيًا، آگ میں داخل ہونا یَصۡلٰی، مضارع واحد مذکر غائب، نَارًا آگ، ذَاتَ لَهَبٍ شعلوں والی، یعنی ایسی آگ جس کے شعلے دور دور تک پھیل رہے ہوں گے۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''یہ ابولہب کے اُخروی انجام کا بیان ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ آخرت میں دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا، ''نار'' کے معنی آگ کے ہیں اور اس سے مراد دوزخ کی آگ ہے، اور ذَاتَ لَهَبٍ اس کی صفت ہے جس کے معنی ہیں شعلہ زن اور بھڑکتی ہوئی، اِس میں اُس آگ کی غیر معمولی شدت کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس کو (یعنی آگ کو) اس کے معروف نام ابولہب سے بھی مناسبت ہے۔'' (درس قرآن)

﴿وَّ امۡرَاَتُهٗ، حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ، فِيۡ جِيۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ﴾

اور اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی (جائے گی) جو لوگوں کے درمیان آگ لگاتی پھرتی تھی، اس کی گردن میں مونج کی ایک رسی ہوگی۔

وَّ اور، عاطفہ، امۡرَاَتُهٗ (امۡرَاَتُ. ہٗ) بیوی، اُس کی ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، ابولہب کی طرف جاتی ہے، حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ اس کا لفظی معنی ایندھن اٹھانے والی، حَطَبُ کے معنی خاردار کانٹے، وہ جنگل سے خاردار کانٹوں کا گٹھا اٹھا کر لاتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے آگے اور آپ کی گزرگاہ بیت اللہ جانے والے راستے میں بچھا دیتی تھی تا کہ آپ کو تکلیف پہنچے۔ ''حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ کے دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ: ''كَانَتۡ تَمۡشِيۡ بِالنَّمِيۡمَةِ بَيۡنَ النَّاسِ لِتُفۡسِدَ بَيۡنَهُمۡ'' لوگوں کے درمیان لگائی بجھائی کرتی پھرتی کہ فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اٹھے۔'' (صفوۃ التفاسیر) فِيۡ جِيۡدِهَا اس کی گردن میں، جِيۡدٌ گردن،

ھَا کی ضمیر واحد مؤنث غائب اِمرأۃ کی طرف جاتی ہے، حَبْلٌ رسی (ہے) مِّنْ مَّسَدٍ مونج کی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

''حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ'' یعنی بہت مضبوط بٹی ہوئی چُبھنے والی رسی، اِس سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک دوزخ کے طوق وسلاسل ہیں اور یہ تشبیہ ''حَمَّالَةَ الْحَطَبِ'' کی مناسبت سے دی گئی ہے کیونکہ لکڑیوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے رسی کی ضرورت پڑتی ہے، لکھتے ہیں کہ اس عورت کے گلے میں ایک ہار بہت قیمتی تھا، کہا کرتی تھی کہ لات وعزیٰ کی قسم، اس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عداوت میں خرچ کر ڈالوں گی، ضروری تھا کہ دوزخ میں بھی اس کی گردن ہار سے خالی نہ رہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس بدبخت کی موت بھی اسی طرح واقع ہوئی، لکڑیوں کے گٹھے کی رسی گلے میں آپڑی جس سے گلا گھٹ کر دم نکل گیا۔'' (تفسیر عثمانی)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسانوں میں سے اللہ تعالیٰ کے رسول وہ نیک اور سعادت مند لوگ ہوئے ہیں جن کی پاکیزہ زندگیاں رب کائنات کے احکام کے تابع ہوتی تھیں اور لوگوں کے لیے بہترین نمونہ بنتی رہیں۔ ان نفوس قدسیہ کی دلوں میں قدر ومنزلت رکھنا ایمان کی نشانی ہے اور ان کی پیروی اور اتباع کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں فلاح وکامرانی کا ذریعہ ہے، خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ نسل انسانیت کے لیے روشنی اور مؤمنوں کے لیے بہترین اسوہ ہے، قرآن اعلان کرتا ہے: فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الاعراف:۱۵۷) ''پھر جو لوگ اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائے اور آپ کی عزت وتعظیم کی اور آپ کی امداد کی (دین کی نشر واشاعت میں ساتھی بنے) اور اس روشنی کی پیروی کی جو ان کے ساتھ بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن حکیم کی) ایسے ہی لوگ پوری طرح فلاح پانے والے ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (بخاری)

’’تم میں سے کوئی ایماندار نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اپنے باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ رکھے۔ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے عقیدت و محبت ہے، اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ آپ کے اتباع اور اطاعت کو حرز جاں بنایا جائے، اس حدیث پر بھی غور کر لیجیے، آپ نے فرمایا:

كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْ خُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى، قِيْلَ وَ مَنْ اَبٰى، قَالَ مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى (بخاری)

’’میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے جنت میں جانے سے انکار کر دیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: بھلا انکار کرنے والا کون ہوگا؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے جنت میں جانے سے انکار کیا۔‘‘

۲) جس طرح دعوتِ انبیاء کو مان لینے پر جنت کی خوشخبری سنائی گئی ہے اسی طرح انبیاء کی دعوت کو قبول نہ کرنے بلکہ اس کی مخالفت کرنے اور اس کے آگے روڑے اٹکانے پر جہنم کی دردناک اور المناک سزا سے بھی ڈرایا گیا ہے قرآن حکیم نے اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا [النساء:۱۱۵] ’’جو شخص رسول کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، دراں حالے کہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اس کو ہم اس طرف چلائیں جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔‘‘

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت اور اتباع و اطاعت سے جنت کو خرید لیا مگر ابولہب اور اس کے ساتھیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت اور بغض سے اور آپ کی شریعت سے انکار اور بغاوت سے جہنم کو اپنے مقدر میں کر لیا۔ اَللّٰهُم اَجِرنا مِنَ النَّار.

...............o...............

سُوْرَۃُ الْاِخْلَاص

اُلاِخلاص اس سورۃ مبارکہ کا محض نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید خالص اور اس کی صفات کا مسئلہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت وتعلیم کا سب سے اہم اور مرکزی نقطہ رہا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء:۲۵)

’’ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے، اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے، پس تم میری بندگی کرو۔‘‘

سب سے پہلے انسان اور سب سے پہلے نبی سیدنا آدم علیہ السلام نے اسی خالص توحید کی اپنے بچوں کو تعلیم دی مگر آہستہ آہستہ اولادِ آدم پھلی پھولی اور چھوٹی چھوٹی بستیوں سے بڑے بڑے قصبات وجود میں آئے تو شیطان نے جو توحید کا ابدی دشمن ہے، انسانوں کے دلوں اور دماغوں کو طرح طرح کے وسوسوں سے بھر دیا، اپنے بزرگوں سے ملنے ملانے کے لیے ان سے ان کے مجسمے بنوا دیے، پھر ان کے لیے نذرونیاز دینا دلانا اور ان کی پوجا پاٹ شروع کرا دی، اور رفتہ رفتہ ان بے جان بتوں کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ ٹھہرا دیا اور انسانوں کا یہ عقیدہ ونظریہ قائم ہو گیا کہ یہ بت ہمیں اللہ سے قریب کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی. (الزمر:۳)

’’وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں [وہ اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ] ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں۔‘‘

باپ دادا سے وراثت میں پائے ہوئے شرک نے ان کی عقلوں کو ایسا مسخ کر دیا تھا کہ یہ بات ان

کے لیے نا قابل فہم ہوگئی تھی کہ اس ساری کائنات کا خالق و مالک اور پروردگار وکارساز بس ایک اللہ ہی ہے اور سب کچھ اس کے اور صرف اسی کے قبضہ واختیار میں ہے اور صرف وہی عبادت اور بندگی کے لائق ہے۔

وہ حسرت وتعجب سے یہ کہتے کہ:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا، اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (ص:۵)

''کیا اس نے سارے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بناڈالا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''

مشرکین کے علاوہ یہود ونصاریٰ بھی جو اہل کتاب تھے، اپنے انبیائے کرام اور ان کی لائی ہوئی آسمانی کتابوں کی اصل تعلیم و ہدایت کو بھلا کر طرح طرح کے مشرکانہ اوہام وخرافات اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں سخت گمراہیوں میں مبتلا ہو چکے تھے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات میں جو ہر قسم کے شرک سے بالا ہے انسانوں کو شریک بنادیا تھا۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (التوبہ:۳۰)

''یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے، اللہ کی مار ان پر، یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔''

حتیٰ کہ فرشتوں کو جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور شب و روز اس کی بندگی میں مصروف ہیں، مشرکین اللہ کا شریک ٹھہرانے میں باز نہ رہے۔ **وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا** (الزخرف:۱۹) ''انہوں نے فرشتوں کو جو اللہ رحمٰن کے خاص بندے ہیں عورتیں قرار دے لیا۔'' ان تمام فرسودہ اوہام اور شرک کی باتوں کو قرآن حکیم نے ختم کر دیا اور پورا قرآن جگہ جگہ توحید کے دلائل سے بھرا پڑا ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کی صفات کو اس سورت الْاِخلاص میں سمودیا گیا ہے۔

آیات:۴ — # سُوْرَةُ الْاِخْلَاص — رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ (۱) اَللّٰہُ الصَّمَدُ (۲) لَمۡ یَلِدۡ ۬ۙ وَ لَمۡ یُوۡلَدۡ (۳) وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (۴)﴾

(اے نبیؐ) کہہ دیجیے وہ اللہ ایک ہے (یگانہ و یکتا ہے)، اللہ بے نیاز ہے (اس کو کسی کی احتیاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں)، نہ اس کی کوئی اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی ہستی اس کے ہمسر اور اس کے برابر ہے۔

﴿قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ﴾ (اے نبیؐ) کہہ دیجیے، وہ اللہ ایک ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"قُلۡ" کہہ دیجیے۔ اس حکم کے اولین مخاطب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ ہی سے سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا رب کون اور کیسا ہے، اور آپ ہی کو حکم دیا گیا کہ اس سوال کے جواب میں آپ یہ کہیں، لیکن آپ ﷺ کے بعد ہر مؤمن اس کا مخاطب ہے، اسے وہی بات کہنی چاہیے جس کے کہنے کا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔

"اللہ" یعنی میرے جس رب سے تم تعارف حاصل کرنا چاہتے ہو وہ کوئی اور نہیں بلکہ اللہ ہے، یہ ان سوال کرنے والوں کی بات کا پہلا جواب ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی نیا رب لے کر نہیں آیا ہوں جس کی عبادت، دوسرے سب معبودوں کو چھوڑ کر، میں تم سے کروانا چاہتا ہوں بلکہ وہ وہی ہستی ہے جس کو تم اللہ کے نام سے جانتے ہو۔ "اللہ" عربوں کے لیے کوئی اجنبی لفظ نہ تھا، قدیم ترین زمانے سے وہ خالق کائنات کے لیے یہی لفظ استعمال کر رہے تھے اور اپنے دوسرے معبودوں میں سے کسی پر بھی اس کا

اطلاق نہیں کرتے تھے، دوسرے معبودوں کے لیے ان کے ہاں اِلٰہ کا لفظ رائج تھا، پھر اللہ کے بارے میں ان کے جو عقائد تھے ان کا اظہار اس موقع پر خوب کھل کر ہو گیا تھا جب ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی، اس وقت خانۂ کعبہ میں 360 بت تھے جن کو انہوں نے اِلٰہ بنا رکھا تھا، مگر مشرکین نے ان سب کو چھوڑ کر صرف اللہ سے دعائیں مانگی تھیں کہ وہ اس بلا سے ان کو بچائے۔ گویا وہ اپنے دلوں میں اچھی طرح جانتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ اس نازک وقت میں ان کی مدد نہیں کر سکتا، کعبے کو بھی وہ اِلٰہوں (بتوں) کی نسبت سے بیت الْاٰلِهه نہیں، بلکہ اللہ کی نسبت سے "بیت اللّٰه" کہتے تھے قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے بارے میں مشرکین عرب کا عقیدہ کیا تھا، مثال کے طور پر:

- سورۃ زخرف میں ہے: "اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔" (آیت: ۸۷)
- سورۃ عنکبوت میں ہے: "اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخر کر رکھا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے...... اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مردہ پڑی ہوئی زمین کو جلا اٹھایا، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔" (آیات: ۶۱ تا ۶۳)
- سورۃ مؤمنوں میں ہے: "ان سے کہو، بتاؤ، اگر تم جانتے ہو، کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے، یہ ضرور کہیں گے اللہ کی...... ان سے پوچھو کہ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ...... ان سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو، ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے اور کون ہے جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور جواب دیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔" (آیات: ۸۴ تا ۸۹)
- سورۃ یونس میں ہے: "ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں [جو تمھیں حاصل ہیں] کس کے اختیار میں ہیں اور کون زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ۔" (آیت: ۳۱)
- سورہ یونس میں ایک اور جگہ فرمایا: "جب تم لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں وشاداں

سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکا یک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے تو اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے، مگر جب اللہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔" (آیات:۲۲-۲۳)

ان آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ تمہارا رب کون ہے اور کیسا ہے جس کی بندگی وعبادت کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو؟ تو انہیں جواب دیا گیا "هُوَ اللّٰهُ" وہ اللہ ہے، اس جواب سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ جسے تم خود اپنا اور ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق اور مدبر اور منتظم مانتے ہو اور سخت وقت آنے پر جسے دوسرے سب معبودوں کو چھوڑ کر مدد کے لیے پکارتے ہو، وہی میرا رب ہے اور اسی کی بندگی کی طرف میں بلاتا ہوں، اس جواب میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ کمالیہ آپ سے آپ آجاتی ہیں، اس لیے کہ یہ بات سرے سے قابل تصور ہی نہیں کہ کائنات کو پیدا کرنے والا، اس کا انتظام اور اس کے معاملات کی تدبیر کرنے والا، اس میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کو رزق دینے والا اور مصیبت کے وقت اپنے بندوں کی مدد کرنے والا، زندہ نہ ہو، سنتا اور دیکھتا نہ ہو، قادر مطلق نہ ہو، علیم اور حکیم نہ ہو، رحیم اور کریم نہ ہو اور سب پر غالب نہ ہو۔" (تفہیم القرآن)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"وہ اللہ احد ہے، اہل لغت نے واحِدٌ اور اَحَدٌ میں یہ فرق کیا ہے کہ اَحَدٌ، وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو اور واحِدٌ وہ ہے جس کی صفات میں کوئی اس کا شریک نہ ہو، غالباً اسی وجہ سے لفظ اَحَدٌ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لیے صفت کے طور پر نہیں آیا، اس سے ہر طرح سے اس کی یکتائی کا علم ہوتا ہے، ہر رشتہ اور قرابت سے پاکی وبرتری اس کا لازمہ ہے، اس سے یہ بات بھی نکلی کہ وہ قدیم [ہمیشہ سے] ہے اور باقی سب حادث ومخلوق، ظاہر ہے کہ جو سب سے پہلے خود بخود تھا، وہ ہمیشہ سے تھا کیونکہ جو کبھی نیست رہا ہو وہ خود ہرگز ہست نہیں ہوسکتا، اس وجہ سے دو باتیں ماننی ضروری ہوئیں، ایک یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور [ہمیشہ رہے گا] دوسری یہ کہ اس کے سوا جو بھی ہیں وہ سب اس کی مخلوق ہیں۔" (تدبر قرآن)

﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ اللہ بے نیاز ہے۔(اس کو کسی کی احتیاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں)

جناب عبدالحی صاحب لکھتے ہیں:

"صَمَدٌ" کا مطلب ہے ایسی ذات جسے کسی کی کسی حالت میں اور کسی کام میں کوئی ضرورت نہ ہو، بلکہ اس کے برخلاف ہر چیز اس کی محتاج ہو، جو خود بے نیاز ہو مگر سب کی دست گیری اور خبر گیری کرے...... مدد حاصل کرنے، تسلی پانے اور سہارا لینے کے قابل اس کے سوا کوئی دوسری ذات ممکن ہی نہ ہو، ہر قسم کی طاقت اور قوت کا مالک ہو، احسان کا سر چشمہ ہو، جب مانگو عطا کرے، حد یہ کہ مانگنے کی خواہش بھی وہی بخشے اور اتنا ہی نہیں بلکہ بن مانگے دے، وہ پشت پناہ ہو اور اس کے سوا کوئی سہارا بنانے کے قابل نہ ہو۔(آسان تفسیر)

﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔

لَمْ يَلِدْ نہ اس نے کسی کو جنا (یعنی اس کی کوئی اولاد نہیں ہے) لَمْ حرف نفی اور مضارع پر جزم دیتا ہے (وَلَدَ، يَلِدُ، وِلَادَةً) جننا، وَلَمْ اور نہ ہی، يُوْلَدْ وہ کسی سے جنا گیا (یعنی وہ کسی کی اولاد بھی نہیں)۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

"نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اللہ کی ہستی ثابت و قائم اور ازلی و ابدی ہے، اس کے حالات میں تغیر نہیں ہوتا، تمام حالات میں مطلق کمال اس کی صفت ہے۔ ولادت کے معنی ہیں پھٹنا اور بڑھنا، عدم یا نقص کے بعد ایک زائد وجود کا ہونا، اور یہ اللہ کے لیے محال ہے، پھر سلسلۂ توالد و تناسل کا تقاضا ہے کہ اللہ کی کوئی بیوی ہو، جو اس کی ہم جنس ہو اور یہ بات بھی اللہ کے لیے محال ہے...... اللہ کے احد ہونے کے مفہوم ہی میں یہ بات مضمر ہے کہ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔" (فی ظلال القرآن) اس میں یہود و نصاریٰ، مشرکین مکہ اور تمام مشرک اور بت پرست قوموں کا رد آ گیا۔

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ اور نہ ہی کوئی ہستی اس کے ہمسر اور اس کے برابر ہے۔

وَلَمْ اور نہ، وَ اور عاطفہ لَمْ، حرف نفی، مضارع پر جزم دیتا ہے، يَكُنْ ہے (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا)

ہونا، كُفُوًا مرتبہ میں برابر (ہمسر)، اَحَدٌ کوئی (بھی)۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

"كُفُوًا" کے معنی مماثل اور ہمسر کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے اعلیٰ و بالا ہے، کوئی اس کے ہمسر اور اس کے برابر نہیں، وہ یکتا و یگانہ خالق ہے، اس کے علاوہ سب مخلوق کا وہ رب ہے اور سب اس کے بندے ہیں۔ وہ ابدی و ازلی ہے اور اس کے علاوہ سب حادث اور فانی اور یہ بھی اس کی شانِ احدیت ہی کا تقاضا ہے۔" (درس قرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

١) اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت ہی بندہ مؤمن کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور جب تک یہ شعور نہ پیدا ہو، نیابت الٰہی کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس تصور توحید کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی دعوت کو قبول کرے، اس دعوت کے منافی اور مخالف الوہیت کے جو بھی تصورات انسانوں نے قائم کر رکھے ہیں ان کا انکار کرے اور عملاً توحید کے اس تصور کو اپنا کر اس کے مطابق زندگی گزارے۔

٢) رب کریم نے انسان کو شکل وصورت اور عقل وفکر کے لحاظ سے اپنی تمام مخلوقات میں سے بہتر اور برتر بنایا ہے، مگر افسوس کہ ان میں سے اکثریت نے ہمیشہ سے احکام الٰہی کو نظر انداز کیا اور انبیاء علیہم السلام کے اتباع کو فراموش کر ڈالا...... کبھی شیطان کے بہکاوے میں آ کر اور کبھی نفس کی خباثتوں کے پیچھے لگ کر اپنا تمام تر شرف وکمال ضائع کر ڈالا اور کبھی شرک اور بت پرستی کی نت نئی راہیں ایجاد کر لیں اور غور وفکر کرنے کی زحمت گوارا ہی نہ کی:

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ(٦) الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ(٧) فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (٨)[الانفطار] "اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ کر تیار کیا۔"

..............o..............

سُورَۃُ الفَلَق

''یہ سورت اور اس کے بعد کی سورت ''الناس'' اللہ کی طرف سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً اور ان کے بعد تمام اہل ایمان کو اس امر کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہیں کہ وہ اللہ کی آغوشِ رحمت اور اس کی (حمیٰ) پناہ گاہ میں پناہ لیں...... ہر پوشیدہ وظاہر اور ہر معلوم ونامعلوم خطرناک شے سے بچنے کے لیے پناہ! یہ بات مجملاً بھی فرمائی گئی اور تفصیل سے بھی بیان کی گئی۔ گویا اللہ سبحان وتعالیٰ ان کے لیے اپنی (حمیٰ) پناہ گاہ کے دروازے کھولتا اور اپنی آغوش رحمت وا کرتا ہے اور ان سے شفقت ومحبت کے ساتھ کہتا ہے...... یہاں آؤ، میری حمیٰ میں آؤ، میری پناہ گاہ میں آؤ، یہاں تم امن اور طمانیت پاؤ گے، آؤ، آؤ میں جانتا ہوں کہ تم کمزور ہو، تمہارے بہت سے دشمن ہیں، تمہارے اردگرد خطرات منڈلا رہے ہیں اور یہاں...... ہاں یہاں امن ہے، طمانیت ہے، سلامتی ہے!'' (فی ظلال القرآن)

''سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے مضامین ایک دوسرے سے قریبی مناسبت رکھتے ہیں اور چونکہ دونوں سورتیں ''اعوذُ'' سے شروع ہوتی ہیں اس لیے ''مُعَوِّذَتین'' [پناہ مانگنے والی دو سورتوں] کے نام سے مشہور ہیں، غور کیجیے کہ قرآن کا آغاز سورۃ الفاتحہ سے ہوتا ہے اور اختتام معوذتین پر...... آغاز میں اللہ رب العالمین رحمان ورحیم اور مالک یوم الدین کی حمد وثنا کر کے بندہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی کی میں بندگی کرتا ہوں اور آپ ہی سے مدد چاہتا ہوں اور سب سے بڑی مدد جو مجھے درکار ہے، وہ یہ ہے کہ مجھے راستہ بتائیے، جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدھا راستہ دکھانے کے لیے اسے پورا قرآن دیا جاتا ہے اور اس کو ختم اِس بات پر کیا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتا ہے کہ میں ہر مخلوق کے ہر فتنے اور شر سے محفوظ رہنے کے لیے آپ ہی کی پناہ لیتا ہوں اور خصوصیت کے ساتھ شیاطین جن وانس کے وسوسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ راہ راست کی پیروی میں وہی سب سے زیادہ مانع ہوتے ہیں''۔ (تفہیم القران)

آیات:۵ سُوْرَةُ الْفَلَق رکوع:۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ(۱) مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ(۲) وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ(۳) وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ(۴) وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ(۵)﴾

آپ کہہ دیجیے کہ میں پناہ لیتا ہوں ہر چیز کو نمودار کرنے والے رب کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے اور اندھیری رات کے شر سے جب اس کا اندھیرا پھیل جائے اور گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والوں کے شر سے اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾

(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ میں پناہ لیتا ہوں ہر چیز کو نمودار کرنے والے رب کی۔

قُلْ فعل امر واحد مذکر حاضر(قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، اَعُوْذُ میں پناہ لیتا ہوں، فعل مضارع واحد متکلم(عَاذَ، یَعُوْذُ، عَوْذًا) التجا کرنا، پناہ لینا، بِرَبِّ الْفَلَقِ صبح کے مالک (کی) رَب کے معنی کائنات میں ہر چیز کا مالک، حاکم، پروردگار مربّی، وہی ہر چیز کو پیدا کرتا ہے اور اس کی نشو ونمو کرتا ہے یہاں تک کہ وہ چیز حد کمال کو پہنچ جاتی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اَلْفَلَقِ' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے صبح لیا ہے لیکن اس کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں، صبح

چونکہ شب کے پردے کو چاک کر کے نمودار ہوتی ہے، اس وجہ سے اس پر بھی اس کا اطلاق ہوا، لیکن پھاڑ کر نمودار ہونے والی چیز صرف صبح ہی نہیں ہے، ہر چیز کسی نہ کسی چیز کے اندر سے اس کو چاک کر کے ہی نمودار ہوتی ہے گٹھلی سے پودا نمودار ہوتا ہے، دانے کو پھاڑ کر کونپل نکلتی ہے، زمین کو پھاڑ کر نباتات اگتی ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چاک کر کے چشمے اور دریا ابلتے ہیں، اِسی طرح انڈے کو پھاڑ کر بچے نکلتے ہیں اور رحم کا منہ کھول کر دوسری تمام زندہ مخلوقات وجود پذیر ہوتی ہیں۔ پھر لفظ فلق کو اس قدر محدود کر دینے کے لیے کیا جواز ہے؟ ہمارے نزدیک اس کو اس کے وسیع معنی میں رکھنا ہی موقع و محل کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے، لغت میں یہ لفظ وسیع معنی میں آیا ہے، قرآن میں جس طرح فَالِقُ الْإِصْبَاحِ آیا ہے (الانعام:۹۶) یعنی پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے، اسی طرح فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى بھی آیا ہے (الانعام:۹۵) یعنی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا، اللہ ہے۔" (تدبر قرآن)

﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔

مِنْ سے حرف جار، شَرِّ شر (برائی) مجرور، مَا جو، اسم موصول، خَلَقَ اس نے پیدا کی، ماضی واحد مذکر غائب (خَلَقَ، يَخْلُقُ، خَلْقًا) پیدا کرنا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"یہ اس مقصد کا حوالہ ہے جس کے لیے تمام عالم کے نمودار کرنے والے رب العالمین کی دہائی کی تلقین کی گئی ہے، فرمایا کہ جس رب نے تمام عالم کو نمودار کیا ہے، اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے شر سے پناہ ان کے پیدا کرنے والے ہی سے مانگو، کسی دوسرے سے نہ مانگو، کوئی دوسرا ان کے شر سے پناہ اسی صورت میں دے سکتا ہے کہ جب وہ ان کو پیدا کرنے والے سے زیادہ طاقتور ہو اور یہ بات بالکل خلاف عقل ہے کہ کوئی چیز خالق کائنات سے زیادہ قدرت و اختیار والی ہو یا ہو سکے، اِس وجہ سے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے شر سے کسی غیر کی پناہ ڈھونڈنا سراسر سفاہت اور حماقت ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس کائنات میں چیزیں جتنی بھی ہیں سب اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، خالق اس کے سوا کوئی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ اصلاً مقصد خیر سے پیدا کی ہیں، لیکن وہ جب چاہے اس کو شر

میں تبدیل کر سکتا ہے، بارش اس دنیا کے لیے سراسر رحمت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اس کو عذاب بھی بنا دیتا ہے، اسی طرح خود انسان اپنی بے خبری اور سوءِ استعمال سے ایک چیز کو جو اصلاً نافع ہے، مضر بنا لیتا ہے، اشیاء کے ان برے پہلوؤں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی اللہ ہی سے استعاذہ کرے، نہ کہ ان اشیا میں سے کسی چیز کو مؤثر بالذّات سمجھ کر ان کی دہائی دینی شروع کر دے، جس طرح مشرک قومیں کرتی ہیں اور نہ اللہ کے سوا کسی 'غوث' یا 'قطب' کو پکارنا شروع کر دے کہ وہ آ کر اللہ کی پکڑ سے اس کو بچائیں، اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے اللہ کے سوا کوئی دوسرا ہرگز رہائی نہیں دے سکتا، آفتوں سے اپنے آپ کو بچانے کی جو جائز تدبیریں انسان اختیار کرتا ہے، مثلاً کسی بیماری میں ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے، تو یہ چیز اس کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ طبیب حقیقی صرف اللہ ہے، شفا صرف اسی کے اختیار میں ہے، اگر وہ شفا نہ دے تو کسی دوسری طاقت کے بس میں نہیں ہے کہ وہ کسی معمولی سے معمولی بیماری سے بھی نجات دے سکے۔" (تدبر قرآن)

﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾

اور اندھیری رات کے شر سے جب اس کا اندھیرا پھیل جائے، (اسی رب کی پناہ لیتا ہوں)۔

وَ اور، عاطفہ، مِنْ سے حرف جار، شَرِّ شر (برائی)، غَاسِقٍ اسم فاعل، رات جبکہ شفق غائب ہو جائے اور تاریکی بڑھ جائے (غَسَقَ اللَّیْلُ، یَغْسِقُ، غَسْقًا) رات کا تاریک ہونا (القاموس الوحید) اِذَا جب، ظرف زمان، وَقَبَ چھا جائے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ اس دنیا کی بقا کے لیے جس طرح دن اور اس کی روشنی و حرارت ضروری ہے، اسی طرح رات اور اس کی خنکی اور سکون، راحت و آرام کے لیے ضروری ہے پھر ظاہری تضاد کے باوصف دنیا کی بقا میں ان دونوں کے توافق کو توحید کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، یہاں اسی رات کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا کی تلقین کی گئی ہے، گویا یہ درس دیا گیا ہے کہ رات کی جو تاریکی تمہاری راحت کے لیے ناگزیر ہے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں یہ چیز بھی ہے کہ اس میں چور، ڈاکو،

قاتل، دشمن اور حشرات اور زہریلے جانور نکلتے ہیں جن سے تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے، شب کے سکون میں ان غیر مطلوب چیزوں کی مداخلت سے یہ نتیجہ نکالنا تو بالکل غلط ہوگا کہ رات کا خالق کوئی اور ہے اور ان میں نمودار ہونے والے ان ناخواندہ مہمانوں کا خالق کوئی اور، پھر دونوں کی دہائی پکاری جائے، بالکل صحیح اور موافق عقل وفطرت بات یہی ہوسکتی ہے کہ ان دونوں کا خالق ایک ہی ہے، اسی نے رات کا سکون بخشا ہے اور وہی اس میں خلل انداز ہونے والی آفتوں سے پناہ دے سکتا ہے، یعنی جس طرح اس کی برکتیں اللہ ہی کے فیض سے ہیں اسی طرح اس کی زحمتیں بھی اس کے اِذن سے ہیں، پس ہر حال میں مرجع اسی کو بنانا چاہیے۔ (تدبر قرآن)

﴿وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ﴾

اور گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والوں کے شر سے (رب کی پناہ لیتا ہوں)۔

وَ اور، عاطفہ، مِنۡ شَرِّ شر سے، النَّفّٰثٰتِ پھونکنے والے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اگر چہ یہ مؤنث ہے لیکن اس سے عورتوں کو مراد لینا لازم نہیں ہے، عربیت کے قاعدے سے آپ اس سے ارواح خبیثہ اور نفوس خبیثہ مراد لے سکتے ہیں، عام اس سے کہ وہ مرد ہوں یا عورتیں اور قطع نظر اس سے کہ ان کا اشارہ یہود ومجوس کی طرف ہو یا عرب کے ساحروں اور کاہنوں کی طرف۔'' (تدبر قرآن)

فِی الۡعُقَدِ گرہوں کے، عُقۡدَة، گانٹھ، گرہ، ذمہ، بار اور معاہدہ اس کی جمع عُقَدٌ آتی ہے، گرہیں، یہاں پر اس کے یہی معنی ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح شیاطین کا وجود ایک حقیقت ہے، اور ان کے شیطانی اعمال کی بھی حقیقت ہے اور ان کے اثرات ہوتے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن جو کچھ ہوتا ہے باذنِ اللہ ہوتا ہے، قرآن حکیم میں جادو کے ضرر ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ''وَمَا هُمۡ بِضَآرِّيۡنَ بِهٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ'' (البقرہ:۱۰۲) اس آیت میں صراحت ہے کہ جادوگروں کے جادو یا سفلی عمل وغیرہ سے جو

ضرر کسی کو پہنچتا ہے اور جو اثر کسی پر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اِذن و حکم کے بغیر نہیں ہوتا، لہٰذا آدمی اپنے رب کی پناہ لے کر اس کی زد سے بچ سکتا ہے، تو اس آیت ''وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ'' کا مطلب یہ ہوا کہ میں ان جادو اور ٹونے ٹوٹکے کرنے والوں کے شر سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں جو گرہوں میں پھونک مار مار کر یہ شیطانی عمل کرتے ہیں۔'' (درس قرآن)

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ﴾ اورحاسد کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

وَ اور، عاطفہ، مِنْ شَرِّ شر سے، حَاسِدٍ حاسد کے، اِذَا جب، حَسَدَ حسد کرے (حَسَدَ، یَحْسُدُ، حَسَدًا) حسد کرنا، کسی کی خوش حالی پر جلنا اور اس کی تمنا کرنا کہ اس کی نعمت اور خوش حالی دور ہو کر مجھے مل جائے تَحَاسَدُوْا، ایک دوسرے پر حسد کرنا۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''حسد کا لفظ ہماری اردو زبان میں بھی مستعمل ہے، اس کا مطلب ہوتا ہے کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر جلنا اور اس کی تدبیر کرنا اور کوشش کرنا کہ وہ اس اچھے حال میں نہ رہے، ظاہر ہے کہ یہ بڑے کمینہ پن کی بات ہے اور دنیا میں بہت سے شر اور فساد اس حسد کی وجہ سے ہوتے ہیں، یہ حسد سخت ترین کبیرہ گناہ ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے ''اِذَا حَسَد'' اس لیے فرمایا گیا کہ حسد کرنے والے کے حسد سے ضرر جب ہی پہنچتا ہے، جب وہ جذبۂ حسد کی تسکین کے لیے عملی کارروائی کرے، جب تک وہ عملی کارروائی نہ کرے اُس وقت تک وہ خود ہی حسد کی آگ میں جلتا بھنتا رہتا ہے، اس کے حسد سے دوسرے کو ضرر اور نقصان اس وقت پہنچ سکتا ہے، جب وہ جذبۂ حسد کے تقاضے سے عملی کارروائی کرے، اس لیے فرمایا گیا ''اِذَا حَسَد''۔ (درس قرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) کائنات کی ہر چیز کا خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس نے پھول اگائے تو ساتھ کانٹے بھی پیدا کیے ہیں، چڑیا اور طوطے ایسے بے ضرر پرندے بھی اس نے بنائے ہیں تو چیتے اور شیر ایسے

خونخوار درندے بھی اسی کی تخلیق ہیں، فرشتے بھی اس کی مخلوق ہیں جو سراپا خیر ہیں اور شیطان (ابلیس) اور اس کے ہمنوا (جنوں اور انسانوں میں سے) اسی کے پیدا کردہ ہیں، ضروری ہے کہ ہم تمام نقصان دہ چیزوں کے شر سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ لیں تب ہی ہم ساحل مراد سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

۲) انسان کے ساتھ مختلف قسم کے شر لگے ہوئے ہیں...... کہیں نفس امارہ کی شرارتیں ہیں اور کہیں شیاطین کے مکر وفریب ہیں، کہیں دشمنوں کی حیلہ سازیاں ہیں اور کہیں اپنوں کی مکاریاں ہیں اور حاسدین کے حسد ہیں اور شب کے وقت چوروں اور ڈاکوؤں کے خطرات بڑھ جاتے ہیں، ان تمام باتوں سے محفوظ رہنے کے لیے رب کائنات کی پناہ گاہ ہی ہمارے لیے سکون اور طمانیت کا سامان ہے۔

۳) اے امت مسلمہ! اس وقت تو حاسدین نے تمہارے گرد گھیرا ڈالا ہوا ہے اور تمہیں ہر طرح سے زک دینے کے لیے کمر کس چکے ہیں۔ اس وقت رب کائنات کی پاکیزہ تعلیمات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اس کی ہدایات کو اپنے لیے مشعل راہ بناؤ اور اسی کی پناہ میں چلے آؤ، وہ تمہیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔

..................o..................

سُوۡرَةُ النَّاس

''اس سے قبل ''سورۃ الفلق'' میں پہلے بالعموم ساری مخلوق کے شر سے اور اس کے بعد بالخصوص تین چیزوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی تھی، وہاں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''ربّ الفلق'' کا ذکر کیا گیا تھا اور گویا اسی ایک صفت کے حوالے سے ان سب چیزوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی تھی۔ ''سورۃ الناس'' میں صرف ایک چیز کے شر سے پناہ مانگنے کے کلمات کی تلقین فرمائی گئی ہے اور یہاں پر اللہ تعالیٰ کی تین صفات عالیہ کا ذکر کیا گیا ہے ۱-رَبُّ النَاسِ، ۲-مَلِکِ النَّاسِ، ۳-اِلٰهِ النَّاسِ، اس میں واضح اشارہ ہے کہ شیاطین کی وسوسہ اندازی کا شر اور فتنہ شدید ترین ہے، اس سے محفوظ رہنے کے لیے بندوں کو خاص طور سے اللہ تعالیٰ کی اِن صفات عالیہ کا سہارا لینا چاہیے اور اپنے آپ کو اس خالقِ کائنات کی حفاظت کے حصار میں دے دینا چاہیے جو اس پوری کائنات اور تمام انسانوں کا رب ہے، پروردگار حقیقی ہے، بادشاہ اور فرمانروا ہے اور اِلٰہ ہے یعنی معبود برحق اور ملجاو ماوا ہے۔'' (درس قرآن)

''بِرَبِّ النَّاسِ'' ربوبیتِ مطلق صرف اسی کے لیے ثابت ہے......اس سے صفت ربوبیت میں ہر قسم کے شریک کی نفی آ گئی، ''مَلِکِ النَّاسِ'' حاکمیت و مالکیت مطلقہ بھی صرف اسی کے لیے ثابت ہے......اس سے صفت حاکمیت و مالکیت میں ہر قسم کے شریک کی نفی ہوگئی، ''اِلٰهِ النَّاسِ'' معبودیت صرف اسی کے لیے ثابت ہے......اس سے صفتِ معبودیت میں ہر قسم کے شریک کی نفی ہوگئی۔ جاہلی قوموں نے عموماً حق تعالیٰ کی انہی تین صفات......ربوبیت، مالکیت اور معبودیت میں دوسروں کو شریک ٹھہرایا، قرآن مجید نے یہاں تینوں صفات کو یکجا کر کے جامع تعلیم توحید دے دی ہے۔ ''سورۃ الفلق'' جس طرح دنیوی مضرتوں سے استعاذہ کی جامع تھی، یہ سورۃ مبارکہ دینی مضرتوں سے استعاذہ کی جامع ہے۔ (تفسیر ماجدی)

آیات:٦ **سُوۡرَةُ النَّاس** رکوع:١

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ (١) مَلِکِ النَّاسِ (٢) اِلٰهِ النَّاسِ (٣) مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۙ الۡخَنَّاسِ (٤) اَلَّذِىۡ يُوَسۡوِسُ فِىۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ (٥) مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ (٦)﴾

(اے نبی ﷺ) آپ کہیے کہ میں انسانوں کے رب کی، انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں، وسوسہ اندازی کرنے والے، چھپ جانے والے (شیطان) کے شر سے جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے، (چاہے) وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾

(اے نبی ﷺ) آپ کہیے کہ میں انسانوں کے رب کی پناہ لیتا ہوں۔

قُلۡ کہیے، فعل امر، واحد مذکر حاضر (قَالَ، یَقُوۡلُ، قَوۡلًا) کہنا، اَعُوۡذُ میں پناہ لیتا ہوں، فعل مضارع واحد متکلم (عَاذَ، یَعُوۡذُ، عَوۡذًا، وَ عِیاذًا) کسی کی پناہ میں آنا، کسی سے بچ کر کسی کی حفاظت میں آنا جیسے ''اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ'' میں شیطان مردود سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ و حفاظت میں آتا ہوں۔ (القاموس الوحید)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''بِرَبِّ النَّاسِ، ''الرّب'' (پروردگار) کا مطلب جو ابتداء سے ہی، جب کہ انسان ابھی ماں کے پیٹ میں ہی ہوتا ہے، اُس کی تدبیر و اصلاح کرتا ہے [اسے پیدا کرتا ہے اور اس کی نشو ونما کرتا ہے] حتیٰ

کہ وہ بالغ و عاقل ہو جاتا ہے، پھر وہ یہ تدبیر چند مخصوص افراد کے لیے نہیں کرتا، بلکہ اپنی تمام مخلوقات کے لیے کرتا ہے، یہاں صرف انسانوں کا ذکر انسان کے اس شرف و فضل کے اظہار کے لیے ہے جو تمام مخلوقات پر اسے حاصل ہے۔'' (تفسیر احسن البیان)

﴿مَلِکِ النَّاسِ﴾ انسانوں کے بادشاہ کی (پناہ میں آتا ہوں)۔

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

''اگرچہ اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت اور بادشاہت وغیرہ میں تمام مخلوقات شامل ہیں، لیکن ان صفات کا کامل ظہور انسانوں میں ہوا، کسی دوسری مخلوق میں نہیں ہوا، اس لیے ''رب'' اور ''ملک'' کی اضافت ان ہی کی طرف کی گئی ہے، نیز وسواس میں مبتلا ہونا بجز انسان کے دوسری مخلوق کی شان بھی نہیں۔'' (تفسیر عثمانی)

﴿اِلٰهِ النَّاسِ﴾ انسانوں کے معبود کی (پناہ میں آتا ہوں)۔

مولانا محمد منظور نعمانی کہتے ہیں:

''اِلٰہ کے معنی ہیں معبود، یعنی وہ ذات جس کی عبادت اور پرستش کی جائے، [رب، ملک، اِلٰہ] ان تینوں صفات میں بہت قریبی تعلق ہے، جو ہستی حقیقی معنی میں لوگوں کی رب ہوگی، وہی حقیقی بادشاہ اور فرمانروا بھی ہوگی اور سب اس کے زیرِ حکومت ہوں گے، اقتدارِ اعلیٰ اسی کا ہوگا اور جس کی یہ شان ہوگی ظاہر ہے کہ وہی اور صرف وہی معبود برحق ہوگا، جس کی عبادت اور پرستش کی جائے اور اپنی حاجتوں کے لیے اُس سے دعا کی جائے، اسی طرح اِس ''دعائے استعاذہ'' کے ساتھ بڑی بلاغت کے ساتھ عقیدہ توحید کا بھی اقرار و اظہار ہے۔'' (درس قرآن)

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ لا الْخَنَّاسِ، الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾

(میں پناہ لیتا ہوں، رب کائنات کی) وسوسہ اندازی کرنے والے، چھپ جانے والے (شیطان) کے شر سے، جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

مِنْ شَرِّ برائی سے (اس کی)، الْوَسْوَاسِ وسوسہ انداز، دل میں برا خیال ڈالنے والا (مراد ہے شیطان)، (وَسْوَسَ، يُوَسْوِسُ، وَسْوَسَةً) کسی کے دل میں برا اور غلط خیال پیدا کرنا، نیکی سے ہٹا کر بدی پر ابھارنا، (القاموس الوحید) الْخَنَّاسِ (خَنَسَ، يَخْنِسُ، خَنْسًا، وَ خُنُوْسًا) پیچھے رہ جانا، نظروں سے چھپ جانا، اسی سے اَلْخَنَّاسِ شیطان، لوگوں کو دھوکہ دینے والا، گویا شیطان وہ ہے جو چھپ کر لوگوں پر حملے کرتا ہے، اس کے معنی پیچھے بھاگنے کے بھی آتے ہیں، جو بندے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں ان سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگتا ہے۔ اَلَّذِیْ جو، اسم موصول ہے، يُوَسْوِسُ خیال ڈالتا ہے، وسولے پیدا کرتا ہے مضارع واحد مذکر غائب، فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ لوگوں کے سینوں میں، صُدُوْر کا مفرد صَدْرٌ، سینہ۔

﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ﴾ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

مِنَ سے، حرف جار، الْجِنَّةِ جن، انسانوں کے بالمقابل پوشیدہ مخلوق، یہ بھی مکلّف ہیں یعنی روز قیامت ان کا بھی حساب کتاب ہوگا، خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنوں اور انسانوں دونوں کی طرف رسول ہیں اور آپ کی لائی ہوئی شریعت دونوں کے لیے ہے۔

سورۂ انعام میں فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا. (الانعام:۱۱۲)

"اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کیے تھے، کچھ آدمی اور کچھ جن، ان میں سے بعض بعضوں کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے شیاطین ایک دوسرے کو چالبازیاں اور حیلے سکھاتے، تا کہ لوگوں کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا کر سکیں۔"

اس آیہ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ (شیاطین) جن و انسان کا گروہ ہر دور اور ہر زمانے میں رہا ہے، انبیاء کرام جو اللہ تعالیٰ کے مقرب ترین بندے ہوتے ہیں ان سے بھی ان شیاطین (جن و انس) کی دشمنی رہی ہے، مگر یہ نفوس قدسیہ اللہ کی رحمت سے جادۂ حق پر ڈٹے رہے۔

شیاطین کی وسوسہ اندازی پر سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''ہم اس بات کو جانتے ہیں کہ آدم اور ابلیس کے مابین جنگ قدیم ہے...... بہت قدیم زمانے سے ہے، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ابلیس نے اپنی فطرتِ شر کے باعث اور اپنے تکبر و غرور اور انسان سے اپنے حسد اور کینہ کی بنا پر آدم کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے، شیطان نے اللہ سے اس کی اجازت چاہی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی اس حکمت کی بنا پر...... جسے وہ خوب جانتا ہے......اس کی اجازت دے دی، لیکن انسانوں کو غیر مسلح نہیں رکھا، اللہ نے اس کے لیے ایمان کی ڈھال بنائی، ذکر الٰہی کا ساز و سامان اس کے لیے تیار کیا اور استعاذہ...... اللہ سے پناہ چاہنے...... کا اسے ہتھیار دیا، اب اگر انسان اپنی اس ڈھال، اپنے ساز و سامان اور اپنے اس ہتھیار سے کام نہ لے تو اس کی ذمہ داری، اسی پر آتی ہے اور تنہا وہی ملامت کا مستحق ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ، سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''شیطان ابن آدم کے قلب پر چھایا رہتا ہے، جب انسان اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے، تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے، لیکن جب وہ اللہ سے غافل ہوتا ہے تو شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔'' (بخاری)

رہی انسانوں کی وسوسہ اندازی تو ہم ان کے بہت سے وساوس کو جانتے ہیں، ہم ان کے ایسے وساوس کو جانتے ہیں جو شیاطین (جن) کے وساوس سے زیادہ شدید ہیں۔

- برا ساتھی اپنے ساتھی کے قلب و دماغ میں برے خیالات اس طرح ڈالتا رہتا ہے کہ اسے محسوس تک نہیں ہوتا، وہ اپنے آپ کو اس [مکار دوست] سے بچانے کی فکر بھی نہیں کرتا اس لیے کہ وہ اسے اپنا قابل اعتماد دوست سمجھتا ہے۔
- ارباب اقتدار کے غلط مشیر اور برے حاشیہ نشین انہیں بہکاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ انہیں ظالم، جابر اور مفسد فی الارض بنا کر چھوڑتے ہیں، جو پیداوار کو بھی تباہ کرتے ہیں اور نسل انسانی کو بھی۔
- چغل خور اور دروغ گو اِس طرح چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی باتیں بالکل سچ اور حق ہیں اور ان پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔
- غیر اخلاقی اور شہوانی چیزیں فروخت کرنے والے انسانی فطرت کو گمراہ کرنے میں لگے رہتے ہیں،

ان کی وسوسہ اندازی کو صرف دل کی بیداری اور اللہ تعالیٰ کی مدد ہی سے دفع کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح بیسیوں وسوسہ ڈالنے والے اور وسوسہ ڈال کر پیچھے ہٹ جانے والے ہیں جو دامِ فریب بچھاتے اور اسے چھپا کر رکھتے ہیں، وہ دلوں کے مخفی گوشوں میں، جنہیں وہ جانتے اور محسوس کرتے ہیں، وسوسہ اندازی کرتے ہیں، یہ جنوں سے زیادہ بدترین ہیں اور ان سے بڑھ کر چپکے سے حملہ کرنے والے ہیں!

انسان ان مخفی وساوس کو دفع کرنے سے عاجز ہے، اس لیے اللہ نے اس خطرناک جنگ کے سلسلے میں اسے ساز و سامان، ڈھال اور اسلحہ کی نشاندہی کر دی ہے۔

وسواس......وسوسہ اندازی کرنے والے شیطان کو ''خَنَّاسٌ'' کہا گیا ہے، اس میں ایک معنی خیز نکتہ ہے، یہ صفت ایک طرف تو یہ واضح کرتی ہے کہ شیطان چھپا رہتا ہے اور جونہی موقع پاتا ہے چپکے سے آتا ہے اور وسوسہ اندازی کرنے لگتا ہے، لیکن دوسری طرف وہ شیطان کی کمزوری کو بھی نمایاں کرتی ہے...... شیطان اس شخص کے مقابلے میں کمزور ہے جو ناخوشگوار صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکنا اور بیدار رہتا ہو اور جو اپنے سینہ اور دل کی حفاظت کرتا رہتا ہو، وسوسہ اندازی کرنے والا، جن ہو یا انسان جب اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے، چھپ جاتا ہے، جہاں سے آیا تھا وہیں لوٹ جاتا اور روپوش ہو جاتا ہے یا جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دقیق و لطیف تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا ''مومن اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا اور چھپ جاتا ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہوتا ہے تو شیطان وسوسہ اندازی کرنے لگتا ہے۔''

یہ حقیقت وسوسہ اندازی کرنے والے شیطان کے مقابلہ کے سلسلے میں دل کو قوت اور طاقت بخشتی ہے، شیطان ''خناس'' ہے، وہ پیچھے ہٹ جانے والا اور چھپ جانے والا ہے اور مؤمن جنگ کے لیے تیار ہو تو شیطان کمزور و ناتواں ہے۔

لیکن ایک اور پہلو سے یہ ایک طویل اور نہ ختم ہونے والی جنگ ہے......شیطان ہمیشہ چھپا رہتا ہے، وہ ہمیشہ غفلت کا منتظر رہتا ہے، ایک بار کی بیداری مستقل بیداری کی جگہ نہیں لے سکتی...... یہ جنگ جس کا پانسہ پلٹتا رہتا ہے تا قیامت جاری رہے گی جیسا کہ قرآن کریم نے مختلف مواقع پر اس کی تصویر کشی کی ہے

مثلاً سورۃ اسراء میں کتنے عجیب وغریب انداز میں ہے:

''اور اس بات کو یاد کرو کہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا، آدم کو سجدہ (تعظیم) کرو تو انہوں نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے، اس نے کہا (باری تعالیٰ) کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے؟ پھر وہ بولا'' دیکھ تو سہی، کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے، تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں، بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' اچھا تو جا، ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں، تجھ سمیت ان سب کے لیے جہنم ہی بھرپور جزا ہے، تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے، پھسلا لے، ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالا، اور مال واولاد میں ان کا ساجھی (ساتھی) بن، اور ان سے (جھوٹے) وعدے کر...... اور شیطان ان سے محض دھوکے کے وعدے کرتا ہے...... بیشک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہ ہوگا اور تیرا رب کافی کارساز ہے (وہ اپنے نیک بندوں کو شیاطین کے چنگل سے ضرور بچائے گا)۔'' (اسراء:۶۱ تا ۶۵)

شیطان اور انسان کے مابین جنگ کی فطرت اور اس میں شر کے محرکات و داعیات...... خواہ شر براہ راست شیطان (ابلیس) سے صادر ہو یا اس کے شر پسند کارکنوں سے...... کے سلسلے میں قرآن کے اس نقطہ نظر سے واضح ہوتا ہے کہ انسان اس جنگ میں مغلوب و ناتواں نہیں ہے...... اس کے رب، فرماں روا اور احکم الحاکمین کا اقتدار و تسلط تمام مخلوقات پر ہے، اُس نے ابلیس کو انسان سے جنگ کرنے کی اجازت تو دے دی ہے مگر اس کے پیشانی کے بال اسی رب قدیر کے ہاتھ میں ہیں، اس نے شیطان کو صرف ان لوگوں پر مسلط کیا ہے جو اپنے رب، اپنے فرماں روا اور اپنے اللہ کریم سے غافل ہیں، جو بندے اللہ کو یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں، وہ اس کے شر اور اس کی مخفی حرکات و داعیات سے محفوظ رہتے ہیں، خیر کا تعلق اس قوت سے ہے جس کے سوا فی الواقع کوئی قوت نہیں اور اس حقیقت سے ہے جس کے سوا کوئی حقیقت نہیں، اس کا تعلق اس اللہ سے ہے جو رب بھی ہے، فرماں روا بھی اور رب کائنات بھی جبکہ شر کا ربط اس شیطان (ابلیس) سے ہے جو وسوسہ ڈال کر پیچھے ہٹ جاتا ہے، جو مقابلہ میں کمزوری دکھاتا ہے، جو مقابلہ میں روپوش ہو جاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ قادر، قدیر سے پناہ مانگنے پر شکست کھا جاتا ہے۔

خیر اور شر کے سلسلے میں یہ کامل ترین تصور ہے، یہ بہترین تصور بھی ہے کیونکہ اس کے باعث دل

شکست خوردگی سے محفوظ رہتا اور قوت، اعتماد اور طمانیت سے معمور ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہے ابتداء میں بھی اور انتہا میں بھی، اسی پر بھروسہ ہے، اسی سے توفیق ملتی ہے، اسی سے مدد چاہی جاتی ہے اور وہی مدد دینے والا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسان اور شیطان کے درمیان روز اول سے ہی جنگ ہے، جو انسان اللہ تعالیٰ کے وفادار بندے بن کر اپنے مولا و مالک سے ''استعاذہ'' کرتے رہتے ہیں، وہ شیطان اور اس کے ساتھیوں سے بچ نکلتے ہیں اور دنیا و آخرت میں ایسے ہی لوگوں کو کامیابی ملتی ہے، یہی مخلصین کا گروہ ہے اور جو شیاطین اور نفس کے بہکاوے میں آجاتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں رسوائی ہے۔

۲) شیاطین کے پھندوں اور وساوس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرنا، اس پر غور و فکر کرنا، اس کے احکام کو حرز جاں بنانا، سیرت طیبہ کو اپنے لیے مشعل راہ بنانا، نمازوں کی پابندی کرنا اور خشوع و خضوع سے باجماعت ادا کرنا، غربا و مساکین کی مدد کرنا اور ہمہ وقت اپنے خالق و مالک کا خوف دل میں سمائے رکھنا بہت ضروری ہے۔ قرآن حکیم نے اس سلسلے میں یہ بات سکھائی ہے:

رَبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَ اَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (المومنون:۹۸)

''اے میرے رب! میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ میں آتا ہوں، اور اے میرے رب میں تو اس سے بھی تیری پناہ میں آتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔''

تَمَّتْ كَلِمَاتُ رَبِّی وَ رَبِّكُمْ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِی وَ لَكُمْ وَ لِسَائِرِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ!

...............o...............

قرآن حکیم اور حدیث رسول ﷺ کا ربط

اللہ رب العالمین نے اپنی آخری کتاب قرآن حکیم خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم وتربیت کا سروسامان اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَدَّبَنِیْ رَبِّی فَاَحْسَنَ تَادِیْبِی

''میرے رب نے مجھے بہترین آداب سے نوازا ہے''۔

پھر قرآن اس کی یوں شہادت دیتا ہے:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم

''بلاشبہ آپ (ﷺ) اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان قبول کرنے والوں (صحابہ کرامؓ) کے سامنے نہ صرف آیات کی تلاوت کرتے اور کتاب کی تعلیم دیتے بلکہ انہیں اس کی حکمت وبصیرت سے بھی آگاہ فرماتے اور اس طرح ان کا تزکیہ نفس ہوتا۔

یَتْلُوْا عَلَیہِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَ یُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (الجمعۃ:۲)

''وہ انہیں کتاب (کی آیات) سناتے، ان کی زندگی سنوارتے (تزکیہ نفس فرماتے) اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے''۔

حافظ عتیق الرحمٰن لکھتے ہیں:

''حکمت کے معنی دانائی اور سمجھ بوجھ کے ہیں، امام شافعیؒ نے اپنی کتاب الرسالۃ میں بے شمار دلائل سے ثابت کیا ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں بھی کتاب کے ساتھ حکمت کا لفظ آیا ہے تو اس سے مراد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے''۔ (تیسیر القرآن)

پھر قرآن حکیم اعلان کرتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىo

''وہ (ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، جو کہتے ہیں وہ تو نازل کردہ وحی ہوتی ہے''

حافظ عتیق الرحمٰن لکھتے ہیں:

''یا وہ وحی جلی ہوتی ہے یا وحی خفی، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میری زبان سے کبھی کوئی بات حق کے سوا نہیں نکلی'' (ابوداؤد) (بحوالہ تیسیر القرآن)

یہ بات ذہن میں رہے کہ وحی جلی تو قرآن حکیم ہے جبکہ وحی خفی وہ باتیں ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفہیم دین کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ کو سمجھائیں اور بتلائیں، انہیں احادیث مبارکہ کہتے ہیں، قرآن کے طالب علم کے لئے ان فرمودات رسول ﷺ کا مطالعہ بھی ضروری ہے، ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا اور آپ ﷺ ہی اس کے بہترین شارح اور مفسر ہو سکتے ہیں، قرآن و احادیث کے مطالعہ سے ایسا ذوق نشو و نما (Develop) پاتا ہے کہ آپ قرآن حکیم کی کوئی آیہ مبارکہ تلاوت کرتے ہیں تو فوراً اس کی تشریح میں کسی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے یا پھر کسی حدیث کو پڑھتے ہیں تو فوراً اس کی توضیح کے لئے کوئی آیت قرآنی ذہن میں آ جاتی ہے، آیئے چند آیات مبارکہ اور چند احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۱) اخلاص

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ، وَيُقِيْمُوْا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (البيّنة:۵)

''اور انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے یکسو ہو جائیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، یہی درست اور صحیح دین ہے۔''

اس آیہ مبارکہ میں خلوص نیت کا تذکرہ ہے اسی سے تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (بخاری، مسلم)

''یقیناً اعمال (کی مقبولیت) کا دار و مدار نیتوں سے وابستہ ہے''۔

یعنی صوم و صلوٰۃ، حج اور زکوٰۃ، صدقات و خیرات اور دیگر اعمال صالحہ اس وقت تک قبول نہیں ہوتے جب تک

کہ ان میں رضائے الٰہی پیش نظر نہ رہے۔

۲) عدل واحسان

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَأمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحِسَانِ (النحل:۹۰)

''بلاشبہ اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے''۔

حدیث مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ الْمُقْسِطِیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ، اَلّذِیْنَ یَعْدِلُوْنَ فِیْ حُکْمِھِمْ وَ اَھْلِیْھِمْ وَمَا وُلُّوْا (رواہ مسلم)

''کوئی شک نہیں کہ عدل کرنے والے نور کے منبروں پر ہوں گے وہ جو اپنی حکومت میں، اپنے گھروں میں اور جو کام ان کے سپرد ہوا ہو اس میں عدل کریں''۔

۳) توبہ واستغفار

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوبُوْآ اِلَیْہِ (ھود:۳)

''اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کے حضور توبہ کرو''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَأَتُوْبُ اِلَیْہِ فِی الْیَوْمِ أَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً (رواہ البخاری)

''اللہ کی قسم! میں اللہ سے بخشش کا طلبگار رہتا ہوں اور دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ توبہ کرتا ہوں''۔

۴) صبر پر انعام

اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاۃِ، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ (البقرہ:۱۵۳)

''صبر اور نماز سے مدد لو، بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''

حدیث شریف میں آتا ہے:

مَا یُصِیْبُ الْمُسْلِمُ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا ھَمٍّ وَلَا حَزَنٍ وَلَا أَذًی وَلَا غَمٍّ حَتَّی الشَّوْکَۃِ یُشَاکُھَا اِلَّا کَفَّرَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ خَطَایَاہُ (بخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کسی مسلمان کو جو مصیبت پہنچتی ہے خواہ وہ کسی قسم کی ہو، بیماری ہو، رنج ہو، غم ہو، تکلیف وایذا ہو، حتیٰ کہ اسے ایک کانٹا بھی چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے صلہ میں اس کی خطائیں معاف کر دیتا ہے''۔

۵) استقامت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ (حٰم السجدہ:۳۰)

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (بوقت موت) اور ان سے کہتے ہیں کہ ''تم نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔''

اب دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استقامت کے بارے میں کتنی جامع نصیحت فرماتے ہیں:

وَعَنۡ أَبِی عَمۡرٍو وَقِیۡلَ أَبِی عَمۡرَۃَ سُفۡیَانِ بۡنِ عَبۡدَاللّٰہُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ قُلۡتُ: یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ قُلۡ لِّیۡ فِی الۡاِسۡلَامِ قَوۡلًا لَا أَسۡأَلُ عَنۡہُ أَحَدًا غَیۡرُکَ قَالَ: قُلۡ: اٰمَنۡتُ بِاللّٰہِ: ثُمَّ اسۡتَقِمۡ (راہ مسلم)

''حضرت ابو عمرو اور وہ ابو عمرہ سفیان بن عبداللہ کے نام سے بھی معروف ہیں، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے اسلام کے بارے میں ایسی بات بتلا دیجئے کہ میں پھر کسی سے نہ پوچھوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہو ''میں اللہ پر ایمان لایا، پھر (اس ایمان اور عقیدہ پر) ثابت قدم رہو''۔

آیئے اب چند احادیث مبارکہ پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کا ربط قرآن میں دیکھتے ہیں:

۱) صدق کا ثمرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

مَنۡ سَأَلَ اللّٰہَ تَعالَی الشَّھَادَۃَ بِصِدۡقٍ بَلَّغَہُ مَنَازِلَ الشُّھَدَاءِ، وَاِنۡ مَاتَ عَلٰی فِرَاشِہٖ (رواہ مسلم)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے شہادت کا سچائی کے ساتھ سوال کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو شہیدوں کے مرتبے کو پہنچائے گا اگر چہ وہ اپنے بستر پر دنیا سے رخصت ہو''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (توبہ:۱۱۹)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو''۔

۲) غصہ ضبط کرنے کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ، اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِی یَمْلِکُ نَفْسَهُ عِنْدَ الغَضَبِ (بخاری، مسلم)

''بہادر وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ دے (حقیقت میں) بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔''

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (الشوریٰ:۴۳)

''اور جو شخص صبر سے کام لے اور (لوگوں سے) درگزر کرے تو یہ یقیناً بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے''۔

۳) والدین سے حسن سلوک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رَغِمَ أَنْفٌ ثُمَّ رَغِمَ اَنْفٌ ثُم رَغِمَ أَنْفٌ مَنْ اَدْرَکَ اَبَوَیْهِ عِنْدَ الْکِبَرِ: اَحَدَ هُمَا اَوْ کِلَاهُمَا فَلَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّةَ (رواہ مسلم)

''اس شخص کی ناک خاک آلود ہو (یعنی خوار ہو۔ اور تین مرتبہ یہ جملہ فرما کر اس کی اہمیت اور نزاکت کو واضح کیا) جس نے اپنے ماں باپ (ان میں سے ایک یا دونوں) کو بڑھاپے میں پایا (اور ان کی خدمت گزاری سے) جنت میں داخل نہ ہوا''۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ کِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا (بنی اسرائیل:۲۳)

تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی (جو رب العالمین ہے) اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو (اگر ایسا نہ کیا تو خوار ہو جاؤ گے)''۔

۴) مسلمانوں کے ساتھ مہربانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَکٰی مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰی لَهُ

سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ والْحُمّٰی (بخاری، مسلم)

''مسلمانوں کی مثال ان کے آپس کی محبت، رحمدلی اور مہربانی میں جسم کی طرح ہے جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم جاگتا ہے اور اس کو بخار ہو جاتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (الحجر:۸۸)

''آپ اور اہل ایمان کے ساتھ نرمی اور تواضع سے پیش آیئے''۔

۵) کامل ترین مومن کی تعریف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا وَخِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَائِھِمْ (رواہ ترمذی)

''سب سے کامل مومن وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے بہترین وہ ہیں جن کا سلوک اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَاشِرُوْھُنَّ بِا لْمَعْرُوفِ (النساء:۱۹)

''اور تم ان کے ساتھ بھلے (اور عمدہ) طریقہ سے زندگی بسر کرو''۔

قارئین! آپ نے غور کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ فرمودات قرآن حکیم سمجھنے میں مفید اور معاون ہیں، قرآن حکیم میں اصول ہیں تو ان کی تشریح اور وضاحت احادیث مبارکہ میں ملتی ہے۔ مثلاً قرآن حکیم میں نماز قائم کرنے کا حکم ہے، تو نماز پڑھنے کی کیفیت، رکعات کی تعداد، اوقات کا تعین، امام کی صفات اور نماز سے متعلق دوسری باتیں حدیث مبارکہ میں ملیں گی۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اللہ رب العزت کا کلام بے مثل اور بے مثال ہے اور نسل انسانیت آج تک اس جیسی چند آیات بھی پیش کرنے سے عاجز رہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیّین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زبان وبیان کی لطافت ونظافت سے نوازا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی ہے، اس میں مٹھاس اور چاشنی ہے، بصیرت اور روشنی ہے، صداقت اور پیغام ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اَفْصَحُ الْعَرَب (عربوں میں فصاحت وبلاغت میں بلند ترین) ہیں۔

قرآن کا طالب علم حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ محدثین کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع اور تدوین کرنے میں محنت شاقہ کی۔ اس سلسلے میں طول وطویل سفر کئے۔ شب و روز مصروف رہے اور اس خدمت جلیلہ کو بھوکے اور پیاسے رہ کر بھی سرانجام دیا۔امام بخاریؒ کی سیرت پڑھی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مردمومن نے حدیث مبارکہ کو جمع کرنے کیلئے کتنی تکلیف اور مشقت سے اِدھراُدھر سینکڑوں میل پا پیادہ سفر کیے،بعض اوقات سفر کے دوران جنگل کے پتوں سے بھوک کومٹایا۔

(دمشق) علاقہ شام کے معروف عالم دین علامہ ابوزکریا محی الدین، یحیٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اخلاق کے باب میں بڑی مفید کتاب ''ریاض الصالحین'' کے نام سے تالیف فرمائی ہے، اس کتاب میں انہوں نے ہر باب کے شروع میں اسی مضمون سے متعلق آیات قرآن درج فرمادی ہیں جس سے قرآن کے طالب علم کے لئے قرآن وحدیث کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، عاجز قرآن حکیم کے طلبا کے لئے اس کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہے، یہ عربی متن اور اردو ترجمہ اور مفید حواشی کے ساتھ مل جاتی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے دلوں کو قرآن کی روشنی سے منور فرمادے۔آمین!

(شیخ عمر فاروق)

قرآن مجید کے فنی محاسن

سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ گزشتہ صدی کے مایۂ ناز مفسر قرآن بہترین ادیب، عزم واستقامت کے پیکر، بیباک اور نڈر داعی اسلام گزرے ہیں۔ ظالم وجابر حاکم وقت کے سامنے کلمۃ الحق بلند کرنا ان کی زندگی کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ اس سلسلہ میں قید وبند کی سخت ترین ابتلا وآزمائش جھیلنا گوارا کیا مگر ظالم حاکم کے سامنے معافی مانگنے کا ہلکا سا لفظ بھی زبان پر نہ آیا اور اسی کلمۃ الحق بلند کرنے کی پاداش میں جام شہادت نوش کیا۔

یہ اقتباس ان کی مشہور کتاب ''التصویر الفنی فی القرآن'' سے پیش کیا جارہا ہے اس کتاب میں انہوں نے قرآن کے مناظر کی فنی نقشہ کشی، حسی تخیل، فن کے لحاظ سے نظم کلام، قرآنی قصے، قصوں کے اغراض ومقاصد، قصہ گوئی میں فن اور دین کا امتزاج، قصہ کے فنی خصائص، قصہ میں واقعہ نگاری کا جز، قرآن کے بیان کردہ انسانی نمونے، وجدانی منطق اور قرآن کا طریق دعوت، ان تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے اس میں سے یہ اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔

مثالی واقعات

۱- باغ والوں کا واقعہ

اب ہم ان مثالی واقعات کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو قرآن نے بیان کیے ہیں۔

ذرا چشم تصور کو وا کیجئے ہم باغ والوں (اصحاب الجنہ) کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ باغ دنیا میں ہے اخروی جنت نہیں ہے باغ والے رات کو کچھ سوچ بچار کر رہے ہیں۔ فقراء ومساکین اس باغ کا پھل کھایا کرتے تھے مگر باغ کے مالک اب ان کو محروم کر کے تنہا اس سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ وہ اس منصوبے کو کس طرح عملی جامہ پہناتے ہیں۔

اِنَّا بَلَوۡنٰهُمۡ كَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ‌ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَيَصۡرِمُنَّهَا مُصۡبِحِيۡنَ(۱۷) وَلَا يَسۡتَثۡنُوۡنَ(۱۸)[القلم]

''ہم نے ان لوگوں کی اسی طرح آزمائش کی ہے جس طرح باغ والوں کی آزمائش کی تھی جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہوتے ہم اس کا میوہ توڑ لیں گے اور ان شاءاللہ نہ کہا''۔

انہوں نے رات کو یہ منصوبہ بنایا کہ صبح سویرے باغ کا پھل توڑ لیں گے اور فقراء کے لیے کچھ بھی باقی نہ چھوڑیں گے۔ ہم سردست ان کے منصوبے کو نظر انداز کر کے دیکھتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں کیا ہوا۔ وہ رات کو نظر نہیں آرہے اور کائنات کا تھیٹر ان سے خالی ہے اچانک ناظرین کیا دیکھتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں ایک پوشیدہ سی حرکت نمودار ہو رہی ہے۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ (١٩) فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ (٢٠)[القلم]

''سو وہ ابھی سو رہے تھے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے (راتوں رات) اس پر ایک آفت پھر گئی تو وہ ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی''۔

یہ سب کچھ ان کی بے خبری میں ہوا۔ جب صبح ہوئی تو ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ چلو چل کر پھل توڑ لیں۔ انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ رات کی تاریکی میں باغ پر کیا حشر گزر گیا ہے۔

فَتَنَا دَوْا مُصْبِحِيْنَ (٢١) اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ (٢٢) فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَا فَتُوْنَ (٢٣) اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ (٢٤)[القلم]

''جب صبح ہوئی تو وہ لوگ ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو تو وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج یہاں تمہارے پاس ہرگز کوئی فقیر نہ آنے پائے''۔

اب تھوڑی دیر کے لیے ناظرین کو چپ رہنا چاہیے اور سردست باغ والوں کو بتانا نہیں چاہیئے کہ ان کے باغ پر کیا گزری۔ ابھی تمسخر و مذاق پر مشتمل وہ قہقے بھی بلند نہیں ہونے چاہئیں جن کا وقت اب آیا چاہتا ہے اور جن میں ابھی تھوڑی سی دیر ہے ناظرین دیکھ رہے ہیں کہ باغ والے فریب خوردہ ہیں۔ وہ چپکے چپکے باتیں کرتے جا رہے ہیں کہ کہیں باتیں سن کر کوئی محتاج نہ آجائے۔ ناظرین اپنے قہقوں کو کب تک دبائے رکھیں گے۔ اب جی کھول کر ہنسی کا وقت آ گیا۔ ان کے ساتھ اب سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ:-

وَغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ (٢٥)[القلم]

''اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر (ہیں)''

بے شک وہ محروم رکھنے پر قادر ہیں......مگر اپنے کو محروم رکھنے پر محتاجوں کو نہیں......اب اچانک انہیں باغ کی بربادی کا پتہ چلتا ہے۔ ناظرین یہ دیکھ کر جتنا چاہیں ہنسیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ (٢٦)[القلم]

''پھر جب اس باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ بیشک ہم راستہ بھول گئے ہیں''۔

کہنے لگے یہ ہمارا وہ باغ نہیں ہے جو پھلوں سے لدا ہوا تھا دراصل ہم راستہ بھول کر کسی اور جگہ آ گئے ہیں۔لوگو! ہمیں راستہ بتاؤ:۔

بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ (۲۷)[القلم] ''بلکہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی''

قَالَ اَوۡسَطُهُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ لَوۡلَا تُسَبِّحُوۡنَ (۲۸) قَالُوۡا سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ (۲۹)[القلم]

''ایک جوان اُن میں فرزانہ تھا بولا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ (تب) وہ کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار پاک ہے بے شک ہم ہی قصوروار تھے''

مگر وقت کھو کر اب افسوس کا کیا فائدہ؟ جس طرح دستور ہے کہ جب کسی کام کا برا نتیجہ برآمد ہوتا ہے تو اس کام کے شرکاء باہم ایک دوسرے پر الزام دھرتے ہیں۔اسی طرح یہ بھی کرنے لگے:۔

فَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَلَاوَمُوۡنَ [القلم:۳۰]

''پھر ایک دوسرے کو مخاطب کر کے باہم الزام دینے لگے''

پھر یکا یک ایک دوسرے کو مجرم قرار دینے کی بجائے سب اعتراف جرم کرتے ہیں یہ عین ممکن ہے یہ اعتراف ان کے لیے مفید ثابت ہو اور ضائع شدہ باغ کے بجائے انہیں اور باغ مل جائے۔

قَالُوۡا يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيۡنَ (۳۱) عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَنَا خَيۡرًا مِّنۡهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوۡنَ (۳۲) [القلم]

''کہنے لگے ہائے شامت ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے امید ہے کہ ہمارا پروردگار اس کے بدلے میں ہمیں اس سے بہتر باغ عنایت کرے ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتے ہیں''۔

۲-دو باغوں والے شخص کا قصہ

آیئے اب آپ کو ایک اور باغ والے کا قصہ سنائیں۔جس کے ایک نہیں دو باغ تھے اور باغ بھی اس باغ سے کہیں بڑے جس کا ذکر آپ نے سنا۔اس کا واقعہ ایک دوسرے ساتھی کے ساتھ وابستہ ہے جس کے پاس باغات تو نہ تھے مگر اسکا سینہ نور ایمان سے ضرور منور تھا۔یہ دونوں شخص اپنے اپنے گروہ کا نمونہ پیش کرتے تھے۔دو باغوں والا اس دولت مند شخص کا نمونہ پیش کرتا تھا جو دولت وثروت کے گھمنڈ میں آ کر اس بڑی طاقت کو بھول گیا ہو جس کے قبضہ میں زندگی اور اس کے تمام لوازم ہیں۔وہ اس زعم باطل میں مبتلا تھا کہ یہ خوشحالی اور فارغ البالی ابدی ودائمی ہے وہ قوت وشوکت سے کبھی محروم نہیں ہوگا اس کے مقابلے میں دوسرا ساتھی صرف ایمان کو اپنے لیے سرمایۂ عزت وافتخار تصور کرتا تھا۔ہمیشہ اپنے پروردگار کو یاد کرتا اور سمجھتا کہ یہ خوشحالی اپنے محسن کی یاد دلاتی ہے۔اس لیے اس کی حمد وثناء کرتے رہنا

چاہیئے اور کفر وجحو د سے احتراز برتنا چاہیے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا(۳۲) كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا(۳۳)[الکھف]

''اوران سے دو شخصوں کا حال بیان کردو جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ (عنایت) کیے تھے اوران کے گرداگرد کھجوروں کے درخت لگادیئے تھے اوران کے درمیان کھیتی پیدا کردی تھی۔ دونوں باغ (کثرت سے) پھل لاتے اوراس (کی پیداوار) میں کسی طرح کی کمی نہ ہوتی اوردونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کررکھی تھی۔''

ان آیات سے دونوں باغوں کی تصویر کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ کس قدر سرسبز وشاداب تھے۔ یہ پہلا منظر ہے۔اب دوسرا منظر ملاحظہ فرمایئے۔

وَ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا [الکھف:۳۴]

''اور(اس طرح) اس (شخص) کو(ان کی) پیداوار (ملتی رہتی) تھی تو (ایک دن) جبکہ وہ اپنے دوست سے باتیں کررہا تھا کہنے لگا کہ میں تم سے مال ودولت میں بھی زیادہ ہوں اور جتھے (اور جماعت) کے لحاظ سے بھی زیادہ عزت والا ہوں''

کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ بات اپنے ساتھی سے اس وقت کہی جب دونوں ان باغات کی طرف جارہے تھے۔کچھ بعید نہیں کہ باغات کے دروازے تک پہنچ گئے ہوں۔ کیونکہ اس کے بعد یہ الفاظ ہیں:-

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا (۳۵) وَّ مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا(۳۶)[الکھف]

''اپنے حق میں ظلم کرتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا کہنے لگا کہ میں نہیں خیال کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو اور نہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت برپا ہو اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا بھی جاؤں تو (وہاں) ضرور اس سے اچھی جگہ پاؤں گا۔''

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شخص تکبر وغرور اور سرکشی کی آخری حد تک پہنچ گیا تھا۔غور فرمایئے کہ اس کے غریب ساتھی پر اس کی گفتگو کا کیا اثر ہوگا؟ اس کے پاس تو نہ باغ ہے نہ مال ودولت۔اعوان وانصار بھی اسکے یہاں موجود نہیں۔اس میں شک نہیں کہ وہ مومن ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو ذلیل نہیں سمجھتا۔وہ اپنے رب کی عزت کو کبھی نہیں بھولتا۔وہ اپنے باغی ساتھی کو راہ راست پر لانے کے فریضے کو کبھی نظرانداز نہیں کرتا۔وہ اسے زجر وتوبیخ بھی کرتا ہے وہ اپنے مغرور ساتھی کو یاد دلاتا ہے کہ اس کی تخلیق مٹی جیسی حقیر چیز سے ہوئی ہے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلًا(۳۷) لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا(۳۸) وَلَوْ لَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا (۳۹) فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا (۴۰) اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا(۴۱) [الکہف]

''تو اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا کہنے لگا کہ تم اس (خالق) سے کفر کرتے ہو جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر تمہیں پورا مرد بنایا مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور (بھلا) جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ کیوں نہ کہا اگر تم مجھے مال واولاد میں اپنے سے کمتر دیکھتے ہو تو عجب نہیں میرا پروردگار مجھے تمہارے باغ سے بہتر عطا فرمائے اور اس (تمہارے باغ) پر آسمان سے آفت بھیج دے تو وہ چٹیل میدان ہو جائے یا اس (کی نہر) کا پانی گہرا ہو جائے تو پھر تم اسے نہ لا سکو''

یہاں پہنچ کر دونوں ساتھیوں کے درمیان یہ سین ختم ہو جاتا ہے ایک ساتھی مرغے کی طرح گردن اکڑائے ہوئے ہے۔اس کے ہرے بھرے باغ نے اس کو مغرور بنا دیا ہے۔اس کے مقابلے میں دوسرا ساتھی مومن ہے اور ایمان کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے وہ اپنے ساتھی کو وعظ نصیحت بھی کرتا رہتا ہے اسے بتاتا ہے کہ باغ کو سرسبز وشاداب دیکھ کر اسے کیا کرنا چاہیئے تھا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ساتھی اس کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔یہ فطری بات ہے کہ اس کی بے حسی کو دیکھ کر دین دار ساتھی کو غصہ آ جاتا ہے وہ بارگاہ خداوندی میں دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالی اس کے باغ کو تباہ وبرباد کر دے اور وہ ایک بے آب وگیاہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے۔یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے اور وہ اسے تلاش بھی نہ کر سکے پانی کا لانا تو خیر بڑی بات ہے غصہ کی حالت ہی میں دونوں ساتھی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اب ہم یہ دیکھنے کے متمنی ہیں کہ پھر کیا ہوا؟ ملاحظہ فرمائیں:

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا[الکہف:۴۲]

''اور اس کے میووں کو عذاب نے آگھیرا اور وہ اپنی چھتریوں پر آ کر رہ گیا تو جو مال اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر (حسرت سے) ہاتھ ملنے لگا اور کہنے لگا کہ کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتا''

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالی نے اس مومن کی دعا قبول کر لی جسے بلاوجہ تنگ کیا گیا تھا ہم دیکھتے ہیں کہ مرد مومن کا ساتھی

اس بات پر کف افسوس مل رہا ہے کہ اس کا کیا دھرا سب ضائع ہوگیا۔ باغ تباہی سے ہمکنار ہو چکا ہے اب حسرت وندامت کے اظہار کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے اب وہ اس بات پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ وہ شرک کا مرتکب کیوں ہوا؟ آیئے اب تباہی وبربادی اور اعتراف واستغفار کے اس منظر کو ختم کردیں۔ اب پردہ گرتا اور یہ سین ختم ہوجاتا ہے۔

(تالیف: سید قطب شہیدؒ، ترجمہ: غلام احمد حریریؒ)

....

قیامت اور عذاب وثواب

ان مناظر کا ایک مقصد زندگی بعد موت اور حساب وکتاب کے بعد جنت ودوزخ کی عکاسی ہے یہ مناظر کبھی تو جنت ودوزخ دونوں کو مادی شکل میں پیش کرتے ہیں جنہیں قوت حاسہ لمس سے محسوس کرتی ہے اور کبھی معنوی صورت میں پیش کرتے ہیں جس کا ادراک انسان کا نفس ناطقہ ہی کرسکتا ہے اور کبھی دونوں صورتیں یک جا ہوجاتی ہیں۔

دوزخ میں جسموں کو داغا جائے گا:-

چنانچہ ٹھوس مادی شکل میں عذاب کا بیان اس صورت میں ہوتا ہے

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۴) يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۳۵) [توبہ]

”دردناک عذاب کی خوشخبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا...... یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزا چکھو“۔

یہاں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والوں کا حشر چشم تصور کے سامنے آگیا ہے وہ مال ودولت جسے وہ دنیا میں سونا چاندی کی شکل میں جمع کرتے رہے تھے آج اسے دوزخ کی آگ میں سرخ کر کے ان کے اعضاء وجوارح کو داغا جارہا ہے اور استہزاءً یہ کہا جارہا ہے۔ لو یہ ہے تمہارا وہ خزانہ جسے تم دنیوی زندگی میں جمع کرتے رہے تھے آج ذرا

اس کا مزہ چکھو۔"

دوزخیوں کے سروں پر کھولتا ہوا پانی:۔

ایک دوسرے مقام پر مجسم عذاب کی یوں عکاسی کی گئی ہے۔

هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِىۡ رَبِّهِمۡ فَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِيَابٌ مِّنۡ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِيۡمُ (۱۹) يُصۡهَرُ بِهٖ مَا فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ وَالۡجُلُوۡدُ (۲۰) وَلَهُمۡ مَّقَامِعُ مِنۡ حَدِيۡدٍ (۲۱) كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا مِنۡ غَمٍّ اُعِيۡدُوۡا فِيۡهَا ۚ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ (۲۲)[الحج]

"یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں۔ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصے تک گل جائیں گے اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے جب کبھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزہ"۔

منکرین حق کو دوزخ میں برہنہ جسم یوں ڈال دیا گیا ہے کہ اب آتش دوزخ ہی ان کے جسم کے گرد لپٹ کر ان کا لباس بن گئی ہے۔ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جا رہا ہے جو ان کے دماغ اور قلب وجگر اور امعاء وجلود کو گھلائے جا رہا ہے۔ جب بھی وہ اس ناقابل برداشت وروح فرسا تکلیف سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں لوہے کے گرز مار مار کر انہیں دوبارہ وہیں دھکیل دیا جاتا ہے اور ان کی خبر لینے والے دوزخ کے کارندے انہیں جھڑک کر یوں مخاطب ہوتے ہیں "اونہوں! اپنے جسم وروح کے جلنے کا مزہ یہیں چکھو نکل بھاگنے کی صورت نہیں۔ اف کتنا دردناک منظر ہے!

اہل جنت کے لیے عیش و بہار:۔

اسی طرح ٹھوس مادی نعمتیں مجسم صورت میں اس طرح بیان کی گئی ہیں:

وَاَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ (۲۷) فِىۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ (۲۸) وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ (۲۹) وَّ ظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ (۳۰) وَّ مَآءٍ مَّسۡكُوۡبٍ (۳۱) وَّ فَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ (۳۲) لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَةٍ (۳۳) وَّ فُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ (۳۴) اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً (۳۵) فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡكَارًا (۳۶) عُرُبًا اَتۡرَابًا (۳۷) لِّاَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ (۳۸)[الواقعہ]

"اور دائیں بازو والے دائیں بازو والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا! وہ بے خار بیریوں اور تہ بر تہ چڑھے ہوئے کیلوں، اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں دواں پانی اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں اور اونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دینگے اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن"۔

اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ لَحُسۡنَ مَاٰبٍ(۴۹) جَنّٰتِ عَدۡنٍ مُّفَتَّحَۃً لَّہُمُ الۡاَبۡوَابُ (۵۰) مُتَّکِئِیۡنَ فِیۡہَا یَدۡعُوۡنَ فِیۡہَا بِفَاکِہَۃٍ کَثِیۡرَۃٍ وَّ شَرَابٍ (۵۱) وَ عِنۡدَہُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ اَتۡرَابٌ (۵۲) ہٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِیَوۡمِ الۡحِسَابِ (۵۳)[صٓ]

''(اب سنو کہ) متقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے ہمیشہ رہنے والی جنتیں، جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے خوب خوب فواکہ اور مشروبات طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی...... ''یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں حساب کے دن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے''۔

سبحان اللہ! کتنا دلکش اور پر بہار منظر ہے اس حیات ناپائیدار میں انسان اس سے بہتر عیش و آرام اور اس سے زیادہ پر لطف و پر بہار زندگی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ آنکھیں بند کر کے ذرا چشم تصور کو وا کیجئے کیا عجیب بہار ہے وسیع باغات ہیں جن میں کبھی ختم نہ ہونے والے پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہیں جن کے بیچوں بیچ ہر دم رواں پانی کے چشمے بہہ رہے ہیں ان چشموں کے کنارے درختوں کے گھنے ٹھنڈے سائے میں نہایت حسین وجمیل ہم عمر نوجوان اور باحیا بیویوں کی معیت میں اونچی نشست گاہوں پر گاؤ تکیہ لگائے اہل جنت فروکش ہیں جی بھر کر قسم ہا قسم کے پھلوں اور شراب طہور سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور بار بار طلب کر رہے ہیں۔ بھئی اور لو! ضیافت کی یہی تو چیزیں ہیں جو آج کے دن تمہیں مہیا کرنے کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، جواب میں کہا جاتا ہے۔

یہ ہے جنت کی وہ ابدی نعمت، جس سے انسان کے کام ودہن لذت اندوز ہوں گے اور جسے یہاں محسوس ومجسم شکل میں لوگوں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔

غور سے دیکھیں تو جنت ودوزخ دونوں الگ الگ راہیں ہیں جن میں نفوس انسانی بالکل منفرد شکلیں اختیار کر جاتے ہیں یا یوں کہئے کہ ان کے چہروں پر کوئی عجیب وغریب قسم کی پرچھائیں پڑی ہے۔ قرآن نے اس کیفیت کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے۔

اہل جنت کی باہم دوستی:۔

جنت کی تصویر ان الفاظ میں:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا (مریم:۹۶) ''یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں عنقریب رحمٰن ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کرے گا''۔

وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا (النساء:۶۹)

''اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء

اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں"۔

اہل دوزخ کی حسرت:۔

اور عذاب دوزخ کے بارے میں:

اِنَّا اَنۡذَرۡنٰکُمۡ عَذَابًا قَرِیۡبًا ۚۖ یَّوۡمَ یَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰہُ وَ یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا (النبا:۴۰)

"بے شک ہم نے قوم کو ایک ایسے عذاب سے ڈرایا ہے جو قریب ہی آنے والا ہے جس دن کوئی شخص اپنے ان اعمال کو اپنے نامہ اعمال میں لکھا دیکھ لے گا جو اس نے دنیا میں اپنے ہاتھ سے کیے تھے اور کافر حسرت سے کہے گا، اے کاش! میں مرنے کے بعد ہو گیا ہوتا مٹی!"

وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ وُقِفُوۡا عَلٰی رَبِّہِمۡ ؕ قَالَ اَلَیۡسَ ہٰذَا بِالۡحَقِّ ؕ قَالُوۡا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ (الانعام:۳۰) "کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ یہ کہیں گے ہاں اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے! وہ فرمائے گا اچھا تو اب اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو"۔

الغرض ان سب مشاہد میں جنت و دوزخ کا نقشہ انسان کے قلب و ضمیر میں ایک طرح کی بے آمیز مسرت واطمینان اور محبت یا بے میل ندامت و رسوائی اور نفرت کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔

(تالیف: سید قطب شہیدؒ، ترجمہ: نصر اللہ خان خازن)

امثال القرآن

تمثیل کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی غیر واضح اور غیر محسوس حقیقت کو مخاطب کے فہم سے قریب تر لانے کے لیے کسی ایسی چیز سے تشبیہ دی جائے جو واضح اور محسوس ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ جو چیز عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے تمثیل کے ذریعے سے گویا اس کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے قرآن حکیم میں یہ طرز بیان بڑی کثرت کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ جن حقائق سے وہ آگاہ کرنا چاہتا ہے وہ قریب قریب سب کے سب غیر مرئی و غیر محسوس ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید کی تمثیلات کا مضمون بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں تدبر کرنا مطالب قرآن کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ علامہ ابن قیمؒ کی کتاب ''امثال القرآن'' سے اقتباس پیش خدمت ہے۔ (علامہ ابن قیمؒ)

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ، اِتَّخَذَتْ بَیْتًا، وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (العنکبوت:۴۱)

جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے ان کی مثال مکڑی سی ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔

یہاں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ مشرکین تو مکڑی کی طرح کمزور و ناتواں ہیں ہی لیکن ان کے اولیاء وشرکاء ان سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور محض ہیں۔ سوان مشرکین کی ذاتی کمزوری و بے چارگی اور پھر اپنے سے بھی بے بس تر اولیاء سے مدد وقوت حاصل کرنے کی مثال، مکڑی اور اس کے گھر کی سی ہے۔ اس مثل کے تحت مشرکین کے انتہائی خسران کا ذکر ہے کہ اگرچہ وہ بے یار و مددگار رہیں لیکن وہ اپنی محرومی اور کمزوری کے نقطہ کمال پر اس وقت پہنچے جب کہ انہوں نے اپنے سے بھی زیادہ مجبور مخلوق کو اپنا والی و مددگار بنایا جس سے وہ سوائے ضعف وخسران کے کچھ نہیں پا سکتے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مشرکین و کفار سبھی جانتے ہیں کہ تار عنکبوت کمزور ترین شے ہے پھر اس سے لو کانو یعلمون (کاش یہ لوگ جانتے) کے ذریعے ان کی واقفیت وعلم کی نفی کیوں کی گئی ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح

ہے،آیت کا مقصدان کے اس علم کی نفی کرنا نہیں ہے کہ مکڑی کا گھر سب سے زیادہ کمزور ہے بلکہ اس علم کی نفی کرتا ہے کہ خدائے واحد کے سوا جو معبود اور اولیاء ٹھیرائے جاتے ہیں ان کی قوت اور قدرت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے اگر وہ اس حقیقت کو جانتے ہوتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہی اولیاء ان کو قوت و جبروت بخشیں گے۔ لیکن اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں ہے،اور نہ کبھی ثابت ہوئی۔ اس مضمون کی بکثرت آیتیں ملتی ہیں جن میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے مثلاً ایک جگہ قرآن کہتا ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ(۷۴) لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ(۷۵)[یٰسٓ]

اور انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے معبود بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے مددگار ہوں گے مگر وہ ہرگز مددگار نہ ہوں گے۔ اور وہ خود لشکروں کے لشکر (جواب دہی کے لیے) حاضر کیے جائیں گے۔

دوسری جگہ ہے:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا(۸۱) كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا(۸۲)[مریم]

''اوران لوگوں نے خدن کے سوا اور معبود بنا لئے ہیں تا کہ وہ ان کے لیے (موجب عزت و) مدد ہوں۔ ہرگز نہیں، وہ (معبودانِ باطل) ان کی پرستش سے انکار کریں گے اور اُن کے دشمن (ومخالف) ہوں گے۔''

ایک مقام پر مشرکین کی ہلاکت وتباہی بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (ھود:۱۰۱)

''اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا اور جب تیرے پروردگار کا حکم (عذاب) آیا تو خدا کے سوا وہ جن معبودوں کو پکارا کرتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے (بلکہ) انہوں نے ان کی تباہی کچھ اور بڑھا دی۔''

ان چاروں مقامات پر یہ حقیقت آشکار کی گئی ہے کہ جس نے اللہ کو چھوڑ کر شرکاء اور اولیاء کا دامن سربلندی وسرفرازی اور نصرت وامداد حاصل کرنے کے لیے پکڑا وہ ناکام رہا اور اس کی یہ عبادت مفید و منفعت بخش ہونے کی بجائے الٹی وبال جان بن جائے گی۔ یہ مثال جو اوپر بیان ہوئی شرک کے ابطال، مشرکین کے خسران اور ان کے انجام کی ہولناکی اور تباہ کاری کی سب سے زیادہ روشن اور بلیغ تمثیل ہے۔

اسماء القرآن

یہ بات بڑی واضح ہے کہ کسی ذات، شخص یا چیز کے زیادہ نام اور اچھے القاب اس کی زیادہ خصوصیت وفضائل پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے بہت سے اچھے اچھے نام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کی دلیل ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قرآن مجید (جو کلام اللہ ہے) کے بھی بہت سے اسماء والقاب ہیں جو اس کے عالی مرتبت، عظیم الشان اور بلند مقام والا ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

ذیل میں ہم قرآن مجید کے اسماء والقاب قرآن کی روشنی میں ذکر کر رہے ہیں۔

(۱) **اَلْکِتَابُ:** لکھی ہوئی یا جمع کی ہوئی کتاب

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

حٰمٓ(۱) وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ(۲)[الزخرف]

''حم۔اس کتاب مبین کی قسم''

درج ذیل وجوہ کی بنا پر قرآن مجید کو''الکتاب'' کہا گیا ہے:

۱- کتاب: یہ مصدر ہے اور اس کے اصل معنی جمع کرنا کے ہیں اور یہ مکتوب (جمع کی ہوئی کتاب) کے معنی میں ہے۔ کتاب کے لفظ سے ہی ذہن میں یہ تصور ابھرتا ہے کہ یہ ایک منظّم اور مرتب چیز ہے۔ بکھرے ہوئے اوراق کو کتاب نہیں کہا جاتا۔

اس لحاظ سے قرآن کو کتاب اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں مختلف علوم ومعارف، واقعات وقصص اور خبریں منظّم اور مربوط صورت میں جمع کی گئی ہیں۔

۲- کتاب کے معنی اگر''لکھا ہوا'' کیے جائیں تو یہ اس لحاظ سے ہے کہ قرآن لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ(۲۱) فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۲۲) [البروج]

''بلکہ وہ عزت والا قرآن ہے لوح محفوظ میں (لکھا ہوا) ہے۔''

یہ بھی ممکن ہے کہ مآل اور نتیجے کے لحاظ سے اسے ''کتاب'' کہا گیا ہو۔ کیونکہ نبی ﷺ نے قرآن لکھوانے کا اہتمام کیا۔قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتب وحی کسی صحابی کو بلا کر اسے لکھنے کا حکم صادر فرماتے۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خود بھی قرآن لکھتے۔ ابتداء میں لوگوں کے لیے قرآن اور حدیث میں امتیاز کرنا مشکل امر تھا تو آپ ﷺ نے حدیث لکھنے سے منع فرمادیا۔آپ ﷺ نے فرمایا:

لا تکتبوا عنی، ومن کتب عنی غیر القران فلیمحه (مسلم باب فی احادیث متفرقه، باب التثبت فی الحدیث)

''میری طرف سے کچھ نہ لکھو، جس نے قرآن کے علاوہ لکھا ہے وہ اسے مٹادے''۔

بعد میں آپ ﷺ نے حدیث لکھنے کی بھی اجازت دے دی تھی۔

۳- ''کتاب''، مجموعہ قوانین کو بھی کہا جاتا ہے بلکہ اس کتاب کو ''الکتاب'' کہنا زیادہ زیب دیتا ہے جس میں احکام کے ساتھ ساتھ قوانین بھی موجود ہوں۔ذیل میں ہم قرآن مجید کے چند مقامات کا تذکرہ کر رہے ہیں جو اس کے قانونی کتاب ہونے کی وضاحت کرتے ہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی (البقرۃ:۱۷۸)

''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے بارے قصاص فرض کیا گیا ہے''

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (البقرہ:۱۸۳)

''تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے''۔

کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا نِ الْوَصِیَّةُ (البقرہ:۱۸)

''تم میں کسی کی موت قریب ہو اور وہ مال چھوڑ رہا ہو تو وصیت تم پر فرض کی گئی ہے۔''

قرآن مجید میں اس کے قانونی کتاب ہونے کی وضاحت اس انداز سے بھی ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰهُ (النساء:۱۰۵)

''یقیناً ہم نے حق کے ساتھ تمہاری طرف یہ کتاب نازل کی تاکہ تم اللہ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔''

۴- کتاب کا لفظ خط (چٹھی) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآن مجید میں ہے:

اِنِّیٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتَابٌ کَرِیْمٌ (النمل:۲۹)

''میری طرف ایک عزت والا خط آیا ہے۔''

اس اعتبار سے یہ (قرآن) اللہ رب العالمین کی طرف سے اپنے بندوں کے نام کھلا خط ہے۔

(۲) **اَلْمُبِیْنُ:** واضح یا صاف بیان کرنے والی

اس نام کی دلیل مذکورہ حوالہ ہی ہے۔ یہ کتاب واضح ہے غور وخوض اور خلوص نیت کے ساتھ پڑھنے والے کے لیے ہے۔اس میں قطعاً کوئی الجھن نہیں اس کے احکام واوامر اور نواہی بالکل واضح ہیں یا یہ حق کو باطل سے بالکل الگ تھلگ کر دیتی ہے۔

(۳) اَلْقُرْآنُ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّهٗ لَقُرْآنٌ كَرِيْمٌ (الواقعة:۷۷)

''بے شک یہ عزت والا قرآن ہے۔''

لفظ قرآن کے بارے مختلف آراء ہیں، جن میں سے مشہور درج ذیل ہیں۔

۱) یہ لفظ غیر مشتق ہے اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی محمد ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب (کلام اللہ) پر علم یعنی مخصوص نام کے طور پر بولا جاتا ہے۔ جیسے تورات، انجیل اور زبور کے الفاظ دیگر آسمانی کتب کے نام ہیں۔

۲) یہ ''قرن'' سے لیا گیا ہے جس کے معنی ''ملانا'' کے ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن کو اس لیے قرآن کہتے ہیں کہ اس میں سورتیں، آیات اور حروف ملائے گئے ہیں۔

۳) یہ قرء کا مصدر ہے (یعنی پڑھنا) اور مفعول کے معنی میں ہے اس لحاظ سے قرآن کے معنی ہیں پڑھی جانے والی کتاب۔

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ قرآن مجید دنیا کی تمام الہامی اور غیر الہامی کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔

(۴) اَلْكَرِيْمُ: عزت واحترام والا

اس کی دلیل بھی مذکورہ حوالہ ہے۔ قرآن کا ایک ادب واحترام تو یہ ہے کہ اس کو ترتیل وتجوید کے ساتھ پڑھا جائے اور اسے سمجھ کر اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ جو آدمی قرآن کے خلاف زندگی بسر کر رہا ہے وہ قرآن کا ادب واحترام کرنے والا نہیں۔

دوسرا اس کا ظاہری ادب ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ جس قدر اس کی ظاہری عزت وتوقیر کرتے ہیں شاید وہ کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے ہاں یہ کتاب نہایت محترم ہے۔

(۵) كَلَامُ اللّٰهِ: اللہ کا کلام

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ (التوبة:۶)

''اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دو حتی کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔'' (ممکن ہے اس پر کلام اللہ کا اثر ہو جائے)

کیا قرآن کا یہ شرف کوئی کم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ خالق و مالک کا کلام ہے؟

اس سے اللہ تعالیٰ کا متکلم ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر چہ اس کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں کہ اللہ کا کلام کیسے کرتا ہے کئی لوگ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا انکار کرتے ہیں۔ مذکورہ آیت اور دیگر نصوص سے ان لوگوں کی تردید کرتی ہیں۔

(۶) النُّوۡرُ: روشنی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ نُوۡرًا مُّبِيۡنًا (النساء:۱۷۵)

''ہم نے تمہاری طرف واضح روشنی نازل کی ہے''

قرآن جہالت وتعصب اور ضلالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں واضح روشنی کا کام دیتا ہے۔

(۷) هُدٰى: ہدایت ورہنمائی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ (یونس:۵۷)

''(قرآن) ایمان والوں کے لیے رہنمائی اور رحمت (کا ذریعہ) ہے''

''هُدًى'' مصدر ہے اور اسم فاعل کے مفہوم میں ہے۔ یعنی رہنمائی کرنے والا رہنما۔ قرآن نے ہمیں زندگی کی تاریک راہوں میں رہنمائی اور روشنی فراہم کی ہے اسی رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے حقائق کے بارے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن کی رہنمائی تمام انسانوں کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هُدًى لِّلنَّاسِ (البقرہ:۱۸۵)

''یہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے''

لیکن اس رہنمائی سے ایمان والے اور متقی ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ (البقرہ:۱)

''اس میں کوئی شک نہیں یہ پرہیزگاروں کے لیے (ہدایت کا) ذریعہ ہے۔''

(۸) رَحۡمَةٌ: مہر ومحبت

مذکورہ حوالہ ہی اس کی دلیل ہے۔انسانیت جہالت وضلالت کے اندھیروں میں بھٹک رہی تھی ان حالات میں قرآن کتاب رحمت بن کر نازل ہوا۔

نقصانات اور نامرادی کے طوفان کے مقابل قرآن نے انسان کو اپنے دامن رحمت میں چھپالیا اور یہ قیامت تک کے لیے انسانوں کے لیے سامان رحمت ہے۔قرآن نے معاشی معاشرتی اور نا اخلاقی ناہمواریوں کو دور کر کے ایک عظیم انقلاب برپا کردیا۔

(۹) **اَلْفُرْقَانُ:** حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (الفرقان:۱)

"وہ ذات بہت بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا۔"

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ (البقرہ:۱۸۵)

"رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا،لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت وفرقان (حق وباطل کے درمیان فرق کرنے) کے کھلے دلائل بنا کر۔"

قرآن کوفرقان کہنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ تبدیل شدہ پہلی کتب ساویہ کی تعلیمات کوقرآن نے الگ تھلگ کردیا ہے حق وباطل اور توحید وشرک کے درمیان ٹھوس دلائل وشواہد کے ذریعے واضح خط کھینچ دیا ہے۔

(۱۰) **شِفَآءٌ:**

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَاھُوَ شِفَآءٌ (الاسراء:۸۲)

"ہم وہ قرآن نازل کرتے ہیں جو (روحانی اور جسمانی بیماریوں کے لیے) شفاء ہے۔"

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (یونس:۵۷)

"(یہ) سینوں کی (بیماریوں) کے لیے شفاء ہے۔"

ہمارے ہاں عام طور پر قرآن کو صرف جسمانی بیماریوں کے لیے شفاء سمجھا جاتا ہے اور اس کے لیے عموماً طریقہ بھی وہ اختیار کیا جاتا ہے جو شریعت اسلامیہ میں ثابت نہیں۔یعنی کاغذوں کے تعویذات بنا کر گلے میں لٹکائے یا بازؤوں سے باندھے جاتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیات یا دعائیں پڑھ کر دم کرنا نبی ﷺ سے ثابت ہے اور ثابت شدہ طریقہ اختیار کرنے میں ہی خیر و برکت ہے۔ جسمانی امراض کے مقابلے میں روحانی بیماریوں کے علاج پر توجہ دینا کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس لیے اپنی سیرت و کردار کو نکھارنے کے لیے قرآن کی رہنمائی اور روشنی میں امراض قلب سے شفا حاصل کرنے پر انسان کو زیادہ محنت کرنی چاہیے۔

(۱۱) **مَوْعِظَةٌ:** نصیحت و ارشاد

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَدْ جَآءَ تْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (یونس:۵۷)

''یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ چکی''۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران:۳۸)

''یہ لوگوں کے لیے وضاحت اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔''

یعنی اس کتاب سے ایک طرف تو عام انسانوں کو دین حق کے بارے واضح حقائق معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف مومنوں اور متقیوں کے لیے یہ کتاب ہدایت و موعظت ہے۔ ہدایت اور موعظت کا رشتہ حد درجہ منطقی ہے۔ جو چیز رہنمائی کرے گی وہ راہ کے خطروں سے بھی ڈرائے گی۔ جیسے سڑک پر خطرے کی مختلف علامتیں اور عبارتیں ملتی ہیں۔ موعظة کے معنی ہیں کہ ''اعمال کے اچھے اور برے نتائج سے اس طرح باخبر کرنا کہ دلوں کی کیفیت بدل جائے۔''

لغوی لحاظ سے وعظ کے معنی حکم دینا اور (برے کام سے) روکنا بھی ہیں۔ گویا قرآن برے اعمال اور غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتا اور حکماً ان سے روکتا بھی ہے۔

(۱۲) **ذِكْرٌ:** یاد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنَاهُ (الانبیاء:۵۰)

''یہ برکت والا ذکر ہے، اسے ہم نے نازل کیا۔''

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (الحجر:۹)

''بے شک ہم نے ہی ذکر نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

ذکر اس شے کو کہتے ہیں جو ذہن میں ایسے محفوظ ہو کہ بھلائی نہ جا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا انتظام

اس طرح کیا کہ لوگوں کے سینوں میں اسے محفوظ کر دیا۔ دنیا میں واحد یہ کتاب ہے جسے لوگ زبانی یاد کرتے ہیں۔ آج بھی بے شمار بڑوں اور بچوں کے سینوں میں یہ قرآن موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ صدیوں سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک کوئی قرآن مجید میں ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں کر سکا۔ صاحب ''تاج'' علامہ ابن مکرم رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ جو کتاب تفاصیل دینی اور قوانین امم پر حاوی ہو وہ ''ذکر'' ہے قرآن مجید میں دین کی تفصیلات بھی ہیں اور پہلی امتوں کے حالات بھی۔ قرآن مجید نے یہ چیزیں اپنے قارئین کی دلچسپی کے لیے بیان نہیں کیں بلکہ اس لیے کہ لوگ ان کے نتائج اور انجام کی روشنی میں اپنی روش حیات کا تعین کر سکیں۔

(۱۳) مُبَارَكٌ: برکت والی کتاب

هٰذَا كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الانعام:۱۵۵)

''یہ کتاب جسے ہم نے نازل کیا ہے، برکت والی ہے۔ اس کی پیروی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

برکت کے مفہوم میں خیر و فلاح، کثرت و نمو (بڑھنا) اور ثبات و دوام شامل ہیں۔ اردو میں بھی یہ لفظ اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں ''اس کے ہاتھ میں کتنی برکت ہے'' ''اس کے قدم ہمارے گھر کے لیے مبارک ثابت ہوئے۔''

جو کتاب رشد و ہدایت کا مرقع حکمت و دانائی کا منبع، دینی تفصیلات کا گنجینہ، روحانی اور جسمانی بیماریوں کی دوا، بیمار دلوں کی شفا، پڑھنے، وعظ و نصیحت اور عبرت حاصل کرنے میں انتہائی سہل اور آسان۔ جس کی تعلیمات تمام انسانیت کے لیے ہوں، جس کا ایک ایک حرف پڑھنے سے دس دس نیکیاں ملیں، جس پر عمل کرنے سے دنیا اور آخرت کی کامیابی و کامرانی کا سرٹیفکیٹ ملے وہ یقیناً ''مبارک'' لقب کی حق دار ہے۔

(۱۴) عَلِيٌّ: بلندی والا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (الزخرف:۴)

''اور یقیناً وہ ہمارے پاس ام الکتاب (لوح محفوظ) میں بہت بلند مرتبے والا حکمت والا ہے۔''

عربی کا مقولہ ہے ''**کلام الملوک ملوک الکلام**'' یعنی ''بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اللہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے تو اس کا کلام بھی فصاحت و بلاغت، وعظ و نصیحت، نظم و ترتیب، اثر انگیزی، سہل انداز بیان، اعجاز اور دیگر خوبیوں کی بناء پر تمام کلاموں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

(۱۵) حِكْمَةٌ: دانائی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ (القمر:۵)

''بلند پائے کی حکمت ودانائی ہے''

حکمت کا مفہوم عام طور پر دانائی ہی بیان کیا جاتا ہے، جب کہ اس کے مفہوم میں قوت فیصلہ، انصاف، حسن، اور تناسب بھی شامل ہے۔

قرآن کو حکمت بالغہ کہا گیا ہے کیونکہ یہ انسان کو ان فیصلوں، اس تناسب اور مقام عدل تک پہنچاتا ہے جو اس کی منزل ہے۔ حکمت میں قوت کا عنصر بھی شامل ہے اور یہی عنصر اسلامی نظام مملکت کو ایک نظام حکمت بنا دیتا ہے۔

(۱٦) **حَكِيۡمٌ**: دانائی والا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡحَكِيۡمِ (یونس:۱)

''یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں۔''

حکیم اگر حکمت والی کتاب کے مفہوم میں ہو تو حکمت کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ حکیم اگر محکم (مضبوط، ٹھوس اور پختہ) کے معنی میں ہو تو اس سے مراد وہ کتاب ہے جس کے حلال وحرام اور حدود واحکام محکم ومضبوط ہیں۔ ان میں کبھی تبدیلی نہ آئے گی۔ یا جو غلطیوں اور اختلاف سے پاک اور مبّرا ہے۔

(۱۷) **مُهَيۡمِنٌ**: نگران، محافظ، گواہی دینے والی کتاب

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ (المائدہ:۴۸)

''وہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان کی نگران ہے۔''

باقی کتب سماویہ سے قرآن مجید کی یہ منفرد خوبی ہے کہ یہ ان کے لیے محافظ اور گواہی دینے والا ہے۔

پہلی آسمانی کتب میں چونکہ تحریفات ہو چکی ہیں، اس لیے قرآن کی بات فیصلہ کن ہے۔ ان کے حوالے سے قرآن جس بات کی گواہی دے وہ صحیح ہے باقی کا کوئی اعتبار نہیں۔

(۱۸) **حَبۡلُ اللّٰهِ**: اللہ کی رسی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا (آل عمران:۱۰۳)

''اور تم اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو''

جو قرآن کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اس پر عمل کرنا شروع کر دے، وہ ہدایت ورہنمائی حاصل کرے گا اور جنت

میں پہنچ جائے گا۔

(۱۹) صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ: سیدھا راستہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا (الانعام:۱۵۴)

''اور یقیناً یہ ہے میرا سیدھا راستہ۔''

قرآن مجید ایک ایسا راستہ ہے جو سیدھا جنت کو جاتا ہے۔اس میں کوئی کجی اور ٹیڑھ نہیں ہے۔

(۲۰) قَيِّمٌ: سیدھا،صاف

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ (الکہف:۲)

''(ہم نے اسے) سیدھا بنایا ہے تاکہ وہ (قرآن یا پیغمبر) اس کی طرف سے سخت عذاب سے ڈرائے۔''

(۲۱۔۲۲) قَوْلٌ فَصْلٌ: فیصلہ کن بات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (الطارق:۱۳)

''بے شک وہ فیصلہ کن فرمان ہے۔''

قرآن واضح، دوٹوک اور فیصلہ کن کلام ہے۔حق و باطل اس سے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ان کو پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

(۲۳) النَّبَاُ الْعَظِيْم: بڑی خبر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عَمَّ يَتَسَآءَ لُوْنَ o عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ (النباء:۱۔۲)

''وہ کس کے بارے ایک دوسرے سے سوال کر رہے ہیں؟ بڑی خبر کے متعلق؟''

قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو کافروں نے آپس میں باتیں کرنا شروع کیں کہ یہ کیا ہے؟ کسی نے اس کو جادو کہا، کسی نے اسے پہلے لوگوں کے قصے اور افسانے قرار دیا۔اس لحاظ سے قرآن ایک بڑی اہم خبر تھی جس کے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کیں۔بعض مفسرین نے بڑی خبر سے مراد قیامت لی ہے۔قیامت کے متعلق بھی بعض نے شک کا اظہار کیا ہے اور کچھ نے انکار کیا تھا اور آج بھی بہت سے لوگ قیامت کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہیں۔

(۲۴۔۲۵۔۲۶) اَحۡسَنُ الۡحَدِيۡثِ، مَثَانِيۡ اور مُتَشَابِهٌ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (الزمر:۲۳)

''اللہ نے بہترین بات نازل فرمائی، ایک کتاب (قرآن مجید) کی صورت میں جس کی آیات ملتی جلتی، دہرائی گئی ہیں۔''

قرآن ایک بہترین کتاب ہے۔ مضامین کے اعتبار سے اس کی آیات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں!۔

مثانی: دہرائی گئی۔ قرآن میں قصص ومواعظ اور احکام کو مختلف انداز میں دہرایا گیا ہے۔

(۲۷) تَنۡزِيۡلٌ:

مصدر تفعیل ہے جو مفعول کے معنی میں ہے یعنی نازل کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ (الشعراء:۱۹۲)

''اور یقیناً وہ جہانوں کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔''

(۲۸) رُوۡحٌ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا (الشوریٰ:۵۲)

''اور ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح وحی کی ہے۔''

قرآن کے ساتھ دلوں اور اخلاق کو زندگی ملتی ہے۔ اگر قرآن کی تعلیمات آدمی کے سامنے نہ ہوں تو آدمی دل سے اور اخلاقی لحاظ سے مردہ بن جاتا ہے۔

(۲۹) اَلۡوَحۡيُ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَآ اُنۡذِرُكُمۡ بِالۡوَحۡيِ (الانبیاء:۴۵)

''میں تم کو صرف وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں۔''

قرآن اللہ کی طرف سے وحی ہے۔ جبریل علیہ السلام کے واسطے سے محمد ﷺ پر نازل ہوئی۔

(۳۰) عَرَبِيٌّ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كِتَابٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (حم السجدہ:۳)

''اس کتاب کی آیات واضح صاف صاف بیان ہوئی ہیں۔قرآن عربی کی صورت میں علم والی قوم کے لیے۔''

قرآن مجید کا عربی زبان میں ہونا بھی اس کی خوبی ہے کیونکہ یہ دنیا کی فصیح ترین زبان ہے۔اس لیے بھی قرآن عربی زبان میں ہے کہ اس کے اولین مخاطب عربی تھے۔یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید عربی میں نازل ہوا۔لیکن غور کیا جائے تو خود قرآن میں ایک اور پہلو سے بھی اس کی وضاحت ملتی ہے۔قرآن مجید میں ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (الرعد:۳۷)

''اور اسی طرح ہم نے اس کو اس طور پر نازل کیا کہ وہ ایک واضح حکم ہے۔''

عربی فصیح اور واضح کو بھی کہتے ہیں۔یہ بات قرآن مجید میں ایک اور جگہ اس انداز سے ہے:

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (الزمر:۲۸)

یہاں ''غیر ذی عوج'' عربیا کی وضاحت ہے،یعنی قرآن جو بہت واضح اور سیدھا ہے،اسمیں کوئی کجی نہیں،اس کی تعلیمات بہت واضح اور سیدھی ہیں۔ہر کجی سے پاک ، ہر دور کے لیے رہنما اور روشن،عربی زبان کے مقابلے میں عجمی (غیر عربی) زبان واضح نہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ (حم السجدہ:۴۴)

''اگر ہم قرآن کو غیر عربی میں نازل کرتے تو وہ کہتے اس کی آیات واضح کیوں نہیں کی گئیں۔''

(۳۱) **بَصَائِرُ**: دلائل،براہین

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (الاعراف:۲۰۳)

''یہ تمہارے رب کی طرف سے دلائل ہیں۔''

قرآن مجید توحید کے اثبات،شرک کی تردید،رسالت کی حقانیت اور یوم آخرت کے ثبوت اور دیگر دینی امور کے متعلق واضح،واشگاف اور ٹھوس دلائل و براہین سے بھرا پڑا ہے۔

(۳۲) **بَيَانٌ**: وضاحت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (آل عمران:۱۳۸)

''یہ لوگوں کے لیے وضاحت ہے۔''

(۳۳) اَلْعِلْمُ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَ كَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ:۱۴۵)

''اگر تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اس کے بعد کہ تیرے پاس علم آ گیا، تو اس وقت تو بے انصافوں میں سے ہو جائے گا۔''

اس آیت میں علم سے مراد قرآن مجید ہے۔

قرآن علوم و معارف کا خزینہ ہے، کسی بڑے سے بڑے مفسر، محدث یا امام نے بھی ان علوم و معارف کے احاطے کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ اس کی صورت حال یہ ہے: **هو المسک ما کررته يتضوع۔**

قرآن کے بار بار پڑھنے سے اس کے نکات علمیہ اور معارف دینیہ اور زیادہ منکشف ہوتے اور مسائل کی گتھیاں مزید سلجھتی اور حل ہوتی ہیں۔

قرآن کے علم میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ یہ وحی کے ذریعے نبی ﷺ تک پہنچا ہے۔ اور اس وحی کی حفاظت کا انتظام بھی کیا گیا۔ آپ پر وحی شروع ہوئی تو آسمانوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ قرآن میں باطل کا شائبہ تک نہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حم السجدہ:۴۲)

''باطل اس کے پاس نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ حکیم وحمید (اللہ) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔''

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ باطل کی یہ مجال نہیں کہ اس پر کسی پہلو سے حملہ آور ہو سکے۔ نہ کھلم کھلا سامنے آ کر اور نہ چوری چھپے پیچھے سے۔ اس لیے وہ نقص و زیادتی سے محفوظ ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ پہلی کتابیں بھی قرآن کو باطل نہیں کرتیں اور نہ کوئی کتاب بعد میں آ کر اس کو جھٹلائے گی۔

قرآن کے متعلق بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

جَمِيْعُ الْعُلُوْمِ فِي الْقُرْاٰنِ لٰكِنْ
تَقَاصَرَ عَنْهُ اَفْهَامُ الرِّجَالِ

قرآن میں ہر قسم کے علوم موجود ہیں لیکن لوگوں کا فہم وادراک کوتاہ ہے۔

(۳۴) اَلْحَقُّ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ (آل عمران:۶۲)

''یقیناً یہ ضرور سچا بیان ہے''

قرآن وہ سچی اور برحق کتاب ہے، جس میں کوئی شک وشبہ نہیں، وہ ظن وگمان سے کوسوں دور، کبھی نہ بدلنے والے حقائق پر مشتمل اور حق وباطل کو الگ الگ کرنے والی ہے۔اس کی تعلیمات وقت کی گردشوں پر غالب آجاتی ہیں۔

حق کی پہچان ہے کہ وہ باطل کے سامنے سمجھوتہ نہیں کرتا۔حق اپنی جگہ قائم رہتا ہےاور حالات اس کے سانچے میں ڈھلتے رہتے ہیں۔

(۳۵) ھَادِیٌ: رہنمائی کرنے والا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ (الاسراء:۹)

''یہ قرآن بہت سیدھے راستے کی رہنمائی کرتا ہے۔''

ھُدٰی کے ضمن میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

(۳۶) عَجَبٌ: عجیب

اللہ تعالیٰ نے جنات کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (الجن:۱)

''(جنات نے کہا) بے شک ہم نے عجیب قرآن سنا''

قرآن اپنے علوم ومضامین،فصاحت وبلاغت اور قوت تاثیر کے لحاظ سے تعجب انگیز ہے۔

(۳۷) تَذْكِرَةٌ: یاددہانی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (الحاقہ:۴۸)

''اور بے شک یہ پرہیزگاروں کے لیے یاددہانی ہے۔''

آج دوسرے مذاہب کی جو کتابیں ہمیں ملتی ہیں وہ افسانوں کی صورت میں ہیں۔ایسے افسانے جن کی دلچسپیوں میں انسان گم ہوجائے اور جب سطح پرابھرے تو رہنمائی کا کوئی نشان اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔قرآن جہاں جنت اور اللہ کے انعامات یاددلاتا ہے،وہاں انفس آفاق میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔پہلی قوموں کے حالات وواقعات بیان کرکے تذکرہ وموعظت اور عبرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔

(۳۸) اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى: مضبوط کڑا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (البقرہ:۲۵۶)

''جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا پس تحقیق اس نے مضبوط کڑے کو پکڑا۔''

یعنی اس نے قرآن کو مضبوطی سے تھام لیا۔قرآن نے طاغوت کو ٹھکرانے اور اللہ پر ایمان لانے کی بھرپور دعوت دی ہے۔

(۳۹) الصِّدْقُ: سچائی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِىْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر:۳۳)

''اور وہ جو سچائی کے ساتھ آیا (یعنی جناب محمد ﷺ) اور جس نے اس کی تصدیق کی (یعنی ابوبکرؓ)، ایسے لوگ ہی پرہیزگار ہیں۔''

قرآن مجید سراسر سچائی اور حق پر مشتمل ہے

(۴۰) عَدْلٌ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (الانعام:۱۱۶)

''اور تیرے رب کا کلمہ سچائی اور عدل کے لحاظ سے مکمل ہو گیا۔''

قرآن کی تعلیمات عدل وانصاف پر مبنی اور اعتدال وتوازن والی ہیں۔اس لیے قرآن کو 'عدل' کہا گیا۔

(۴۱) اَمْرُ اللّٰهِ: اللہ کا حکم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ (الطلاق:۵)

''یہ اللہ کا (حکم) امر ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا۔''

امر اللہ سے ''قرآن'' مراد لیا گیا ہے۔

(۴۲) مُنَادِیْ: اعلان کرنے والا، آواز دینے والا

اللہ تعالیٰ نے اولو الالباب یعنی اہل ایمان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ (آل عمران:۱۹۳)

''(وہ کہتے ہیں) ہم نے بلانے والے کو سنا وہ ایمان کے لیے بلا رہا تھا کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ۔''

منادی سے ''قرآن'' مقصود ہے۔

(۴۳) **بُشْرٰی:** خوش خبری اور بشارت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (النمل:۲)

''(یہ) ایمان والوں کے لیے ہدایت اور خوش خبری کا ذریعہ ہے۔''

قرآن ہمیں بشارت دیتا ہے کہ اچھے اعمال کا نتیجہ دونوں جہانوں کی سرفرازی، ہمیشہ کی زندگی اور جنت ہے۔ یہ بشارت ہمارے لیے مہمیز اور قوت محرکہ کا کام دیتی ہے۔

(۴۴) **مَجِيْدٌ:** عظمت وشرف والا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ (البروج:۲۱)

''بلکہ وہ بزرگی والا قرآن ہے۔''

قرآن یقیناً عزت وشرف اور عظمت والی کتاب ہے۔

(۴۵) **زَبُوْرٌ:**

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء:۱۰۵)

ایک معنی کے لحاظ سے زبور سے ہر آسمانی کتاب اور ذکر سے لوح محفوظ مقصود ہے اور معنی یہ ہے:

''ہم نے لوح محفوظ کے بعد ہر کتاب میں لکھا کہ میرے نیک بندے زمین کے واث ہوں گے۔''

اس عمومی معنی کے لحاظ سے زبور کا لفظ قرآن پر بولنا ٹھیک اور یہاں اس کا تذکرہ برمحل ہے۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے اس آیت میں زبور سے داؤد علیہ السلام کی کتاب اور ذکر سے تورات مراد ہے۔ یعنی

''ہم نے تورات کے بعد زبور میں (بھی) لکھا کہ بے شک میرے بندے زمین کے وارث ہوں گے۔''

(۴۶۔۴۷) **بَشِيْرٌ** اور **نَذِيْرٌ:**

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (حم السجدہ۔۳۔۴)

''یہ کتاب ہے جس کی آیات کی وضاحت قرآن عربی کی صورت میں علم (سے دلچسپی رکھنے) والی قوم کے لیے

صاف صاف کی گئی ہے، اس حال میں کہ وہ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا ہے۔"

قرآن اپنے ماننے والوں کو جنت کی نعمتوں، اخروی کامیابیوں اور اللہ کی رحمت ورضوان کی خوشخبری دیتا اور انکار کرنے والوں کو جہنم کی سزا، آخرت کے دن کی ذلت ورسوائی اور اللہ جبّار و قھّار کے غضب اور ناراضی سے ڈراتا ہے۔

(۴۸) **عَزِیْزٌ:** عزت والا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ (حم السجدۃ:۴۱)

"اور بے شک وہ عزت والی کتاب ہے"۔

اللہ کے ہاں یہ کتاب عزت والی ہے اور مسلمان بھی اس کو دل وجان سے عزیز سمجھتے ہیں۔"عزیز" کے ایک معنی قوت اور غلبہ والا بھی ہیں۔ مسلمان قرآن پر عمل کر کے عزت وشرف پاتے، قوت وغلبہ حاصل کرتے اور ایسی بلندی پر پہنچ جاتے ہیں کہ ستارے ان کی گردراہ ہوتے ہیں۔

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

آج مسلمان عملی اور نظری طور پر اس کتاب عزیز سے دور ہیں، جس سے ذلت ورسوائی ان کا مقدر بنی ہوئی ہے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفت "عزیز" بار بار ذکر ہوئی ہے، کیونکہ اللہ عزت وشرف والا اور صاحب قوت وغلبہ ہے اور عزت وغلبہ دینے والا ہے۔

(۴۹) **بَلَاغٌ:**

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ (ابراہیم:۵۲)

"بلاغ" اصل میں مصدر ہے۔ یہ اگر اسم فاعل کے معنی میں ہو تو مفہوم یہ ہے کہ "قرآن اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچانے والا ہے"۔ اور اگر اسم مفعول کے معنی میں ہو تو مراد یہ ہے کہ "قرآن لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے"

(۵۰) اَحسَنُ القَصَصِ: بہترین بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَحنُ نَقُصُّ عَلَیکَ اَحسَنَ القَصَصِ (یوسف:۳)

''ہم تم پر بہترین بیان پیش کرتے ہیں''۔

القصص مصدر ہے اور اس لحاظ سے اس کے معنی وہی ہیں جو بیان ہوئے۔ اگر مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہو تو ''احسن القصص'' سے مقصود بہترین قصہ ہوگا۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاتَّبِعُوٓا اَحسَنَ مَآ اُنزِلَ اِلَیکُم مِّن رَّبِّکُم (الزمر:۵۵)

''اور تم اپنے رب کے پاس سے آئے ہوئے بہترین (کلام) کی پیروی کرو''۔

قرآن صرف حسن (اچھا) نہیں بلکہ احسن (بہت ہی اچھا) ہے۔

اچھائی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ برائی کو ختم کرے، قرآن انسانی زندگی اور ذہن کی کمی اور کوتاہی کو دور کرتا ہے۔ جہاں اچھائی ہوگی وہاں سے سیئات اور گناہ دور ہوں گے۔

(۵۱۔۵۲۔۵۳۔۵۴)

قرآن مجید میں ہے:

رَسُولٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (البینۃ:۲)

''اللہ کی طرف سے رسول (محمد ﷺ) پاکیزہ صحیفے تلاوت کرتا ہے۔''

صحف سے وہ کاغذ اور تختیاں وغیرہ مراد ہیں، جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید لکھتے تھے۔ اس لحاظ سے قرآن پر صحف کا لفظ بول کر اس کے منظّم و مرتب ہونے کی ابتدائی حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کو صحف کہنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ (صحف) صحیفہ کی جمع ہے اور یہ لفظ چھوٹے کتابچے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آج بھی لوگ اس کو صحف کی شکل یعنی چھوٹے چھوٹے اجزاء میں تقسیم کر کے چھاپتے اور پڑھنے والوں کے لیے آسانی مہیا کرتے ہیں۔ مذکورہ آیت میں ان صحف کو مطھرہ کہا گیا ہے کیونکہ قرآن اس ذات کا کلام ہے جو ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہے اور خود قرآن بھی ہر لحاظ سے نقص اور کمزوری سے پاک صاف ہے۔

قرآن مجید کو پکڑتے اور چھوتے وقت مسلمان بھی عام طور پر طہارت کا اہتمام کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ ان صحف کو مکرمۃ (عزت والے) اور مرفوعۃ (بلند مرتبہ) بھی کہا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ہے۔

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ٥ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ٥ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ٥ كِرَامٍ بَرَرَةٍ٥ (عبس:۱۳-۱۶)

''(وہ)عزت والے، بلند مرتبہ، پاکیزہ، صحیفوں میں ہے جوعزت والے، نیکوکار لکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے''

اس آیت میں بھی ایک رائے کے مطابق صحف سے کاغذ اور تختیاں اور لکھنے والوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔دوسری رائے کے مطابق صحف سے وہ چیزیں مراد ہیں جن پر فرشتے لوح محفوظ سے قرآن منتقل کرتے ہیں اور سفرۃ سے لکھنے والے فرشتے مراد ہیں۔

(۵۵) **مُصَدِّقٌ:** تصدیق کرنے والا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ (المائدہ:۴۸)

''(وہ)اپنے سے پہلی کتب کی تصدیق کرتا ہے۔''

(۵۶) **مُفَصَّلٌ:** کھلا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (الانعام:۱۱۵)

''اور وہی (اللہ) ہے جس نے تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے، جو کھلا بیان ہے۔''

(۵۷) **حُكْمٌ:** فرمان، حکمت سے بھرا ہو، حکمت کے مطابق فیصلہ کرنے والا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا

''اور اسی طرح ہم نے اس کو'عربی فرمان' کے طور پر نازل کیا ہے''۔

حکیم اور حکمت کے تحت اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

(۵۸) **بُرْهَانٌ:** روشن اور مضبوط دلیل

قرآن مجید میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (النساء:۱۷۴)

''اے لوگو! تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل آ گئی اور ہم نے تمہاری طرف نورِ مبین نازل کیا''۔

قرآن ایک ٹھوس اور مستحکم دلیل ہے۔ باطل کے پاس کمزور اور بودی قسم کی دلیلیں تو ہوتی ہیں لیکن برہان نہیں ہوتی۔ اس لیے قرآن نے اپنے مخالفین کو کہا ہے:

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ٥

''اگر تم سچے ہو تو اپنی ٹھوس دلیل لاؤ''۔

(۵۹) اَلْعَظِيْمُ: عظمت والا

قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (الحجر:۸۷)

''اور ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی (آیات) اور عظمت والا قرآن دیا ہے''۔

اہل علم کی ایک رائے کے مطابق اس آیت میں **سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ** سے سورۃ الفاتحہ اور **قرآن عظیم** سے پورا قرآن مراد لیا گیا ہے۔ گویا کل کا جزء پر عطف ہے۔

دوسری رائے کے مطابق ''القرآن العظیم'' سے بھی فاتحہ الکتاب ہی مراد ہے اور عطف تفسیری ہے۔ بہرحال قرآن عظمتوں اور رفعتوں والا اور اپنے ماننے والوں کے لیے عظمت و رفعت کا موجب بننے والا ہے۔ حدیث میں ہے

ان اللّٰہ یرفع بھذا لکتاب اقواماً ویضع بہ آخرین (صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل من یقوم بالقرآن)

''اللہ اس کتاب (قرآن مجید) کے ذریعے بہت سی قوموں کو بلند کرتا اور بہت سی قوموں کو ذلیل کرتا ہے۔''

(۶۰) خَيْرٌ:

قرآن مجید میں ہے:

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا (النحل:۳۰)

''اور پرہیزگاروں سے کہا گیا کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا؟ تو انہوں نے کہا: خیر۔''

عربی میں خیر کا لفظ ''شر'' کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ ہر نفع بخش، اچھی خوبیوں والی اور بلند مرتبہ چیز ''خیر'' ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی معانی کے لیے استعمال ہوا ہے:

۱) شر، فتنہ اور ادنیٰ کے مقابلے میں۔

۲) مال و دولت کے لیے۔

۳) منتخب اور برگزیدہ افراد کے لیے۔ (اخیار)

۴) عمدہ اشیاء کے لیے۔

۵) حسین اور صاحب کردار خواتین کے لیے (خیرات)۔

قرآن مجید میں خیر اس لیے ہے کہ اس میں عزت، قدر و منزلت کی بلندی، تناسب اور حسن جیسی سب خوبیاں ہیں اور اس کی پیروی سے یہی خوبیاں مومنوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر نصیب ہوتی ہیں۔ اجتماعی زندگی کو قرآن کے مطابق ڈھالنے کا مطالبہ اس لیے ہے کہ یہ سب برکتیں ہمارے معاشرے کا حصہ بن جائیں۔

(۶۱) اَلْغَیْبُ:

قرآن مجید میں ہے:

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (التکویر:۲۴)

''اور وہ (رسول ﷺ) غیب پر بخیل نہیں ہے۔''

یعنی آپ کے پاس قرآن کی شکل میں جو غیب کی خبریں اور احکام وغیرہ نازل ہوتے ہیں، رسول ﷺ بے کم وکاست اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید کو اس لیے غیب کہا گیا کہ یہ آئندہ پیش آنیوالے حالات، یوم آخرت، جنت، جہنم، فرشتوں اور دیگر غیب کی خبروں پر مشتمل ہے۔

(۶۲) قول ثقیل: وزنی اور ذمہ داری والا قول

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (المزمل:۵)

''ہم آپ پر عنقریب وزنی قول پیش کر رہے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل کر کے نبی ﷺ پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی۔ آپ کو کفر و شرک، ظلم و تشدد اور جہالت و تعصب کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کو کہا گیا اور رات کو اللہ کے لیے قیام و سجود اور تلاوت کی تلقین کی گئی تا کہ آپ اچھے انداز سے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد والہ واصحابہ اجمعین

(حافظ محمد عبداللہ رفیق)

....

قرآنی دعائیں

قرآن حکیم میں جو دعائیں وارد ہوئی ہیں ان کی فضیلت اور برکت کے بارے میں کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ یہ وہ دعائیں ہیں جو خود اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مختلف اوقات میں تلقین فرمائیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم وہدایت کے تحت اللہ کے ان مقبول بندوں نے ان کے ذریعے سے اپنے رب جلیل سے مناجات کی جو قبول ہوئی۔ پھر یہی دعائیں اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کی تعلیم وتلقین کے لئے ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی معرفت قرآن حکیم میں قیامت تک کے لئے جمع کر دیں تاکہ ہم انبیائے کرام علیہم السلام کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے ان کے ذریعہ اپنے خالق ومالک سے رابطہ قائم کریں۔

رب کریم کے اس احسان واکرام کا کہ اس نے اپنے بندوں کو خود سے شرف ہم کلامی بخشنے کے لئے یہ دعائیں خود سکھائیں کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ ان سب دعاؤں کو حفظ کر لیا جائے اور جب یاد آئیں یا جب دعا کی ضرورت محسوس ہو تو سب سے پہلے ان کو پڑھا جائے اور ان کے وسیلہ سے اللہ کا فضل اور خیر طلب کی جائے۔

سورۃ الفاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۱) الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۲) مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ (۳) اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (۴) اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (۵) صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ (۷)

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

تمام تعریفیں اور ہر شکر اللہ ہی کے لئے ہے جو رب ہے تمام جہانوں کا۔ نہایت مہربان ہر حالت میں رحم کرنے والا ہے۔ مالک روز جزا کا، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔

ہدایت دے ہمیں سیدھے راستے کی۔ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا، نہ ان لوگوں کا جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان کا جو بھٹک گئے۔ آمین

۱) حضرت ابو سعید رافع بن الْمُعَلِّیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا سورۃ فاتحہ، قرآن مجید کی سب سے عظیم سورہ ہے، یہی سبع المثانی ہے اور یہی قرآن عظیم ہے۔ (صحیح بخاری)

۲) امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سورۃ فاتحہ ہر مرض کے لئے شفا ہے۔ (سنن دارمیؒ)

۳) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی نے سانپ کے ڈسے ہوئے ایک شخص کا علاج سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے سے کیا اور وہ شخص بالکل تندرست ہو گیا۔ بعد ازاں صحابہ کرامؓ نے اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے اظہار مسرت کرتے ہوئے فرمایا تم نے ٹھیک کیا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ دم جھاڑ کا کام بھی دیتی ہے۔ (صحیح بخاری)

اس سورۃ کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ ہر نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کرنا ضروری ہے۔

حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے نماز میں سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔ (صحیح بخاری)

الغرض یہ سورۃ مبارکہ تمام دعاؤں میں سب سے عظیم دعا، ذکر اور مناجات ہے اور بندے اور رب کے درمیان رابطے کا سب سے زیادہ جامع اور مکمل ذریعہ ہے۔

نیک کام کی قبولیت کی دعا

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (البقرہ:۱۲۷)

وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (البقرہ:۱۲۸)

''اے ہمارے رب! قبول فرما ہم سے (یہ خدمت) بے شک تو ہی ہے سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا''۔

''اور قبول فرما ہماری توبہ بے شک تو ہی ہے توبہ قبول فرمانے والا، رحم فرمانے والا''۔

یہ دعا دو جلیل القدر پیغمبروں (سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام) کی ہے جو وہ بیت اللہ کی تعمیر کے وقت پڑھتے جاتے تھے۔

یہ دعا اپنے نیک کاموں کی قبولیت کے لئے خاص طور پر مانگتے رہنا چاہئے۔

نوٹ: وتب علینا ......الخ دوسری آیت کا حصہ ہے جسے اس دعا میں شامل کر دیا گیا ہے۔

دنیاوآخرت کی بھلائی کی دعا

رَبَّنَآ آتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲۰۱)[البقرہ]

''اے ہمارے رب! عطافرما ہمیں دنیا میں بھی اچھائی اور بھلائی اور آخرت میں بھی اچھائی اور بھلائی اور بچا تو ہمیں آگ کے عذاب سے''۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سب دعاؤں سے زیادہ یہ جامع دعا مانگا کرتے تھے۔(صحیح بخاری)

اللہ کے سپاہی کی دعا

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ (۲۰۵)[البقرہ]

''اے ہمارے رب! فیضان کر ہم پر صبر کا اور جمائے رکھ ہمارے قدم اور فتح عطا فرما ہمیں کافر لوگوں پر''۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ طالوتؒ کے لشکر میں جو مسلمان تھے انہوں نے جالوت (کافر) کے خلاف جہاد کرتے وقت یہ دعا مانگی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مسلمانوں نے کافروں کو شکست دے دی۔

خطا بخشی کے لئے دعا

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ (۲۸۵)[البقرہ]

''سنا ہم نے اور اطاعت کی، طالب ہیں ہم تیری بخشش کے، اے ہمارے رب! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے''

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کی شان میں فرمایا ہے کہ وہ پختہ ایمان کے ساتھ یہ دعا مانگتے ہیں۔

مومنین کی جامع اور کامل دعا

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْ نَآ اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ، وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْلَنَا، وَارْحَمْنَا، اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ[البقرہ:۲۸۶]

''اے ہمارے رب! نہ مواخذہ کیجیو اگر بھول یا چوک ہو جائے ہم سے۔ اے ہمارے رب! اور نہ ڈالیو ہم پر بھاری بوجھ جیسا کہ ڈالا تھا تو نے ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے تھے، اے ہمارے رب! اور نہ اٹھوائیو ہم سے ایسا بار جس

کی برداشت ہم میں نہ ہو اور ہمیں معاف فرما دیجئے اور ہمیں بخش دیجئے اور ہم پر رحم فرمائیے تو ہی ہمارا مولا ہے پس ہماری مدد فرمائیے کافروں کے مقابلے میں۔''

صراط مستقیم پر استقامت کی دعا

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ[آل عمران:۸]

''اے ہمارے مالک! نہ فرما کجی ہمارے دلوں میں بعد اس کے کہ اب تو ہمیں ہدایت دے چکا ہے اور بخش ہمیں اپنے خزانہ فیض سے رحمت، یقیناً تو ہی ہے بہت زیادہ عطا کرنے والا''۔

راسخین فی العلم یعنی دین میں پختہ لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ یہ دعا مانگا کرتے ہیں۔

اہل ایمان کی دعا

رَبَّنَا اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۶)[ال عمران]

''اے ہمارے مالک بے شک ہم ایمان لائے سو بخش دے تو ہمارے گناہ اور بچالے ہمیں دوزخ کے عذاب سے''۔

اقتدار کے قائم ودائم رہنے اور ادائیگی قرض کی دعا

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۶) تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ز وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ز وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۷)[ال عمران]

''اے اللہ! مالک بادشاہی کے! دیتا ہے تو حکومت جسے چاہے اور چھین لیتا ہے حکومت جس سے چاہے، عزت دیتا ہے تو جسے چاہے اور ذلت دیتا ہے جسے چاہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ہے ہر طرح کی خیر بے شک تو ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے اور داخل کرتا ہے تو رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور نکالتا ہے جاندار کو بے جان میں سے اور نکالتا ہے بے جان کو جاندار میں سے اور رزق دیتا ہے تو جسے چاہے بے حساب''۔

جناب نبی کریم ﷺ کو اس جامع دعا کے مانگنے کا حکم دیا گیا۔

نوٹ: جو شخص ان آیات کے ذریعے سے دعا مانگے گا اس پر اگر احد پہاڑ کے برابر بھی قرض ہوگا اللہ تعالیٰ اس کا قرض ادا کر دے گا۔(طبرانیؒ)

حصولِ اولاد کی دعا

رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً ۚ اِنَّکَ سَمِیۡعُ الدُّعَآءِ (۳۸) [آل عمران]

"اے میرے رب! عطا کر مجھے اپنی قدرت خاص سے پاکیزہ اولاد۔ بے شک تو ہی ہے ہر ایک کی دعا سننے والا"

یہ دعا زکریا علیہ السلام نے آخری عمر میں حصول اولاد کے لئے مانگی تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے منظور فرمایا اور یحییٰ علیہ السلام جیسا بہترین صفات کا حامل بیٹا عطا فرمایا۔ محروم الاولاد لوگوں کے لئے یہ دعا اکسیر ہے۔ صاحب اولاد لوگوں کو بھی اپنی اولاد کی صلاح وفلاح کے لئے اس کا پڑھنا مفید ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی دعا

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنۡزَلۡتَ وَاتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاکۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِیۡنَ (۵۳) [آل عمران]

"اے ہمارے مالک! ایمان لائے ہم اس ہدایت پر جو تو نے اتاری اور پیروی کی ہم نے رسول کی؛ لہٰذا لکھ لے تو ہم کو (حق کی) گواہی دینے والوں میں"۔

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انصار وحواریوں نے ایمان لاکر یہ دعا مانگی تھی۔

مجاہدین کی دعا

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِیۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ (۱۴۷) [آل عمران]

"اے ہمارے رب! معاف فرمادے ہمارے گناہ اور بے اعتدالیاں جو ہم سے سرزد ہوئیں اپنے معاملات میں اور ثابت قدم رکھ ہمیں اور فتح عطا فرما ہمیں کافروں پر"۔

تہجد کے لئے بیدار ہونے پر یہ دعا پڑھے

رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۱) رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ (۱۹۲) رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَکَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ (۱۹۳) رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ط اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ (۱۹۴) [آل عمران]

"اے ہمارے رب! نہیں پیدا کیا تو نے یہ سب بے مقصد کہ پاک ہے تو ہر نقص وعیب سے پس بچالے ہم کو

دوزخ کے عذاب سے۔اے ہمارے رب! بے شک تو نے جس کو ڈالا دوزخ میں سو در حقیقت بڑا ہی رسوا کر دیا تو نے اسے اور نہیں ہوگا ایسے ظالموں کا کوئی مددگار۔اے ہمارے رب ہم نے اس اعلان کرنے والے کو سن لیا جو ایمان کی طرف آنے کے لیے اعلان کر رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ، تو ہم ایمان لے آئے۔اے ہمارے رب! اب بخش دے ہماری خاطر ہمارے گناہ اور دور کر دے ہم سے وہ برائیاں جو ہم میں ہیں اور موت دے ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ۔اے ہمارے رب! اور عطا فرما تو ہم کو وہ کچھ جس کا وعدہ کیا ہے تو نے اپنے رسولوں کی معرفت اور نہ رسوا کر ہمیں قیامت کے دن، بیشک تو نہیں خلاف کرتا اپنے وعدے کے"۔

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تہجد کے لئے اٹھتے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

ظالم سے نجات پانے کی دعا

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (۷۵)[النساء]

"اے ہمارے رب! نکال تو ہم کو اس بستی سے کہ ظالم ہیں اس کے باشندے اور بنا ہمارے لئے اپنی جناب خاص سے کوئی حامی اور بنا ہمارے لئے اپنی جناب خاص سے کوئی مددگار"۔

فراخی رزق کی دعا

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۱۱۴)[المائدہ]

"اے اللہ! تو ہی ہمارا رب ہے۔نازل فرما ہم پر کوئی خوان آسمان سے کہ ہو جائے ہمارے لئے خوشی کا موقع، ہمارے اگلوں کے لئے بھی اور ہمارے پچھلوں کے لئے بھی اور اور نشانی قرار پائے تیری طرف سے اور ہم کو رزق عطا فرما اور تو ہی تو ہے بہترین رزق دینے والا"۔

حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی دعا

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۲۳)[الاعراف]

"اے ہمارے رب! ظلم کیا ہے ہم نے اپنی جانوں پر اور اگر نہ معاف فرمایا تو نے ہمیں اور نہ رحم فرمایا تو نے ہم پر یقیناً ہم ہو جائیں گے تباہ"۔

حضرت آدم وحوا علیہما السلام جب شیطان کے ورغلانے سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو فراموش کرنے کی سنگین غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے تو توبہ کیلئے اللہ تعالیٰ نے انہیں خود یہ دعا تلقین فرمائی۔

مقدمہ میں کامیابی کی دعا

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ (۸۹)[الاعراف]

''اے ہمارے رب! فیصلہ کر ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان انصاف کے ساتھ اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے''۔

موحد مظلوم کی دعا

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (الاعراف:۱۲۶)

''اے ہمارے رب! فیضان کر ہم پر صبر کا اور دنیا سے اٹھا تو ہمیں اس حال میں کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں۔''

نوٹ! ساحران فرعون نے ایمان لاتے وقت فرعون کی طرف سے سولی وغیرہ کی دھمکی کے موقع پر یہ دعا مانگی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ (۱۵۵) وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ط [الاعراف]

''تو ہی ہے ہمارا سرپرست، سو بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے اور لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی۔ ہم نے رجوع کر لیا تیری طرف''۔

سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب فرما کر طور پر لے گئے تھے۔ ان لوگوں سے وہاں ایک بے ادبی سرزد ہوگئی جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہو گئے اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ سب دوبارہ زندہ کر دیئے گئے۔ (ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم)

غلامی اور مظالم سے نجات پانے کی دعا

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۸۵) وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۸۶)[یونس]

''اے ہمارے رب! نہ بنا تو ہم کو فتنہ ظالم لوگوں کے لئے اور نجات دلا ہم کو اپنی مہربانی سے کافر لوگوں سے''۔

یہ دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تلقین فرمائی تا کہ ان میں اپنے رب پر بھروسہ کرنے کی صلاحیت

پیدا ہوا اور وہ فرعون کے مظالم اور اس کی غلامی سے نجات پائیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعا

وَمَا تَوۡفِيۡقِىۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ‌ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ اُنِيۡبُ (۸۸) [ہود]

''نہیں ہے مجھ میں کچھ کرنے کی توفیق مگر اللہ (کے فضل وکرم) سے اسی پر بھروسہ کیا میں نے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں (ہر معاملہ میں)''۔

ہر کام کی ظاہری تدبیر اختیار کرنے کے بعد اس کے بہتر انجام کے لئے یہ دعا مانگے۔

مسافر کو الوداع کہنے کی دعا

فَاللّٰهُ خَيۡرٌ حٰفِظًا‌ وَّهُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ (۶۴) [یوسف]

''سو اللہ ہی سب سے بہتر محافظ اور وہی ہے سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا''۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی دعا

اِنَّمَاۤ اَشۡكُوۡا بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ (۸۶) [یوسف]

''میں تو اپنی پریشانی اور رنج وغم کی فریاد صرف اللہ سے کرتا ہوں (اس کے سوا کسی سے نہیں)''

رنج اور غم کے موقع پر یہی کلمات پڑھتے رہنا چاہئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَنۡتَ وَلِىّٖ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ ۚ تَوَفَّنِىۡ مُسۡلِمًا وَّ اَلۡحِقۡنِىۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ (۱۰۱) [یوسف]

''اے پیدا فرمانے والے، آسمانوں اور زمین کے! تو ہی سرپرست اور کارساز ہے میرا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اٹھا تو مجھے اس دنیا سے اس حال میں کہ تیرا فرمانبردار ہوؤں اور شامل کر تو مجھے اپنے نیک بندوں میں''۔

خاتمہ بالخیر کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ دعا بکثرت پڑھنی چاہئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا

رَبِّ اجۡعَلۡنِىۡ مُقِيۡمَ الصَّلٰوةِ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ‌ ‌ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ (۴۰) رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَىَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡحِسَابُ (۴۱) [ابراہیم]

''اے میرے رب! بنا تو مجھ کو ایسا کہ قائم رکھوں میں نماز کو اور میری اولاد میں سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں) ہمارے مالک! قبول فرما تو ہماری یہ دعا۔ اے ہمارے مالک! بخش دیجیو مجھے اور میرے والدین کو اور سب مومنوں کو اس دن جب حساب قائم ہوگا''۔

بیت اللہ کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی جس میں اپنے، اپنی اولاد، تمام مومنین اور اپنے والدین کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی ہے۔

والدین کے لئے رحمت کی دعا

رَبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىۡ صَغِيۡرًا (۲۴)[بنی اسرائیل]

''اے میرے رب! رحم فرما ان (والدین) پر جس طرح پالا ہے ان دونوں نے مجھے (رحمت وشفقت کے ساتھ) بچپن میں''۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو اپنے والدین کے حق میں اس طرح دعا مانگنے کا حکم فرمایا ہے۔

آغاز سفر کی دعا

رَبِّ اَدۡخِلۡنِىۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِىۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلْ لِّىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِيۡرًا (۸۰)

''اے میرے رب! لے جا تو مجھے (جہاں لے جائے) سچائی کے ساتھ اور نکال تو مجھے (جہاں سے نکالے) سچائی کے ساتھ اور بنا تو میرے لئے اپنی جناب خاص سے کسی صاحب خاص کو میرا مددگار''۔

جناب نبی کریم ﷺ کو مکہ سے ہجرت کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ دعا مانگنے کا حکم فرمایا۔

اصحاب کہفؓ کی دعا

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا (۱۰)[کہف]

''اے ہمارے رب! نواز تو ہمیں اپنی جناب سے ہمارے معاملات میں درستگی''۔

یہ دعا اصحاب کہف نے مانگی تھی۔ اس دعا کا اثر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے منظور فرمایا اور بطور خاص ان کی حفاظت فرمائی۔

حاکم کے پاس جانے سے پہلے پڑھنے کی دعا

رَبِّ اشۡرَحۡ لِىۡ صَدۡرِىۡ (۲۵) وَيَسِّرۡلِىۡۤ اَمۡرِىۡ (۲۶) وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِىۡ (۲۷)

يَفْقَهُوْا قَوْلِىْ (٢٨)[طٰہٰ]

''اے میرے رب! کشادہ کردے میرے لئے میرا سینہ اور آسان بنادے میرے لئے میرا کام اور کھول دے گرہ میری زبان کی کہ وہ سمجھیں میری بات''۔

سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے جو آپ نے اس وقت مانگی تھی جب اللہ تعالی نے ان کو فرعون کے پاس جا کر اسے پیغام حق پہنچانے کا حکم دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد اس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوا:

قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (٣٦)[طٰہٰ] ''بے شک دیا گیا تجھ کو جو مانگا تھا تو نے اے موسیٰ''۔

علم میں اضافے کے لیے دعا

رَبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا (١١٤)[طٰہٰ]

''اے میرے رب! زیادہ کر میرا علم''

یہ دعا مانگنے کا حکم خود نبی کریم ﷺ کو دیا گیا۔

بیمار کی دعا

رَبِّ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (٨٣)[الانبیاء]

''اے میرے رب! لگ گئی ہے مجھے بیماری (اس سے نجات دلا کہ) تو ہے سب رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا''۔

یہ حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا ہے جس کی برکت سے ان کی سب تکالیف دور ہو گئیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کی دعا

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ، اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (٨٧)[الانبیاء]

''نہیں کوئی معبود مگر تو، پاک ہے تیری ذات بیشک میں ہی قصوروار ہوں''۔

یہ حضرت یونس علیہ السلام کی دعا ہے جو آپ نے سخت تکلیف کی حالت میں یعنی جب ایک خاص مچھلی نے بحکم الٰہی آپ کو نگل لیا تھا مانگی تھی ساتھ ہی اس کی قبولیت کا بھی ذکر ہے۔ ارشاد ہوا۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ (٨٨)[الانبیاء]

''سو قبول کی ہم نے اس کی دعا اور نجات بخشی ہم نے اس کو غم سے اور اسی طرح ہم نجات دیتے ہیں ایمان والوں کو''۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ مومن یہ دعا مانگے گا تو ضرور قبول ہوگی۔

نوٹ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب کوئی بندہ مومن اپنی کسی تکلیف اور پریشانی کے موقع پر وہ دعا مانگتا ہے جو یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں مانگی تھی تو اسے ضرور شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے۔ (ترمذی)

حصول اولاد کی دعا جو حضرت زکریا علیہ السلام نے مانگی

رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ (۸۹) [الانبیاء]

''اے میرے رب! نہ چھوڑ مجھ کو اکیلا اور تو ہی ہے سب سے بہتر وارث''

یہ دعا حضرت زکریا علیہ السلام نے حصول اولاد کے لئے مانگی تھی جسے بارگاہ الٰہی میں شرف قبول حاصل ہوا اور نتیجۃً انہیں حضرت یحییٰ جیسا فرزند عطا ہوا۔

سواری سے اترنے یا نئی جگہ قیام کرنے کی دعا

رَبِّ اَنۡزِلۡنِیۡ مُنۡزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ (۲۹) [مومنون]

''اے میرے رب! اتار مجھ کو برکت والی جگہ اور تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے''

حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ طوفان کے وقت کشتی میں سوار ہو کر یہ دعا پڑھیں۔

شیطان کے وسوسوں سے بچنے کی دعا

رَبِّ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ (۹۷) وَاَعُوۡذُ بِكَ رَبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ (۹۸) [مومنون]

''اے میرے رب! پناہ مانگتا ہوں میں تیری شیطان کی اکساہٹوں سے اور میرے رب! پناہ مانگتا ہوں میں تیری اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔''

جناب نبی کریم ﷺ کو یہ دعا مانگنے کا حکم ہوا، مخالفین سے سوال و جواب کے وقت اس کا پڑھنا بہت مفید ہے۔

بخشش مانگنے کی دعا

رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰحِمِیۡنَ (۱۰۹) [مومنون]

''اے ہمارے رب! ایمان لائے ہم پس بخشش دے تو ہم کو اور رحم فرما ہم پر اور تو ہی تو ہے سب رحم کرنیوالوں سے بہتر رحم کرنے والا''

بہترین دعا

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (۱۱۸)[مومنون]

''اے میرے رب! بخش دے مجھ کو اور رحم فرما (میرے حال پر) اور تو ہی ہے سب رحم کرنے والوں سے بہتر رحم کرنے والا''۔

جناب نبی کریم ﷺ کو اس دعا کے پڑھنے کا حکم ہوا۔

عبادُالرحمٰن کی خاص دعا

رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (٦٥) اِنَّهَا سَآءَ تْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (٦٦)[فرقان]

''اے ہمارے رب! بچالے تو ہم کو عذاب جہنم سے بے شک اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے۔ یقیناً وہ بہت ہی برا ٹھکانہ اور بہت ہی بری جگہ ہے''۔

قرآن مجید میں عبادالرحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے صفات وکمالات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ اس طرح دعا مانگا کرتے ہیں۔

اہل اولاد کی اطاعت اور فرمانبرداری کیلئے دعا

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۷۴)[فرقان]

''اے ہمارے رب! عطا فرما تو ہم کو ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور بنا تو ہمیں متقیوں میں سب سے آگے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۹)[نمل]

''اے میرے رب! توفیق دے مجھ کو کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیری نعمتوں کا جو تو نے عطا فرمائیں مجھے اور میرے والدین کو (اور مجھے توفیق عطا فرما) کہ میں کرتا رہوں ایسے نیک کام جن سے تو راضی ہو اور داخل کر تو مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں''۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نعمت کے حصول اور خوشی وخوشخبری کے موقع پر یہ دعا پڑھنی چاہیے۔

ظالموں سے نجات پانے کی دعا

رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (۲۱) [قصص]

"اے میرے رب! نجات دلا تو مجھے ان ظالم لوگوں سے"۔

یہ دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے نکلتے وقت مانگی تھی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو سلامتی کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (۲۴) [قصص]

"اے میرے رب! بے شک میں ہر اس خیر کا محتاج ہوں جو تو مجھ پر نازل فرمائے"

یہ دعا بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے سروسامانی کی حالت میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریوں کو پانی پلانے کے بعد مانگی تھی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ ان قیام وطعام اور نکاح وغیرہ کا انتظام فرمایا بلکہ اس کے بعد نبوت کی نعمت عظمیٰ بھی عطا فرمائی۔

حضرت لوط علیہ السلام کی دعا

رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ (۳۰) [عنکبوت]

"اے میرے رب! مدد فرما تو میری ان فسادی لوگوں کے مقابلے میں"

یہ دعا حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے شر سے بچنے کے لئے مانگی تھی جو قبول ہوئی۔

جب خوشخبری سنے تو یہ دعا پڑھے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ (۳۴) [فاطر]

"تمام تعریفیں اور ہر شکر اللہ کے لئے ہے جس نے دور کر دیا ہم سے ہر قسم کا رنج وغم۔ بے شک ہمارا رب بہت بخشنے والا اور قدردان ہے۔"

حصول اولاد کی دعا

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۱۱۰) [صافات]

"اے میرے رب! عطا فرما تو مجھے (اولاد جو) صالحین میں سے ہو"۔

یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حصول اولاد کے لئے مانگی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسمٰعیل علیہ السلام

جیسا حلیم الطبع اور اطاعت شعار فرزند عطا فرمایا۔ آپ ہی کے متعلق بعد ازاں ذبح کا اشارہ ہوا اور آپ ہی کی برکت سے قربانی مسلمانوں کا شعار قرار پائی۔

نبی کریم ﷺ کی دعا

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۴۶) [زمر]

''اے اللہ! پیدا فرمایا ہے (تو نے ہی) آسمانوں اور زمین کو، جاننے والا ہے (تو ہی) چھپے اور کھلے کا۔ تو ہی فیصلہ فرمائے گا اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے رہے ہیں۔''

نبی کریم ﷺ کو یہ دعا مانگنے کا حکم دیا گیا۔

اعمال صالح کی توفیق کی دعا

رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ج اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۵) [احقاف]

''اے میرے رب! توفیق دے تو مجھ کو کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیری ان نعمتوں کا جو تو نے عطا فرمائیں مجھے اور میرے والدین کو اور (یہ توفیق دے) کہ میں کرتا رہوں ایسے نیک کام جن سے تو راضی ہو اور نیک بنا دے تو میری خاطر میری اولاد کو میں توبہ کرتا ہوں تیرے حضور اور میں ہوں تیرے تابع فرمان بندوں سے''۔

یہ دعا بکثرت مانگتے رہنا چاہئے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا

رَبِّ اِنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۱۰) [قمر]

''پس پکارا اس نے اپنے رب کو میں مغلوب ہو چکا ہوں اب تو انتقام لے''۔

یہ دعا حضرت نوح علیہ السلام کی ہے جو آپ نے اپنی قوم کو ایذا رسانی کے وقت مانگی تھی جب آدمی چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہو اور بچ نکلنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی ہو تو نہایت عاجزی سے یہ دعا بکثرت پڑھے۔

انصار مدینہ کی دعا

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۰) [حشر]

''اے ہمارے رب! بخش دے تو ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور نہ باقی رہنے دے ہمارے دلوں میں کوئی بغض اہل ایمان کے لئے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بڑا مہربان اور ہر حالت میں رحم کرنے والا ہے''۔

فرض اور نفل نمازوں کے بعد یہ دعا ضرور مانگنی چاہئے۔

فتنہ سے بچنے کی دعا

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ(۴) رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْلَنَا رَبَّنَا ج اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ(۵)[ممتحنہ]

''اے ہمارے رب! تجھ ہی پر بھروسہ کیا ہم نے تیری ہی طرف رجوع کیا ہم نے، تیرے ہی حضور لوٹ کر جانا ہے ہمیں۔ اے ہمارے رب! نہ بنائیو ہم کو فتنہ ان لوگوں کے لئے جو کافر ہیں اور معاف فرما دے تو ہمارے قصور۔ اے ہمارے رب! بے شک تو ہی ہے زبردست اور حکمت والا۔''

یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے جو آپ نے اپنے والد اور اپنی قوم کی ایذارسانی کے وقت مانگی تھی۔

طلب ہدایت و تکمیل نور کی دعا

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا ج اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ(۸)[تحریم]

''اے ہمارے رب! تکمیل فرما ہمارے نور کی اور بخش دے ہم کو بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے''۔

....

حرزِ اعظم

جادو، جن وانس کی نظر بد اور ہر قسم کی بلاؤں سے محفوظ رہنے کا مسنون عمل

۱) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک اعرابی آیا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرا بھائی بیمار ہے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا اسے کیا بیماری ہے؟ اُس نے عرض کیا: اس پر آسیب کا اثر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ اسے لا کر آپ ﷺ کے سامنے لٹا دیا گیا۔

آپ ﷺ نے ''حرزِ اعظم'' کی آیات تلاوت فرما کر اس پر دم کیا اور وہ شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا گویا کبھی بیمار تھا ہی نہیں۔

۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جو شخص ان آیات کو پڑھے گا اس کے گھر بار، اس کے بال بچوں اور اس کے مال و دولت کے قریب نہ شیطان آئے گا اور نہ اس پر کوئی ناپسندیدہ چیز اثر انداز ہو گی اور ان آیات کو پڑھ کر اگر دیوانے پر دم کیا جائے تو وہ بھی ٹھیک ہو جائے۔ علاوہ ازیں کچھ اور روایات میں بھی ان آیات کی فضیلت اور برکت کا ذکر ہے۔

(۱) زوائد مسند احمد بن حنبلؒ (۲) حاکم (۳) بیہقی (۴) دارمی (۵) طبرانی بحوالہ تفسیر فتح القدیر شوکانی

ان منتخب آیات کریمہ کے مضمون کو دیکھتے ہوئے ایمانی ذوق کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان ہر وقت ان کو ورد زبان رکھے اور توحید خالص کا جو جامع تصور ان میں پیش کیا گیا ہے اسے اپنے ذہن و شعور میں پوری طرح راسخ کر لے۔ ان آیات کے مفہوم میں خود اس بات کی شہادت موجود ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس ''حرزِ اعظم'' کی برکت سے انسان کا دل و دماغ نور توحید سے منور ہو جائیں تو اس کی زندگی کے تمام مسائل و معاملات حل ہو جائیں اور اس کا سب سے بڑا دشمن شیطان لعین اس کے قریب آنے کی بھی جرات نہ کرے۔

(۱) بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (۱) الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ (۲) مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ (۳) اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ (۴) اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (۵) صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ (۶) [الفاتحہ]

''پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سے شیطان مردود کی''

''اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور ہر وقت اور ہر حالت میں رحم کرنے والا ہے''

''تمام تعریفیں اور ہر شکر اللہ ہی کے لئے ہے۔ جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ نہایت مہربان اور ہر حالت میں رحم کرنے والا۔ مالک روز جزا کا۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔ ہدایت دے ہمیں سیدھے راستے کی، راستہ ان لوگوں کا کہ انعام فرمایا تو نے ان پر نہ ان لوگوں کا کہ غضب ہوا تیرا ان پر اور نہ ان کا جو بھٹک گئے۔''

۲) الٓمّٓ (۱) ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ (۲) الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ وَيُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ (۳) وَالَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ (۴) اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (۵) [البقرة]

''الف۔ لام۔ میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ کوئی شک نہیں اس (کے کتاب الٰہی ہونے) میں، ہدایت ہے اللہ سے

ڈرنے والوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز اور اس میں سے جو ہم ہی نے دیا انہیں وہ خرچ کرتے ہیں اور وہ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو نازل کیا گیا تم پر اور اس پر جو نازل کیا گیا تم سے پہلے اور آخرت پر بھی یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ قائم ہیں ہدایت پر اپنے رب کی اور یہی ہیں فلاح پانے والے۔'' (سورہ البقرۃ:۱تا۵)

۳) وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (البقرۃ:۱۶۳)

''اور تم سب کا معبود ایسا معبود ہے جو ایک ہی ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی۔ جو نہایت مہربان ہر حالت میں رحم کرنے والا ہے۔''

۴) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۲۵۵) لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۵۶) اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵۷) [البقرہ]

''اللہ، کہ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے، زندہ جاوید ہے۔ پوری کائنات کو قائم رکھنے والا ہے۔ نہیں لاحق ہوتی اس کو اونگھ اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں۔ کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے حضور بغیر اس کی اجازت کے وہ جانتا ہے اس کو جو بندوں کے سامنے ہے اور اس کو بھی جو ان سے اوجھل ہے اور نہیں جان سکتے بندے ذرا بھی اس کے علم میں سے مگر جس قدر وہ چاہے۔ چھائی ہوئی ہے اس کی کرسیٔ اقتدار آسمانوں اور زمین پر اور نہیں تھکاتی اس کو نگہبانی ان دونوں کی اور وہ تو بہت ہی برتر اور عظیم تر ہے۔ نہیں ہے کوئی جبر دین کے معاملہ میں (اس لئے کہ) بیشک واضح طور پر نمایاں ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے۔ لہٰذا جس نے انکار کر دیا طاغوت کا اور ایمان لے آیا اللہ پر پس اس نے تھام لیا ایسی مضبوط رسی کو جو ٹوٹ نہیں سکتی اللہ ہر بات سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے اللہ ساتھی اور کارساز ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو (جاہلیت کی) تاریکیوں سے (ہدایت کی) روشنی کی طرف اور وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کے دوست اور ساتھی شیاطین ہیں جو نکال لے جاتے ہیں ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف یہی لوگ ہیں اہل دوزخ۔ یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

۵) لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْتُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ
فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲۸۴) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ
اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ
وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ (۲۸۵) لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ
لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ
عَلَیْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۣ
وَاغْفِرْ لَنَا ۣ وَارْحَمْنَا ۣ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ (۲۸۶) [البقرہ]

"اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور خواہ تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اس کو چھپاؤ بہر حال حساب لے لے گا تم سے اس کا اللہ پھر معاف فرما دے جس کو چاہے اور سزا دے جس کو چاہے اور اللہ تو ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ ایمان لایا رسول اس ہدایت پر جو نازل کی گئی اس پر اس کے رب کی طرف سے اور سب مومن بھی۔ ہر ایک ایمان لے آیا اللہ پر اور اسکے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر (ان کا اقرار ہے) نہیں فرق کرتے ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک میں (رسول ہونے کے اعتبار سے) اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا (تیرے احکام کو) اور اطاعت کی۔ تیری بخشش (کے طلب گار ہیں ہم) اے ہمارے مولا! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ نہیں ڈالتا ذمہ داری کا بوجھ اللہ کسی جاندار پر مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اسی کے لئے ہے فائدہ اس (خیر) کا جو اس نے کمایا اور اسی کو پہنچے گا نقصان اس (شر) کا جو اس نے کمایا۔ اے ہمارے مولا! نہ گرفت فرمائیو ہماری اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں۔ اے ہمارے مالک! نہ ڈالیو ہم پر بار جیسا ڈالا تھا تو نے ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے ہو گزرے۔ اے ہمارے مالک! اور نہ اٹھوائیو ہم سے ایسا بوجھ کہ نہیں طاقت ہم میں اس کے اٹھانے کی۔ ہمیں بخش دے۔ اور ہمیں اپنی شفقت میں ڈھانپ لے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا مولا ہے سو ہمیں فتح عطا فرما کافر لوگوں پر۔

۶) شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ
الْحَكِیْمُ (آل عمران:۱۸)

"گواہی دی خود اللہ نے اس بات کی کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے اور گواہی دی فرشتوں نے اور علم والوں نے کہ وہ قائم ہے عدل پر لہٰذا نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے وہ سب پر غالب اور بڑی حکمت والا ہے"

۷) اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۣ یُغْشِی
الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ

تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۵۴) اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً ط اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۵۵)
وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا وَادْعُوْہُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ
الْمُحْسِنِیْنَ (۵۶) [الاعراف]

’’بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پھر جلوہ فرما ہوا وہ عرش پر ڈھانک دیتا ہے رات کو دن پر (اور پھر) تلاش میں دوڑتا چلا آتا ہے دن رات کے پیچھے اور سورج چاند اور تارے سب (جکڑے ہوئے) ہیں اس کے حکم سے (اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں) خبردار رہو اسی کے اختیار میں ہے پیدا فرمانا اور حکم دینا اسی کو زیبا ہے۔ بڑا برکت والا ہے اللہ مالک سب جہانوں کا۔ تم پکارو اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے بے شک وہ نہیں پسند فرماتا حد سے بڑھنے والوں کو اور مت فساد برپا کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور دعا مانگتے رہو اللہ سے (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور اس کی (رحمت کی) امید رکھتے ہوئے بے شک اللہ کی رحمت بہت قریب ہے نیک کام کرنے والوں سے‘‘ (سورہ اعراف:۵۴تا۵۶)

۸) قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ج وَلَاتَجْھَرْ بِصَلَاتِکَ
وَلَا تُخَافِتْ بِھَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا (۱۱۰) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّہٗ
شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا (۱۱۱) [بنی اسرائیل]

’’کہو پکارو اللہ (کہہ کر) یا پکارو رحمان (کہہ کر) جس نام سے بھی پکارو سو اس کے لئے ہیں تمام نام اچھے اور نہ زیادہ بلند آواز سے پڑھو اپنی نماز اور نہ بہت پست آواز سے اور اختیار کرو ان دونوں کے درمیان کا طریقہ۔ اور کہو تعریف ہے اللہ ہی کے لئے جس نے نہ بنایا کسی کو بیٹا اور نہیں ہے کوئی اس کا شریک بادشاہی میں اور نہیں ہے کوئی اس کا مددگار اس بناء پر کہ وہ عاجز ہے کوئی اس کا پشتیبان ہو اور بڑائی بیان کر اس کی کمال درجے کی بڑائی۔‘‘

۹) اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (۱۱۵) فَتَعٰلَی اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ ج لَآ اِلٰہَ
اِلَّا ھُوَ ج رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ (۱۱۶) وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ لَا بُرْھَانَ لَہٗ بِہٖ لا فَاِنَّمَا حِسَابُہٗ
عِنْدَ رَبِّہٖ ط اِنَّہٗ لَایُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ (۱۱۷) وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ
الرّٰحِمِیْنَ (۱۱۸) [المومنون]

کیا تم خیال کرتے ہو کہ پیدا کیا ہے ہم نے تم کو بے مقصد اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ پس بالا وبرتر ہے اللہ بادشاہ حقیقی۔ نہیں کوئی معبود اس کے سوا۔ مالک ہے وہ عرش کریم کا اور جو کوئی پکارے اس کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں ہے اس کے پاس کوئی دلیل اس پکارنے کی تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا۔ کبھی

نہیں فلاح پا سکتے کافر اور (اے نبی) کہو اے میرے رب! معاف فرما اور رحم کر اور تو ہے بہتر رحم کرنے والا۔ سب رحم کرنے والوں سے۔"

۱۰) وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا(۱) فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا(۲) فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا(۳) اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ(۴) رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ(۵) اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۣ الْكَوَاكِبِ(۶) وَحِفْظًامِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ(۷) لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ(۸) دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ(۹) اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ(۱۰)[الصّٰفّٰت]

"قسم ہے صف باندھ کر کھڑے ہونے والے (فرشتوں کی) پھر ڈانٹنے پھٹکارنے والے (فرشتوں کی) پھر ذکر (الٰہی) کی تلاوت کرنے والے (فرشتوں کی) (غرض ہم کو ان فرشتوں کی قسم) بے شک تمہارا معبود صرف ایک ہے۔ جو مالک ہے آسمانوں، زمین اور ان سب چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں اور مالک ہے سب مشرقوں کا۔ بیشک ہم نے آراستہ کیا آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے اور محفوظ کر دیا (اس کو) ہر شیطان سرکش سے نہیں سن سکتے (یہ شیطان) عالم بالا کی کوئی بات اور دھکے دے کر نکال دیئے جاتے ہیں یہ ہر طرف سے اور ان کے لئے ہے دائمی عذاب، تاہم اگر کوئی لے اڑے ان میں سے کوئی سن گن تو اس کا پیچھا کرتا ہے ایک تیز شعلہ۔"

۱۱) يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ط لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ(۳۳) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ(۳۴) يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ(۳۵)[الرحمٰن]

"اے گروہ جن و انس اگر تم میں یہ طاقت ہے کہ نکل کر بھاگ سکو آسمانوں اور زمین کی سرحدوں سے تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے تم اس کے لئے بڑا زور چاہیے۔ سو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (بھاگنے کی کوشش کرو گے تو) چھوڑ دیا جائے گا تم پر شعلہ آگ کا اور دھواں پس نہیں مقابلہ کر سکو گے تم اُس کا۔"

۱۲) لَوْاَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ(۲۱) هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّاهُوَ ج عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ط هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ(۲۲) هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ط سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ(۲۳) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ(۲۴)[الحشر]

"اگر اتارا ہوتا ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر تو دیکھتے تم اسے کہ وہ دبا جا رہا ہے پھٹا پڑتا ہے اللہ کے خوف سے اور یہ

مثالیں بیان کررہے ہیں ہم لوگوں کیلئے تا کہ وہ غور کریں۔ وہ اللہ ہی ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، جاننے والا چھپے اور ظاہر کا اور وہی ہے بے انتہا رحم کرنے والا اور ہر حالت میں رحم کرنے والا۔ وہ اللہ ہی ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، بادشاہ ہے نہایت مقدس سراسر سلامتی امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا، بڑا ہی ہو کر رہنے والا، پاک ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کررہے ہیں۔ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اسکو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے اس کے لئے ہیں تمام بہترین نام، تسبیح کررہی ہے اس کی وہ ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔''

۱۳) قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا(۱) يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا(۲) وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا(۳) وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا(۴)[الجن]

''(اے نبی! کہو) وحی بھیجی گئی ہے میری طرف کہ غور سے سنا جنّوں کے ایک گروہ نے پھر (جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے) کہا ہم نے سنا ہے ایک قرآن جو بڑا عجیب ہے۔ رہنمائی کرتا ہے راہ راست کی طرف سو ایمان لے آئے ہم اس پر اور (اب) ہرگز نہیں شریک بنائیں گے ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو اور واقعہ یہ ہے کہ بہت اونچی ہے شان ہمارے رب کی (اس لئے) نہیں بنایا اس نے کسی کو بیوی اور نہ بیٹا اور یہ کہ کہتے تھے ہم میں سے بیوقوف لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کی خلاف حق باتیں۔''

۱۴) قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ(۱) لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ(۲) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ(۳) وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ(۴) وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُو(۵) لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ(۶)[الکافرون]

''کہہ دو! اے کافرو! نہیں عبادت کرتا میں ان کی جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ ہی میں عبادت کرنے والا ہوں ویسی جیسی عبادت تم نے کی اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو ویسی جیسی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔''

۱۵) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ(۱) اَللّٰهُ الصَّمَدُ(۲) لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ(۳) وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ(۴)[الاخلاص]

''کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ بے نیاز ہے سب اس کے محتاج۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور ہرگز نہیں ہمسر و ہم پایہ بھی اس کا کوئی۔'' (سورۃ اخلاص)

۱۶) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ(۱) مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ(۲) وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ(۳) وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ(۴) وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ(۵)[الفلق]

”کہو پناہ مانگتا ہوں میں رب الفلق کی، ان چیزوں کے شر سے جو اس نے پیدا کیں اور اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جائے اور گرہوں میں پھونک مارنے والیوں کے شر سے اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔“

۱۷) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱) مَلِكِ النَّاسِ (۲) اِلٰهِ النَّاسِ (۳) مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ لا الْخَنَّاسِ (۴) الَّذِىْ يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ (۵) مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۶) [الناس]

”کہو پناہ مانگتا ہوں میں انسانوں کے رب کی، انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے معبود کی، وسوسے ڈالنے والے (شیطان) کے شر سے جو دبک جانے والا پھر پلٹ آنے والا ہے۔ جو وسوسے ڈالتا رہتا ہے انسانوں کے دلوں میں، وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔“

(مولانا سید شبیر احمدؒ)

....

قرآن فہمی کے آداب

............تفہیم القرآن اور تدبر قرآن کی روشنی میں............

1- سب سے ضروری بات تو یہ ہے کہ قرآن کو کھلے ذہن سے پڑھا جائے۔ یعنی اس کو پڑھنے سے پہلے تمام خیالات ونظریات سے ذہن کو صاف کرلیا جائے۔ اس کے بعد جو بھی شخص قرآن کو مطالب ومعانی کے ساتھ پڑھے گا تو اس پر قرآن کا صحیح فہم خود ہی واضح ہوتا چلا جائے گا۔ سید مودودی کے الفاظ میں "اگر وہ اس کتاب کو فی الواقع سمجھنا چاہتا ہے تو اولین کام یہ کرنا چاہئے کہ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم کئے ہوئے تصورات اور نظریات سے اور موافقانہ یا مخالفانہ اغراض سے جس حد تک ممکن ہو خالی کرلے اور سمجھنے کا خالص مقصد لے کر کھلے دل سے اس کو پڑھنا شروع کرے۔ جو لوگ چند مخصوص قسم کے خیالات ذہن میں لے کر اس کتاب کو پڑھتے ہیں وہ اس کی سطروں کے درمیان اپنے ہی خیالات پڑھتے چلے جاتے ہیں"۔

یہ عام تجربہ ہے کہ مدارس کے طلبہ کا قرآن پڑھنے سے پہلے ہی ایک خاص ذہن بنا دیا جاتا ہے اس لئے وہ قرآن کی اصل روح سے آشنا نہیں ہو پاتے بلکہ اس سے اپنے مطلب کی اختلافی باتیں اخذ کرنے پر ساری توجہ صرف کرتے ہیں۔ الحمدللہ تعلیم یافتہ طبقہ اور اسلامی تحریک کے کارکنوں میں ایسی کوئی صورتحال نہیں پائی جاتی، ان کے لئے آسان طریقہ ہے کہ کھلے ذہن کے ساتھ اس کو کلام الٰہی سمجھ کر پڑھیں اور اپنی زندگی کے مسائل کے حوالے سے اس میں ہدایت تلاش کریں۔ ان شاء اللہ تمام مشکلات کا حل خود ہی ملتا چلا جائے گا۔

2- قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے کہ کتاب اللہ کی زبان یعنی عربی سے آپ کو واقفیت ہو۔ عربی کی بنیادی گرائمر سمجھے بغیر قرآن کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ سید مودودیؒ کے الفاظ میں "قرآن کو بار بار پڑھنا چاہئے۔ ہر مرتبہ ایک خاص ڈھنگ کے ساتھ پڑھنا چاہئے اور ایک طالب علم کی طرح پنسل اور کاپی ساتھ لے کر بیٹھنا چاہئے تاکہ ضروری نکات نوٹ کرتا چلا جائے......اس ابتدائی مطالعے کے دوران میں وہ قرآن کے پورے منظر پر ایک جامع نظر حاصل کرنے کی

کوشش کرے......اس طرح قرآن پر ایک جامع نظر حاصل کرنے کے بعد تفصیلی مطالعہ کی ابتدا کرنی چاہئے۔اس سلسلے میں ناظر کوتعلیمات قرآن کا ایک ایک پہلو ذہن نشین کر کے نوٹ کرتے جانا چاہئے"۔

مولانا امین احسن اصلاحی فہم قرآن کے داخلی وسائل کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''قرآن کی زبان عربی ہے اور عربی بھی وہ جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزے کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔جن و بشر میں سے کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ اس کے مثل کلام پیش کر سکے......اس درجے و مرتبے کے کلام کے زور و اثر اور اس کی خوبیوں اور لطافتوں کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو یہ کام ظاہر ہے کہ وہ اس کے ترجموں، اس کی تفسیروں اور اس کی لغتوں کے ذریعے سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے لئے اس کو اس زبان کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا، جس میں وہ کلام ہے"۔

3- ایک اور اہم چیز نیت کی پاکیزگی ہے، نیت کی پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی قرآن مجید کو صرف ہدایت کے لئے پڑھے۔کسی اور غرض کو سامنے رکھ کے نہ پڑھے۔اگر طلب ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے اور کوئی غرض ہوگی تو وہ نہ صرف قرآن کے فیض سے ہی محروم رہے گا بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دور وہ اب تک رہا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے......قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا صحیفہ بنا کر اتارا ہے اور ہر آدمی کے اندر طلب ہدایت کا داعیہ ودیعت فرمایا ہے۔اس داعیے کے تحت آدمی قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ بقدر کوشش اور بقدر توفیق الٰہی اس سے فیض پاتا ہے۔

4- قرآن مجید کو ایک اعلیٰ اور برتر کلام مان کر اس پر غور کیا جائے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔اگر دل میں قرآن مجید کی عظمت و اہمیت نہ ہو تو آدمی اس کو سمجھنے اور اس کے حقائق و معارف دریافت کرنے پر وہ محنت صرف نہیں کر سکتا جو اس کے خزائن حکمت سے مستفید ہونے کے لئے ضروری ہے۔اگر کسی رقبہ زمین کے متعلق یہ علم ہو کہ وہاں سے سونا نکلتا ہے اور کسی زمانے میں اس سے کافی سونا نکل چکا ہے تو توقع یہی کی جاتی ہے کہ اگر کھدائی کی جائے تو یہاں سے سونا ہی نکلے گا اور اس پر اسی حیثیت اور اعتبار سے محنت کی جاتی ہے۔

بظاہر یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوگی کہ ایک کتاب کے متعلق اس کے سمجھنے سے پہلے یہ حسن ظن قائم کر لیا جائے کہ وہ نہایت ہی عظیم اور برتر کتاب ہے لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے متعلق یہ پیشگی حسن ظن کوئی عجیب بات نہیں ہے۔قرآن مجید اپنے پیچھے عظیم تاریخ رکھتا ہے۔کوئی شخص اس کتاب پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتا کہ جتنا بڑا انقلاب دنیا میں اس کتاب نے برپا کیا ہے اتنا بڑا انقلاب کسی کتاب نے بھی برپا نہیں کیا۔اس نے دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک انسانی زندگی کے ہر گوشے کو نہایت گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔اس کتاب میں کیا جادو پوشیدہ ہے کہ عربوں کی قوم، جس کو اونٹ چرانے کے علاوہ اور کسی بات کا بھی

سلیقہ نہ تھا، اس قرآن کو پڑھ کر دفعتاً شتربانی کے درجے سے ترقی کر کے جہاں بانی کے مرتبے پر پہنچ گئی۔

5- قرآن حکیم سے صحیح استفادے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر قرآن مجید کے تقاضوں کے مطابق، اپنے ظاہر و باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ ایک شخص جب قرآن مجید کو گہری نگاہ سے پڑھتا ہے تو وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کے تقاضے اور مطالبے اس کی اپنی خواہشوں اور چاہتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تصورات و نظریات بھی قرآن سے بالکل الگ ہیں۔ اس کے معاملات و تعلقات بھی قرآن کی مقرر کردہ حدود سے ہٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے باطن کو بھی قرآن سے دور پاتا ہے اور اپنے ظاہر کو بھی اس سے بالکل منحرف دیکھتا ہے۔ اس فرق و اختلاف کو محسوس کر کے ایک صاحب عزم اور حق طلب آدمی تو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خواہ کچھ ہو میں اپنے آپ کو تا حد امکان قرآن کے مطالبات کے مطابق بنانے کی کوشش کرونگا۔ وہ ہر قسم کی قربانیاں دے کر، ہر طرح کے مصائب جھیل کر، ہر نوع کی ناگواریاں برداشت کر کے اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی نیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق پاتا ہے...... کامیابی اور فلاح کی راہ صرف یہ ہے کہ آدمی قرآن کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرے اور اس کے لئے ہر قربانی پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ عرصے تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے اس ارادے کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس آزمائش میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کے لئے کامرانی کی راہیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔

6- قرآن حکیم سے استفادے کے لئے ایک اور شرط تدبر ہے۔ اس شرط کا ذکر قرآن مجید نے خود بار بار کیا ہے۔ (اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا...... کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں) صحابہ کرامؓ جو قرآن کے اولین مخاطب تھے وہ قرآن کو برابر تدبر کے ساتھ پڑھتے تھے اور جو لوگ جتنا زیادہ تدبر کرتے تھے وہ اتنے ہی قرآن کے فہم میں ممتاز تھے۔ بعض صحابہؓ نے خود اپنے بارے میں یہ شہادت دی ہے کہ انہوں نے سورۃ بقرہ پر پورے آٹھ سال صرف کئے۔ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کے مطالعے کے لئے گروپ بھی قائم کئے تھے جن میں اہل ذوق حضرات اکٹھے ہو کر اجتماعی مطالعہ کرتے تھے تا کہ ایک دوسرے کے فکر و تدبر سے استفادہ کر سکیں۔ اس طرح کی کلاسز اور کورسز سے نبی پاک ﷺ کو خاص دلچسپی تھی اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کورسز کو آپ ﷺ ذکر کے حلقوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ بعد میں خلفائے راشدین خصوصاً حضرت عمرؓ اس قسم کی کلاسز اور قرآن مجید کے ماہرین سے نہایت گہری دلچسپی لیتے رہے۔

محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور معانی کی طرف دھیان نہ کرنا صحابہ کرامؓ کا طریقہ کار نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا ہے جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفہ ہدایت کے بجائے محض حصول برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا۔ جب زندگی کے مسائل سے قرآن عظیم کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دم نزع اس کے ذریعے

سے جان کنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعے سے میت کو ایصال ثواب کیا جائے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن حکیم سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ اسی صورت میں حاصل کیا جاسکتا ہے جب اس کو پورے غور وتدبر سے پڑھا جائے لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ یہی ایک کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھیں بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی کتاب بھی پڑھنے کے لئے لوگ کھولتے ہیں تو اس کے لئے سب سے پہلے اپنے دماغ کو حاضر کرتے ہیں لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کی یہ انوکھی روش ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بالعموم سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ (تدبر قرآن از مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

7- سید مودودیؒ کے الفاظ میں...... ’’فہم قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی روح قرآن سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لئے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں کہ آپ آرام سے کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصور مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لئے جائیں۔ جیسا کہ آغاز میں بتایا جا چکا ہے یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نام انسان کو گوشہ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور اس وقت کے علمبرداران کفر وفسق وضلالت سے اس کو لڑا دیا...... اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاع کفر و دین اور معرکہ اسلام وجاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کر دیں اور جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح قدم اٹھاتے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے...... جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں‘‘۔ اس راستے پر چل کر ہی قرآن کو سمجھا جاسکتا ہے۔

قرآن کافہم عام کرنے کے لئے لائحہ عمل

قرآن مجید اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے جو اس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے۔ ہم مسلمان بڑے خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عظیم نعمت ہمارے سپرد فرمائی ہے۔ اس کی متبادل، دنیا کی کوئی اور نعمت نہیں ہو سکتی۔ یہ بات ہمارے دل و دماغ میں جاگزیں ہو جائے تو ہمارے لئے قرآن فہمی کی منزلیں خود ہی آسان ہوتی چلی جائیں گی۔ ذیل میں چند ایسے اصحاب کی تحریریں پیش کر رہے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں کا بڑا حصہ قرآن فہمی کو عام کرنے کے لئے لگایا۔ اس سے آپ کو بہترین رہنمائی مل سکے گی۔

خرم مرادؒ:

”قرآن کریم کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کو ہم خود سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ ہم پر اس کا دوسرا حق یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اسے بیان کریں اور پیش کریں۔ جب روشنی آتی ہے تو اس لئے نہیں آتی کہ اس کے اوپر آدمی پردہ اور کمبل ڈال دے۔ روشنی آتی ہی اس لئے ہے کہ وہ اپنے ماحول کو روشن کر دے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اس لئے آئی ہے کہ انسانوں کو صحیح راستہ بتائے۔ اس لئے نہیں آئی کہ وہ لپیٹ کر جزدان میں رکھ دی جائے یا ڈرائنگ روم کی شیلف میں سجا دی جائے یا گاہے گاہے اس کی تلاوت کر لی جائے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔ ہماری عظمت و سر بلندی کے سارے خزانے اس میں پوشیدہ ہیں۔ کامیابی کی ساری کنجیاں اس کے دامن میں ہیں۔ کامرانی کے سارے دروازے اسی کے اندر ہیں۔ کامرانی، نجات، سکون اور مغفرت کا اس کے باہر کوئی دروازہ نہیں۔ ہم ہر روز صبح اخبار پڑھتے ہیں اور قوم کی حالت زار پر روتے ہیں اور مرثیہ پڑھتے ہیں لیکن میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ صرف ایک ہی نسخہ ہے جو ہمارے ملی اور قومی امراض کا علاج ہے اور وہ ہے قرآن مجید!“

محترم خرم مراد صاحب اس مقصد کے لئے ایک نہایت ہی آسان طریقہ قرآن سمجھنے کا بتاتے ہیں۔اس طریقے پرعمل کرنے سے گھر کا ہر فرد قرآن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔" آپ قرآن پاک کا کوئی آسان ترجمہ لے لیں اور یہ ارادہ کرلیں کہ چوبیس گھنٹے کا دن جسے آپ کاروبار، روزگار اور بیوی بچوں میں لگاتے ہیں،اس میں سے پانچ منٹ، روزانہ اس بات پر لگائیں گے کہ قرآن مجید کی صرف تین آیات ترجمے سے پڑھ لیں اگر پڑھنا نہ جانتے ہوں تو کسی سے سن لیں۔اس طرح چار پانچ سال میں پورا قرآن ختم ہو جائے گا۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، اگرچہ آج یہ کام بہت مشکل لگتا ہے کہ پورا قرآن پڑھا جائے لیکن ارادے سے اور عزم سے، تہیہ کر کے روزانہ پانچ منٹ صرف تین قرآنی آیات اس طرح سے پڑھی جائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے بات کر رہا ہے تو چند ہی روز میں اس کی لذت اور اس کا کیف آپ کو خود ابھارے گا کہ آپ اس کو ڈوب کر پڑھیں گے۔"

اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب ہمارے لئے اتاری ہے وہ ہم سے بار بار کہہ رہا ہے کہ میں نے تمہارے لئے یہ کتاب اتاری ہے۔وہ ہم سے کلام کر رہا ہے...... اگر ہم روزانہ اس کے کلام کے ساتھ صرف پانچ منٹ صرف کر دیں، اس کی صحبت میں لپک کر جائیں اور ارادہ کر لیں کہ روزانہ کم از کم تین آیات پڑھیں گے اور اس کے مطابق اپنی زندگی بنانے کی کوشش کریں گے تو پانچ سال میں قرآن مجید مکمل ہو جائے گا اور یہ بڑا کام ہو جائے گا۔اگر قرآن مجید کا مفہوم اور ترجمہ اس قوم کے ہر فرد تک پہنچ جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی حالت نہ بدل جائے۔

محض اپنی اصلاح سے بھی بات نہیں بنے گی۔ یہ کتاب آپ کو اس لئے دی گئی تھی کہ آپ اسے لے کر کھڑے ہوں اور اسے دوسروں تک پہنچائیں۔کبھی غور کیجئے، غار حرا سے لے کر اس وقت تک، جب آنحضرت ﷺ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی، اس وقت تک آپ ﷺ کے دن رات کس کام میں صرف ہوتے تھے؟ پھر آپ ﷺ صبح، شام، رات، دن، مکہ کی گلیوں میں اور طائف کی وادی میں، مدینہ اور مسجد نبوی میں، اپنے حجرے کے اندر بیٹھ کر، میدان جنگ میں فوجیں لے جا کر کیا کام کر رہے تھے۔آپ ﷺ صرف اللہ کے دین کی دعوت پہنچا رہے تھے اور اس کے لئے جہاد کر رہے تھے۔اس عمل کے بغیر قرآن کو سمجھنے کا کام مکمل نہیں ہو سکتا۔

حافظ محمد ادریس:

شہدائے اسلام فاؤنڈیشن کے چیئر مین اور پنجاب یونیورسٹی یونین کے سابق صدر حافظ محمد ادریس کہتے ہیں کہ قرآن مجید انسان کا دستور حیات ہے۔ یہ مسلمانوں کا سرمایہ افتخار ہے۔اس کی تعلیمات کو عام کرنا جہاد ہے۔اسی سے انقلاب آئے گا۔حافظ محمد ادریس صاحب کے خیال میں فہم قرآن کو عام کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔

1- گھروں کے اندر افراد خانہ کے روزانہ مختصر درس، صبح یا رات کو اپنی سہولت کے مطابق رکھ لئے جائیں۔ بچوں کو

اور خواتین کو بھی قرآن فہمی کے اس پروگرام میں شامل کیا جائے۔

2- درس قرآن کی عام فہم کتابیں مرتب کی جائیں۔ مساجد میں صبح یا شام چند صفحات پڑھے جائیں اور جہاں ضروری ہو وہاں تشریح کی جائے۔

3- ماہ رمضان میں نماز تراویح میں پڑھی جانے والی منزل کا خلاصہ پیش کیا جائے۔

4- شہر شہر، قریہ قریہ تعلیم یافتہ افراد کیلئے قرآن کورسز کا اہتمام کیا جائے، تفاسیر کا تعارف، عربی زبان سے واقفیت اور قرآن کا ترجمہ پڑھانے کا اہتمام کیا جائے۔

5- عام تعلیمی اداروں اور سرکاری تعلیمی اداروں میں اساتذہ اور طلبہ کے لئے عام فہم دینی کورسز ان اداروں کی انتظامیہ کے مشورے اور تعاون سے منظّم کئے جائیں۔

6- طلبہ اور نوجوانوں کے درمیان وقتاً فوقتاً قرآن فہمی کے سلسلے میں تحریری و زبانی مقابلے کرائے جائیں۔ نوجوانوں کے لئے مختلف مقامات پر قرآن کوئز پروگرام مرتب کئے جائیں۔

7- قرآن مجید کو صحیح تجوید کے ساتھ پڑھنے کے لئے بچوں، بالغوں، خواتین، عام شہریوں، تعلیم یافتہ لوگوں کو متوجہ کیا جائے اور ان کے لئے خصوصی کورسز کا اہتمام کیا جائے۔

8- قرآن فہمی کا اولین قدم ناظرہ پڑھنا ہے۔ جن لوگوں نے قرآن مجید نہیں پڑھا ہے ان کو پڑھنے کی طرف مائل کیا جائے اور ان کے لئے قرآن پڑھنے کے آسان مواقع فراہم کئے جائیں۔

9- اسلامی جمعیت طلبہ، تنظیم اساتذہ، جمعیت طلبہ عربیہ، شباب ملی اور شعبہ خواتین دیہات میں قرآن پڑھانے کے لئے خصوصی پروگرام ترتیب دیں۔

10- اللہ تعالیٰ کا مملکت خداداد پاکستان کے باشندوں پر یہ خاص احسان ہے کہ جابجا ایسے ادارے قائم ہو رہے ہیں جن کا نصب العین صرف قرآن فہمی ہے۔ قرآن ہاؤس، قرآن انسٹیٹیوٹ، دارالفرقان، دارارقم، انجمن خدام القرآن، قرآن اکیڈمی، قرآن آسان تحریک، قرآن کالج، الفجر ٹرسٹ وغیرہ ایسے ادارں میں شامل ہیں جو محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر لوگوں کو دین کے علم کی طرف بلا رہے ہیں۔ پاکستان کے عوام کی بڑی تعداد تقاضا کر رہی ہے کہ بڑی تعداد میں ایسے ادارے جابجا قائم ہوں۔

پروفیسر عرفان احمد:

دارارقم کے پروفیسر عرفان احمد قرآن فہمی کے حوالے سے جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں ''قرآن وسنت کی طرف رجوع کے جتنے عملی طریقے اس وقت مسلم معاشروں اور خاص طور پر پاکستان میں جاری ہیں سارے ہی قابل قدر اور

لائق تحسین ہیں لیکن ہم یہاں رجوع الی القرآن کی خاطر ایک ایسی تجویز اور خاکہ پیش کر رہے ہیں جس پر ان شاء اللہ عمل بھی ہوگا اور جس کے ذریعے اللہ کے فضل وکرم سے امت مسلمہ اور سارے انسانوں میں اسلام کی تعلیم، ابلاغ اور اقامت کا عظیم الشان اور بے مثال تاریخی کارنامہ سرانجام پائے گا۔ ذرا سا غور کریں تو ہر شخص اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ پاکستان کے جس مسلم معاشرے میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں یہاں معاشرے کے عام افراد مرد وخواتین کے لئے دین کی بنیادی سمجھ اور تعلیم حاصل کرنے کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں ہے۔ اگر کچھ احساس کرنے والے اٹھیں خلا کو پر کرنے کے لئے عوام میں دینی تعلیم اور سمجھ پیدا کرنے کے لئے منظم ادارے قائم کریں تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔ ان مجوزہ اداروں کے درج ذیل خواص ہونے چاہئیں۔

1- ان اداروں کو چلانے والے ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو ایمان، تقویٰ، اخلاق اور احسان کے قابل قدر مرتبے پر فائز ہوں اور اللہ کی رضا اور جنت کی طلب میں اس زندگی کا سودا کرنے پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہوں۔

2- ان اداروں میں معاشرے کے عام افراد (مرد وخواتین) کو دین کی بنیادی سمجھ دینے کے لئے مختصر مدت کے انتہائی مختصر کورسز ہر وقت جاری رہنے چاہئیں۔

3- ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ قریب کے لوگ اگر دن میں ایک یا دو گھنٹے وقت نکال سکیں تو ان کے لئے اس کے مطابق دینی تعلیم کا اہتمام ہو اور اگر کچھ لوگ دور کی بستیوں سے آ کر متعین مدت یہاں رہ سکیں تو ان کا الگ اور بہترین انتظام کیا جائے۔

4- ان اداروں کا بہترین عمارتوں، جدید سہولتوں اور صاف ستھرے ماحول کے اعتبار سے بہترین ہونا انتہائی ضروری ہے۔

5- یہ ادارے عوام کے لئے آڈیو، وڈیو اور کمپیوٹر پروگرامز کی تیاری کے لئے کام کریں۔

6- ان عوامی تعلیمی اداروں میں دین کی تعلیم دینے والوں، تعلیم حاصل کرنے والوں اور تعلیمی نصاب مرتب کرنے والوں کو امت میں موجود ہر قسم کی سیاسی، مذہبی، گروہی، جماعتی اور فرقہ وارانہ وابستگیوں سے قطعی بالاتر ہو کر یہ کام کرنا چاہئے۔ ان تعلیمی اداروں کا یہ تشخص پوری امت کو بہت جلد قرآن اور سنت کے گرد جمع کر کے کفر کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دے گا۔ ان شاء اللہ۔

7- ان اداروں میں دی جانے والی دینی تعلیم میں ذکر، نصیحت، فہم، خوف وخشیت، خوشخبری، بشارت اور جذبہ عمل پیدا کرنے کا پہلو بہت زیادہ نمایاں ہونا چاہئے۔

8- ان اداروں میں ان پڑھ اور ناخواندہ مرد وخواتین کے لئے سماعی علم وفہم کا بہت موثر اور کامیاب سسٹم ہونا چاہئے تاکہ لوگ اپنی سماعت کے ذریعے دین کا فہم حاصل کر کے جہنم کی آگ سے بچنے کی فکر کریں۔

9- بچوں کے لئے فہم قرآن کا اہتمام ان کے سکولوں اور کالجوں میں کیا جائے۔

یہ ہے رجوع الی القرآن والسنہ کی تجویز کا مختصر خاکہ جس کے بارے میں ہم اپنے اور جہانوں کے رب سے یہ توقع اور امید رکھتے ہیں کہ ایسے کسی ادارے کی بنیاد رکھ دی جائے تو پھر وہ مکمل ہو تو اللہ تعالیٰ انسانوں کی سوچوں اور تصورات سے کہیں بڑھ کر اس میں برکت ڈال دے گا اور یہ صدقہ جاریہ ہوگا۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ:

مفسر قرآن مولانا احسن اصلاحیؒ کی تمام زندگی قرآن کے پیغام کو پھیلانے میں گزری۔ قرآن فہمی کو عام کرنے کے لئے وہ رقم طراز ہیں۔ ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کچھ ذہین اور سعید طلبہ کو لے کر ان پر محنت کی جائے اور ان کو باقاعدہ دین کی تعلیم دی جائے۔ باقاعدہ سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان کو صرف بطور تبرک قرآن کے کچھ حصے نہ پڑھائے جائیں بلکہ جس طرح وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جدید علوم وفنون باقاعدہ ایک خاص ترتیب اور مخصوص نظام کے تحت دلیل اور محبت کے ساتھ سیکھتے ہیں اس طرح ان کو دین کے اصل ماخذوں یعنی قرآن اور حدیث سے عالمانہ اور محققانہ طور پر آگاہ کیا جائے اور وہ اصل حقائق تک براہ راست رسائی حاصل کر سکیں۔

اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے ایک عرصے تک اس قسم کے کام کی ذمہ داری براہ راست اپنے سر لینے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن اس ضرورت کی اہمیت نے مجھے بھی مجبور کر دیا ہے کہ میں بھی اس کام پر کچھ وقت صرف کروں۔ چنانچہ علم دین کے جو قدر دان مجھ سے ملتے رہے تھے میں نے ان پر مشتمل ایک حلقہ قائم کر دیا ہے۔ اس حلقے میں میری طرف سے کسی دعوت کے بغیر طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد شامل ہوگئی جس کی اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ہے...... میں نے اس دوران ان کو سادہ طریقے پر عربی زبان کی تعلیم دی ہے اور ساتھ ہی قرآن مجید کے درس میں ان تمام مباحث سے تعرض کیا ہے جو ابتدائی مرحلے میں ضروری ہیں مثلاً تحقیق الفاظ، نحو، زبان، اسلوب، نظم، تاویل آیات وغیرہ...... میں نے کم وبیش 14 سال عربی اور علوم دینیہ کے محنتی طلبہ کو قرآن، ادب اور فلسفہ وتاریخ کی تعلیم دی ہے لیکن اس کے نتائج سے میں کبھی اتنا مطمئن نہیں ہوا جتنا مطمئن اس حقیر کوشش کے نتائج سے ہوا ہوں۔

اب میری دلی آرزو ہے کہ یہ حلقہ ایک باقاعدہ ادارے کی صورت اختیار کر لے جو برابر کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے لوگوں کی دینی تعلیم وتربیت کی خدمت کو تسلسل سے جاری رکھ سکے اور اس کی کوشش سے ہماری قوم کو دین کے ایسے خدمت گزار مل سکیں جو ایک طرف جدید تعلیم سے آراستہ ہوں اور دوسری طرف دین میں پوری بصیرت رکھنے والے ہوں۔ تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل کے ساتھ ساتھ یہ سب سے عزیز آرزو ہے جو میرے دل ودماغ پر اس وقت جاری ہے اور میں جس کے لئے اپنے رب سے شب وروز دعا کر رہا ہوں کہ وہ اپنے فضل خاص سے اس کے اسباب اور وسائل

فراہم فرمادے۔

ہمارے پیش نظر ''دین سیکھو اور سکھاؤ'' کا نصب العین ہے اور ہم اپنے وسائل کی وسعت کے ساتھ اس کام کو پورے ملک میں وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ کم از کم اپنے ملک کے ہر بڑے شہر میں ایک مرکز تو ایسا ضرور قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جو نئ تعلیم یافتہ نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بن سکے۔ اس وجہ سے اس حلقہ میں مطلوب صرف انہی لوگوں کی شرکت ہے جو ''دین سیکھو اور سکھاؤ'' کے نصب العین کو اپنانے کو تیار ہوں اور آج بھی اس کے لئے جدوجہد کر سکیں اور آئندہ بھی اس کے لیے کام کرنے کا عزم و جزم رکھتے ہوں۔ دین سیکھنے کے معاملے میں بھی ہمارے پیش نظر صرف بطور تبرک دین کی باتیں جان لینا نہیں ہے جس سے صرف رسمی دین داری کا کچھ تحفظ ہو سکے بلکہ دین میں وہ تفقہ پیدا کرنا ہے جو موجودہ زمانے کے فکری تصادم میں نو جوانوں کو اسلام کی حقیقی نصرت و حمایت کے قابل بنا سکے۔

تین سال کے تجربے کے بعد پورے اطمینان قلب کے ساتھ میں اب یہ اعلان کرنے کی پوزیشن میں ہوں کہ نئ تعلیم یافتہ نسل کو دین کی تربیت دینے کا یہ نہایت کامیاب راستہ ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ بس ایک شرط ہے کہ تعلیم و تربیت کی ذمہ داری جس شخص پر ڈالی ہے وہ اس کام کا اہل ہو۔ (اقتباسات از مقالات اصلاحی)

............❁............

صحابہؓ کا فہم قرآن

حضورﷺ کے پاکباز ساتھیوں کا گروہ جسے ہم صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے نام سے پکارتے ہیں، کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی تربیت خود نبی پاکﷺ نے فرمائی۔ مکی دور میں کفار مکہ کے مظالم کے دوران آپﷺ اپنے ساتھیوں کو توحید، رسالت، آخرت اور صبر کی تعلیم دیتے رہے۔ مکہ میں دارارقم کی تربیت گاہ قائم کی گئی، قرآن کی تعلیم کا سلسلہ مسلسل جاری رہا حتیٰ کہ ہجرت کا حکم آ گیا۔ مدنی دور کے آغاز ہی میں صفہ کا چبوترہ مسجد نبوی کے ساتھ قائم کیا گیا اور قرآن کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا مرکز قرار پایا۔ یہ سلسلہ عرصہ دراز تک صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے حلقوں کی صورت میں مسجد نبوی میں قائم رہا۔ خلفائے راشدینؓ کے دور میں بالخصوص ان پروگراموں کی سرکاری سرپرستی ہوتی رہی اور قرآن وسنت کی تعلیمات کا سلسلہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتا چلا گیا۔

صحابہ کرامؓ نے قرآن کی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے اس قدر جانفشانی سے کام لیا کہ نہ صرف اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں سرفراز کیا (آدھی دنیا کی حکومت ان کے حوالے کر دی) بلکہ آخرت میں بھی ان سے جنت اور مغفرت کا وعدہ فرمایا۔ یہ گروہ "فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة" کی عملی تفسیر بن کر سامنے آیا۔ یہ کتاب آئی ہی اس غرض سے ہے کہ اس کی آیات پر تدبر کیا جائے اور یہ کام اس کا فہم حاصل کئے بغیر ممکن نہیں۔

قرآن کا فہم حاصل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ یہی یاد الٰہی کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اسی سے ایمان دلوں میں داخل ہوتا ہے۔ اسی سے خشیت الٰہی کا جذبہ دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے عمل کے جذبے کو تحریک ملتی ہے اور اسی سے راہ خدا میں مصائب برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے آدمی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، اسی سے اقامت دین کے لئے جدوجہد کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس سے اللہ کی راہ میں صبر و استقامت نصیب ہوتی ہے اور یہی دنیا وآخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

قرآن کے اولین مخاطبین صحابہ کرامؓ اس کے معنی پوری طرح سمجھتے تھے اور اس پر پوری طرح عمل کرنے والے

تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ کی پیروی میں ہر مسلمان مرد وعورت پر قرآن مجید کو سمجھنا ضروری ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب کوئی شخص اس علم کے حصول کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو فرشتے ہر گام اس کی عزت وتکریم کے لئے اپنے پر اس کے قدموں میں بچھاتے ہیں اور جب تک وہ اس کے حصول میں لگا رہتا ہے وہ عرصہ جہاد میں ہوتا ہے''۔

حضرت امام بخاریؒ نے حضرت عثمان غنیؓ سے نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک نقل کیا ہے!

''تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو قرآن مجید کا علم حاصل کرے اور اسے دوسروں کو سمجھائے''۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''دو آدمیوں کے سوا کسی پر رشک کرنے کی اجازت نہیں ہے ایک وہ شخص جسے اللہ نے قرآن عطا کیا (یعنی اس کی سمجھ عطا کی ہو) اور وہ اس پر دن رات عمل کرتا ہو اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا ہو اور وہ اس میں سے رات دن اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔ (متفق علیہ)

امام احمد اور امام ابوداؤدؒ نے حضرت معاذؓ الجہنی سے رسول اللہ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے:

''جس نے قرآن پڑھا اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کیا، اس کے والد کو قیامت کے روز ایک ایسا تاج پہنایا جائے گا کہ جس کی روشنی دنیا کے گھروں میں سورج کی روشنی سے زیادہ خوبصورت ہو گی جب کہ وہ سورج تمہارے درمیان ہو''۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

''العلم (قرآن وسنت) کا رات کی ایک ساعت پڑھانا تمام رات کی عبادت کرنے سے بہتر ہے''۔

(رواہ الدارمی)

صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کے ان اقوال کی روشنی میں اپنے آپ کو پوری طرح ڈھال لیا تھا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وہ قرآن کو سمجھنے اور اس کی باریکیوں سے آگاہ رہنے کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ اپنی مسجد میں دو مجالس کے پاس سے گزرے تو فرمایا...... دونوں بھلائی پر قائم ہیں مگر ایک مجلس دوسری سے افضل ہے۔ جہاں تک اِن کا تعلق ہے تو یہ اللہ سے دعائیں کر رہے ہیں اور اس سے امید رکھتے ہیں۔ اللہ چاہے گا تو انہیں دے دے گا اور چاہے گا تو روک لے گا۔ جہاں تک اُن کا تعلق ہے (جو دین کا فہم یا العلم پڑھ رہے ہیں اور ناواقف لوگوں کو پڑھا رہے ہیں) سو وہ افضل ہیں۔ بے شک میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔

صحابہ کرامؓ نے قرآن کی تعلیم براہ راست حضور اکرم ﷺ سے حاصل کی۔ یہ لوگ اہل زبان بھی تھے اور نزول قرآن کے ماحول سے پوری طرح باخبر بھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے، قرآن کریم کو سبقاً سبقاً آپ ﷺ سے پڑھا۔

مشہور تابعی عالم امام ابوعبدالرحمٰن سلمی فرماتے ہیں۔

''صحابہ کرامؓ میں سے جو حضرات قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے، ان میں سے حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آپ ﷺ سے دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک ان سے آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان کی تمام علمی و عملی باتوں کا صحیح علم نہ حاصل کرلیں۔ ہم نے قرآن کے علم و عمل کو ایک ساتھ حاصل کیا یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورۃ کو سیکھنے میں کئی کئی برس لگا دیتے''۔

حضرت مسروقؒ بن الاجدع (تابعی) فرماتے ہیں:

''حضرت عبداللہؓ بن مسعود ہمارے سامنے ایک آیت تلاوت فرماتے اور دن کا بیشتر حصہ اس کی تفسیر میں اور اس کے بارے میں احادیث بیان کرنے میں صرف فرمادیتے''۔ (تفسیر ابن جریر)

جس صحابی کا بھی ذکر کریں وہ قرآن مجید سے سبق حاصل کرتا ہوا، اس کو یاد کرتا ہوا، اس کے معانی و مفہوم کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے کمر بستہ نظر آتا ہے۔

موطا امام مالک میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمر نے سورۃ البقرہ آٹھ سال میں مکمل کی۔ گویا یہ مدت الفاظ قرآنی کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تفسیر اور جملہ مسائل کا علم حاصل کرنے میں گزار دی۔

حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ کو قرآن کی تفسیر بیان کرنے میں ایک خاص امتیازی مقام حاصل تھا۔ حضور ﷺ نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی ''اے اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما اور تفسیر قرآن کا علم عطا فرما''۔ اس دعا کی بدولت حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ کو قرآن کی تفسیر و تاویل میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ سند اور خطاب بھی دیا ''تم قرآن کریم کے اچھے ترجمان ہو''۔

حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ خود بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک انصاری سے کہا کہ ابھی تو آنحضرت ﷺ کے بہت سے صحابہؓ موجود ہیں تو آؤ ہم ان سے علم کی باتیں حاصل کریں۔ اس صحابی نے کہا ''کیا آپ کا خیال ہے کہ کسی وقت لوگ علم کے معاملے میں آپ کے محتاج ہوں گے'' چنانچہ انہوں نے میری تجویز منظور نہ کی اور میں نے تنہا یہ کام شروع کردیا کہ صحابہ کرامؓ کے پاس جاتا اور ان سے علم کی باتیں معلوم کرتا۔ میں کسی صحابیؓ کے دروازے پر پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ وہ دوپہر کے وقت آرام کررہے ہیں میں وہیں دروازے پر بیٹھ جاتا۔ ہوا کے جھکڑ میرے چہرے پر مٹی لا لا کر ڈالتے رہتے۔ جب وہ صحابی باہر نکل کر مجھے دیکھتے تو کہتے ''رسول اللہؐ کے چچا زاد بھائی! آپ کیوں تشریف لائے؟ میرے پاس پیغام بھیج دیا ہوتا میں آپ کے پاس چلا آتا''۔ میں جواب دیتا کہ ''نہیں یہ میرا فرض تھا کہ آپ کے پاس آؤں''۔ (الاصابہ بحوالہ مسند دارمی)

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کی عمر 14 برس تھی جب حضور اکرم ﷺ کا وصال ہوا۔ آپؓ کے پاس ہر وقت

طالبعلموں کا جھمگٹا لگا رہتا اور آپ ان کے سامنے قرآن کریم کی تفسیر، احادیث نبوی، فقہی مسائل بیان فرماتے رہتے تھے۔ انہی وجوہ کی بناء پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ''امام المفسرین'' بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''سورۃ الزلزال اور القارعہ جیسی سورتیں تامل اور غور وفکر کے ساتھ پڑھنا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ البقرہ اور آل عمران جیسی سورتیں جلدی پڑھ جاؤں'' وہی روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے (ساری رات قرآن پڑھنے میں گزر جاتی تھی)

اصحابؓ رسول اللہؐ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ قرآن مجید کی تلاوت کا حق ادا کرنا ایمان کی سند ہے۔ ان کے سامنے ارشاد باری تعالیٰ واضح ہدایت کے طور پر موجود تھا:

''جنہیں ہم نے اپنی کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت یوں کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔ وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کا انکار کرتے ہیں وہ خسارے میں رہنے والے ہیں''۔ (البقرہ: 121)

''مومن تو درحقیقت وہی لوگ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں (الانفال: 2)

لہٰذا ہر وہ شخص جو اس کتاب پر ایمان کا دعویدار ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرے۔ اس کی تلاوت کا حق کیا ہے؟ صحابہ کرامؓ اور تابعین نے اس میں تین چیزوں کو شامل کیا ہے:

1- اس کی تلاوت اس کے الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ اور اس کے مطالب و معانی کو سمجھ کر پورے حضور قلب کے ساتھ کی جائے۔

2- اس کے حلال کو حلال اور اس میں حرام کردہ چیزوں کو حرام ٹھہرایا جائے اس طرح کہ حلال کو استعمال کیا جائے اور حرام سے اجتناب کیا جائے۔

3- اس میں بیان کردہ احکامات کا اتباع کیا جائے۔

نبی اکرم ﷺ کے بارے میں صحیح روایت ہے:

''جب آپ ﷺ رحمت کی کوئی آیت پڑھتے تو رحمت مانگتے اور جب عذاب کی آیت سے گزرتے تو پناہ مانگتے تھے''۔ (ابن کثیر)

حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد ابن ابی حاتم نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عمرؓ کے غلام اسلمؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت **یتلونہ حق تلاوتہ** کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

''جب وہ جنت کا ذکر کرے تو اللہ سے جنت مانگے اور جب دوزخ کا ذکر پڑھے تو دوزخ سے اللہ کے ہاں پناہ مانگے''۔

جب نماز کا وقت آتا تو حضرت علیؓ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ ایک بار ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ کا یہ کیا حال ہے تو فرمانے لگے "یہ اس بار کو اٹھانے کے سبب ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو ان سب نے خشیت الٰہی کی وجہ سے اس بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا"۔ (احیاء العلوم)

حضرت ابوبکر صدیقؓ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں خانہ کعبہ میں نماز میں اس سوز و گداز کے ساتھ تلاوت کرتے کہ قریش کے لوگ متاثر ہو کر آپ کے گرد جمع ہو جاتے۔ سرداران قریش کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ آبائی دین سے منحرف نہ ہو جائیں۔ اس لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نماز پڑھنے سے روکتے اور اذیت پہنچاتے۔ حضور اکرم ﷺ کے قریبی ساتھیوں کی یہ حالت اس لئے ہوتی کہ وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھتے تھے چنانچہ اس کی آیات کا ان کے دل و دماغ پر اثر ہوتا تھا۔

صحابہ کرامؓ جو قرآن کے اولین مخاطب تھے، وہ قرآن کو برابر تفکر و تدبر کے ساتھ پڑھتے تھے۔ جو صحابیؓ جتنا تدبر کرتے وہ اتنا ہی قرآن مجید کے فہم میں ممتاز تھے۔ صحابہؓ نے قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے حلقے بھی قائم کئے ہوئے تھے جن میں قرآن کا اجتماعی مطالعہ کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم (صحابہ) مسجد نبوی میں مختلف حلقے بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ذکر و دعا میں مشغول تھے اور کچھ قرآن مجید کی تلاوت اور غور و فکر میں مصروف تھے۔ حضور ﷺ اپنے حجرے سے نکل کر آئے اور حلقہ قرآن میں آکر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ مجھے قرآن کے حلقے میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح کے حلقوں سے نبی ﷺ کو خاص دلچسپی تھی۔ دارارقم کے رہنے والوں اور اصحاب صفہ کا بڑا وقت قرآن مجید کی تعلیم اور اس کو پڑھانے میں گزرا ہے۔ ان لوگوں کو ترغیب دینے کے لئے حضور ﷺ اکثر ان کے سامنے قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کی فضیلت بیان فرمایا کرتے تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدینؓ کے دور میں بالخصوص حضرت عمرؓ اس قسم کے حلقوں سے نہایت گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

"میری امت کی بہترین عبادت قرآن کی تلاوت کرنا ہے"۔

محض تبرک اور ثواب کی نیت سے قرآن کے الفاظ کی قرأت کر لینا اور قرآن کے معانی و مفہوم کی طرف دھیان نہ کرنا صحابہؓ کا طریقہ کار نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں رسول اکرم ﷺ اور صحابہؓ کے طریقوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مسلمانوں کے عمل میں اسی وقت قوت و تازگی پیدا ہو سکتی ہے جب وہ قرآن حکیم کے مطالب کو خود سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور قرآن کے جاننے والوں سے سن کر استفادہ کریں۔ قرآن کو حرز جاں بنائے بغیر اسلامی معاشرے کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔

خواتینِ اسلام کا فہم قرآن

محسن انسانیت دلِ مضطرب اور روحِ بے چین کے ساتھ غور وفکر اور ذکر وعبادت کرتے ہوئے جب غار حرا کی تنہائیوں میں ایک عرصہ گزار چکے تو آخر کار اس سناٹے میں ایک انجانی آواز ابھری:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍO اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُO الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِO عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْO ''پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا''۔ (سورۃ العلق: 1-5)

اس آواز نے پیغمبر انسانیت پر لرزہ طاری کر دیا۔ ذمہ داری کے بارگراں کے احساس سے جب سرتا پا پسینے میں شرابور آپ گھر تشریف لائے اور یہ ماجرا سنایا تو آپ کے بعد، اس قرآن سے سب سے پہلا ناتا ایک خاتون یعنی ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہی نے جوڑا۔ بعد ازاں نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنے غیر مسلم اعزہ واقارب کے طعن و تشنیع کی ذرہ برابر بھی پروانہ کی بلکہ اس قرآن سے دوسروں کا تعلق جوڑنے کے لئے صاحب قرآن کا ایسا دست و بازو بن گئیں کہ ملک شام سے اطراف یمن تک پھیلی ہوئی وسیع تجارت سے حاصل ہونے والی اپنی تمام دولت اس راہ میں نچھاور کر دی اور قرآن کی دعوت دوسروں تک پہنچانے کے لئے رسول عربیﷺ کو ہر پیش آنے والی رکاوٹ اور مشکل میں ہر لمحہ اس طرح مدد کے لئے کمر بستہ رہتیں کہ آپ فرمایا کرتے تھے:

''میں کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجھے ناگوار معلوم ہوتی تھی تو میں خدیجہؓ سے کہتا۔ وہ میری اس طرح ڈھارس بندھاتی تھیں کہ میرے دل کو تسکین ہو جاتی اور کوئی رنج ایسا نہ تھا جو خدیجہؓ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا تھا''۔

حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت ام سلمیٰ اور ام ورقہ رضی اللہ عنہن کے تعلق بالقرآن کا اندازہ تو اس سے

لگایا جاسکتا ہے کہ پورا قرآن ان کے سینوں میں محفوظ تھا اور ہند بنت اسدؓ، ام ہشام بنت حارثہؓ، ایۃ بنت حیانؓ اور ام سعد بنت سعدؓ ابن ربیع کو قرآن کے کئی حصے زبانی یاد تھے۔

ام المومنین حضرت حفصہؓ لکھنے پڑھنے میں خصوصی مہارت رکھتی تھیں۔ رسول کریم ﷺ کے قرآن حکیم کے کتابت شدہ اجزاء حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی تا حیات ان کے پاس رہے۔ گویا یہ شرف بھی ایک خاتون کا مقدر ہوا۔

حضرت ام عطیہؓ بیان کرتی ہیں کہ حفصہ بنت سیرینؒ نے اپنی قرآنی تعلیمات بارہ سال کی عمر میں مکمل کیں اور ان کا شمار مشہور ججوں اور قانون دانوں میں ہوتا تھا۔

مجموعی طور پر خواتین کے تعلق بالقرآن کا اندازہ کرنا ہو تو ابو سعید خدریؓ کے اس قول کو سنیئے! بیان کرتے ہیں کہ ''عورتوں نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ آپ کے گرد ہر وقت مردوں کا جھمگٹا لگا رہتا ہے اور ہم لوگ آپ کا وعظ و نصیحت نہیں سن پاتے۔ ہمارے لئے آپ ایک دن مقرر فرما دیں۔ لہٰذا آپؐ نے عورتوں کے لئے ایک دن مقرر فرما دیا اور اس روز آپ عورتوں کو دین کی تعلیمات سکھاتے اور وعظ و نصیحت کرتے تھے'' ۔(بخاری شریف)

اسی طرح حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انصار کی عورتیں دین سیکھنے کا اتنا جذبہ رکھتی تھیں کہ عورتوں کی فطری شرم و حیا ان کے آڑے نہیں آتی تھی۔ ان کے ذوق و شوق کو حضرت عائشہؓ نے اس طرح بیان کیا ہے جب بھی آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہم فوراً اوامر و نواہی کو دہرا کر یاد کر لیتیں۔ اس قرآن کے اوامر و نواہی کو خواتین نے جو اہمیت اپنی عملی زندگیوں میں دی اس کا اندازہ چند مثالوں سے کیا جاسکتا ہے۔

حضرت عائشہؓ ہی فرماتی ہیں جب سورۃ نور نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ سے اس کو سن کر لوگ اپنے گھروں کی طرف پلٹے اور جا کر انہوں نے اپنی بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں کو اس کی آیات سنائیں۔ انصار کی عورتوں میں سے کوئی ایسی نہ تھی جو وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ (اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں) کے الفاظ سن کر اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی ہو۔ ہر ایک اٹھی اور کسی نے اپنا کمر کا کپڑا کھول کر اور کسی نے چادر اٹھا کر فوراً اس کا دوپٹہ بنایا اور اوڑھ لیا۔

اسی طرح آیات حجاب کا حکم ایک خاتون نے اس حال میں سنا کہ وہ کسی راستے سے گزر رہی تھیں اور پھر اس پر عمل درآمد کے لئے وہیں ایک طرف دیوار کی اوٹ میں ہو گئیں اور اپنے ہمراہ جانے والے بیٹے کو اپنے لئے چادر لانے کی خاطر گھر روانہ کیا جب وہ بیٹا چادر لے کر آیا تو اسے اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر گھر کی راہ لی کہ مبادا حکم قرآنی کی عدم تعمیل کی مرتکب نہ ہو جائیں۔

پردے کے احکام قرآن آجانے کے بعد ہی کا یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک خاتون ام خلاد رضی اللہ عنہا کا بیٹا ایک

جنگ میں شہید ہو گیا۔ وہ اس حال میں بھی چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے تھیں۔ بعض صحابہ نے حیرت سے کہا کہ اس وقت بھی تمہارے چہرے پر نقاب ہے، جواب میں کہنے لگیں ''میں نے بیٹا تو ضرور کھویا ہے مگر اپنی حیا تو نہیں کھو دی''۔

حارثہ ابن نعمان رضی اللہ عنہ کی ایک بیٹی کہتی ہیں کہ میں نے سورہ ق میں ایک دعا آنحضرتؐ کے لبوں سے سیکھی۔ یہ دعا تذکیر کے لئے آپ جمعہ کے خطبہ میں پڑھا کرتے تھے۔

ام المومنین حضرت ام سلمیٰؓ کے تعلق بالقرآن والحدیث کا یہ عالم تھا کہ ایک دن رسولؐ خدا کو لوگوں کو مخاطب فرماتے ہوئے سنایا ایہا الناس تو اسی وقت اس لڑکی کو جو آپ کی کنگھی کر رہی تھی فرمایا کہ مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ وہ کہنے لگی حضور ﷺ نے تو صرف مردوں کو بلایا ہے، عورتوں کو نہیں بلایا تو جواب دیا کہ حضور ﷺ نے لوگوں کو بلایا ہے اور بے شک میں لوگوں میں سے ہوں۔

حضرت زینبؓ کو قرآن سے بڑا لگاؤ تھا، ان کی عبادت و زہد کا خود رسول اللہ ﷺ کو اعتراف تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ: ''میں نے دین کے معاملے میں زینب رضی اللہ عنہا سے بہتر کوئی عورت نہیں دیکھی''۔

اس خاتون کے تعلق بالقرآن کا کیا کہنا جن سے حضرت عبداللہؒ بن مبارک کی ملاقات اپنے سفر حج کے دوران اس حالت میں ہوئی ہے کہ وہ خاتون بھی حج ہی کی غرض سے سفر کرتی ہوئی اپنے قافلے سے بچھڑ کر پریشانی کے عالم میں ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اسے متعلقہ قافلے تک پہنچانے کے دوران اس سے جو سوال بھی کرتے وہ ہر سوال کے جواب میں قرآن کی کوئی آیت تلاوت کر دیتی تھیں اور اپنا مدعا بخوبی سمجھا دیتی تھیں۔ جب عبداللہ بن مبارک اس خاتون کو قافلے کے ہمراہ جانے والے اس کے بیٹوں تک پہنچا دیتے ہیں تو بیٹے انہیں بتاتے ہیں کہ ان کی والدہ گزشتہ چالیس سال سے یونہی آیات قرآنی کے پیرائے میں گفتگو کر رہی ہیں اور کوئی دوسرا لفظ زبان سے نہیں نکالتیں۔

نہر زبیدہ کھدوانے اور دیگر بے شمار رفاہی کام کرنیوالی خاتون زبیدہ کو قرآن پاک سے اتنا شغف تھا کہ ان کے گھر کے در و دیوار ہمہ وقت تلاوت کلام سے معطر رہتے تھے۔

علم قرآن پر خواتین کی دسترس کا اندازہ تاریخ اسلام کی چند روشن مثالوں سے بخوبی ہو سکتا ہے: ''حضرت عائشہؓ کو تفسیر قرآن پر بھرپور ملکہ حاصل تھا ان کو قرآن کی تعلیمات پر اتنی گرفت تھی کہ ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں کو کوئی ایسی مشکل پیش نہ آتی تھی جس کا علم حضرت عائشہؓ کے پاس نہ ہو۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے سوچا کہ لوگوں نے خواہ مخواہ مہر کی رقم بڑھا دی ہے۔ لہٰذا انہوں نے لوگوں کو کہا کہ مہر کی رقم کم رکھا کریں۔ ایک بوڑھی عورت اٹھی اور کہنے لگیں عمرؓ تمہیں کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ تم مہر کی رقم کی حد مقرر کر لو اور اس کے ثبوت کے طور پر سورۃ النساء کی آیات 21-40 پڑھیں، تو اس پر حضرت عمرؓ نے اپنی غلطی

تسلیم کر لی۔

ایک دفعہ حضرت امام حسنؓ کے ہاں معززین مکہ مدعو تھے۔ایک لونڈی دسترخوان پر کھانا چننے میں مصروف تھی۔ جب وہ شوربے کا پیالہ حضرت امام حسنؓ کے سامنے رکھنے لگی تو اچانک اس کا پاؤں پھسلا جس سے تمام شوربہ حضرت امام حسنؓ کے اوپر گر گیا۔آپ نے قہر آلود نظروں سے لونڈی کی طرف دیکھا تو لونڈی تھر تھر کانپنے لگی لیکن قرآن پر دسترس کی بنا پر اس حالت میں بھی اس کی زبان سے قرآن کے یہ الفاظ نکلے وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ ''جو غصے کو پی جاتے ہیں''۔

نتیجۃً امام حسنؓ نے لونڈی سے فرمایا میں نے اپنے غصے کو روک لیا۔ پھر لونڈی نے کہا وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ''اور جو لوگوں کی خطائیں معاف کر دیتے ہیں''۔

حضرت امام حسنؓ نے کہا میں نے تمہاری خطا معاف کر دی۔اس کے بعد لونڈی نے آیت کا آخری حصہ پڑھا:
وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ''اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے''۔

یہ سن کر حضرت امام حسنؓ نے فرمایا جاؤ میں نے تمہیں آزاد کر دیا۔

ایک عالی مرتبہ خاتون کو عدالت میں ایک مرد اور ایک عورت کے ہمراہ گواہی دینے کے لئے جانا پڑا۔قاضی نے دونوں عورتوں کے بیانات جدا جدا لینا چاہے۔ بزرگ خاتون نے گواہی دینے سے قرآن کی آیت اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى کی بنا پر انکار کر دیا اور عدالت سے کہا کہ خدا نے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر اس بنا پر قرار دی ہے کہ اگر ایک کوئی بات بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔ظاہر ہے کہ جدا جدا گواہی دینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔قاضی نے اس قرآنی استدلال کو قبول کیا اور دونوں خواتین کی گواہی ایک ساتھ لی۔ بزرگ خاتون امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ تھیں۔

چند ایک ایسی خواتین کی مثالیں جنہوں نے اپنے تعلق بالقرآن کا اظہار اپنے علم کی زبان سے کیا ان کا تذکرہ بھی یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے۔

ان میں عمار بن یاسرؓ کی والدہ جو ابوحذیفہؓ کی باندی تھیں اور سمیہؓ نام تھا انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ قرآن کی دعوت کو قبول کرنے کے جرم میں دشمن خدا ابوجہل کے ناقابل بیان اور ناقابل برداشت ظلم و ستم کا نشانہ بن کر اپنی جان تک کا نذرانہ پیش کر دیا اور اس راہ کی پہلی شہید ہونے کا شرف حاصل کیا۔

پھر یہ فاطمہؓ بنت خطاب کا تعلق بالقرآن ہی تھا کہ جب ان کے بھائی عمر بن خطاب نے انہیں تلاوت کلام کے جرم میں خوب زدوکوب کر کے لہولہان کر دیا تو جواباً کہا:''ابن خطاب! میں ایمان قبول کر چکی ہوں اب جو چاہو......کر گزرو''۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پوتے حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکرؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز صبح کے وقت میں

اپنی پھوپھی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نماز پڑھ رہی تھیں اور آپ کی زبان پر یہ آیت شریف تھی
فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ "اللہ نے ہم پر فضل کیا اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچالیا"۔

آپ اس آیت کو دہراتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ میں کچھ دیر تو آپ کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب زیادہ دیر ہوئی تو میں نے سوچا کہ بازار کا کام کرتا آؤں واپسی پر سلام عرض کر کے چلا جاؤں گا۔ میں بازار سے جب واپس آیا تو دیکھا کہ آپؓ اسی طرح آیت دہرا رہی ہیں اور رو رہی ہیں۔

یہ قرآن جو رب رحمٰن کی طرف سے نصیحت، دلوں کے امراض کی شفا اور قبول کر لینے والوں کے لئے راہنمائی او ررحمت ہے۔ اس کے ساتھ پورے اخلاص سے ناتا جوڑنے والوں سے آج بھی دنیا خالی نہیں ان میں مریم جمیلہ صاحبہ کا نام قابل ذکر ہے۔ جنہوں نے امریکہ کے ایک یہودی گھرانے میں آنکھ کھولی، لیکن حق کی طلب نے انہیں قرآن تک پہنچا دیا اور پھر قرآن کے تعلق کی خاطر انہوں نے 28 سال کی عمر میں اپنا گھر بار، وطن اور عزیز و اقارب چھوڑ کر ارض پاکستان کا رخ کیا۔ قرآن کے لیے ہجرت کی سنت کو تازہ کر کے تا حال قرآن اور اس کی دعوت کو عام کرنے کے فریضے میں ہمہ تن مشغول ہیں۔ دیار مغرب میں ہزاروں خواتین قرآن سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو چکی ہیں۔

جنگ قادسیہ کے موقع پر حضرت خنساءؓ نے اپنے چار بیٹوں کے ہمراہ شرکت کی اور ایک رات قبل انہوں نے اپنے بیٹوں کو اکٹھا کر کے نہایت موثر الفاظ میں جہاد کی ترغیب دی اور ساتھ ہی قرآن مجید کا یہ حکم من و عن سنایا کہ اللہ فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْن

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے"۔ (آل عمران: 200)

حضرت ام اسد رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ درس قرآن دیا کرتی تھیں۔ حضرت ام سلمیٰؓ کی ایک باندی ام الحسن جن کو اللہ تعالیٰ نے ذہن کی بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ باقاعدگی سے قرآن کی دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کا کام کرتی تھیں۔

ام درداءؓ کا علم و فضل میں اتنا بلند مقام تھا کہ حضرت امام بخاریؒ نے ان کے اعمال کا اپنی کتاب صحیح بخاری میں تذکرہ کیا۔ وہ تفکر، تفہیم اور تنظیم کی صلاحیتوں کی مالک اور متقی و پرہیزگار تھیں۔

اسی طرح امام مالکؒ کی بیٹی کو کتاب حدیث مؤطا پر اتنا عبور حاصل تھا کہ اگر تعلیم کے دوران کوئی شاگرد مؤطا میں غلطی کرتا تو وہ لڑکی گھر کے اندر سے دروازہ بجا دیتیں۔ امام مالکؒ کو اس کی ذات پر اتنا یقین تھا کہ وہ اپنے شاگردوں سے کہہ دیتے کہ سبق دہراؤ۔

اسی طرح قرآن کے مطابق عمل کی راہیں کھولنے کے لئے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمیٰؓ کے بعد جن خواتین نے فتوے دیئے ہیں ان میں حضرت حفصہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت صفیہؓ، سلمیٰ بنت قائمؓ، اسماء بنت ابوبکرؓ، ام شریکؓ، ام درداءؓ، عاتکہ بنت زیدؓ، فاطمہ بنت قیسؓ، سہیلہ بنت سہیلؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت فاطمہؓ، ام عطیہؓ، زینب بنت ام سلمیٰؓ، ام ایمنؓ، ام یوسفؓ، اور غامدیہؓ کا شمار قابل ذکر ہے جنہوں نے قرآن وحدیث کی بصیرت اور سمجھ بوجھ سے مختلف عقدہ ہائے حیات کی گرہوں کو کھولا۔

خواتین کے تعلق بالقرآن کا یہ مختصر سا تذکرہ مجھے اور آپ کو دعوت فکر دیتا ہے کہ ہم اللہ کی طرف سے دی گئی امانت یعنی زندگی کے ہر دن میں اپنا جائزہ لیں کہ آج ہم نے خود قرآن کا کتنا فہم حاصل کیا ہے؟ کیا ہم نے اس کا فہم دینے والی کسی محفل میں شرکت کی ہے؟ اس سے متعلق کسی کتاب یا مضمون کا خود اتنا مطالعہ کیا ہے اور پھر اس علم کو اپنے بچوں، گھر والوں، حلقہ احباب اور حلقہ تعارف میں کس حد تک پہنچایا ہے؟

اگر ہم خدانخواستہ یہ نہ کر سکے تو اس سے بڑی محرومی اور کیا ہوگی؟

(یہ تحریر محترمہ نسیم عرفان صاحبہ کی ہے جو ماہنامہ ''ارقم'' کے فہم قرآن نمبر میں شائع ہوئی تھی اور شکریہ کے ساتھ اس کتاب میں شامل کی جا رہی ہے)

(قرآن فہمی اکیسویں صدی میں- از ڈاکٹر عبداللہ محسن)

قرآن حکیم پر حیرت انگیز عبور

[ایک خاتون کا عجیب طرز گفتگو]

ایک دفعہ جلیل القدر عالم دین اور اپنے زمانے کے محدث وفقیہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض سے حالت سفر میں تھے کہ ایک معمّر عرب خاتون حج کے راستے میں ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھی تھی۔ بڑھیا کو کچھ پریشان اور مایوس پا کر حضرت عبداللہ نے اس سے استفسار کیا تو ایک عجیب وغریب صورت حال سامنے آئی۔ حضرت عبداللہ عام عربی زبان میں اس سے سوال کرتے لیکن بڑھیا قرآن کی آیات میں آپؒ کے سوالوں کے جواب دیتی۔ پورا مکالمہ درج ذیل ہے:-

ابن مبارکؒ: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''

خاتون: ''سَلٰمٌ، قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ'' (یسین:۵۸)

[یعنی سلام نہایت مہربان رب کا قول ہے۔ مراد کہ سلام کا جواب تو خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔]

ابن مبارکؒ: تم یہاں کیسے ہو؟

خاتون: ''مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ'' (الاعراف:۱۸۶)

جسے اللہ بھٹکا دے اسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں۔ [مراد یہ کہ میں راستہ بھول گئی ہوں۔]

ابن مبارکؒ: آپ کہاں سے آرہی ہیں؟

خاتون: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی (الاسراء:۱)

''یعنی پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا۔''

[مراد یہ تھی کہ میں مسجد اقصیٰ سے آرہی ہوں۔]

ابن مبارکؒ: ''یہاں کب سے پڑی ہو؟''

خاتون: ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (مریم:۱۰) ’’برابر تین رات سے‘‘۔

ابن مبارکؒ: تمہارے کھانے کا کیا انتظام ہے۔

خاتون: وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ (الشعراء:۷۹)

’’وہ (رب) مجھے کھلاتا پلاتا ہے‘‘ [یعنی کہیں نہ کہیں سے رزق مہیا ہو جاتا ہے۔]

ابن مبارکؒ: کیا وضو کا پانی موجود ہے؟

خاتون: فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا (المائدہ:۶)

’’اگر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمّم کرلو‘‘ [مطلب یہ کہ پانی نہیں مل رہا ہے تو تیمّم کر لیتی ہوں۔]

ابن مبارکؒ: یہ کھانا حاضر ہے، کھا لیجئے۔

خاتون: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ (البقرہ:۱۸۷)

’’روزے رات کے آغاز تک پورے کرو‘‘ [اشارہ یہ تھا کہ میں روزے سے ہوں۔]

ابن مبارکؒ: یہ رمضان کا مہینہ تو نہیں ہے۔

خاتون: فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ (البقرۃ:۱۸۴)

’’اور جو نیکی کے طور پر خوشی سے روزہ رکھے تو بیشک اللہ تعالیٰ شکر گزار اور علیم ہے۔‘‘

[یعنی میں نے نفلی روزہ رکھا ہے۔]

ابن مبارکؒ: لیکن سفر میں تو روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے۔

خاتون: وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ:۱۸۴)

’’اور اگر تم روزہ رکھنا چاہو تو تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔‘‘

ابن مبارکؒ: آپ میرے جیسے انداز میں بات کریں۔

خاتون: مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ

’’وہ (انسان) کوئی بات نہیں کرتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک مستعد نگہبان ضرور ہوتا ہے‘‘۔

[یعنی چونکہ انسان کے ہر لفظ پر ایک فرشتہ نگہبانی کرتا ہے اور اس کا اندراج ہوتا ہے اس لئے بر بنائے احتیاط میں قرآن کے الفاظ میں ہی بات کرتی ہوں۔]

ابن مبارکؒ: کس قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں؟

خاتون: وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ. اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْؤُلًا (الاسراء:۳۶)

''جو بات تمہیں معلوم نہ ہو اس کے درپے نہ ہو بیشک کان، آنکھ اور دل اس کے طرف سے جواب دہ ہیں۔'' [یعنی جس معاملے کا پہلے سے آپ کو کچھ علم نہیں ہے اور جس سے نہ کچھ واسطہ ہے اسے پوچھ کر اپنی قوتوں کو کیوں ضائع کرتے ہیں۔]

ابن مبارکؒ: مجھے معاف کردیں میں نے واقعی غلطی کی۔

خاتون: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ (یوسف:۹۲)

''آج تم پر کوئی ملامت نہیں اور اللہ تمہیں بخش دے''۔

ابن مبارکؒ: کیا آپ میری اونٹنی پر بیٹھ کر قافلہ سے جاملنا پسند کریں گی؟

خاتون: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (البقرۃ:۱۹۷)

''اور تم جو نیکی کرتے ہو، اللہ اسے جان لیتا ہے''

[یعنی اگر آپ مجھ سے یہ حسن سلوک کرنا چاہیں تو اللہ اس کا اجر دے گا۔]

ابن مبارکؒ: اچھا تو پھر سوار ہو جایئے (یہ کہہ کر آپ نے اپنی اونٹنی بٹھادی)

خاتون: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور:۳۰)

''اور ایمان والوں سے کہہ دیجئے کہ وہ (خواتین کا سامنا ہونے پر) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔''

حضرت عبداللہؒ مدعا سمجھ گئے اور منہ پھیر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے لیکن جب خاتون سوار ہوئیں تو اونٹنی بدکی اور خاتون کا کپڑا کجاوے میں الجھ کر پھٹ گیا اور وہ پکار اٹھیں:

وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ'' (الشوری:۳۰)

''تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی کیے کرائے (کوتاہی ولغزش) کا نتیجہ ہے۔''

خاتون گویا حضرت عبداللہ کو توجہ دلا رہی تھیں کہ یہاں کچھ مشکل پیش آگئی ہے۔ حضرت عبداللہ سمجھ گئے اور اونٹنی کا پیر باندھا اور کجاوے کے تسمے درست کیے۔

خاتون نے حضرت عبداللہ کی مہارت وقابلیت کی تحسین کرنے کے لئے ایک آیت کے ذریعہ اشارہ کیا)

فَفَهَّمْنَا سُلَيْمٰنَ (الانبیاء:۷۹) ''ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کو اس معاملے میں فہم وبصیرت دی''

اور پھر جب سواری کا مرحلہ طے ہو گیا تو خاتون نے سواری کا آغاز کرنے کی آیت پڑھی:

سُبْحَانَ الَّذِىْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (الزخرف:۱۳)

''پاک ہے وہ ذات جس نے اس (سواری) کو ہمارے لئے مفید خدمت کے قابل بنا دیا، ورنہ ہم (اپنے بل بوتے پر) اس قابل نہ تھے اور یقیناً ہمیں لوٹ کر (جواب دہی کے لئے) اپنے رب کے

سامنے حاضر ہونا ہے۔''

اب حضرت عبداللہ نے اونٹنی کی مہار تھامی اور حُدی (عربوں کا مشہور نغمہ سفر) الاپتے ہوئے تیز تیز چلنے لگے۔تو خاتون نے کہا:

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ" (لقمٰن:۱۹)

''اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو اور اپنی آواز دھیمی رکھو''۔

حضرت عبداللہؒ بات سمجھ گئے اور آہستہ آہستہ چلنے لگے اور گنگنانے کی آواز بھی پست کر دی۔

خاتون نے کہا: فَاقْرَؤُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (مزمل:۲۰) ''قرآن میں سے جتنا آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہو پڑھو''۔

[یعنی فرمائش ہوئی کہ حدی (شعر ونغمہ) کے بجائے قرآن میں سے کچھ پڑھئے۔]

حضرت عبداللہؒ قرآن پڑھنے لگے اور خاتون نے اس پر خوش ہو کر کہا:

وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (البقرہ:۲۶۹) ''اور اہل دانش و بینش ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔''

حضرت عبداللہ نے کچھ دیر قرآن پڑھنے کے بعد کہا: اے خالہ کیا آپ کے شوہر ہیں؟

خاتون: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْأَلُوْا عَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ (المائدہ:۱۰۱)

''اے ایمان والو ایسی باتوں کے متعلق نہ پوچھو جو اگر تم پر ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری معلوم ہوں''۔

[مطلب یہ کہ اس معاملے میں سوال نہ کرو۔ غالباً خاتون کے شوہر فوت ہو چکے ہیں۔]

آخر کاران دونوں نے قافلے کو جا پکڑا۔ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے پوچھا:

کیا اس قافلے میں آپ کا کوئی لڑکا یا عزیز ہے جو آپ سے تعلق رکھتا ہے؟

خاتون: اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا"(الکهف:۴۶)

''مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں''۔

[یعنی میرے بیٹے بھی قافلے میں شامل ہیں اور ان کے ساتھ مال و اسباب بھی ہے۔]

ابن مبارکؒ: آپ کے لڑکے قافلہ میں کیا کام کرتے ہیں (موصوف کا مدعا یہ تھا کہ ان کو پہچاننے میں آسانی ہو)؟

خاتون: وَعَلَامَاتٍ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ (النحل:۱۶)

''اور نشانیاں ہیں اور ستاروں سے وہ راہ پاتے ہیں''۔

[مفہوم یہ تھا کہ وہ قافلے کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔]

ابن مبارکؒ: کیا آپ ان کے نام بتائیں گی؟

خاتون: وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا O وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا O يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ(النساء:۱۲۵،۱۶۴، مریم:۱۲)

''اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو دوست بنایا اور موسیٰ سے کلام کیا۔ اے یحییٰ اس کتاب کو قوت سے پکڑو''۔

[ان تین آیتوں کو پڑھ کر خاتون نے بتادیا کہ ان کے نام ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ ہیں۔]

حضرت عبداللہؒ نے قافلہ میں ان ناموں کو پکارا تو وہ تینوں نوجوان فوراً حاضر ہوگئے۔

خاتون نے بیٹوں سے کہا:

فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ (الکھف:۱۹)

''اپنے لوگوں میں سے کسی کو اپنا سکہ (یعنی نقدی) دے کر شہر میں (کھانا خریدنے کے لئے) بھیجو اور اسے چاہیے کہ وہ دیکھے کون سا کھانا زیادہ پاکیزہ ہے پھر اس میں سے تمہارے پاس روزی لے آئے۔'' (یعنی لڑکوں کو ہدایت کی کہ مہمان [عبداللہ بن مبارک] کو کھانا کھلائیں)۔

اور جب کھانا لایا گیا تو خاتون نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے کہا:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (الحاقۃ:۲۴)

''ہنسی خوشی کھاؤ پیو، بہ سبب اس اچھے کام کے جو تم نے گزشتہ ایام میں کیا''

اور ساتھ ہی دوسری آیت پڑھی جس کا منشا یہ تھا کہ میں آپ کے حسن سلوک کی شکر گزار ہوں:

هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (الرحمٰن:۶۰) ''نیکی کا بدلہ نیکی ہی ہوسکتا ہے''

یہاں یہ مبارک گفتگو ختم ہوگئی اور اس ضعیف خاتون کے لڑکوں نے عبداللہ بن مبارکؒ کو بتایا کہ ان کی والدہ چالیس سال سے اسی طرح قرآن ہی کے ذریعے گفتگو کر رہی ہیں۔ اللہ اکبر!

اسلام......ایک متوازن طرز زندگی

ISLAM --- A BALANCED WAY OF LIFE

OUR CREATOR ہمارا خالق

"زندہ جاوید"

اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ، اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ

اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی ہے، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

Allah! There is no god but He --- Ever-living, the Supporter of the whole Universe. (So none has the right to be worshipped but He.)

"نینداوراونگھ سے مبرا"

لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ

اس کی ذات نینداوراونگھ سے مبرا ہے

Neither slumber overtakes Him, nor Sleep.

"زمین وآسمان کا مالک"

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

زمین اورآسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے

His are all things in the heavens and on the earth.

"اس کی اجازت کے بغیر لب کشائی ناممکن"

مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ

کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرسکے؟

Who is there that could intercede with Him, except with His

permission.

”ظاہر اور چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے“

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے

He knows all that lies open before men and all that is hidden from them.

”انسان کو اسی سے علم ملتا ہے“

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ

اور وہ نہیں پاتے اس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے۔

And not even a little of His knowledge can they grasp except what He wills.

”زمین و آسمان پر اسی کی حکومت ہے“

وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

اس کی کرسی میں سمائے ہوئے ہیں آسمان اور زمین

His kingdom spreads over the heavens and the earth.

”وہ تھکتا نہیں ہے“

وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (البقرہ:۲۵۵)

اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے، بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے

And He tires not protecting them He alone is all High and Supreme.

”وہ زندہ و پائندہ ہے“

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ (الفرقان:۵۸)

(اے نبی) اس اللہ پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور جسے کبھی موت نہیں ہے اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے۔

Muhammad! Trust in Allah who is Ever Living and will never die. Glorify Him with His praise.

"اس کی بندگی کرو، شرک سے بچو"

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (النساء:٣٦)

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔

And worship Allah and join none with Him in worship.

"بندگی کا ثمرہ"

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ:٢١)

اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی، تاکہ تم متقی بن سکو۔

O, mankind! Worship your Lord (Allah) who created you and those who were before you so that you may become pious and righteous persons.

"زمین و آسمان اس نے بنایا"

الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ:٢٢)

(اللہ تعالیٰ ہی ہے) جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنا دیا اور آسمان سے پانی برسایا جس سے تمہارے کھانے پینے کو (انواع و اقسام کے) پھل پیدا کئے پس اس حقیقت کو جانتے ہوئے (کہ اس کے سوا کوئی ایسا نہیں کر سکتا ہے) کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہ کرو۔

Who has made the earth a resting place for you, and the sky as a canopy and sent down rain from the sky and brought forth therewith fruits as a provision for you. Then do not set up rivals unto Allah (in worship) while you know (that He alone has the right to be worshipped).

"وہ ہر جگہ، اور ہر وقت ہماری پکار سنتا ہے اور جواب دیتا ہے"

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ:١٨٦)

(اے نبی ﷺ) میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔

(O, Prophet!) When My servants enquire of you about Me, I am

near, and listen to the call of every supplicant the moment he calls.

"وہ تمہیں ہر چیز عطا کرتا ہے اور اس کی نعمتیں لاتعداد ہیں"

وَاٰتٰکُمۡ مِنۡ کُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡہُ وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡھَا (ابراہیم:۳۴)

جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا، اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے

He gave you whatsoever you asked Him. If you try to count the favours of Allah, you will not be able to calculate them at all.

"تمہاری تکلیف اس کے سوا کون رفع کر سکتا ہے؟"

وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ھُوَ وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ بِخَیۡرٍ فَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (الانعام:۱۷)

اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے، تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

If Allah sends you harm, there is no one but He who can take it away; and if He brings good, surely He has power over every thing.

"کھلانا، پلانا، موت وحیات وغیرہ اسی کے قبضہ میں ہے"

اَلَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَھُوَ یَھۡدِیۡنِ (۷۸) وَالَّذِیۡ ھُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ (۷۹) وَاِذَا مَرِضۡتُ فَھُوَ یَشۡفِیۡنِ (۸۰) وَالَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ (۸۱) [الشعرا]

(میرا رب وہ ہے) جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھے زندگی بخشے گا۔

(My Lord is that) Who created me and showed me the way; Who gives me food and drink, and heals me when I am sick.Who will make me die, then give me life again.

"اس کی ذات پر بھروسہ کرو اس کی حمد وثنا بیان کرو"

وَتَوَکَّلۡ عَلَی الۡحَیِّ الَّذِیۡ لَا یَمُوۡتُ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِہٖ (الفرقان:۵۸)

اور (اے نبی ﷺ) اسی اللہ پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور جسے کبھی موت نہیں ہے، اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔

(O Muhammad!) Trust in that Allah who is Ever Living and will never die: Glorify Him with His praise.

"صرف اسی کی ذات زندہ و پائندہ"

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ(٢٦) وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ(٢٧)[الرحمٰن]

زمین پر ہر چیز فانی ہے فقط آپ کے رب کی ذات ہی باقی رہ جائے گی جو عزت اور بزرگی والی ہے

All that is on earth will perish, But will abide forever the face of your Lord - full of Majesty, Bounty and Honour.

"وہ اپنے بندوں کی تمام خطاؤں کو معاف کردیتا ہے"

قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر:۵۳)

(اے نبی ﷺ) لوگوں کو یہ پہنچا دیجئے (کہ اللہ کا فرمان ہے) اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کردیتا، وہ تو غفورٌ رحیم ہے۔

(O, Muhammad! convey the message of Allah) "O, my servants who have transgressed against their souls! Despair not of the Mercy of Allah: for Allah forgives all sins. (Surely) He is the All Forgiving, the All Merciful.

"توبہ کے بعد نیک اعمال ضروری ہیں"

مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ و عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُوْلٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (الفرقان:۷۰)

جس نے سچے دل سے توبہ کی اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا، تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔

He who repents, believes (in Allah) and works righteous deeds, for Allah will change the evil of Such persons into good, and Allah is the All Forgiving, the All-Merciful.

اللہ کن لوگوں کو پسند فرماتا ہے؟

Allah likes these people.

"احسان کرنے والے"

وَاَحۡسِنُوۡا، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (البقرہ:۱۹۵)

احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند فرماتا ہے

And do good, for Allah loves those who do good.

"توبہ کرنے والے اور صفائی کا خیال رکھنے والے"

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيۡنَ وَ يُحِبُّ الۡمُتَطَهِّرِيۡنَ (البقرہ:۲۲۲)

بلاشبہ اللہ توبہ کرنے والوں اور صفائی رکھنے والوں کو پسند فرماتا ہے

Allah loves those who turn to Him in repentance and He loves those who keep themselves pure and clean.

"وعدہ پورا کرنے والے اور ڈرنے والے"

بَلٰى مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ (ال عمران:۷۶)

ہاں جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرے اور اس سے ڈرتا رہے تو اللہ ایسے ہی متقیوں کو پسند فرماتا ہے۔

Nay, but (Allah is aware of) those who keep their bond with Him and act aright - verily, Allah loves those who act aright.

"صبر کرنے والے"

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ (ال عمران:۱۴۶)

اور اللہ (مصیبت میں) صبر کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

Allah Loves those who are patient in adversity.

"انصاف کرنے والے"

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ (المائدہ:۴۲)

بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

Surely Allah loves those who are just.

اللہ کن لوگوں کو پسند نہیں فرماتا ہے

ALLAH DISLIKES THESE PEOPLE

''نافرمانی کرنے والے''

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (الصّف:۵)

اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

Allah does not show the transgressors (law-brakers) the way.

''فساد کرنے والے''

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (المائدہ:۶۴)

اور اللہ فسادیوں کو دوست نہیں رکھتا۔

Allah does not love those who are corrupt.

''ظالم''

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (التوبہ:۱۹)

اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔

Allah does not grace His guidance the people who (deliberately) do wrong.

''منکرین''

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (التوبہ:۳۷)

اور اللہ منکرین حق کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

Surely Allah does not like the traitors who deny the truth.

''غرور کرنے والے''

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ (النحل:۲۳)

بے شک اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

Surely Allah does not love those who are arrogant.

"فضول خرچ"

وَكُلُوا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الاعراف:۳۱)

اور تم کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کیا کرو، کیونکہ فضول خرچ لوگوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔

Eat and drink (pure and right things) but waste not by excess for Allah loves not the wasters.

"شرک کرنے والے"

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (النساء:۱۱۶)

اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا

The person who joins other gods with Allah, surely he has strayed far, far away (from the right path).

"حد سے گزر جانے والے، جھوٹے"

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (المومن:۲۸)

یقیناً اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو

Allah guides not one who transgresses and lies.

نیکی کا تصور

THE CONCEPTION OF PIETY

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے

It is not piety that you turn your faces towards East or West but (in fact) it is piety - to believe in Allah (He is alone the creator and owner of the whole Universe.) and the Last day (Everybody will be answerable for his actions) and the angels (they are servants of Allah) and the Book (the Quran and other books are sent from Allah) and the

Messengers (All are truthful and honest)

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُوْلٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ اُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرہ:۱۷۷)

اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ (اور نیک وہ لوگ ہیں کہ) جب عہد کریں تو اسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی متقی ہیں۔

(And truly pious is he who) Spends his substance - however much he himself may cherish it - upon his near of kin, and the orphans, and the needy, and the wayfares, and the beggars and for the freeing of human beings from bondage; and constant in prayer (five times a day) and renders the purifying dues; and (truly pious are) they who keep their promises whenever they promise, and are patient in misfortune and hardship and in time of peril: it is they that have proved themselves true and it is they, who are conscious of Allah.

والدین کے ساتھ حسن سلوک

Good Behaviour with Parents

”بندگی رب کے بعد بندوں میں سرفہرست خدمت خلق کا حق“

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (بنی اسرائیل:۲۳)

اور تمہارے رب نے حکم قطعی دے دیا ہے کہ (لوگو!) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔

So your Lord has decreed (ordered) Do not worship any one but Him and be kind to your parents.

”بڑھاپے میں خدمت“

اِمَّا یَبۡلُغَنَّ عِنۡدَکَ الۡکِبَرَ اَحَدُھُمَاۤ اَوۡ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّھُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنۡھَرۡھُمَا وَقُلۡ لَّھُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا (بنی اسرائیل:۲۳)

(اے مخاطب) اگر والدین میں سے ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کے آگے (اُف) ہُوں بھی نہ کرنا، اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے کچھ کہنا سننا تو ادب اور ملاطفت کے ساتھ ایسا کرنا۔

If one or both of them grow old in your presence, do not say even a little word of contempt to them nor repel them but address them in terms of honour and respect.

”نرم رویہ اور دُعا“

وَاخۡفِضۡ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ وَ قُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا (بنی اسرائیل:۲۴)

اور محبت سے خاکساری کا پہلو ان کے آگے جھکائے رکھنا، اور (ان کے حق میں) دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! جس طرح انہوں نے مجھے میرے بچپن میں پالا پوسا اور میرے حال پر رحم کرتے رہے اس طرح تو بھی (اپنی رحمت سے) ان پر اپنے کرم کی بارش نازل فرما۔

And look after with kindness and love and say: "O Lord! have mercy on them as they nourished me when I was small.

”شرک کرنے پر مخالفت“

وَاِنۡ جَاھَدٰکَ عَلٰۤی اَنۡ تُشۡرِکَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡھُمَا وَ صَاحِبۡھُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا (لُقمان:۱۵)

اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ شریک کرے جس کا تجھے علم ہی نہیں (یعنی شرک کے معاملے میں ہرگز اطاعت نہ کرنا) تو ان کا کہنا نہ ماننا، البتہ دنیاوی معاملات میں ان سے بھلائی کے ساتھ رفاقت کرنا۔ (اسلام کی بلند تعلیمات ملاحظہ کیجئے)

If they try to force you to associate with Me, that of which you have no knowledge, Do not obey them. (However) Live with them honourably in this world (Consider high teachings of Islam.)

اولاد کے ساتھ حسن سلوک

NOBLE TREATMENT WITH CHILDREN

”زندگی کا حق“

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (بنی اسرائیل:۳۱)

اور اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو

Do not kill your children for fear of Poverty.

”تعلیم وتربیت“

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم:۶)

اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔

O You who believe, save yourselves and your families from the fire (of Hell).

”اولاد کو جامع نصائح“

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان:۱۳)

اور (یاد کرو) جب لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا ”بیٹا، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

(Remember) When Luqman advised his son: "O Son, do not associate any one with Allah to associate others with Allah is a grievious wrong.

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ، اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (لقمان:۱۶)

اے میرے بیٹے برائی اگر رائی کے دانہ برابر ہو پھر وہ پتھر کی چٹان میں یا آسمانوں میں یا زمین میں کہیں ہو اللہ اسے لے آئے گا بے شک اللہ ہر باریکی کا جاننے والا خبردار ہے

O my son, whatsoever it may be, even though equal to a mustard seed in weight, within a rock or in the sky or in the earth, Allah will

bring it forth. Verily Allah is perceptive All Aware.

يٰبُنَىَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذَالِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان:۱۷)

اے میرے بیٹے، نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر اور یہ بڑے حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔

O, my son! Be constant in prayer, enjoin what is just, and forbid what is wrong and bear with patience what befalls you.Indeed these are acts of courage and perseverance.

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (لقمان:۱۸)

اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔

Do not hold men in contempt, and do not walk with pride on the earth. Verily Allah does not like the proud and boastful.

وَاقْصِدْ فِىْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (لقمان:۱۹)

اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز ذرا پست رکھ (یہ شرف انسانیت کا تقاضا ہے) یاد رکھو! سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھے کی ہوتی ہے۔

And be moderate in your bearing and keep your voice low (due to your dignity) for, behold, the ugliest of all voices is the (loud) voice of ass.

”اولاد کیلئے دعا“

وَاَصْلِحْ لِىْ فِىْ ذُرِّيَّتِىْ، اِنِّىْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اِنِّىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (الاحقاف:۱۵)

اے اللہ! میری اولاد کو نیک بنا کر مجھے سکھ دے میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔

O Allah! Make my children also good to comfort me. I turn to you in penitence and I am of those who have surrendered to You (as Muslims).

عدل سے تمہاری پرہیزگاری عیاں ہوتی ہے

Justice Shows Your Piety

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَانُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا، هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ:۸)

اور (دیکھو) کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کیا کرو، یہی بات تقویٰ کے قریب تر ہے اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

And do not let the hatred of a people deviate you from justice Be just: This is closest to piety and fear Allah. For Allah is well acquainted with all that you do.

سب سے زیادہ عزت والا

The Most Respectable Person

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات:۱۳)

بے شک اللہ کے یہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار رہے

Verily, the most honoured of you in the sight of Allah is (he who is) the most righteous of you.

نیکی اور بدی کا فائدہ

The Benefit of Good or Evil

اِنْ اَحْسَنْتُمْ، اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ، وَاِنْ اَسَاْتُمْ، فَلَهَا، (بنی اسرائیل:۷)

دیکھو! تم نے بھلائی کی تو خود اپنے ہی لئے بھلائی کی اور اگر برائی کی تو اس کا وبال بھی تم ہی پر ہوگا۔

If you do good, you will do so for your own good, if you do ill, you will do it for your own loss.

کامیابی کا راز

The Secret of Success

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس:۹)

کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا (قرآن کی روشنی میں) اور نامراد ہوگا وہ جس نے اسے گھٹیا بنایا (خواہشات نفس سے)۔

Truly he Succeeds that Purifies it (in the light of Quran) and he fails that corrupts it (with his wrong wishes).

امانت اس کے حقدار کو پہنچا دو

Deliver Trust to the entitled

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (النساء:۵۸)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو (مال و دولت یا عہدہ و حکومت وغیرہ)

Behold! Allah bids you to deliver all that you have been entrusted with unto those who are entitled thereto.

جو چیز ہاتھ نہ آئے اس پر غم نہ کرو

Grieve Not

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ (الحدید:۲۳)

جو تمہیں مل نہ سکے، اس پر غم نہ کرو

You grieve not for what you missed.

جو چیز مل جائے اس پر اتراؤ نہیں

Rejoice Not

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ (الحدید:۲۳)

اور جو (اللہ) تمہیں دے اس پر اترایا نہ کرو۔

And rejoice not at what you received.

Covet Not ہوس نہ کرو

لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (النساء:۳۲)

اور جو اللہ نے تم میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے تو اس کی ہوس نہ کرو (بلکہ جو تمہیں دیا ہے اس پر قناعت کرو اور راضی ہو جاؤ)

And do not covet what Allah has given some of you more than others.

ناحق مال نہ کھاؤ

Eat not Wrongfully

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ:۱۸۸)

اور آپس میں ایکدوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ (حرام ذرائع، رشوت، دھوکہ، غبن، ڈاکہ وغیرہ)۔

And Devour not one another's possessions wrongfully (by unjust means)

سود مت کھاؤ

Usury is not lawful

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰو (البقرہ:۲۷۵)

اور اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

Allah has permitted trade and forbidden usury.

تعاون کہاں اور کہاں نہیں

Cooperation and Non-cooperation

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى، وَلَاتَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ:۲)

نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو گناہ اور سرکشی کے کاموں میں تعاون نہ کیا کرو۔

Cooperate with all in what is good and pious but do not cooperate in what is sinful and wicked.

نکاح - زندگی کا صحیح راستہ

Marriage - a right way.

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ، فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا، فَوَاحِدَةً(النساء:٣)

تم اپنی پسند سے دو تین یا (زیادہ سے زیادہ) چار عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر (تم پر لازم ہے کہ) ایک ہی بیوی کرو۔

Marry woman of your choice (such as are lawful to you) two, or three or four, but if you have reason to fear that you might not be able to treat them with equal fairness, then (only) one.

زنا - زندگی کا غلط راستہ ہے

Fornication - a wrong way

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً، وَّسَآءَ سَبِيْلًا(بنی اسرائیل:٣٢)

زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو، وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ ہے۔

And do not go near fornication, as it is immoral and an evil way (opening the road to other evils)

یہ زندگی امتحان ہے

Life is a test

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک:٢)

اللہ نے موت وحیات کو اس لئے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے

Allah created death and life that He may try you to see which of you is best in deeds.

جو کوشش کرتے ہیں انہیں راہ ملتی ہے

Those who struggle find way

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (العنکبوت:۶۹)

جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے (سچائی کے) ضرور بالضرور دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکوں کاروں ہی کے ساتھ ہے۔

And those who strive in our (cause) ...... we will certainly guide them to our Paths: for verily, Allah is with those who do right.

ہر چھوٹی بڑی نیکی یا بدی وہاں درج ہوتی ہے

Record of every good and bad action

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال:۷-۸)

جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر بدی کی ہوگی (وہ بھی) اسے دیکھ لے گا۔

Whosoever has done even an atom's weight of good will see it, And whosoever has done even an atom's weight of evil will see it.

کامیابی کی کلید

The key of Success

وَالْعَصْرِ (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۲) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ، وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳) [العصر]

زمانے کی قسم (یعنی زمانہ انسانوں کے اعمال پر گواہ ہے) انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

By the time. (Consider the flight of time!) Lo! man is in a state of

loss, Except such as have faith (in Allah) and do good and enjoin truth on one another and enjoin one another to bear with fortitude (the trials that befall in the way of Allah).

یہ راستہ کن لوگوں کا ہے

The way of successful people

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ، صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ(الفاتحہ:۶-۷)

(اے اللہ) ہمیں صراط مستقیم پر استقامت عطا فرما، ان کی راہ پر جن پر تو نے انعام کیا۔

(O, Allah) Guide us to the path that is straight (which leads to paradise). The Path of those you have blessed.

اللہ نے کن لوگوں پر انعام کیا؟

Who are rewarded people

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓـئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ وَحَسُنَ اُولٰٓـئِكَ رَفِيۡقًا(النساء:۶۹)

جولوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاءؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین، کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔

And whosoever obeys Allah and the Messenger, shall be with those whom Allah has blessed -- the Prophets, the truthful, the martyrs and the righteous: what excellent companions that one may have!

مسلمان آپس میں کیسے رہیں؟

How do Muslims live with one another

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا(ال عمران:۱۰۳)

(مسلمانو!) سب مل کر اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

(O Muslims!) Hold on firmly together to the rope of Allah (The Quran) and be not divided among yourselves

مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ

Brotherhood among the Muslims

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (الحجرات:١٠)

مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح وصفائی قائم رکھو۔

The faithful are surely brothers; Hence (when ever they are at Odds) restore friendship among them

وہ آپس میں رحمدل اور دشمنوں پر بھاری ہیں

Strong and kind

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:٢٩)

محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کفار پر سخت ہیں (میدان جنگ میں) اور آپس میں رحمدل ہیں۔

Muhammad (Peace be upon him) is the prophet of Allah; and those who are with him are severe with infidels (in the battle field but) compassionate among themselves.

تفریق ڈالنے والوں کا انجام

Those Who Split up their religion?

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ، اِنَّمَا اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ، ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (الانعام:١٥٩)

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقوں اور ٹولیوں میں بٹ گئے، یقیناً آپ کا ان سے کچھ واسطہ نہیں، ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے، وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔

You have nothing to do with those, who split up their religion and become different sects. Their case rests with Allah and He Himself will let them know (on the day of Judgement).

انسانی جان کی حرمت

The Honour of Human Life

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًاوَمَنْ اَحْيَا هَا، فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا(المائدہ:۳۲)

جس نے کسی انسان کوخون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کوقتل کردیااور جس نے کسی کوزندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کوزندگی بخشی۔

Whosoever kills a human being except (as punishment) for murder or for spreading corruption in the land, it shall be like killing all humanity, and whosoever saves a life, saves the entire human race.

مسلمان کوقتل کرنے والے کا انجام

The Person who kills a Muslim?

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآئُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا(النساء:۹۳)

اور جوشخص کسی مومن کوعمدًا (جان بوجھ کر) قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

Anyone who kills a believer intentionally will be cast into Hell to abide there for ever, and the wrath and the curse of Allah are upon him, and a dreadful penalty is prepared for him.

اسلامی حکومت کی ذمہ داری

The Responsibilities of Islamic State

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ، وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج:۴۱)

وہ لوگ جنہیں اللہ زمین پر اقتدار بخشے تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ کا نظام نافذ کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

(They are) Those who, if we establish them in the land, will establish regular prayer (five times a day) and will establish the system of Zakat (charity) enjoin the right and forbid wrong. With Allah rests the end and decision of all affairs.

فحاشی پھیلانے والوں کا انجام

A Painful Punishment

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ(النور:۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی کی اشاعت ہو، ان کے لئے دنیا اور آخرت میں المناک عذاب ہے۔

There is painful punishment in this world and the next for those who like that immorality should spread among the believers.

امت مسلمہ کی ذمہ داری

The Duty of the Muslim Nation

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (ال عمران:۱۱۰)

اب (دنیا میں وہ) بہترین امت تم ہو جسے انسانوں کی صلاح وفلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

You are indeed the best community that has ever been brought forth for the good on mankind, you enjoin what is right and forbid what is wrong and you believe in Allah.

شیطان سے جنگ

A Constant war with Satan

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ، اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (البقرہ:۲۰۸)

مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

O you who believe. Enter into Islam Wholeheartedly (by Obeying all the rules and the regulations of Islam) and follow not Satan's footsteps, for, verily, he is your open foe.

شیطان تمہیں تنگدستی کا خوف اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے

What Satan Wishes and what Allah wishes

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ:۲۶۸)

"شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے (کہ انفاق فی سبیل اللہ سے تنگدست ہو جاؤ گے) اور تمہیں فحش کام کرنے کا حکم دیتا ہے جبکہ اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا اور خوب جاننے والا ہے۔"

Satan threatens you with the prospect of poverty (you will become poor by spending in the way of Allah) and orders you (to commit) shameful acts but Allah promises His pardon and grace (no doubt) Allah is bounteous and all knowing.

رحمٰن کے بندے

The true servants of the most Gracious

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا

رحمٰن کے (حقیقی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں۔

The (true) servants of the Most gracious are (only) they who walk gently on the earth.

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان:٦٣)

اور جب جاہل ان کے منہ آئیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام (یعنی الگ ہوجاتے ہیں)۔

Whenever the foolish address them, thay reply with (words of) peace.

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا (الفرقان:٦٤)

جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔

And those who spend their nights bowed and Standing before their Lord;

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا(٦٥) اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا(٦٦)[الفرقان]

اور جو اپنے رب کے حضور اس طرح دعا کرتے رہتے ہیں "اے ہمارے رب! جہنم کے عذاب سے ہمیں بچائے رکھ، کیونکہ اس کا عذاب ٹلنے والا نہیں ہے، بلاشبہ وہ جائے قرار بھی بری ہے اور مقام بھی برا ہے۔

And who pray: "O our Sustainer! Avert from us the suffering of hell - for, verily, the suffering caused by it is bound to be a torment dire. Verily, how evil an abode and a station!

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان:٦٧)

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔

Who, when they spend, are neither extravagant nor miserly but keep the golden mean between the two extremes.

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْ عُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًاo یُّضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَ یَخْلُدْ فِیْہٖ مُھَانًا(الفرقان:٦٨-٦٩)

جواللہ کے سوا کسی اور معبود کونہیں پکارتے اوراللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کوناحق ہلاک نہیں کرتے اورنہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں...... یہ کام جوکوئی کرے وہ اپنے گناہ کابدلہ پائے گااور قیامت کے روزاسے مکرر عذاب دیا جائے گا۔

Who do not invoke any god but Allah, nor kill a soul, which Allah has forbidden, unjustly, nor commit adultery. He who does this shall be punished for his sin, and his torment shall be doubled on the day of judgement, and he shall abide in state of disgrace.

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُوْلٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا(٧٠) وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّہٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ مَتَابًا(٧١)[الفرقان]

مگر یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہواور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو،ایسے لوگوں کی برائیوں کواللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور اللہ بڑاغفور رحیم ہے اور جوشخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے، پس وہ اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے،جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔

Except those who repent and come to believe and do the right, for whom Allah will turn evil into goodness for Allah is forgiving and kind. Whosoever repents and does the right will have turned back to Allah.

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْھَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِا للَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا(الفرقان:٧٢)

اور(رحمٰن کے بندے) وہ ہیں جوجھوٹے کاموں کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو پران کا گزر ہوجائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزرجاتے ہیں۔

(And the true servants of the Most Gracious) Are those who do not give false evidence and if they come across unbecoming talk, ignore it and pass by in a sedate way.

وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا(الفرقان:٧٣)

اور جنہیں اگران کے رب کی آیات سنا کرنصیحت کی جاتی ہےتو وہ اس پراندھےاور بہرے بن کرنہیں رہ جاتے۔

Who, when reminded of their Lord's revelations, do not fall

for them like the dead and blind.

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (الفرقان:۷۴)

اور جو دعائیں مانگا کرتے ہیں ''اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔

And those who say: "O Lord, give us comfort in our wives and children, and give us (the grace) to lead the righteous.

اُولٰٓئِکَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا(۷۵) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا(۷۶)[الفرقان]

یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے آداب وتسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا، وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے، کیا ہی اچھی جائے قرار اور قیام ہے۔

Those are the people who will be rewarded with the highest place in heaven, because of their Patient constancy. Therein shall they be met with salutations and peace.

مومنین کے چند اوصاف

Some other attributes of the Believers

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (الاحزاب:۳۵)

بالیقین جو مرد اور عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور بہت بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

Most Surely the men and the women who have surrendered themselves to Allah; who are believing, obedient, truthful and patient; who bow down before Allah, practise charity, Observe the fasts, guard

their Private parts and remember Allah much; Allah has prepared for them forgiveness and a great reward.

سیدالانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے

The Benefactor of mankind - Muhammad (Peace be upon him)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ(الاحزاب:۲۱)

یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسول (ﷺ) (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے۔

There is indeed the best model (to spend a good life) for you in the Massenger of Allah.

"وہ تو نسل انسانیت کے لئے رسول ﷺ ہیں"

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا(الاعراف:۱۵۸)

(کہہ دیجئے) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

(O Muhammad,) Say, "O mankind! I am a Messenger to all of you from Allah.

"وہ اخلاق کی بلندی پر فائز ہیں"

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ(القلم:۴)

اور بیشک آپ اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہیں۔

You are verily born of sublime nature.

"اللہ اور اس کے فرشتے ان پر درود بھیجتے ہیں"

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا(الاحزاب:۵۶)

اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجا کرو۔

Allah and His angels shower their belessings on the Prophet. O, believers, you shold also send your belessings on him.

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[شیخ عمر فاروق]

اسلامی نظامِ تہذیب کے چودہ رہنما اصول

کرہ ارض جس پر ہم آپ رہتے ہیں خدا کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہے۔اس صوبے میں خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھیجے گئے ہیں۔ان کی حیثیت کچھ اس طرح کی سمجھ لیجئے جیسے دنیا کی حکومتیں اپنے ماتحت ملکوں میں گورنر یا وائسرائے بھیجا کرتی ہیں۔ایک لحاظ سے دونوں میں فرق ہے۔دنیوی حکومتوں کے گورنر اور وائسرائے محض انتظام ملکی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں اور سلطان کائنات کے گورنر اور وائسرائے اس لیے مقرر ہوتے ہیں کہ انسان کو صحیح تہذیب، پاکیزہ اخلاق اور سچے علم و عمل کے وہ اصول بتائیں جو روشنی کے مینار کی طرح انسانی زندگی کی شاہراہ پر کھڑے ہوئے صدیوں تک سیدھا راستہ دکھاتے مگر اس فرق کے باوجود دونوں میں ایک طرح کی مشابہت بھی ہے۔دنیا کی حکومتیں گورنری جیسی ذمہ داری کے منصب ان لوگوں کو ہی دیتی ہے جو ان کے سب سے زیادہ قابل اعتماد آدمی ہوتے ہیں اور جب وہ انہیں اس عہدے پر مقرر کر دیتی ہے تو پھر انہیں یہ دیکھنے اور سمجھنے کا پورا موقع دیتی ہے کہ حکومت کا اندرونی نظام کس طرح کس پالیسی پر چل رہا ہے اور ان کے سامنے اپنے وہ راز بے نقاب کر دیتی ہے جو عام رعایا پر ظاہر نہیں کیے جاتے۔ایسا ہی حال خدا کی سلطنت کا بھی ہے وہاں بھی پیغمبری جیسے ذمہ داری کے منصب پر وہی لوگ مقرر ہوئے ہیں جو سب سے زیادہ قابل اعتماد تھے اور جب انہیں اس منصب پر مقرر کر دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کو اپنی سلطنت کے اندرونی نظام کا مشاہدہ کرایا اور ان پر کائنات کے وہ اسرار ظاہر کر دیے جو عام انسانوں پر ظاہر نہیں کیے جاتے۔

اسی نوعیت کے تجربات میں سے ایک وہ چیز ہے جس کو معراج کہتے ہیں۔معراج صرف سیر اور مشاہدے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایسے موقع پر ہوتی ہے جب کہ پیغمبر کو کسی کارخاص پر مقرر کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے اور ایسا ہی ایک اہم موقع وہ تھا جب حضرت محمد ﷺ کو طلب کیا گیا۔یہ وہ وقت تھا کہ صرف حجاز اور صرف عرب ہی نہیں بلکہ گردو پیش کی دوسری قوموں سے بھی سابقہ پیش آنا تھا اور اسلام کی تحریک ایک اسٹیٹ میں تبدیل ہونے کو تھی اس لیے اس اہم موقع پر آپ کو ایک نیا پروانہ تقرر اور نئی ہدایات دینے کے لیے بادشاہ کائنات نے اپنے حضور میں طلب فرمایا:

اسی پیشی و حضوری کا نام معراج ہے عالم بالا کا یہ حیرت انگیز سفر ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔

اس سفر کے ضمنی واقعات احادیث میں آئے ہیں۔ مثلاً بیت المقدس پہنچ کر نماز ادا کرنا، آسمان کے مختلف طبقات سے گزرنا، پچھلے زمانے کے پیغمبروں سے ملنا اور پھر آخری منزل تک پہنچنا۔ لیکن قرآن ضمنی چیزوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اصل مقصد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے اس لیے اس نے کیفیت معراج کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ بلکہ وہ چیز تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے جس کے لیے آنحضرت ﷺ کو بلایا گیا تھا قرآن کی سترھویں سورت میں آپ کو یہ تفصیل مل سکتی ہے اس کے دو حصے ہیں ایک حصے میں مکے کے لوگوں کو آخری نوٹس دیا گیا کہ اگر تمہاری سختیوں کی وجہ سے خدا کا پیغمبر جلاوطنی پر مجبور ہوا تو مکے میں تم کو چند سال سے زیادہ رہنے کا موقع نہ مل سکے گا اور بنی اسرائیل کو جن سے عنقریب مدینے میں پیغمبر سے براہ براست سابقہ پیش آنا تھا خبردار کیا گیا کہ تم اپنی تاریخ میں دو زبردست ٹھوکریں کھا چکے ہو اور دو قیمتی موقعے کھو چکے ہو۔ اب تم کو تیسرا موقع ملنے والا ہے اور یہ آخری موقع ہے۔

دوسرے حصے میں وہ بنیادی اصول بتائے گئے جن پر انسانی تمدن کی تعمیر ہونی چاہئے۔

یہ ۱۴ اصول ہیں:

۱) صرف اللہ کی بندگی کی جائے اور اقتدار اعلیٰ میں اس کے ساتھ کسی کی شرکت تسلیم نہ کی جائے۔

۲) تمدن میں خاندان کی اہمیت ملحوظ رکھی جائے۔ اولاد والدین کی فرمانبردار و خدمت وگذار ہو اور رشتہ دار ایک دوسرے کے ہمدرد و مددگار ہوں۔

۳) سوسائٹی میں جو لوگ غریب یا معذور ہوں یا اپنے وطن سے باہر مدد کے محتاج ہوں وہ بے وسیلہ نہ چھوڑ دیے جائیں۔

۴) دولت کو فضول ضائع نہ کیا جائے جو مال دار اپنے روپے کو برے طریقے سے خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

۵) لوگ اپنے خرچ کو اعتدال پر رکھیں۔ نہ بخل کر کے دولت کو روکیں اور نہ فضول خرچی کر کے اپنے لیے اور دوسرے کے لیے مشکلات پیدا کریں۔

۶) رزق کی تقسیم کا قدرتی انتظام جو خدا نے کیا ہے انسان اس میں اپنے مصنوعی طریقوں سے خلل نہ ڈالے خدا اپنے انتظام کی مصلحتوں کو زیادہ بہتر جانتا ہے۔

۷) معاشی مشکلات کے خوف سے لوگ اپنی نسل کی افزائش نہ روکیں جس طرح موجودہ نسلوں کے رزق کا انتظام خدا نے کیا ہے آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہی انتظام کرے گا۔

۸) خواہش نفس کو پورا کرنے کے لیے زنا کا راستہ برا راستہ ہے لہٰذا نہ صرف زنا سے پرہیز کیا جائے بلکہ اس کے قریب جانے والے اسباب کا دروازہ بھی بند ہونا چاہئیے۔

۹) انسانی جان کی حرمت خدا نے قائم کی ہے لہٰذا خدا کے مقرر کردہ قانون کے سوا کسی دوسری بنیاد پر آدمی کا خون نہ بہایا جائے، نہ کوئی اپنی جان دے، نہ دوسرے کی جان لے۔

۱۰) یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

۱۱) عہدو پیمان کو پورا کیا جائے۔انسان اپنے معاہدات کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

۱۲) تجارتی معاملات میں ناپ تول ٹھیک ٹھیک راستی پر ہونا چاہیئے اوزان اور پیمانے صحیح رکھے جائیں۔

۱۳) جس چیز کا تمہیں علم نہ ہواس کی پیروی نہ کرو۔وہم اور گمان پر نہ چلو کیونکہ آدمی کو اپنی تمام قوتوں کے متعلق خدا کے سامنے جواب دہی کرنی ہے کہ اس نے انہیں کس طرح استعمال کیا۔

۱۴) نخوت اور تکبر کے ساتھ نہ چلو،غرور کی چال سے نہ تو زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں سے اونچے ہو سکتے ہو۔

یہ چودہ اصول جو معراج میں آنحضرت ﷺ کو دیے گئے تھے ان کی حیثیت صرف اخلاقی تعلیمات ہی کی نہ تھی بلکہ یہ پروگرام تھا جس پر آپ کو آئندہ سوسائٹی کی تعمیر کرنی تھی یہ ہدایات اس وقت دی گئی تھیں جب آپ کی تحریک عنقریب تبلیغ کے مرحلے سے گزر کر حکومت اور سیاسی اقتدار کے مرحلے میں قدم رکھنے والی تھی۔لہٰذا یہ گویا ایک مینی فسٹو (Manifesto) تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ خدا کا پیغمبران اصولوں پر تمدن کا نظام قائم کرے گا اسی لیے معراج میں یہ ۱۴ نکات مقرر کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے تمام پیروان اسلام کے لیے پانچ وقت کی نماز فرض کی تاکہ جو لوگ اس پروگرام کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے اٹھیں ان میں اخلاقی انضباط پیدا ہو اور وہ خدا سے غافل نہ ہونے پائیں ہر روز پانچ مرتبہ ان کے ذہن میں یہ بات تازہ ہوتی رہے کہ وہ خود مختار نہیں ہیں بلکہ ان کا حاکم اعلیٰ خدا ہے جس کو انہیں اپنے کام کا حساب دینا ہے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)